قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ہمارا وطن پیارا وطن اس وقت ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا ہے۔ ہمارے قیمتی ووٹوں کے سہارے جو لوگ اسمبلیوں میں پہنچے ہیں۔ جن کو ہم نے اسی لیے وہاں بھیجا ہے کہ ملک و ملت ترقی کی راہ پر آگے بڑھے لیکن اخباری اطلاعات دہلا رہی ہیں۔ نیب نے جن لوگوں کی نشاندہی کی ہے ان سب کا تعلق سیاسی جماعتوں سے ہے۔ ان سب پر ایسے ایسے الزامات سننے میں آرہے ہیں جو ملک و قوم کی خدمت نہیں، ملک و قوم کو لوٹنے کی سعی ہے جو سراسر ملک سے غداری ہے۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں مگر قانون کا حافظہ کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ جن لوگوں کا نام آرہا ہے انہیں کڑی سے کڑی سزا نہ دی گئی تو آنے والے لوگ بھی یہی کچھ کریں گے اور ملک ترقی کرنے کی بجائے الجھتا رہے گا۔ بحیثیت عوام ہمارا پرزور مطالبہ ہے کہ ایسے تمام سیاہ کار لوگوں کو سیاست سے الگ کر کے مجرموں کی صف میں لاکر عبرت ناک سزا دی جائے ورنہ آنے والی پود طعنے دے گی بقول اکبر بخاری

ہمارے دور میں انصاف یارو
ستم کا پاسباں ہونے لگا ہے

معراج رسول

جلد 26 ❖ شمارہ 02 ❖ مارچ 2016ء

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شیراز خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عثمان خان	0333-2168391
	ثاقب محمود	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فرحان علی بخش	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِسالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35004200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

سرگزشت

پہلی ستمبر 1915ء کو صبح تین بج کر سینتالیس منٹ پر سیالکوٹ کے گاؤں ڈسکی میں ایک بچے کی ریں ریں ہیرا سنگھ کے گھر میں گونجی۔ ماں سیوادئی عرصے سے بستر سے لگی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اسے دائمی مرض نے گھیر رکھا ہے۔ ایسے دائمی مریضہ کے ہاں وہ پیدا ہوا تھا اس لیے ورثے میں اسے کمزوری ملی۔ کبھی ریں ریں کرتے کھوں کھوں کرنے لگتا تو کبھی کھوں کھوں کرتے کرتے ریں ریں۔ گویا پیدا ہوتے ہی ریں ریں کرنا اس کی سرشت میں شامل ہوگیا۔ مریضہ ماں کا مریض بچہ تھا اس لیے کچھ دنوں تک لوگ اس کے حشر کا انتظار کرتے رہے مگر اس معاملے میں سخت جاں نکلا۔ ریں ریں کھوں کھوں کرتے ہوئے وہ گھٹنوں پر چلنے گزارتا چلا گیا۔ اب ہیرا سنگھ کو فکر ہوئی کہ وہ بیٹے کی جنم کنڈلی بنوائے۔ جوتشی کو بلوایا گیا اس نے حساب کتاب سے معلوم کر کے کہا۔ ”یہ لگن مین کہتی ہے اس پرکیتو کا گہرا سایہ ہے۔ ہر دم پریشان رہے گا مگر برہسپت اپنے خانہ میں ہے اس لیے پریشانیاں حل ہو جائیں گی۔ برہسپت کی نظر بدھ پر ہے اس لیے یہ بڑا ہو کر فنکار بنے گا لیکن شنی کی نظریں بھی جمی ہوئی ہیں جس پر شنی یعنی زحل کی نظریں ہوتی ہیں اسے اصل شہرت مرنے کے بعد ملتی ہے۔ اس کی بیوی ہر دم بیمار رہے گی۔“ اتفاق ہے کہ اس وقت جوتشی نے جو کچھ بتایا تھا وہی کچھ ہوتا رہا۔ باپ کی بیوی دائمی مریضہ تھی تو اسے بھی دائمی مریضہ ملی تھی۔ کچھ بڑا ہوا اور تعلیم کی شدبد ہوئی تو اسے مزید تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا گیا۔ لاہور سے ہی اس نے گریجویشن کیا۔ بچپن میں رات گئے تک وہ بیمار ماں کی پائنتی بیٹھا پیر دباتا رہتا تھا اور باپ ہر روز ایک پیسا یومیہ کرایہ کی کوئی کتاب ضرور لاتا تھا اور وہ کتاب سرہانے بیٹھ کر بیوی کو سناتا رہتا تھا۔ گویا کہانی قصے سے یارانہ اسے بچپن سے ہی ہوگیا تھا۔ شرلک ہومز اور ناڈے سے وہ بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ بچپن میں سنے گئے قصے ذہن میں گردش کرتے رہتے تھے اسی لیے نوعمری سے ہی قلم سے دوستی ہوگئی تھی۔ بڑھتی عمر کے ساتھ قلم میں پختگی آتی گئی۔ اس کی تحریریں جرائد کا حصہ بننے لگیں۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ لوگ اس کا نام احترام سے لینے لگے۔ پہلے چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ”دان ودام“ آیا پھر ”گرم کوٹ“ جس نے 1940ء میں ہلچل مچا دی تھی۔ پھر 1942ء میں ”گرہن“ آئی تو شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔ اس کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کے لیے 1943ء میں مہوری فلمز لاہور نے اپنی ٹیم میں اسے شامل کر لیا لیکن بمشکل چھ ماہ بعد ہی وہ اس اسٹوڈیو سے جان چھڑا کر آل انڈیا ریڈیو جموں چلا گیا اور 1947ء میں اسے جموں کشمیر براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ تب تک اس کے مجموعوں کے تراجم ہندی، بنگلہ اور کشمیری زبانوں میں آچکے تھے۔ اسی دوران اس نے ایک کے بعد ایک ”کوکھ جلی“ ”اپنا دکھ مجھے دے دو“ اور ”سات کھیل“ نامی مجموعے شائع کیے جو ہاتھوں ہاتھ بکے۔ پھر وہ بمبئی فلم نگری کی طرف چلا گیا۔ جہاں اس نے 1949ء میں ”بڑی بہن“ کے ڈائیلاگ لکھے۔ 1952ء میں ”داغ“ اب اس نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا اور 1954ء میں امر کمار، بلراج ساہنی، گیتا بالی وغیرہ کے ساتھ مل کر ایک نئی فلم کمپنی کی بنیاد رکھی اور 1955ء اپنی ہی کہانی پر ”گرم کوٹ“ بنائی پھر 1962ء میں دوسری فلم رنگولی اسی ادارے سے پیش کی گئی جب کہ انورادھا، میم دیدی، آس کا پنچھی، بمبئی کا بابو، مدھومتی، مسافر، بسنت بہار، طلاپ، دیوداس، مرزا غالب، داغ، بڑی بہن کے ڈائیلاگ لکھ کر کامیاب مکالمہ نگار کی حیثیت سے خود کو منوا چکے تھے۔ اس کے بعد بھی اس نے ایک چادر میلی سی، آنکھیں دیکھی، مٹھی بھر چاول، نواب صاحب، پھاگن، ابھیمان، گرہن، دستک، ستیم، میرے ہمدم میرے دوست، بہاروں کے سپنے، انوپما، میرے صنم جیسی کامیاب فلموں کے ڈائیلاگ بھی لکھے اس وجہ سے زیادہ تر لوگ اسے فلمی رائٹر اور فلمی کتھا کار کہنے لگے جب کہ وہ اردو ادب میں بھی اہم قلمکار کی حیثیت سے مقام رکھتا ہے۔ لوگ اسے راجندر سنگھ بیدی کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

شہرِ خیال

☆ ناصر حسین رند کی آمد بہاولپور سے۔ ”فروری کا مہینا ادب کی دنیا کے لوگوں پر بھاری رہا۔ 6 تاریخ کو خبر ملی محترم انتظار حسین چل بسے۔ ادارے سے وابستہ عظیم رائٹر محی الدین نواب 7 فروری کو رحلت فرما گئے جو کہ انتہائی قیمتی اثاثہ تھے۔ ان کا خلا شاید کبھی بھی پورا نہ ہو سکے۔ پھر عرفا خلیلی اور اب محترمہ آپا فاطمہ ثریا بجیا بھی رخصت ہو گئیں۔ کاشف زبیر کے لیے بھی دعائے صحت کی درخواست ہے اللہ تعالیٰ انہیں جلد صحت یاب فرمائے، آمین۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے عالموں اور نیک اچھے لوگوں کا دنیا سے چلے جانا قربِ قیامت کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ مرحومین کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔ سب سے پہلے ”گینڈا اور جنگل“ پڑھی۔ واقعی انتہائی معزز اور پارسا نظر آنے والے ایسے مکروہ دھندوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ ”پُراسرار خط“ اور ”مذاق“ کو پُراسرار نمبر میں شامل کر لیتے تو پچی کہانیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا جو کہ صرف 5 عدد تھیں (خاص نمبر میں سچ بیانیاں کم رکھی جاتی ہیں تا کہ معلوماتی مضامین زیادہ لگ سکیں)۔ ”ماماز بوائے“ ہمارے معاشرے میں مرد اگر اپنی ماں کا فرماں بردار ہو تو ماماز بوائے اور بیوی سے محبت کرتا ہو تو زن مرید کا لقب پاتا ہے۔ ”علم عروض“ واقعی انٹرنیٹ پر لڑکے اور لڑکیاں اسی طرح سے ایک دوسرے سے دھوکے بازیاں کر رہے ہیں۔ ”فروری کی شخصیات“ میں صائمہ اقبال کے طاہر القادری کے بارے میں یہ الفاظ اچھے لگے کہ ان کے سیاسی اور انقلابی نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کی تعلیمی اور دینی شعبوں میں خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پُراسرار نمبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہو گی۔ دھند بھرے موسم میں چسکے لے کر پڑھا کہ سواد آ گیا۔ ”تاریخ بین“ راسپوٹین جیسی پُراسرار اور محیر العقول ہستی پر اگر پُراسراریت پر ملکہ رکھنے والے رائٹر سے لکھوایا جاتا تو کہانی کا مزہ ذرا الگ سا ہو جاتا کیونکہ راسپوٹین جیسے عجیب و غریب شخص سے نہ جانے کتنے مافوق الفطرت واقعات بن رکھے تھے۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آئے۔ شیراز خان، پرویز بلگرامی، ایم اے راحت، انور علیگی سے لکھواتے تو سواد آ جاتا کیونکہ محترم ڈاکٹر ساجد امجد کا شعبہ ذرا علیحدہ ہے اور وہ عقل کی کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھتے ہیں۔ ”توہم پرستی“ کافی سارے واقعات دراصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ”زومبی“ یورپ والے جن زندہ لاشوں سے پریشان ہیں۔ دراصل وہ روز حشر قبروں سے اٹھیں گے۔ یورپ والے قبل از وقت پریشان ہو گئے ہیں۔ خوفناک فلمیں اور ڈراموں کے ذکر پر ہمیں بھی کچھ یاد آ گیا۔ جن زمانوں میں پی ٹی وی پر ہر جمعرات ایک جمعرات چھوڑ کر لگتا تھا اس پر جمشید انصاری کا ڈراما ”آسیب“ اور ملکی قبرستان پر طویل دورانیہ کا کھیل، عجیب و غریب قسم کے یہ دونوں ڈرامے بھولیں سے نہیں بھولتے۔ پُراسرار نمبر کے معلوماتی حصے سے جو سب سے زیادہ تحریریں پسند آئیں۔ ان میں ایک تو بھارت سے حیرت انگیز قصہ ”خون آشام“ اور دوسرا ”نادیدہ عفریت“ معلوماتی بھی تھی اور کہانی کی صورت میں بیان کی گئی، وری گڈ۔ اور سچی کہانیوں میں ”دہشت کدہ“ اور ”خانہ خالی“ پُراسراریت سے بھرپور کہانیاں تھیں۔ ”خانہ خالی“ پڑھ کر انور علیگی کا پُراسرار اور دہشت سے بھرپور ناول ”خالی گھر“ یاد آ گیا۔ پُراسرار نمبر کے لیے اگر سال پہلے پلاننگ کرتے تو یہ شمارہ اس سے بھی عمدہ ہو سکتا تھا۔ 2015ء کی پُراسرار اور شاہکار کہانیاں جیسے ساحر، اسرار، جل پری اور غیر انسانی کو خاص نمبر کے لیے الگ کر لیا جاتا اور ایک آدھ اتنی خوف زدہ تحریریں یکجا ہو جاتیں دوسرا پُراسرار نمبر یا خاص نمبر ذرا عام سرگزشت سے موٹا ہونا چاہیے۔ قیمت بڑھا دیا کریں۔ اب ”شہرِ خیال“ پر تھوڑا سا تبصرہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، شاندار خط لکھنے پر ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ محمد سلیم قیصر جس محبت سے آپ نے ہمیں یاد کیا آپ کے لیے ہر نماز کے بعد ہم نے دعا کرنی شروع کر دی ہے۔ سدرہ بانو نا گوری ہمیشہ کی طرح پھولوں کی پتیاں بکھیر رہی تھیں۔ احسان سحر کا جامع تبصرہ خوب صورت تھا۔ سعید احمد چاند آخر کافی عرصے بعد بدلی سے نکل آیا۔ طاہرہ گلزار آپا کیا شہرِ خیال میں آپ کی، بشریٰ افضل اور سدرہ بانو کی جو تعریف ہم کیا کرتے رہتے ہیں کیا صنفِ نازک کی لسٹ سے باہر ہے۔ ڈیئر وحید ریاست بھٹی نے واقعی حق ادا کر دیا۔ وری گڈ دوست۔ ایک بات ذہن سے نکل گئی تھی ”قدیم تہذیب“ میں طارق عزیز خان لکھتے ہیں کہ پُراسرار تحریریں موئنجودڑو کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا کہیں ہم نے پڑھا تھا کہ موئنجودڑو کے اسرار مولانا ابوالجلال ندوی، سمجھنے اور پڑھنے میں کامیاب ہوئے (احمد حسین دانی صاحب سے بڑا قدیم تہذیب کی تختیاں پڑھنے والا کوئی نہیں اور وہ بھی ناکام رہے ہیں اگر کوئی پڑھ لیتا تو پوری دنیا میں ہلچل مچ جاتی) آخر میں ان ساتھیوں کا ذکر جو ان پچیس سالوں میں سرگزشت سے جڑے ہوئے ہیں۔ میرا انجم، آفتاب احمد قیصر، مرزا طاہر الدین بیگ، احمد خان توجیدی، اعجاز حسین سٹھار، روبینہ نفیس انصاری، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، سہیل احمد عباسی اور خالد کبیر سے گزارش ہے سالانہ رپورٹ سے منہ موڑا ہے

لیکن کبھی کبھی شہرِ خیال میں دوستوں کی خاطر آجایا کرو۔ منشی عزیز مئے، رانا محمد شاہد، رانا محمد سجاد سرگزشت کی پہچان بن چکے ہیں۔ صائمہ نور سرگزشت میں خوب صورت اضافہ ہیں۔ انہیں ویلکم کرتے ہیں۔"

☆ نجمی رحمٰن برٹ لیٹ یو ایس اے سے لکھتی ہیں۔ "شمارہ مجھے 20 نومبر کو ملا۔ ایک ہفتہ پڑھنے میں لگا۔ آپ ہی انصاف کریں اگر خط لکھوں تو آپ کو ہمیشہ لیٹ ہی ملے گا۔ پلیز یہ کہہ کر خط لیٹ ملا ہے شائع ہونے سے مت روکیے پاکستان سے دور رہنے والوں کے خط آپ کو ہمیشہ دیر سے ملیں گے۔ (شکر کریں کہ 20 نومبر کو مل گیا۔ نانگا پربت کا عقاب والے ندیم اقبال کو ایک ماہ اور کبھی سات دن بعد ملتا ہے بے فکر رہیں دیارِ غیر سے آنے والے خطوط جن میں تبصرے یا کوئی اہم بات ہوا سے ہم اگلے ماہ ضرور لگاتے ہیں) "شہرِ خیال" کے سب ساتھی ایک خاندان کی طرح لگتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نوک جھوک دلچسپ لگتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر اتنی دلنشین ہوتی ہے کہ پہلی سطر سے ہی توجہ کھینچ لیتی ہے۔ شاہد رانا نے میری جنم پتری کب دریافت کی مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ اچھی کتاب اچھی تحریر پڑھنے کے لیے ویسے بھی عمر کی کوئی قید نہیں ہم دیارِ غیر میں ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ پاکستان سے باہر نکلیں گے مگر اللہ کی طرف سے اس طرح سبب پیدا ہوئے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ویسے بھی باہر سے آنے والے بہترین دماغ اعلیٰ ڈگریوں والے جتنا امریکا کی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اتنا امریکا اہم نہیں البتہ یہ ہے کہ یہاں کا قانون اسلام کے قوانین ہیں جن پر یہ لوگ عمل کر رہے ہیں۔ یہاں ہمیں اللہ نے بسایا ہے اس طرح یہ ہمارا ملک ہے۔ "تاریخِ عالم" میں منظر امام دنیا کی تاریخ بتا رہے ہیں۔ بتدریج ترقی کرتی ہوئی دنیا اور سائنس کی انتہا کو پہنچ کر اب یہ منزل کی طرف جا رہی ہے۔ انور فرہاد اچھا لکھ رہے ہیں۔ ہمیں بہت پرانے دور کی کہانیاں سنا رہے ہیں۔ سرگزشت جب سے شروع ہوا ہے کئی ایک سچ بیانیوں کا جواب نہیں اگر ان میں سے کوئی یادگار کہانی بھی شائع کریں تو ہم فیضیاب ہو جائیں گے۔ "سراب" حسبِ معمول اونچی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر ہمیں اپنے ساتھ ساتھ دنیا کی سیر کرا رہے ہیں۔"

☆ وحید ریاست بھٹی کا تبصرہ کلرسیداں سے۔ "سالِ نو کے آغاز پر "پُراسرار نمبر" پیش کرنے پر مبارک باد اور پھر "پُراسرار نمبر" کی عالمگیر کامیابی پر "خصوصی مبارک باد"۔ پھر "پُراسرار نمبر" پر اظہارِ رائے کرنا چاہوں گا۔ "شہرِ خیال" کی رونق" ناصر حسین رند" نے بہت باریک بینی سے "سرگزشت" کی زینت بننے والی "پُراسرار" تحاریر کا خوبصورت تجزیہ پیش کیا۔ نانگا پربت کا عقاب (ندیم اقبال) غالباً نہیں یقیناً اکثریت کی دلچسپی کا محور قرار پا گئے۔ اب آتے ہیں فروری 2016ء کے شمارے کی جانب، سب سے پہلے معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا، جو سچائی اور اظہارِ سچائی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ معراج صاحب نے دلچسپ پیرائے میں جدید معاشی مسئلہ پیش کیا، ایک سطحی سرگزشت میں "عکسِ داستان" کے نام سے ممتاز مفتی جلوہ گر تھے، پڑھ کر لطف آ گیا، پھر "شہرِ خیال" میں داخل ہوئے۔ کرسی صدارت پر عبدالجبار رومی براجمان تھے، جو اپنے خیالات کو بڑی چابکدستی سے قرطاسِ ابیض پر منتقل کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ محترمہ سدرہ بانو ناگوری، محمد سلیم قیصر، اعجاز حسین سحار، ملک شیر ملک، صائمہ نور، انور عباس شاہ، اویس شیخ، بشریٰ افضل، فرزانہ نگہت، خالد محمود اور احسان سحر کے نامے بھی حسنِ تحریر سے آراستہ تھے، پیارے بھائی سعید احمد جاندی کی طویل غیر حاضری کے بعد حاضری "چودھویں کے چاند" کی طرح خوشگوار احساس کی حامل رہی۔ باجی طاہرہ گلزار پہلی مرتبہ ناول بلڈ پریشر کے زیرِ سایہ لکھتی نظر آئیں اور یہ ایک بہت مثبت تبدیلی تھی، سب سے جاندار اور شاندار خط "عبداللہ شجاع" لاڑکانہ کا تھا، ندرتِ تخیل سے بھرپور اور نہایت سلیقے سے ترتیب دیئے گئے جملے دیر تک مطالعاتی ذوق کی تسکین کا باعث بنتے رہے۔ اس کے بعد اپنا ہی تحریر کردہ "تجزیاتی جائزہ برائے سال 2015ء" پڑھا، یقین نہیں آیا کہ یہ میرے نوکِ قلم کا نتیجہ ہے، جسے ادارہ نے نمایاں طور پر رونقِ سرگزشت بنایا، میں کتنا کامیاب رہا؟ یہ آپ کی مفید آراء سے اندازہ کر پاؤں گا۔ آگے بڑھے تو ڈاکٹر ساجد امجد صاحب "فدائے اُردو" لیے موجود تھے، جسے یقیناً اُردو ادب سے تعلق رکھنے والی ایک بڑی تعداد ضرور پذیرائی بخشے گی، اس کے بعد ساؤتھ افریقن کرکٹ پر ضیا اعجاز نے خامہ فرسائی فرمائی۔ محترم انور فرہاد اس مرتبہ بازی مات کرنے میں کامیاب رہے۔ نصرت نذیر پر ان کی تحریر "ملکۂ موسیقی" زیرِ بحث کے زمرے میں آتی ہے، میری جانب سے مبارک باد قبول ہو۔ نویر ریاض صاحب کی تحریر "میری لوم" "ایک عزم و حوصلے سے بھرپور تحریر تھی، "م الف" نے "لوا کو" لکھ کر خون آشام شخصیات کو قارئین کی مطالعاتی عدالت میں نہایت بہادری کے ساتھ پیش کیا، محترم منظر امام "تاریخِ عالم" کو احسن انداز میں سمیٹتے نظر آئے، محترمہ کشمالہ حسن کی تحریر "الو کے امراض" بہت معلوماتی تحریر تھی، ابھی فروری کا شمارہ زیرِ مطالعہ تھا اور سچ بیانیاں پڑھنا شروع بھی نہیں کی تھیں کہ ایک خبر جانکاہ نے قلب و روح کو ہلا کر رکھ دیا، جب یہ خبر سُنی کہ ہمارے ہر دلعزیز مصنف محترم محی الدین نواب اب اس عالمِ رنگ و بو میں نہیں رہے تو یقین جانیں یقین نہیں آ رہا تھا، ابھی چند دن پہلے تک تو ہم محترم کاشف زبیر صاحب کے لیے اپنے پروردگار کریم کے حضور دعائے صحت و سلامتی کر رہے تھے اور ابھی محی الدین نواب کے لیے دُعائے مغفرت کر رہے ہیں، دیر تک سوچتا رہا کہ یہ سفرِ زیست کیوں اتنا مختصر ہے؟ کوئی آتا ہے، کوئی جاتا ہے، کیوں ہم سے وہی چھین لیا جاتا ہے جو ہمیں سب سے پیارا ہوتا ہے، ابھی گزشتہ برس علی سفیان آفاقی کی ابدی جدائی کا زخم کیا کم گہرا تھا جو محی الدین نواب کی صورت کاری ضرب ناگزیر قرار پائی، یا الٰہی تیرے لیے موت و زیست کا بھید تُو ہی جانے، ہم عاجز و مسکین بندے تیری خفیہ تدبیر سمجھنے سے یکسر قاصر و لاچار ہیں، ہاں ہم تو فقط اتنا ہی جانتے ہیں کہ مخلوق کے حق میں تُو سب سے بہتر سمجھنے والا ہے؟ (نواب صاحب پر تبصرہ اچھا تھا لیکن اس میں شامل بہت سی باتیں مضمون میں آ چکی ہیں)۔ اُن کا سب سے بڑا شاہکار "دیوتا" تھی، جو سسپنس ڈائجسٹ میں فروری 1977ء سے جنوری 2010ء تک مسلسل چونتیس برس شائع ہوتی رہی، جسے پاکستان کے علاوہ ہندوستان اور باقی ماندہ دُنیا میں بھی اُردو دان طبقے کی ایک بڑی تعداد نے دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ اُن کی اور کوئی کتاب نہ بھی ہوتی، صرف "دیوتا" ہی انہیں صبحِ قیامت تک کے لیے زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔ دُنیا کی طویل ترین کہانی کا عظیم مصنف اپنے چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دے کر ملکِ عدم کی جانب 6 فروری 2016ء کو 79 برس کی عمر میں سدھار گیا، اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل جیسی دولت عطا فرمائے، آمین۔"

☆ فریدہ جاوید فری لکھتی ہیں۔ "میں بہت پرانی قاری ہوں سرگزشت کی مگر کبھی تبصرہ نہیں کیا۔ پڑھتی ضرور ہوں پاکیزہ اور سرگزشت میرے

فیورٹ میگزین ہیں اس سرگزشت کی سچی کہانیاں بہترین ہوتی ہیں، اتنی شاندار کہ میں کن الفاظ میں اس کی تعریف کروں۔ اس مرتبہ بھی اس کی ہر کہانی لاجواب تھی۔ خاص کر "ٹھوکر" نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ زمانی بیگم جیسی پُرخلوص اور ہمدرد خاتون نے جولیا کا ساتھ خوب دیا۔ سرگزشت کی اشاعت پر میں آپ کو سلام پیش کرتی ہوں۔"

☆ ایم عمران جونانی کا اظہاریہ کراچی سے۔ "کاشف زبیر تادمِ تحریر اسپتال میں ہیں۔ الٰہی معجزہ دکھا دے (آپ سب کی دعائیں بارگاہِ رب العزت میں مقبول ٹھہریں۔ کاشف زبیر کی طبیعت بہتری کی جانب مائل ہے) اس قدر جامع اور بھرپور اداریہ معراج رسول ہی لکھ سکتے ہیں۔ انداز اچھا لگا۔ علی پور کے ایلی کی یک مکمل سرگزشت معلومات کا در کھول گئی۔ مفتی کے لاحقہ کا پس منظر خوب رہا۔ سچ بیانیوں کی سربراہی کے لیے انتخاب کوو اوہ ہے۔ ندیم قیصر نے اونچ نیچ پر مشتمل آپ بیتی خوب صورتی سے ہم تک پہنچائی۔ ناظم بخاری لٹتے لٹتے رہ گئے۔ "علم عروض" نے Orkut کے دن یاد دلا دیے جب سیل فون کمی نئے نئے آئے تھے۔ ہر وقت SMS مس کال اور آن لائن آنے کا انتظار رہتا تھا۔ پہلی محبت کسی بھی روپ میں چھب دکھلا کر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے ایک دفعہ مجھے فون پر بتایا تھا کہ اچھی کہانی وہ ہوتی ہے جو قاری کو یکدم چونکا دے۔ نام "گیدڑ اور جنگل" اور پھر بچیوں کا غائب ہونا لگ رہا تھا کوئی آسیب وغیرہ کا چکر ہوگا لیکن پھر بیگ صاحب کے کردار سے پرتیں کھلتی گئیں اور ہم دل تھام کر رہ گئے۔ وقار احسن! بہت خوب ویسے تمہارا نام اقرار احسن ہونا چاہیے۔ ابتداء میں صداقت حسین ساجد کی جھول اور ستم سے بھری کہانی "پُراسرار خط" سرگزشت جیسے شمارے میں سچ بیانی کے طور پر شائع کیسے ہوگئی؟ کراچی کے قرب وجوار میں ایسے گھنے جنگلات کی موجودگی جہاں چیتے پائے جاتے ہوں اس قدر دھند کہ حدِ نگاہ نہایت کم ہے اور سرد موسم میں طوفانی بارش (مقامات تبدیل کیے گئے ہیں اصل شہر کی جگہ کراچی کا نام دیا گیا)۔ عالمگیر کی "اے بی سی" بھی دل کو نہ چھو سکی۔ عمر کے کسی بھی حصے میں نامحرموں کی قربت غضب ڈھا سکتی ہے یہ بھی ہم نہیں کر پایا نہ چاہا ہو جاتا ہے۔ جولیا نے سرگزشت کے قارئین کو اپنا سمجھ کر آپ بیتی سنائی اور بہت سوں کے لیے سبق چھوڑا۔ میرے نانا مرحوم بھی نادیدہ مخلوق کا بلاوجہ تذکرہ کرنے سے گریز کی تلقین کرتے تھے جب کہ شہباز اور حنا نے تو مذاق ہی بنا لیا۔ یہ کہانی ان والدین کے لیے خاص تلقین ہے جو شادی میں بچوں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے۔ عارف بھائی! انسان کسی بھی اجنبی راستے سے واپس آتا ہے تو خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے، بڑی مناسب تفصیلات کے ساتھ آپ نے واقعہ بیان کیا۔ لبابی کا کردار اور باتیں بہت اچھی لگیں۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ کہانی ختم ہونے تک "ماما زیوائے" کی چھاپ فرہاد پر سے ہٹ جائے گی لیکن جناب مسز فواد کی حکمتِ عملی کی بدولت اب یہاں ایک ماما زگرل بھی تیار ہے جب کہ ایک ننھا تیاری کے مراحل میں ہے۔ اس تحریر نے آخری کہانی کے جاندار ہونے کی روایت برقرار رکھی۔ "نانگا پربت کا عقاب" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بلاشبہ ایک اعلیٰ پائے کا سفر ہے۔ وطنِ عزیز کی خوشبو میں بسا ہوا۔ "عبیرِ خیال" میں رومی انصاری نے ہر تحریر پر بہترین تبصرہ کرتے ہوئے صدارت حاصل کی۔ صائمہ نور وعلیکم السلام اولیس شیخ بھرپور تحریر ہے آپ کی۔ فرزانہ بہت خوش آمدید۔ احسان سحر آپ نے تعزیت کی جزاک اللہ۔ اعجاز سنگھار، ایم اسلم، احسان سحر، طاہرہ گلزار اور شجاع نے بھی بہت اچھا لکھا۔ وحید بھٹی نے سال بھر محنت کر کے رواں تبصرہ و تجزیہ مرتب کیا اور ادارے نے بھی عمدگی سے علیحدہ شائع کر کے حق ادا کر دیا۔ جمالی صاحب "پت جھڑ کے رنگ" کی صورت میں دل کی آنکھوں سے پڑھنے والا عطیہ کر آئے: منظر نگاری شاندار، الفاظ رسیلے، اشعار کا برمحل استعمال، لہجے میں برجستگی، جو شخص اس قدر خوب صورت لکھتا ہوا سے طویل خط لکھنے کا حق حاصل ہے۔"

☆ فلک شیر ملک کی شاہ گڑھ رحیم یار خان سے آمد۔ "اس شمارے نے پچھلی ساری کسر نکال دی۔ معلومات کا ذخیرہ تھا اور بھر واقعات سے بھرپور بھی۔ معراج رسول نے اچھی کہانی سنائی۔ ایسے کو تیسا کے مصداق بہی کچھ ہو رہا ہے۔ حرام میں لذت ہے مگر برکت نہیں۔ جھوٹ فریب چاپلوسی سے کمائی ہوئی دولت سے حلال کا ایک روپیا ہزار درجے بہتر ہے۔ "عبیرِ خیال" میں اپنے خط کا جواب پڑھ کر دھچکا لگا۔ (لکھنے کے ایک ماہ بعد آپ اپنی تحریر کو دوبارہ سے بارہ پڑھیں اس سے تحریر میں رہ گئی خامی خود سامنے آجائے گی۔ ہاں اپنی تحریریں لکھیں اور بھیج سکتے ہیں)۔ میں نے ایک سفرنامہ "سفر صوبائی" بھی لکھ رکھا ہے مگر آپ نے پہلے ہی بڑی دل آزاری کر دی (کوتاہی کی بجائے کوالٹی پر توجہ دیں تحریر خود اپنی جگہ بناتی ہے)۔ عبدالجبار رومی انصاری کا تبصرہ ٹاپ پر تھا۔ اعجاز حسین سنگھار، محمد سلیم قیصر، سدرہ بانو ناگوری، طاہرہ گلزار اور احسان سحر کے تبصرے بھی خوب رہے۔ وحید ریاست بھٹی نے پورے سال کا تجزیہ بڑی جانفشانی سے پیش کیا۔ شاہ گڑھ میرا گاؤں ہے اور رحیم یار خان میرا شہر۔ "فدائے اردو" ساجدہ امجد صاحب نے ڈاکٹر محی الدین زور پر تفصیلی مضمون لکھ کر ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے والے اس محقق کی یادیں تازہ کیں۔ "پت جھڑ کے رنگ" خوب صورت انداز میں بداپسٹ شہر کا پس منظر بیان کیا گیا۔ مزاحیہ انداز پسند آیا۔ "انوکھے مرض" ان بیماریوں میں سے تین چار تو ہمارے ملک میں بھی جڑ پکڑ چکی ہیں۔ "نانگا پربت کا عقاب" اچھی سمت رواں ہے۔ دلچسپ اور پراثر یہ تحریر بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ "مردِ بحران" کرکٹ پر لکھی گئی یہ اسٹوری بڑی دلچسپ تھی۔ "اے بی ڈی ویلیئرز" پر معلوماتی مضمون نے واقعی متاثر کیا کیونکہ جنوبی امریکا کا یہ کھلاڑی میرا بھی آئیڈیل ہے۔ "ملکۂ موسیقی" مسرت نذیر پر انور فرہاد نے دل کھول کر لکھا۔ "میری کوم" بھی مردِ بحران جیسی خوب صورت کہانی تھی۔ میری کوم فلم میں اشرین اداکارہ پریانکا چوپڑا نے میری کوم کا بہ از بردست کردار ادا کیا تھا۔ منظر امام کی "تاریخِ عالم" اور طارق عزیز خان کی "قدیم تہذیب" دونوں معلوماتی تحریریں تھیں۔ خصوصاً قدیم تہذیب میں موہن جودڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے متعلق آگاہی زبردست کاوش تھی۔ "فردوسی کی شخصیات" کا سلسلہ کامیابی سے ہمکنار ہے۔ صائمہ اقبال صاحبہ بڑی محنت سے اتنی معلومات اکٹھی کر کے ہم تک پہنچا رہی ہیں۔ سچ بیانیوں کا سلسلہ بھی سرگزشت کی پہچان ہے جو اپنی تمام تر رعنائیوں سے رواں ہے یوں تو ساری ہی سچ بیانیاں حیران کن تھیں مگر ماما زیوائے، اجنبی راستے اور ٹھوکر سپرہٹ رہیں۔ "قرض، مرض اور قرض" ایک اچھی کہانی تھی۔"

☆ شکیل الرحمٰن کراچی سے لکھتے ہیں۔ "آپ کا اداریہ پڑھا کوفت میں اضافہ ہو گیا۔ کراچی میں لیاقت علی خان مرحوم کے صاحبزادے اکبر بھائی

سے ملاقات ہوئی۔ میرا 2007ء میں انڈیا میں دہلی میں پاکستانی سفارت خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کافی بڑی حویلی میں سفارت خانہ ہے۔ بہرکیف میں نے اکبر بھائی سے پوچھا یہ حویلی کتنے گز پر محیط ہے انہوں نے بتایا کہ 12000 گز پر ہے۔ میں نے پھر پوچھا کہ حویلی کے بدلے پاکستان میں کیا لیا؟ بولے کچھ نہیں لیا۔ اب ہم کیا کر رہے ہیں؟ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے!!"

☆ اعجاز حسین سُتھار کا اظہار پُرزور پُرتحمل ہے۔ "پُراسرار نمبر" کے پُرتحیر واقعات، مضامین اور کہانیوں کی گونج ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ حالانکہ رومان انگیز اور چسکا والی کوئی بات نہ تھی بلکہ ہم تو بے تابی سے سلور جوبلی نمبر کا انتظار کر رہے تھے جو میرے خیال میں دھماکا خیز چیز ہوگا۔ تجزیاتی جائزہ سال 2015ء ترتیب دینے پر وحید ریاست بھٹی کو مبارک باد۔ "انوکھے امراض" کا احوال پڑھ کر فکرمندی نے گھیر لیا ہے کیونکہ یہ امراض اچانک حملہ کرتے ہیں اور اس میں عمر کی قید بھی نہیں ہے۔ "ملکۂ موسیقی" میں مسرت نذیر کے فن اور خداداد صلاحیتوں کے قائل ہو گئے۔ میں تو ان کا پرستار بھی ہوں اور ایک حیرانی بھی ہوئی کہ وہ اتنی عمر کی ہیں کیونکہ وہ جب بھی ٹی وی پر دکھائی دیں جوان اور تروتازہ نظر آئیں۔ ان کی خوب صورتی کے ساتھ صحت بھی عطیہ خداوندی ہے۔ "تانگا پربت کا عقاب" کے انداز تحریر نے مزہ دیا۔ "فروری کی شخصیات" میں فضل محمود، جوش ملیح آبادی، قدرت اللہ شہاب، طاہر القادری، عارفہ کریم، شعیب ملک، اسفند یار ولی، عطاء الحق قاسمی، بدر میاں داد اور شفقت امانت علی سے متعلق حالات و معلومات مزہ دے گئیں۔ "تراکو" خوف کی وجہ سے ابھی تک نہیں پڑھ سکا۔ کیونکہ ابھی تک پراسرار نمبر کے واقعات اور ماحول سے نہیں نکل پائے ہیں۔ "سراب" سے متعلق جن دوستوں کو مار دھاڑ اور جنگ و جدل کی وجہ سے شکایات تھیں اب دور ہو گئی ہوں گی اس بار کہانی کا ٹمپو تیز اور تجسس عروج پر ہے۔ سچ بیانیوں میں "فرض، مرض اور قرض" ٹائٹل کا اعزاز پانے کی حقدار ہے۔ "علم عروض" میں سارا ملبا صنف نازک پر ڈالا گیا ہے لیکن شاعر صاحب تو خود لٹو ہوئے اور بغیر دیکھے محبوب کے لب و رخسار اور ناز و انداز پر مرمٹے اور اکاؤنٹ میں رقم تک ٹرانسفر کرا دی انہیں بے وقوف بنایا نہیں گیا بلکہ وہ خود ہی بے وقوف تھے جس کا صدف نے موقع کی مناسبت سے فائدہ اٹھایا۔ "کینہ اور شیطان" پڑھ کر بڑی دیر کے بعد اصل کہانی کا مزہ آیا ہے۔ بیگ صاحب کیسی دوہری شخصیت رکھتے تھے اور کامیاب اداکاری سے شیطانی چیلے بنے ہوئے تھے۔ "پراسرار خط" تجسس اور دلچسپی میں عروج پر ہے۔ صداقت حسین ساجد نے تانا بانا خوب بُنا ہے لیکن افسانوی رنگ حد سے زیادہ چڑھا بیٹھے ہیں۔ "ماما زبولنے" کو موجودہ حالات کے تناظر میں دیکھیں تو جیسے حالات نوجوان نسل کے ہیں تو اس سے بہتر ہے کہ ہر بچہ ماما زبولے ہو ورنہ زیادہ تعداد ایسے بچوں کی ہے جو نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں جو تباہی پر جاکر ختم ہوتے ہیں۔"

☆ عارف محمود پیرس فرانس سے لکھتے ہیں۔ "سرگزشت کا عرصے سے قاری ہوں۔ بہت زبردست پرچہ ہے۔ اچھا معیار ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج کے دور میں بھی چھا جانے والے رائٹرز ہیں۔ یورپ میں تو رائٹر بنانے کی بھی ٹریننگ ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں تو ایسا کوئی ادارہ ہی نہیں۔ آپ سے گزارش ہے ایک خاص نمبر اسلام کے دشمن کا شائع کریں۔ اکثر لوگوں کو تو ابوجہل کا ہی نام پتا ہے اور ایک خاص شمارہ مسلمان سائنسدانوں کا۔ ڈاکٹر ساجد صاحب سے گزارش ہے کہ William quilliam abumb جن کو liverpol کا پہلا مسلمان کہا جاتا ہے۔ Mohammad piktau اور Sir Barren hadle پر ضرور لکھیں اور رکن الدین بیبرس اسلام کے ہیرو جس نے صلیبی جنگوں کا خاتمہ کیا اور دوسری طرف منگولوں کا رخ موڑ دیا (اتفاق ہے کہ سب پر تحریر شائع ہو چکی ہے) کاشف زبیر صاحب کی "سراب" زبردست جا رہی ہے خاص کر ایکشن کے پلاٹ خوب ہوتے ہیں۔ نسیم حجازی صاحب کی کمی ہمیشہ رہتی ہے۔"

☆ عامر زمان عامر کی ڈی آئی خان سے آمد۔ "جناب کیسے مزاج ہیں، طویل رفاقت کے بعد آپ سے مخاطب ہوں اس لیے ہو سکتا ہے آپ کے ذہن سے میرا نام مٹ چکا ہو۔ محترم ذوالفقار عابد کے توسط سے معلوم ہوا کہ آپ جاسوسی ادارہ سے وابستہ ہیں۔ ساتھ ہی مجھے سرگزشت میں حاضری کی تاکید کی۔ 2016ء کے آغاز میں میرا افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آ رہا ہے دعا کیجیے گا۔ کوشش ہوگی ماہ بہ ماہ سرگزشت میں باقاعدگی سے حاضری دے سکوں۔ 2 عدد تازہ کاوشیں "چہرے" اور "پاداش" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے (پڑھنے کے بعد مطلع کر دیا جائے گا)۔"

☆ علی حسنین تابش چشتیاں ضلع بہاولنگر سے رقمطراز ہیں۔ "سرگزشت عرصہ پانچ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ آج پہلی بار اس کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ ایک چھوٹی سی کاوش حاضر خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گی اگر شائع فرما کر حوصلہ افزائی کریں گے تو آپ کا مستقل رائٹر بھی بن جاؤں گا۔ کہانی پڑھ کر اطلاع ضرور دیجیے گا (پلیز سرگزشت میں چھپنے والی کہانیاں غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کو کس طرح آگے بڑھایا جا رہا ہے)۔"

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کا خلوص نامہ اسلام آباد سے۔ "کچھ عرصہ میں خط نہ لکھ سکی کیونکہ میں ملک سے باہر تھی۔ ویانا گئی تھی کورس کے سلسلے میں۔ بہرحال واپس آ کر سرگزشت پڑھا۔ پراسرار کہانی جو ہر شمارے میں ہوتی تھی وہ بھی ختم کر دی گئی لیکن اب آپ نے پراسرار نمبر دے کر سارے گلے شکوے دور کر دیے۔ سب مضامین بہترین تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد بہترین ایمان افروز تحریر کے ساتھ آئے۔ مریم کے خان کا مضمون بھی بہت اچھا تھا اور ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ بہترین انداز تحریر لیے ہوئے تھا۔ سچ بیانیاں بھی سب دلچسپ تھیں۔ "چھوٹا سا کام" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ جنتی کا نام شیا سن کر بڑی ہنسی آئی۔ دیگر سب سچ بیانیاں بھی بہت پراسرار تھیں اور پسند آئیں۔ رند صاحب کا تجزیہ بہت شاندار تھا۔ جن کہانیوں کا انہوں نے ذکر کیا وہ سب میری بھی بہت پسندیدہ ہیں۔ لکھنا تو بہت کچھ چاہ رہی ہوں لیکن مصروفیت اجازت نہیں دیتی۔ طاہرہ باجی کو خصوصی سلام۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ بشریٰ افضل، رانا سجاد، رانا شاہد، قیصر عباس، عمران جونانی صاحب اور دیگر قارئین کو سلام۔"

☆ تسنیم زہرا کاظمی کا خط کراچی سے۔ ”میں سرگزشت کی مستقل قاری ہوں۔ لیکن کافی عرصے سے کچھ نہیں لکھا۔ اپنے اوپر بیتا ایک واقعہ لکھ رہی ہوں۔ عورتوں کو قبرستان جانے سے منع کیا جاتا ہے لیکن جب اپنے پیارے چلے جاتے ہیں تو انسان یہ بات بھلا دیتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ اُمید ہے نزدیکی شمارے میں جگہ دیں گے۔“

☆ رضا احمد خان نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے (کافی پہلے لکھا ہے لیکن آج موصول ہوا)۔ ”پُراسرار نمبر پڑھا۔ سچ بیانیوں میں ”چھوٹا سا کام“ ”سرسراہٹ اور مدیم انصاری کی ’خواب یا سچائی‘ “بہترین کہانیاں تھیں۔ دانیہ صدیقی کی کہانی ”دہشت کدہ“ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ منظر امام کی تحریر پڑھ کر کراچی کے بہت سے مقامات سے آگاہی ہوئی۔ جنوری کی شخصیات میں سعادت حسن منٹو، ذوالفقار علی بھٹو، سلطان راہی، سید ضمیر جعفری اور حکیم سعید پر تحریریں پسند آئیں۔ ”کمال احمد رضوی“ پر راشد اشرف کی تحریر پڑھ کر میں کتنی ہی دیر سوچوں میں گم رہا کہ کتنی ہی عظیم ہستیاں ہمارے درمیان سے اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔“

☆ آصفہ ضیاء احمد نے حیدرآباد سے لکھا ہے۔ ”2015ء میں سرگزشت میں میری متواتر تین کہانیاں شائع ہوئیں۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ اس کے لیے میں آپ کی اور ادارے کی شکر گزار ہوں۔ اللہ کرے آپ کا ادارہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے، آمین۔ اللہ کرے میری بقیہ تحریریں بھی ان قیمتی صفحات پر جگمگاتی نظر آجائیں۔ ہر مہینے آنکھیں منتظر رہتی ہیں۔ سب سے پہلے میں فہرست پر ہی نظر ڈالتی ہوں۔ اس ماہ ایک نئی کہانی ”رشتے“ لے کر حاضر ہو رہی ہوں کسی قریب ترین شمارے میں جگہ مل جائے تو کرم نوازی۔ (پڑھنے کے بعد فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔)“

☆ سدرہ بانو ناگوری کی صدا کراچی سے۔ ”گلزار آپا کے خط کے آخری الفاظ اداس کر گئے یہ کیا؟ آپ تو خودسری کی طرف جا رہی ہیں فوراً کے لیے پلٹ آئیے ورنہ یہ احساسِ کمتری شخصیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ حوصلہ مندی سے کام لیں گی۔ بشریٰ آپا یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ ہم نہ ہوں گے تو؟؟ آپ ایسی دل دکھانے والی باتیں نہ کیا کریں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اولیس شیخ آپ کو میرے خطوط میں سنجیدگی نظر آئی بہت شکریہ۔ یہ سرگزشت کے مطالعے کا اثر ہے ورنہ ابھی تو ابھی تک جہازوں اور چینے کی نظر سے ہی دیکھتی ہیں۔ وحید ریاست بھٹی نے تجزیاتی جائزہ برائے سال 2015ء بہت اچھے انداز میں لکھا گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ بہت خوب بھٹی صاحب۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ہمیشہ کی طرح اپنے قلم کا جادو خوب جگایا۔ ”پت جھڑ کے رنگ“ میں خط کو لے کے دلچسپ انداز میں تحریر کیا گیا کہ مصنف کو داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ دلکش انداز شوخ جملے کہ پڑھ کر مزہ آگیا۔ ویلڈن ابراہیم بھائی آیندہ کے احوال کو ذرا جلدی لکھنے کی کوشش کیجیے گا۔ ”انوکھے مرض“ کی انوکھیاں حیران کر گئیں۔ ”نزاکو“ پڑھ کر کپکپی سی طاری ہوگئی کہ بھلا انسان اتنا ظالم اور انا پرست کیسے ہو گیا۔ ”میری کوم“ کی روداد زندگی قابلِ ستائش ہے کہ اس کے بلند ارادوں نے اسے عرش پر پہنچا کر کامیابی کا مزہ چکھا دیا۔ میری کوم کی سب سے بڑی جیت تو یہی ہے کہ اس نے اپنی غربت کو شکست دی اور شاید یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ”سراب“ بھی خوب دوروں پر ہے مگر جاسوسی میں کاشف زبیر کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں پڑھا۔ میری دعا ہے کہ خدا ان کو جلد صحت یاب کرے، آمین۔ مدیم اقبال بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ ”رسم شادی“ کی رسومات کچھ تو عجیب و غریب اور کچھ بہت دلچسپ لگیں۔ ”نظریے“ پر صرف ایک نظر ہی ڈال سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو مسلمان گھرانے میں پیدا کیا ورنہ ہم بھی کہیں ایسے عجیب سے مذاہب کے چکروں میں پڑ جاتے تو شاید کہیں کے نہ رہتے۔ ”ملکۂ موسیقی“ کا مختصر سا احوال دلوں میں گھر کر گیا۔ ”قرض، مرض اور فرض“ کے لیے کیا عرض کریں کہ بعض اوقات وقت، حالات اور اپنے اس قدر مجبور کر جاتے ہیں کہ انسان وہ سب کچھ بھی کر گزرتا ہے کہ جن کے بارے میں وہ عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ”علم عروض“ فیس بک کی دنیا میں ہونے والے فراڈ کی ساری ہی داستان تھی۔ ”نامزد بیوائیں“ بچوں کی شخصیات تباہ کرنے کے اثرات سے آگاہ کر گئی مگر نائلہ نے بھی اپنے بچوں کو... انہی خطوط پر چلانے کی تیاری کی ہے جس پر شوہر کے چلنے پر وہ ناراض تھی اسی لیے کسی نے کیا خوب کہا ہے عورت ایک معما ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ”اس بار تو اپنا سویٹ سویٹ محبوب سرگزشت 2 فروری کو ملا لیکن بھائی کی شادی کی وجہ سے لیٹ پڑھا تو خط بھی لیٹ ہو جائے گا۔ اُمید تو ہے کہ پہنچ جائے گا وقت پر اور شائع بھی ہوگا۔ 2016ء تو ہمارے لیے اور بھی بھاری ہوا۔ 9 جنوری کو میری نانی فوت ہوگئی۔ پھر کچھ دن بعد بزدل دہشت گردوں نے چارسدہ میں باچا خان یونیورسٹی چارسدہ پر حملہ کیا اور 20 سے زائد لوگ شہید اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ لڑکے لڑکیوں کو ذبح کیا پرنسپل کو شہید کیا گیا۔ ایک لڑکے کی 20 دن بعد شادی ہونی تھی۔ میری رشتے کی بھانجی جو وہاں کی اسٹوڈنٹ ہے ابھی تک ذہنی تکلیف میں ہے۔ ابھی ابھی یہ منحوس خبر ملی کہ میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ پوری شادی کے دوران دل و دماغ کاشف کی طرف رہا۔ اللہ کا کرم ہوا کہ اب وہ بہتر ہو رہے ہیں۔ میری دعا ہے اللہ صحت کاملہ عطا کریں (آمین ثم آمین)۔ معراج رسول انکل نے کیا خوب کہانی سنائی ہے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہر بندہ کہتا ہے کہ ہر ایک نے لوٹ مار مچا رکھی ہے۔ کیا ہوگا اس ملک کا!! لیکن اپنے گریبان میں نہیں دیکھتے کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں صحیح مسلمان بنائے اور ہمارے ملک اور عوام پر رحم کریں، آمین ثم آمین۔ یک جی میں ”عکس داستان“ میں ممتاز مفتی کے بارے میں پڑھ کر شوق پیدا ہو گیا کہ ”علی پور کا ایلی“ پڑھ لوں۔ ”معیارِ خیال“ میں پہلے نمبر پر عبدالجبار رومی انصاری کا بہت ہی شاندار اور دلچسپ خط تھا۔ دل خوش ہو گیا۔ اعجاز حسین سحاب بھی اپنے مخصوص اندازِ تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ محمد سلیم قیصر، بارش آئے طوفان آئے لیکن تیری باجی گل سرگزشت کا ساتھ نہیں چھوڑتی کبھی لیٹ ہو جائے تو شائع نہیں ہوتا۔ بھائی میں تو ان تمام دوستوں کو بلا بلا کے تھک گئی ہوں۔ اب کیا ان کے پیچھے ڈنڈا

لے کر جاؤں۔ تمام دوست سنیں جلد حاضر ہو جائیں ورنہ مابدولت آپ سب پر فائن لگا دے گی۔ بھائی فلک شیر ملک تو اس بار بڑے کرج چمک کے ساتھ نظر آئے۔ میں عرصہ تقریباً 8 سال سے سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت میں تبصرہ لکھ رہی ہوں لیکن آج تک شروع کے نمبر نہیں ملے (مختصر اور جامع تبصرہ لکھ کر تو دیکھیں)۔ واہ سدرہ بانو ناگوری کیا خوب صورت انداز میں اتنا پیارا تبصرہ کیا، ویلڈن۔ صائمہ نور بھی خوب چمک رہی تھیں۔ انور عباس شاہ کا تبصرہ لاجواب ہے۔ آپ کے آزادی تبصرہ والی بات سے میں بھی متفق ہوں۔ شکر ہے بشریٰ افضل کہ اس بار آپ بھی حاضر ہو یا دان کو کیا جاتا ہے جو بھول گئے ہوں پلیز ڈیئر آتی رہو۔ خالد محمود آف ملتان تو ادارے کو ان کا کام سمجھانے لگے، مچھلی کو تالاب میں تیرنا سکھایا جا رہا تھا ہاہاہا۔ فرزانہ نگہت بھی پہلی بار حاضر تھیں۔ احسان سحر بھائی آپ کا مطلب ہے کہ میں بری ہوں میں حقیقت بیان کرتی ہوں، لوگوں کے تلخ رویے دیکھ کے عمل سچ لکھتی ہوں اس لیے میں بری ہوں کہ میں منافقت برداشت نہیں کر سکتی نہ ریاکاری۔ میرے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر ہوتا ہے۔ احسان سحر آپ نے تبصرہ بہت لاجواب اور تفصیلی لکھا ہے۔ ظاہر ہے آپ رائٹر بھی ہیں۔ واہ میرے فیورٹ تبصرہ نگار سعید احمد چاند آخر چاند بدلی سے نکل ہی آیا۔ آپ چار پانچ مہینے نہیں کم از کم 8 مہینے کے بعد آئے ہو۔ اب آپ پر بھی فائن ہے کہ آپ ہر مہینے حاضری دیں گے۔ رسالہ سرگزشت کراچی میں کم از کم 28 کو اور پشاور میں 3 تاریخ کو مل جاتا ہے۔ محمد خلیل چودھری تو عاشق سرگزشت نکلے واہ صاحب کیا محبت سرگزشت سے ہے۔ آپ کا مختصر تبصرہ بہت پسند آیا۔ خوش رہیے یہ تو ہم بھی چاہتے ہیں کہ سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت میں 20 سال پہلے والے سلسلے دوبارہ شائع کریں تا کہ نئی نسل کو بھی کچھ علم حاصل ہو۔ عبداللہ شجاع سندھی آپ کا تبصرہ آپ کے پختہ علم اور پُرسوچ تحقیق پر تنقید کرنے کا لاجواب نمونہ میرا خیال ہے آپ کا خط اس شمارے کے ''معصر خیال'' کا سب سے بہترین خط ہے۔ پلیز میں ایک بار پھر پرانے تبصرہ نگاروں رانا شاہد، تنویر عباس، محمد جاوید کادوانی، ثاقب نواز ثاقب اور باقی لوگوں کو التجا کرتی ہوں کہ واپس آ جائیں۔ اس بار تو عمران جونانی بھی غائب۔ شاہد جہانگیر شاہد بھی نہیں ہیں اللہ ان کو صحت کاملہ عطا کریں، آمین ثم آمین۔ ہاں شکر ہے وحید ریاست بھٹی تبصرہ میں نہیں لیکن تجزیاتی جائزے برائے سال 2015 بہت خوب صورت انداز میں لے کر حاضر تھے۔

☆ صائمہ نور ملتان سے لکھتی ہیں۔ ''اداریہ میں معراج رسول بجا فرما رہے ہیں۔ ملک میں افراتفری لوٹ مار سب ہمارا ہی تو کیا دھرا ہے۔ رشوت خوری، کرپشن کو ہم نے ہوا دی ہے اگر آج ہم رشوت لینا اور دینا ترک کر دیں تو نظام بدل جائے گا۔ ملک میں امن ہو جائے گا ہم تحریف اپنے لیے اور اصلاح دوسروں کے لیے پسند کرتے ہیں۔ ''عکس داستان'' میں ممتاز مفتی کے بارے میں پڑھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ مشکلات میں کیسے کیسے انسان صبر و تحمل سے آگے آئے ہیں اور اپنا نام بنایا ہے۔ ''معصر خیال'' میں عبدالجبار رومی انصاری صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زور قلم اور زیادہ کرے۔ (آمین)۔ اعجاز حسین سحاب، محمد سلیم قیصر، سدرہ بانو ناگوری، انور عباس شاہ، اویس شیخ، بشریٰ افضل، خالد محمود، فرزانہ نگہت، احسان سحر طویل خط، سعید احمد چاند، محمد خلیل چودھری، طاہرہ گلزار، عبداللہ شجاع سندھی کے تبصرے خوب صورت تھے۔ فلک شیر ملک بھائی مجھے خط میں جو بات کی ہے تصدیق ہوں۔ تجزیاتی جائزہ وحید ریاست بھٹی نے کمال لکھا۔ فدائے اردو، بت جھڑ کے رنگ، الو کے مرض بہت اچھی تحریریں تھیں۔ ''تانگا پر بت کا عقاب'' بہترین سفرنامہ ہے۔ پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ ''رسم شادی'' نے عجیب و غریب رسومات کا پڑھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ لبوں پر مسکراہٹ بھی پھیل گئی بہت خوب۔ ''فروری کی شخصیات'' بھی خوب رہی۔ ''سراب'' اچھی چل رہی ہے اور کاشف زبیر علیل ہیں اب ان کی صحت کیسی ہے؟ (بہت بہتر ہے)۔ سچ بیانیوں میں ''پُراسرار خط'' واقعی پُراسرار تحریر تھی لیکن راقم کو بھی سزا ملی کیونکہ اس قتل کی واردات میں برابر کا شامل تھا۔ ''اے پی سی'' محمد عالمگیر نے زبردست لکھا۔ کہانی کے آخر میں جا کر لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ٹھوکر'' دل گیر تحریر تھی۔ پاکستان میں آج بھی کچھ ہو رہا ہے۔ برائیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ ''مذاق'' حنا رؤف نے بہترین لکھا۔ بہترین درس بھی ہے کہ مذاق ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ماں اپنے بچے کو بھی مذاق کے طور پر جھوٹ نہ بولے۔''

☆ قیصر خان نے بھکر سے لکھا ہے۔ ''انکل معراج بھی بادشاہ ہیں۔ ہم اگر اپنا احتساب کریں تو ترقی نہ کر جائیں۔ جیسے لوگ عوام ویسی حکومت، ارکان شکوہ کرنا فضول ہے ہم خود کہاں چھوڑتے ہیں۔ بس دعا ہے ہمیں ہدایت ملے، آمین۔ ممتاز مفتی کے بارے میں پڑھا اس پر ایک مکمل مضمون لکھنا چاہیے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کو۔ حاجی اعجاز صاحب، محمد سلیم قیصر انور عباس شاہ سب لوگ حاضر تھے۔ میری اور سب کی ہردلعزیز شخصیت آپا طاہرہ صاحبہ حاضر تھیں۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ خالد محمود بھی حاضر تھے اور بہت دکھی تھے۔ جنوری رسالہ اچھا تھا سب کچھ تو تھا پھر ان کو پسند کیوں نہ آیا مجھ سے بالاتر ہے۔ مظفر علی حاضر نہیں تھے ان کا تبصرہ کاٹ دار ہوتا ہے اس سے ہم محروم رہے۔ رانا سجاد، عمران جونانی، اشعر، شاہد جہانگیر کے تبصرے شامل نہیں تھے۔ ڈاکٹر قرۃ العین اور روبینہ صاحبہ مکمل غائب ہیں، اللہ پاک ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ محمد عامر ساحل بھی غائب ہیں۔ محمد خلیل بہت خوب صورت تجویزیں لے کر آئے اور کافی محبت والے بندے ہیں۔ ان کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ ان کی تجویز کا جواب نہیں ادارے سے میری درخواست ہے کہ جن کی سوانح حیات لکھیں ڈاکٹر ساجد صاحب ان کے موجودہ بچوں کے بارے میں ضرور لکھیں تا کہ معلوم ہو کون ہیں کیا کرتے ہیں وغیرہ۔ فروری کی بہت بڑی شخصیت پر مضمون تھا۔ ڈاکٹر محی الدین زور پر لیکن ان کی شادی وغیرہ پر کچھ نہیں تھا اور ساتھ ہی میں اس شخصیت کے نام و کام سے پہلی مرتبہ واقف ہوا ہوں۔ یہ نہیں کہتا بہت معلومات ہے میرے پاس لیکن اتنی بڑی اہم شخصیت کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ سچ بیانیوں پر پہلی سچ بیانی واقعی انسان کو مرض و قرض و فرض بے بس کر دیتے ہیں۔ دوسری سچ بیانی میں محبت کے نام کا ڈھونگ تھا پتا نہیں لوگ اتنی جلدی محبت کیسے کر لیتے ہیں۔ تیسری کہانی میں حیرانی ہوئی کہ مردہ ضمیر لوگوں کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ''ٹھوکر'' اسلام میں ایسے ہی اخلاق کا حکم ہے۔ گناہ سے نفرت کرو گناہ گار سے نہیں۔ ''مذاق'' جیسے الفاظوں کو مذاق برا لگتا ہے اس مخلوق کو بھی پسند نہیں۔ رؤف نے اچھا لکھا ہے افسر تھیں۔ سنبھال لیا ورنہ مار ہو جانے بھی قاتل نہیں بنتے۔ فروری کا رسالہ اچھا تھا۔ پوری ٹیم لاجواب ہے۔ رضا احمد اعوان بھکر والے بھی

حاضر نہیں ہو رہے ان سے اپیل ہے وہ اپنی خیریت سے مطلع کریں۔"

☆ انور عباس شاہ کا مکتوب بھکر سے۔"سب سے پہلے آپ کی میٹھی میٹھی باتیں پڑھنے کے لیے صفحہ کھولا۔ پڑھا تو پڑھتے ہی چلے گئے۔ واقعی ہم سب ہی ایک دوسرے کو لوٹ رہے ہیں۔ حکومت بھی بے جا ٹیکس لگا کر غریب عوام کو بے دردی سے لوٹ رہی ہے۔ عبدالجبار رومی انصاری مبارک باد قبول فرمائیں۔ خط تو احسان سحر کا بھی بے حد شاندار اور دل موہ لینے والا تھا۔ فرزانہ نگہت کو ویلکم۔ اس کے علاوہ سعید احمد جاند، خالد محمود، محمد خلیل چوہدری، آپی طاہرہ گلزار اور عبداللہ شجاع سندھی کے خطوط بھی قابلِ تعریف تھے۔ کوئٹہ کے کاظم علی کاظمی ہمیشہ بلیک لسٹ کی نذر ہو جاتے ہیں ہماری شدید خواہش ہے کہ ہمیں ان کے خط کا دیدار نصیب ہو۔ تجزیاتی جائزہ برائے سال 2015ء وحید ریاست بھٹی کی بہترین کاوش تھی۔ اس میں ہم اپنا نام اول نمبر پر پا کر خوشی سے کھل اٹھے۔ صرف افسوس اس بات کا ہوا کہ اس سال "عشیر خیال" میں ہمارے 11 خطوط شائع ہوئے حالانکہ خطوط تو ہم نے پورے یعنی 12 لکھے تھے شائع 11 ہوئے ایک خط ڈاکا ڈالنے والوں کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عمدہ تحریر لے کر حاضر ہوئے۔ "گینڈا اور بیٹل" ایک لاجواب تحریر تھی۔ بیگ صاحب نے پانڈے کے شرافت کا نقاب اوڑھ کر غریب عوام کو خوب لوٹا۔ اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہمیں اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنی چاہیے۔ "لڑاکو" تحریر پڑھ کر تو دل کانپ اٹھا۔ خاص طور پر ڈراؤنا اور خوف ناک کردار ڈریکولا کے بارے میں پڑھنے کی تو ہم میں سکت ہی نہ رہی۔ کشمالہ حسن کی تحریر "انوکھے امراض" "مختلف امراض کے بارے میں ایک معلوماتی تحریر تھی۔ اسی طرح ایک مرض اعصابی یا جلدی مرض، اس مرض میں انسان کے جسم کے مختلف حصوں پر غدود سے بن جاتے ہیں عام طور پر یہ موروثی مرض ہوتا ہے۔ ان غدودوں میں کوئی درد یا تکلیف وغیرہ نہیں ہوتی صرف بڑے لگتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس مرض کا کوئی علاج کہیں نہیں ہے۔ سرورق پر "ملکۂ موسیقی" پڑھ کر ہمیں لگا کہ یہ مضمون ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کے بارے میں ہوگا لیکن یہ مضمون مسرت نذیر کے بارے میں تھا۔ مضمون بے حد دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ ہر مہینے کی شخصیات کا مضمون ہمیں ہر بار متاثر کرتا ہے اور ہر بار ہم اس کی تعریف کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار فروری کی شخصیات کا مضمون بھی اپنی مثال آپ تھا۔ صائمہ اقبال کا بے حد شکریہ۔"

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔"میں اپنے ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے "نا گا پربت کا عقاب" پسند کیا۔ یقین کریں یہ میری پہلی تحریر ہے کیونکہ میں کوئی رائٹر تو ہوں نہیں، غیر ملک میں زندگی گزار رہا ہوں۔ ایک معمولی سا بندہ ہوں۔ میرا اصل شوق تصویر اور فوٹوگرافی ہے جو آپ کو انٹرنیٹ پر میرے ویب پیج پر نظر آجائے گی۔ جو لوگ فیس بک پر ہیں وہ میرے پیج کو ضرور وزٹ کریں کہ میں کس طرح کی فوٹوگرافی کرتا ہوں۔ گورے تو تعریف کرتے ہی ہیں آپ کو میری فوٹوگرافی کیسی لگتی ہے اس کا مجھے پتا نہیں اسی لیے پیج وزٹ کا مشورہ ہے۔ جن دوستوں کا اصرار ہے کہ اپنے سفرنامے کو طویل کروں وان کی خواہش پر ایک دوسرا سفرنامہ "شمشال سے ٹورنٹو تک" ادارے کو بھیج رہا ہوں جس میں شمشال کا حسن بھی ہے۔ وطن عزیز کے اس خوب صورت حصے کا تعارف بھی اور کینیڈا آکر جو حالات تھے ستم سہے اس کا تذکرہ بھی۔ جو لوگ یورپ و امریکا میں آکر کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں ان کے لیے اس میں راہیں بھی بتلائی ہیں۔ یہ سفرنامہ اگر سرگزشت کی زینت بنا تو آپ کی آرا کا منتظر رہوں گا۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا پیغام پشاور سے۔"ایام علالت مختصر ہونے کے نہیں دے رہے ہیں۔ آپ سب کی دعاؤں کا حاجت مند ہوں۔ بہ مشکل تمام تھوڑا تھوڑا کر کے سرگزشت پڑھ رہا ہوں۔ فروری کا سرگزشت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اداریے نے چونکا دیا۔ کیا خوب انداز تھا۔ واقعی ہم صرف دوسروں پر تنقید کرتے ہیں۔ اپنے گریبان میں جھانکنا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ ہم سب خود ہی جس شاخ پر بیٹھتے ہیں اسی کو کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ ملک و ملت کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہیں۔ "انوکھے امراض" قابلِ تعریف تحریر ہے۔ "نانگا پربت کا عقاب" نے تو اسیر کر لیا ہے۔ انتاز بردست انداز تحریر ہے کہ انسان کھو کر رہ جائے۔ سچ بیانیوں میں "قرض، مرض اور فرض" نے چونکا دیا۔ "پراسرار خط" اپنا اثر نہ چھوڑ سکی۔ "مذاق" بہت عمدہ تحریر تھی۔ "گینڈا اور بیٹل" بھی پسند آئی لیکن رک رک کر پڑھنے والی تحریر تھی۔ ایک گزارش ہے عرصہ ہو گیا میں نے ایک تحریر روانہ کی تھی۔ اسے بھی موقع دے دیں (ہر روز ابھی خاصی تعداد میں تحریریں موصول ہوتی ہیں۔ سب کو پڑھنا ضروری ہے اس لیے ذرا دیر میں نمبر آیا۔ وہ تحریر جلد لگنے والی ہے)۔"

☆ صوبی شاہ نے ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے۔"جنوری کا سرگزشت بہت زبردست اور بہت اچھا تھا۔ بس سچ بیانیاں کچھ کم تھیں۔ چھوٹا سا کام، خانہ خالی اور دہشت کدہ یقین کریں کتنے دن تک اکیلے چھت پر دن کے ٹائم بھی کسی کام سے جاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ غرض تمام مضامین سمیت تمام شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ پوری ٹیم اور بالخصوص رائٹر حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ابھی فروری کے شمارے میں صرف آپ کا اداریہ پڑھا ہے انکل آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ مختصر الفاظ میں ہمارے معاشرے کا ایک سیاہ پہلو بے نقاب کر دیا۔ اللہ کریم بھی کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا اور ظالم کی دراز رسی بھی جلد کھینچ لیتا ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور نیکی کی توفیق دے۔ مسز طاہرہ گلزار دنیا میں ہر انسان ہی کسی نہ کسی سے فریب کھائے ہوئے ہے۔ سچی تو بس رب کی ہی ذات ہے۔ میں تمام قارئین کے خط اور تبصرے ہر مہینے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ روبینہ ثاقب کیوں غیر حاضر ہیں اور معراج انکل آپ قلم کے ذریعے برائیوں کے خلاف جو جہاد کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ یقین کریں سرگزشت میں کچھ واقعات ایسے بھی پڑھے کہ بہت سے لوگوں نے اپنی بگڑتی زندگیوں اور عادات کی اصلاح کر لی۔ ویل ڈن انکل۔"

☆ سعید احمد جاند کی کراچی سے تشریف آوری۔ ”پُراسرار نمبر دیکھا اور پڑھا۔ بعض مضمون تو واقعی حیرت انگیز تھے۔ جنہیں پڑھ کر طبیعت حیران رہ گئی۔ پہلے تو میں نے اپنا نام لیٹ کر میں دیکھا۔ پھر خطوط کے سلسلے پر نظر ڈالی اور نام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جن قارئین کے طویل خط اچھے لگے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ عبدالجبار انصاری (لاہور)، احسان سحر (میانوالی)، محمد خلیل چودھری (جہلم)، عبداللہ شجاع سندھی (لاڑکانہ)، اویس شیخ (رحیم یار خان)، فلک شیر ملک (رحیم یار خان)، سدرہ بانو ناگوری (کراچی)، صائمہ نور (ملتان)، طاہرہ گلزار (پشاور)، اعجاز حسین سٹھار (نور پور تھل)، محمد سلیم قیصر (سینٹرل جیل ملتان)، فرزانہ نگہت (اسلام آباد)، بشریٰ افضل (بہاولپور) اس دفعہ پرانے لکھنے والے کم اور نئے زیادہ نظر آئے۔ وحید ریاست بھٹی کا تجزیاتی جائزہ برائے سال 2015ء میں خوب تھا۔ ”عکس داستان“ میں ممتاز مفتی کے متعلق جان کر اور محی الدین زور کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ واقعی ساجد امجد نے فدائے اردو لکھ کر واقعی اس کا حق ادا کر دیا۔ ”تاثا پربت کا عقاب“ پسند آئی۔ ملکہ موسیقی مسرت نذیر تو اب داستان گئی گزری ہو گئی۔ ویسے انور فرہاد کی کاوش اچھی تھی۔ منظر امام کی ”تاریخ عالم“ اچھی جا رہی ہے۔ صائمہ اقبال کی ”فروری کی شخصیات“ بھی اچھی رہی۔ م الف کا ”ٹرا کو“ اچھا رہا۔ کاشف زبیر کی ”سراب“ تو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ ندیم قیصر کی ”فرض، مرض اور قرض“ نے متاثر کیا۔ ناظم بخاری کا ”علم عروض“ سبق آموز تھا۔ ”کینہ اور چپل“ ذکا ر حسن کی دلچسپ تحریر تھی۔“

☆ محمد احمد رضا انصاری کا خلوص نامہ بکھر سے۔ ”اداریہ میں معراج انکل ایک دلچسپ کہانی سنا رہے تھے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ ”عکس داستان“ میں ممتاز مفتی کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ”شہر خیال“ میں اس دفعہ عبدالجبار انصاری کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ مبارک ہو آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ ہوتا ہے دیگر قارئین کے خط بھی اچھے تھے۔“

☆ مرزا عبدالجبار روی انصاری بہاولنگر سے تشریف لائے ہیں۔ ”مجھے یقین نہیں تھا کہ میرا خط پہلے نمبر پر آ جائے گا اور پھر دوستوں نے پہلے ہی مبارک باد دے کے نوید سنا دی کہ اس دفعہ ”شہر خیال“ کی صدارت میرے حصے میں آئی ہے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور بہت اچھا لگا جو اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی۔ ممتاز مفتی کی باتیں حکمت سے بھرپور ہوتی ہیں۔ یک تی احوال پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ ”شہر خیال“ میں اعجاز حسین سٹھار، سلیم قیصر اور فلک شیر ملک کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی جو کہہ رہے تھے کہ کرسی صدارت پر جگہ نہ ملی۔ آپ کا خط بھی اچھا ہوتا ہے۔ بہر حال مشورہ بھی غور طلب ہے۔ سدرہ بانو ناگوری اور صائمہ نور کا تجزیہ بھی زبردست رہا۔ اویس شیخ، بشریٰ افضل، خالد محمود، فرزانہ نگہت کے نامے بے جا لگے تھے۔ احسان سحر کا بھرپور تبصرہ کر دی علمی باتوں سے ناموراچھا لگا۔ محمد خلیل چودھری کے پاس تو سرگزشت نمبر کا خزانہ ہے۔ واہ زبردست جی طاہرہ گلزار کی سویٹ سی آمد مختصر لگی۔ عبداللہ شجاع سندھی کی باتیں بھی عمدہ تھیں۔ 2015ء کا تجزیاتی جائزہ پڑھ کے بے حد خوشی ہوئی پتا تو چلا کس کی کیا کارکردگی رہی۔“

☆ محمد عمران خان بھکر سے لکھتے ہیں۔ ”یوں تو سرگزشت سے تعلق پرانا ہے لیکن ”شہر خیال“ میں حاضری بہت کم ہوتی ہے۔ سرگزشت کی پسندیدگی کی وجہ اس کا معیار اور معلومات ہے۔ سب سے پہلے نظر سچ بیانوں پر پڑتی ہے۔ پہلی سچ بیانی ”فرض، مرض اور قرض“ بہت اچھی لگی۔ کہتے ہیں فرض مرض اور قرض کو کبھی چھوٹا نہ سمجھو لیکن انسان کبھی ایسے حالات اور واقعات سے دوچار ہوتا ہے کہ اس کے لیے کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے تاہم ندیم نے جو فیصلہ کیا قسمت نے بھی ان کا ساتھ دیا اور وہ سرخرو ہوا۔ علم عروض بھی اچھی تحریر تھی تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ مرد و عورت کے کردار میں کسی ایک کو مجرم بنانا یا الزام دینا درست نہیں۔ ”کینہ اور چپل“ پڑھ کر یہی خیال آیا کہ جرم کبھی چھپ نہیں سکتا۔ باقی سچ بیانوں میں پُراسرار خط اور اجنبی راستے بہت پسند آئیں۔ ”شہر خیال“ عبدالجبار روی انصاری کو مبارک باد اعجاز حسین سٹھار صاحب یاد دہانی کا بہت بہت شکریہ۔ محمد سلیم قیصر صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو آزادی نصیب کرے۔ باقی دوستوں فلک شیر، اویس شیخ احسان سحر، سعید احمد جاند کا تبصرہ پسند آیا۔ سدرہ باجی کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔“

☆ سجاد سرور کا ای میل۔ ”میں مانچسٹر یو کے کا رہائشی ہوں۔ عرصہ دس سال دیارِ غیر میں گزار دیا۔ یہاں کاؤنسل لائبریری میں سرگزشت کا مطالعہ کیا۔ مارچ 2015ء کے شمارے میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی پر مضمون شاملِ اشاعت تھا۔ اسے پڑھ کر میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں نے ان کی شخصیت پر مزید جاننے کے لیے وکی پیڈیا میں سرچ کیا لیکن افسوس ان کے بارے میں وہاں بھی بہت کم معلومات ہے۔ میں ڈاکٹر ساجد امجد یا کسی بھی مصنف سے التجا کرتا ہوں کہ ان کے بارے میں معلومات دیں۔“

☆ احسان سحر کی آمد میانوالی سے۔ ”سب سے پہلے شہر خیال“ کے چمن کی سیر کی۔ جس پھول کی خوشبو نے متاثر کیا وہ تھے جناب عبدالجبار روی کا فی مدلل انداز سے تبصرہ مکمل کیا اور آنکھوں دیکھا واقعہ بھی بیان کر ڈالا۔ باقی دوستوں میں اعجاز حسین سٹھار، سلیم قیصر، فلک شیر ملک، بھئی ٹینشن کیوں لیتے ہو، ہر بات پہ جذباتی ہونا ٹھیک نہیں ہے صحت کے لیے۔ سدرہ بانو، صائمہ نور، انور عباس شاہ، اویس شیخ، بشریٰ افضل، خالد محمود، فرزانہ نگہت، سعید احمد جاند، محمد خلیل، آپا طاہرہ گلزار اور آخری دوست عبداللہ شجاع اچھے تبصروں کے ساتھ جلوہ گر رہے۔ وحید ریاست بھٹی کا سالنامہ تجزیہ دلچسپی اور حیرت سے پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔“

تاخیر سے موصول خطوط: اشرف صدیقی، ناہید نیازی، میمونہ بانو (کراچی)، لطیف ارشد (لاہور)، ڈاکٹر شیرازی (لاڑکانہ)، حامد (حیدرآباد)، دانش (کوئٹہ)، علی شاہ (نگر گلگت)، ذیشان علی (ملتان)۔

آہ.....محی الدین نواب

پ ب

مضطرب آرزوؤں کے سائے جیسے ابر گھٹ گھٹ کے ہر طرف چھائے پھر بھی انسان کو تمام آرزوئیں تمام خواب سمیٹ کے جانا پڑتا ہے۔ الفاظ کے اس جادوگر کو بھی جانا پڑا۔مگر اس فسوں گر کی زندگی پر کچھ لکھنا، خود لکھ کر پچھتانا ہے کہ اس کی زندگی ناتمام آرزوؤں کا مجموعہ ہے،اس لیے کہ اسے حسرت ہی رہی کہ ایسا کچھ لکھا جائے جسے دنیائے ادب بھی قبولیت کی سند عطا کرے۔

قلم سے ایک جہان کی تشکیل کرنے والے کو خراج تحسین

4 ستمبر 1930 کو مغربی بنگال کے شہر کھڑک پور میں پیدا ہونے والا، الفاظ کے آبگینوں سے چٹانوں کا جگر توڑنے والا اب ہم میں نہیں رہا۔ لفظوں کا جسے جادوگر کہا جاتا تھا۔ جس نے ایمان کا سفر، شیشوں کا مسیحا، کچرا گھر، آدھا چہرہ، آتش قدم، راہ خارزار، خوش دامنی، ممتا کا عذاب، شجر ممنوعہ، سپنے سب اپنے، قدیم رشتے، خریدار وفا، شناخت، پتھر، سچا فریب، اندھیر نگری، جرم وفا، دل پارہ پارہ، اجازت، لبادہ، شارٹ کٹ، شعلوں کا پیچ، آخری وعدہ، ادھورا ادھوری، اجل نامہ، اجازت، یوم حساب، خالی سیپ، پل صراط، طاعون، گندی گلی، بند مٹھی، آخری موسم، وغیرہ جیسی طویل کہانیاں لکھ کر ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنایا۔ قارئین کو اسیر کیا۔ زمانے کو وہ آئینہ دکھایا جس میں ہر ایک کو اپنی شکل نظر آنے لگی تھی۔ تاریخ پر قلم اٹھایا تو "ہند سے یونان تک" جیسی کہانی سامنے آئی جسے برصغیر پر لکھی گئی ایک اچھی کہانی کہا جا سکتا ہے۔ فلمی کہانی بھی تو باکس آفس پر کامیاب ٹھہری جس میں قابل ذکر "حسینوں کی بارات۔ رنگیلے جاسوس۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ ناگ منی" وغیرہ شامل ہیں۔ ٹی وی پر ڈرامے پیش کیے تو "شام سے پہلے۔ سرپرست۔ آدھا چہرہ۔" جیسے ناقابل فراموش ڈرامے سامنے آئے لیکن سب سے زیادہ اہم کام دنیا کی طویل ترین کہانی "دیوتا" ہے جسے 1977 میں سسپنس کے صفحات پر شروع کی گئی۔ اپنی نوعیت کی انوکھی کہانی تھی۔ اس دور میں جب لوگ ٹیلی پیتھی کے بارے میں زیادہ جانتے بھی نہیں تھے۔ انہوں نے اس علم پر کھل کر لکھا۔ دیوتا کی پہلی ہی قسط نے قارئین کو اسیر کر لیا۔ 33 سال تک عوام کے دلوں پر راج کرنے والی کہانی بالآخر 2010 میں زبردستی اختتام پذیر ہو گئی۔ تمام کردار ایکشن میں تھے۔ کہانی آگے بڑھ سکتی تھی لیکن نواب صاحب کا عارضہ انہیں یکسو ہونے نہیں دے رہا تھا۔ اور یہ کہانی بہت زیادہ توجہ چاہتی تھی اس لیے انہوں نے

اسے اختتام تک کھینچ لیا۔ بہت کم احباب جانتے ہیں کہ وہ عرصے سے عارضہ تنفس میں مبتلا تھے۔ دمہ کہ سانس سینے میں گھٹنے لگتی تھی۔ کئی کئی دن تک کمزوری اس طرح جکڑے رکھتی کہ ان سے ہلا بھی نہ جاتا۔ اس وقت وہ سوچتے "جس کہانی کو میں نے سنبھالا ہے اگر مجھے کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ کیا کوئی اس کہانی کو سنبھال سکے گا؟ کہیں کہانی کی جان ہی نہ نکال دے۔" بس اسی خیال نے انہیں کہانی کو زبردستی سمیٹنے پر مجبور کردیا جس کا اظہار انہوں نے اسی وقت اپنے ایک انٹرویو میں بھی کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں۔ "میں بہت زیادہ بیمار ہوں۔ یہ میرے لیے بہت دشوار ہے کہ میں اس کہانی کو منطقی انجام تک پہنچاؤں۔ یوں بھی دنیا بھر میں پھیلے اس کہانی کے قارئین کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اسے چلنے دیا جائے مگر میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کہانی لکھتے لکھتے میں ہی سو گیا تو میرے بعد کیا کوئی اسے اسی انداز میں ختم کرپائے گا جو میرے ذہن میں ہے۔ پتا نہیں وہ اسے کس طرف دھکیل دے اس لیے یہی اچھا ہے کہ میں خود ہی اسے ختم کردوں۔"

دیوتا ایک کہانی نہیں ڈائجسٹ کی تاریخ میں ایک اہم باب ہے۔

یہ داستانوں کی تاریخ میں سب سے طویل داستان تسلیم کی جاتی ہے۔ "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ" نے 1994ء میں فرانسیسی شاعر اور ناول نگار "Louis Henri Jean Farigoule a.k.a Jules Rmains" کے تحریر کردہ ناول "Les Hommes De Bonne Volonte" (The Men Of Good Will) میں شامل الفاظ کی تعداد 20,70,000 کی بنا پر دُنیا کی طویل ترین کہانی قرار دیا، جبکہ اس کے مقابلے میں "دیوتا" کو بیان کرنے کے لیے "محی الدین نواب" نے 1,12,6,310 الفاظ کا سہارا لیا۔ "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ" نے 1998ء کے ایڈیشن میں "À la recherche du temps perdu" (Remembering Of Things Past" جسے مشہور فرانسیسی ناول نگار "Mercel Proust" نے لکھا تھا، جس میں شامل 96,00,000 حروف کی بنا پر طویل ترین کہانی قرار دیا، جبکہ اس کے مقابلے میں "دیوتا" میں شامل حروف کی تعداد 2,24,00,000 ہے۔ "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ" نے 1997ء کے ایڈیشن میں معروف جاپانی ناول نگار "Shozo Tokugawa Yamauchi" کے تحریر کردہ ناول "Leyasu" کو 40 جلدوں میں شائع ہونے پر طویل ترین کہانی قرار دیا، جبکہ اس کے مقابلے میں "دیوتا" کے 56 حصے شائع ہوئے ہیں۔

اتنے برسوں تک قاری کو ساتھ لے کر چلنا آسان نہیں ہے مگر یہ اہم کام انہوں نے انجام دیا۔ بیماری کی حالت میں بھی کام کرتے رہے۔ جس کا ذکر انہوں نے اجل نامہ کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے "میں بدترین کھانسی اور دمے کا مریض رہا ہوں۔ ہر موسم سرما میں چار مہینے بستر پکڑ لیتا ہوں۔ میں ایسے ہی کسی بستر پر پیدا ہوا تھا اور ایسے ہی کسی بستر سے مجھے ہمیشہ کے لیے اٹھ جانا ہے مگر میں ابھی اٹھنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی سے بہت پیار ہے۔ ایسا پیار جس میں قدرتی طور پر بھرپور اعتماد ہے کہ میں ابھی بہت عرصہ زندہ رہوں گا۔ مگر آہ جب اجل سر پر کھڑی ہو تو انسان کیسا بے بس بے اختیار ہو جاتا ہے۔ جب مجھ پر کھانسی کا دورہ پڑتا ہے تو مسلسل کھانسی کے دوران سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی۔ میری بیوی بچے دم بخود ہو کر توجہ سے دیکھتے ہیں کہ میں سانس لے بھی رہا ہوں یا نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے جیسے مریض ایسی کھانسیوں کے دوران کس طرح اپنی سانسیں بحال رکھتے ہیں۔ میں یوگا کی مشق کرتا ہوں لیکن اس دن جب کھانسی کا دورہ پڑا تو مشق یاد نہ رہا۔ کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اسی رات ایک خواب دیکھا۔ میں کھانستے کھانستے مر چکا ہوں اور میرا جنازہ اٹھایا جارہا ہے۔ میں ڈولے میں لیٹا ہوا ہوں لوگوں سے پوچھ رہا ہوں کہاں لے جارہے ہو لیکن پوچھ نہیں سکتا۔ جنازہ لے جا کر ایک مسجد اور مزار کے درمیان رکھ دیا گیا ہے۔" اس پیش لفظ میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن میں اسی بات پر اختتام کرتا ہوں۔ جو لوگ نواب صاحب کے جنازے میں شریک تھے انہوں نے بھی غور کیا ہوگا۔ میں تو اسی وقت چونک گیا تھا۔ اس لیے کہ نماز جنازہ جس مسجد میں ہونا تھا وہ مسجد چھوٹی ہے اس لیے نماز سڑک کے پار کھلی جگہ پر پڑھائی گئی اس سے کچھ آگے بڑھیں تو ایک چھوٹا سا مزار ہے گو کہ مسجد اور مزار کے درمیان کافی بڑا علاقہ آتا ہے لیکن جنازہ بالکل درمیان میں رکھ کر پڑھایا گیا۔ کیا یہ اتفاق تھا یا نواب صاحب کو آگاہی ہوگئی تھی۔ وہ خواب کئی سال پیشتر بتا گیا تھا کہ ان کے چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے اور اس کا اظہار بھی انہوں نے اجل نامہ میں کیا ہے۔

☆☆☆

باراں دیدہ

ڈاکٹر ساجد امجد

برصغیر پر حکومتِ انگلشیہ کا پرچم لہرانے میں سب سے اہم کردار غدارانِ وطن کا ہے اور غداروں کی کھیپ تیار کرنے میں صرف ایک شخص کا ہاتھ رہا ہے جسے دنیا لارڈ ویزلی کے نام سے جانتی ہے. اس نے حالات کو اپنے موافق میں کرنے کے لیے کس طرح غداروں کی فوج تیار کی اس کے گواہ تاریخ کے صفحات ہیں. ریشہ دوانی میں اسے ملکہ حاصل تھا. مطلب براری کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا اور اس کا مظاہرہ اس نے کھل کر کیا کیونکہ عیاری و مکاری اس کی سرشت میں تھی. جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اس وقت اس نے اپنے اسکول کے ہی صدر مدرس کے خلاف تحریک چلانے کے لیے بغاوت کے بیج بونے کی کوشش کی تھی. گویا اس کے ضمیر میں سازش رچنا شامل تھی. اس نے برصغیر پر حکومتِ انگلشیہ کو مسلط کرنے کے لیے ہزارہا سازشیں رچیں. ایک ریاست کو دوسرے سے لڑایا اور پھر باری باری سے ان کے علاقے پر قابض ہوا. ہزاروں بے گناہوں کا قاتل ٹھہرا مگر اسے ملا کیا؟ واپس انگلستان پہنچا تو لعنت کا طوق منتظر تھا، بدنامی مقدر ٹھہری.

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک اہم لارڈ کا قصہ حیات

چند ننھے سیاست دان ایک کمرے میں بند تھے اور آیندہ کیا کرنا ہے اس سوال پر غور ہو رہا تھا۔ یہ بچے بہت سی باتیں کر رہے تھے لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے میں انہیں اس لیے دیر ہو رہی تھی کہ ان کا ایک ساتھی اس اہم اجلاس میں شامل ہونے کے لیے ابھی نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا اور وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔

یہ آئرلینڈ کے قصبے کا ایک اسکول تھا جس کے الگ تھلگ ایک کمرے پر بچوں نے اس وقت قبضہ کیا ہوا تھا۔ یہ تعداد میں کل چار تھے اور پانچویں کا انتظار تھا۔

دروازہ کھلا اور گیارہ بارہ سال کا ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ اس کا قد چھوٹا لیکن بدن سڈول تھا۔ اعضا متناسب تھے اس کے چہرے پر دانش وروں جیسا وقار تھا اور چال شاہانہ تھی اور جب اس نے بولنا شروع کیا تو معلوم ہوا تھا کوئی شاعر یا ادیب ہے جو اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔

اس نے آتے ہی جیسے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

''ہاں دوستو! پھر آپ لوگوں نے کیا سوچا۔''

''ہمیں کیا سوچنا ہے ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ اگر میں نہ آتا تو تم آج کا دن بھی ضائع کر چکے ہوتے۔''

''ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں مسٹر ہیتھ کا صدر مدرسی پر تقرر قطعی قبول نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ سیمویل پادگر کو یہاں بلایا جائے۔''

''یہ کوئی نئی اطلاع نہیں ہے۔ میں تو خود اس معاملے کے حق میں ہوں۔ میں تو یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ آپ لوگوں نے مسٹر ہیتھ کا تبادلہ منسوخ کرانے کے لیے کیا تدابیر سوچیں یا اختیار کیں۔''

''ہم نے تو یہ سوچا ہے کہ اس سلسلے میں انتظامیہ سے بات کی جائے۔''

''اس طرح تو تم خود کو انتظامیہ پر ظاہر کر دو گے۔ اگر انتظامیہ نے تمہارا مطالبہ مسترد کر دیا تو پھر تم کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا سکو گے۔ ترکیب تو یہ ہونی چاہیے کہ انتظامیہ کو معلوم بھی نہ ہو اور مسٹر ہیتھ کی جگہ مسٹر سیمویل کو یہاں بھیج دیا جائے۔''

''رچرڈ، یہ کام تو تم ہی کر سکتے ہو۔ تمہارا خاندان آئر

لینڈ کے طبقہ امرا میں شامل ہے۔ تمہارے دادا کو "مارننگٹن" کا خطاب ملا تھا۔ تمہارے والد گیرٹ ویزلی "مارننگٹن ثانی" کہلاتے ہیں۔ تمہارے نانا نواب (اوّل) کے رتبے پر فائز ہیں، تمہارے خاندان میں سے کسی کے اتنے تعلقات تو ہوں گے کہ یہ تبادلہ رکوا سکو۔ ایٹن کے مسٹر ہیتھ کو یہاں نہ آنے دو۔"

"یہ کام میرے لیے قطعی مشکل نہ ہوگا لیکن کام وہ اچھا ہوتا ہے جو اپنے بل بوتے پر کیا جائے۔"

"کیا تم یہ کام خود کر سکتے ہو؟"

"میں نہیں ہم سب مل کر کریں گے۔"

"وہ کیسے۔"

"ہم اس وقت اس کمرے میں صرف پانچ ہیں۔ ہماری آواز بے اثر ہوگی۔ ہمیں پورے اسکول کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔ جب پورا اسکول ہمارے ساتھ ہوگا تو انتظامیہ کو ہماری بات ماننی پڑے گی۔"

"ضروری تو نہیں کہ پورا اسکول مسٹر ہیتھ کے خلاف ہو اور ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جائے۔"

"یہ کام تمہیں مجھ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں طلبہ کی اکثریت کو انتظامیہ اور مسٹر ہیتھ کے خلاف کردوں گا۔ اگر مسٹر ہیتھ یہاں آ بھی گئے تو ان کا ٹکنا مشکل ہو جائے گا۔"

"تم یہ کام کیسے کرو گے۔"

"یہ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

اس یقین دہانی کے بعد اجلاس ملتوی ہو گیا۔ ننھے سیاست داں ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکلے اور اسکول کا گیٹ پار کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن سے رچرڈ نے اپنی تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اپنے ہاتھ سے لکھے اور لڑکوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی فصیح البیانی سے لڑکوں کو متاثر بھی کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات اتنی سلاست سے ادا کرتا تھا کہ دلوں پر اثر ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے بہت سے ہم خیال پیدا کر لیے۔ اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ انتظامیہ پر دباؤ ڈال سکے لیکن اس سے پہلے ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔ چند پمفلٹ پکڑے گئے۔ تحریر سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کس نے لکھے ہوں گے۔ چند ایسے کمزور لڑکے بھی صدر مدرس کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے سب کچھ اگل دیا۔

ذرا سی چھان بین کے بعد اس سازش کے سرغنہ کا پتا چل گیا۔ یہ کوئی اور نہیں رچرڈ ویلزلی تھا جو اس وقت اپنا نام رچرڈ ویزلی لکھتا تھا۔

اس سازش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے "ہیرو" کے مدرسے سے ایٹن (یا ایلٹن) کی درس گاہ میں بھیج دیا گیا۔

☆......☆

آئرلینڈ میں ایک قدیم خاندان تھا جس کو ولسیلی کہتے تھے۔ اس وقت جب کہ اصول املا رائج نہیں ہوئے تھے اس کو ویلزلی یا ویلز لے لکھا جاتا تھا۔ یہ گھرانا کسی خاص شہرت و امتیاز کا حامل نہیں تھا لیکن صدیوں سے خوش حال چلا آتا تھا۔ اس گھرانے کا ایک فرد گیرٹ ویزلی تھا۔ وہ جب مرا تو لاولد تھا۔ اس کا ایک قریبی رشتہ دار چارلس ویزلی تھا۔ وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے گیرٹ ویزلی کا وارث بن جاتا لیکن وہ بے نیاز مزاج کا فنکار تھا۔ اسے ان چیزوں سے سروکار نہ تھا اس نے انکار کر دیا اس کے انکار کے بعد کسی اور رشتے دار کی تلاش کی گئی اور ایک نوعمر لڑکے کو منتخب کیا گیا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچا تو اس خاندان کی تمام جاگیر کا مالک بن گیا۔

یہ 1746ء کا واقعہ ہے کہ اس شخص کو آئرلینڈ کی حکومت نے "مارننگٹن" کے خطاب سے موسوم کیا۔ اس کا بیٹا گیرٹ ویزلی تھا جو ماہر علم موسیقی کی حیثیت سے مشہور ہوا اور مارننگٹن ثانی کہلایا۔

گیرٹ موسیقی کا ایسا دیوانہ تھا کہ اپنے مرتبے کو بالائے طاق رکھ کر رقص و سرود کی محفلوں کا میر مجلس ہوا کرتا تھا۔ طائفوں کے ساتھ شہر در شہر گھومتا تھا۔ یہ بات لوگوں کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں تھی کہ آئرلینڈ کا امیر ابن امیر ان طائفوں کی رونق بنا ہوا ہے لیکن وہ فن موسیقی میں کمال رکھنے کے علاوہ ایسی انسانیت کا حامل تھا کہ ہر شخص اس کی تکریم کرتا تھا۔

اس عظیم مطرب کی شادی ایک لارڈ کی بیٹی سے ہوئی جس کا نام آرتھر ہل تھا۔ اس جوڑے کے ہاں پہلوٹھی کا لڑکا بیس جون 1760ء کو پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اپنے دادا کے نام پر رچرڈ کولے ویزلی رکھا۔ بعد میں وہ اپنا نام "ویلزلی" لکھنے لگا۔

یہی وہ نامور مارکوئیس ویلزلی ہے جو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے ہندوستان کے ساتھ کوئی بھی سلوک روا رکھا ہو لیکن اپنی قوم کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

☆......☆

اسے ایک سازش کو پروان چڑھانے کے الزام میں ہیرو کے مدرسے کی دیواروں سے دور کر کے ایٹن بھیج دیا گیا۔ یہ شاید اس لیے کیا گیا کہ مسٹر ییتھ تبادلہ ہو کر ہیرو کے مدرسے میں آرہے تھے۔ رچرڈ کی موجودگی کسی اور سازش کو جنم دے سکتی تھی۔

وہ نہ مسٹر ییتھ کا تبادلہ منسوخ کرا سکا نہ اپنا۔ اسے نئے مدرسے میں جانا پڑا۔

وہ کسی قدر نفرت کے جذبات لے کر نئے اسکول میں آیا تھا لیکن یہاں کے قابل اساتذہ نے اس کا ایسا دل موہ لیا کہ کسی مذہب کے نئے پیرو کی طرح اس پر جان چھڑکنے لگا۔

اس اسکول کی علمی فضا نے اس کی صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیے۔ یہاں رہ کر اس نے یونانی اور لاطینی علوم قدیمہ میں ید طولیٰ حاصل کیا جو اس کی زندگی میں اس کا طرۂ امتیاز بنی رہی۔

یہاں سے جب وہ کرائسٹ چرچ کالج پہنچا تو بھرپور شباب اس کا قدم چوم رہا تھا۔ اس کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن خدوخال میں عجیب و غریب دلکشی تھی۔ ایسی دلکشی جو صنف مخالف کو اپنی سمت کھینچتی ہے۔ ہوش ربا ماہ وشیں اس کے قدموں کے ساتھ تھیں۔

ان دوستیوں میں صرف اس کی خوب صورتی کا دخل نہیں تھا بلکہ اس کی پوری شخصیت شامل تھی۔ وہ بلا کا لطیفہ سنج تھا۔ وہ جس محفل میں چلا جاتا محفل کی سنجیدگی کو باہر بٹھا دیتا۔ اس کے ظریفانہ چٹکلے دوسری محفلوں میں دہرائے جاتے۔ ایسی باغ و بہار شخصیت کا کون عاشق نہ ہوتا۔

وہ زندگی میں جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا۔ فنون لطیفہ میں اس کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔ یہ اس کے خاندانی اثرات تھے جو اس کی شخصیت میں ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کا باپ علم موسیقی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ رچرڈ نے اپنے لیے شاعری کا انتخاب کیا۔ اسکول کے زمانے میں سے وہ شعر کہنے لگا تھا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے ادبیات قدیم اور ادبیات جدید پر وہ ایسا حاوی ہو گیا کہ قدیم اطالوی اشعار اپنی گفتگو کے درمیان بے تکلفانہ استعمال کرتا تھا۔ اس کا کتب خانہ نادر کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے احباب اسے چھیڑتے تھے کہ اسے تو شاعر ہونا چاہیے۔ وہ اپنا وقت نصابی کتابوں میں کیوں برباد کر رہا ہے۔

”شاعر ہونا چاہیے سے کیا مطلب ہے۔ میں شاعر ہوں۔ کیا میں تمہیں اپنی نظمیں نہیں سنا تا رہا ہوں۔“

”کسی معرکے میں اپنے آپ کو منواؤ تو بات ہے۔“

”جب کوئی معرکہ برپا ہوگا تو میں ثابت بھی کر دوں گا۔“

”نظم نگاری کا ایک مقابلہ ہونے والا ہے۔ تمہیں اس میں شامل ہونا چاہیے۔“

”میں نے اس مقابلے کے لیے اپنا نام لکھوا دیا ہے۔ اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ معرکہ ہوا تو خود کو شاعر ثابت کروں گا۔“

وہ اس مقابلے میں شامل ہونے کے لیے نظم لکھنے میں مشغول تھا۔ ایک فرانسیسی دوشیزہ جو کچھ دنوں سے اس کی دوست بن گئی تھی اس وقت بھی وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔

”اگر تم نہ ہوتیں تو میری شاعری کے سوتے خشک ہو گئے ہوتے۔“

”باتیں بنانے کے تو تم ماہر ہو۔ اب تو میں تمہاری ہوں۔ مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔“

”میں دوسروں کے لیے تو ضرور باتونی ہوں لیکن تمہارے سامنے تو میرا دل باتیں کرتا ہے۔“

”اگر ایسا ہی ہے تو تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“

”تمہیں معلوم ہے ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی۔“

”تم جیسے رئیس زادے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ پہلے تعلیم مکمل کرے اور پھر کہیں نوکری کرے اور تب کہیں جا کر مجھ سے شادی کرے۔“

”نوکری کے علاوہ بھی کچھ عزائم ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا ہوتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے تم مجھے بہلا رہے ہو تم میرے بدن کی خوب صورتی پر نظمیں لکھ سکتے ہو۔ میری قربت سے اپنی راتیں رنگین بنا سکتے ہو لیکن مجھ سے شادی نہیں کر سکتے۔ میں پھر بھی تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔“

”میں ان دنوں تعلیم کے سلسلے میں گھر والوں سے دور ہوں۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی میں اپنے خاندان والوں سے تمہارا ذکر کروں گا۔“

”اگر انہوں نے مجھے قبول نہ کیا؟“

”میں تم سے پھر بھی شادی کر لوں گا۔“

”اوہ ڈیئر! تم کتنے اچھے ہو، مجھے یقین ہے تم مجھ

پر ایک اور خوب صورت نظم لکھو گے۔''
''اس وقت تو مجھے مقابلے کے لیے نظم لکھنے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔''
وہ رخصت ہوئی تو شاعری کا دستر خوان پھر اس کے سامنے بچھا ہوا تھا۔ وہ پھر کاوش فکر میں مشغول ہو گیا۔ وہ لاطینی زبان میں ایک نظم تخلیق کر رہا تھا۔ اس نظم کا موضوع کپتان کک کی موت تھی۔
وہ نظم تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ دوسرے دن اس کا دوست ولیم گرینول اس سے ملنے آیا تو اس نے یہ نظم اسے سنائی۔
''تم لاطینی زبان پر عبور رکھتے ہو اور شاعرانہ ذوق کے حامل بھی ہو۔ تم یقیناً کوئی اچھا مشورہ دو گے۔''
''میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک شاہ کار نظم ہے جو تمہیں شہرت دوام بھی بخشے گی اور انعام کا مستحق بھی ٹھہرائے گی۔''
''دوست تو ایسی رائے دیتے بھی ہیں۔''
''میں تمہارا دوست بھی ہوں اور تمہارا ناقد بھی۔ میں نے جو کہہ دیا وہ حرف آخر ہے۔''
ولیم گرینول کو نظم سنانے کے بعد وہ خاصا پُراعتماد ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مقابلے والے دن تک کانٹ چھانٹ کرتا رہا۔ نوک پلک سنوارنے کے بعد اس نے یہ نظم جیوری کے سامنے سنائی۔ اس کا افلاطونی تلفظ اور پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ تالیوں کی گونج نے فیصلے کا اعلان کر دیا اس نے اس نظم پر چانسلرز پرائز جیتا۔
اس کے والد گیٹ ویزلی کا انتقال ہوا تو اس کے تین چھوٹے بھائی ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دوسرے اہلِ ثروت کی طرح اس کا باپ بھی اپنی شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے قرض لیتا رہا تھا اور اسے یہ قرض اتارنا پڑے گا۔
نوجوان لارڈ مارننگٹن (ویلزلی) کی قابلیتوں نے آئرلینڈ کے دارالامرا میں بحیثیت رکن سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور کچھ نہ کچھ آمدنی کا ذریعہ نکل آیا تھا۔
اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ اس کا ہم مکتب اس کا دوست ولیم گرینول آئرلینڈ کا چیف سیکریٹری مقرر ہوا ہے۔ اس نے فوراً اسے مبارک باد کا خط لکھا۔
''مجھے اس دن بڑی خوشی بڑا فخر ہو گا جس دن میں پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر آپ کا رفیق کار ہوں گا اور نہایت مستعدی اور تن دہی سے آپ کی تجاویز کو کامیاب بنانے اور جامہ عمل پہنانے میں اپنی تمام قابلیت صرف کر دوں گا۔ درحقیقت میں اپنی تمام مساعی کو اپنی اس جگری دوستی، وفاشعاری اور وضعداری کی ادنیٰ نذر سمجھوں گا جس نے ہر حالت میں میری مدد کی ہے اور اپنی خدمات ایسے حکومت کے لیے وقف کر دوں گا جو صحیح اور عمدہ اصولوں پر جاری ہے۔''
ایک اور خط اس نے تحریر کیا۔
''آپ مجھے اپنا مددگار تصور کریں۔ میں بادشاہ کا خادم ہوں، غلام نہیں اور میں آپ کے ساتھ محنت اور جانفشانی سے کام کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہوں۔''
وہ برابر اس کوشش میں تھا کہ ولیم گرینول کے ذریعے اس کا داخلہ حکومتی ایوانوں میں ہو جائے۔ اس کی قابلیت کے جھنڈے ہر طرف گڑے ہوئے تھے۔ شخصیت بھی ایسی مسحور کن تھی کہ اس کے لیے اپنے عزائم کی تکمیل کچھ زیادہ دشوار نہیں تھی بالآخر وہ قصبہ بیراسٹیئن کی طرف سے انگریزی دارالشوریٰ میں بطور ایک رکن داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ دارالشوریٰ میں بہت جلد اس کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا اس کی قابلیت کے اعتراف میں اسے سینٹ پیٹرک کا خطاب دیا گیا۔ پھر اسے خزانے کا اعلیٰ افسر مقرر کر دیا گیا۔
وہ کئی برس تک سیاست کے صحرا میں روشن خیالی اور آزادی کے پھول کھلاتا رہا۔ فرسودہ اور تنگ خیال فرقوں سے اسے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ امورِ خارجہ کے متعلق اس کے نظریات بہت وسیع تھے۔ رفاہِ عام کی تحریکوں میں اسے بہت دلچسپی تھی۔
1793ء میں اس سے حلف لے کر برطانوی پریوی کونسل میں اسے داخل کیا گیا اور اسی سال نگران مجلس کی رکنیت کی وجہ سے ہندوستانی معاملات سے اس کے تعلقات شروع ہوئے۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ اور اس سے متعلق دیگر علوم کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا بھائی آرتھر پہلے ہی ہندوستان جا چکا تھا۔ اس سے برابر خط کتابت ہوتی رہتی تھی اور وہاں کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان میں یورپین بستیوں کے متعلق حالات سے اسے پوری طرح واقفیت ہو چکی تھی۔

☆......☆

حیدر علی کی موت کی خبر انگریزوں نے خوشی کے ساتھ سنی تھی۔ گورنر نے کہا۔ ''ہمیں اس سے جتنا فائدہ اٹھانا ہے

اٹھالیا جائے۔ حیدر کی موت کے اہم واقعے سے ہندوستان میں ہمارے مفاد کے لیے بہت سے سود مند نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سے مشرقی خطے پر ہمارے وطن کے لیے مستقل اور بغیر کسی تشویش کے قبضہ حاصل کرنے کے بہت بہتر امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔"

ان خیالات کے باوجود انگریز حیدر علی کی موت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ سلطنت میسور کی تخت نشینی نہایت پُرامن طریقے سے ہوگئی۔

حیدر علی نے انگریزوں کے دانت کھٹے کردیے تھے اور اب اس کا بیٹا ٹیپو سلطان تخت نشین تھا۔

ٹیپو نے جب جنوبی ہند کی سب سے بڑی سلطنت "میسور" کی باگ ڈور سنبھالی تو ہر طرف انگریزوں کا دور دورہ تھا۔ دربار دہلی کی سطوت قلعہ دہلی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔ دوسری طرف نظام اور مرہٹے اسے انگریزوں سے زیادہ خطرناک سمجھ رہے تھے۔ ٹیپو کو ان سب سے نمٹنا تھا۔ غداران وطن کی سازشیں الگ اس کا راستہ روک رہی تھیں۔

ٹیپو کو گدی سنبھالتے ہی سرنگا پٹنم سے نکلنا پڑا۔ انگریزی فوج "ونڈی راش" کے نواح میں ڈیرے ڈالے ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی مقام سے قریب خیمہ زن ہوگیا۔ دونوں کے درمیان ایک ندی حائل تھی۔ تمام دن دونوں طرف سے گولیاں برستی رہیں لیکن اگلے دن انگریزوں نے پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ ٹیپو کی فوج نے تعاقب کیا اور دو سو آدمیوں کو قتل کردیا۔

ٹیپو کو فتح مل گئی تھی لیکن اس نے مزید آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اسے کرناٹک چھوڑ کر مالابار کے ان مقبوضات کی مدافعت کے لیے جانا تھا جن پر انگریزی فوجوں نے جنرل میتھیوز کی زیرکمان حملہ کردیا تھا۔

حیدر نگر پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ ٹیپو سلطان حیدر نگر اور اس کے اردگرد کے قلعوں کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے روانہ ہوا۔

جنرل میتھیوز پر ٹیپو کا رعب اس قدر طاری ہوا کہ اس نے اپنے لشکر کو اپنے ساتھ "اننت پور" کے قلعے میں بند کرلیا۔ یہ قلعہ اس نے ایک مسلمان غدار کی مدد سے فتح کیا تھا۔

ٹیپو سلطان کے حکم سے قلعہ پر گولہ باری شروع کردی گئی۔ قلعے کے اندر موجود عمارتوں کو نقصان پہنچنا شروع ہوگیا۔ روزانہ متعدد انگریز سپاہی مر رہے تھے۔

جنرل میتھیوز صرف اٹھارہ دن تک اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ پھر اس نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا اور صلح پر آمادہ ہوگیا۔ صلح کے معاہدے میں یہ طے ہوا تھا کہ انگریز فوج اپنے ذاتی سامان کے سوا اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جائے گی۔ ٹیپو کی نیک نیتی کو یقین تھا کہ اس پر عمل کیا جائے گا لیکن جب انگریزوں کی روانگی سے قبل اس نے اپنے ایک سردار کو قلعے کے اندر بھیجا تو خزانہ خالی پڑا تھا۔

ٹیپو نے میتھیوز سے بازپرس کی تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔

"میں نے یا میرے آدمیوں نے کوئی چوری نہیں کی۔ تمہارے سردار نے خود خزانہ خالی کیا ہوگا۔"

"میں تلاشی لوں گا اگر تمہارے آدمیوں کے پاس سے خزانہ نکل آیا تو سمجھو کا معاہدہ ختم۔"

"میں کسی کی انفرادی چوری کا ذمہ دار نہیں۔"

"ذمے دار میں بھی نہیں۔" ٹیپو نے کہا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انگریز سپاہیوں کی تلاشی لی جائے۔ جس سپاہی کی تلاشی لی گئی اس کے لباس کے اندر کی تہوں میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے نکلے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خزانے کا ڈھیر فرش پر لگ گیا۔ ٹیپو کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "میں اس معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔" اس نے یہ حکم بھی دیا کہ انگریز فوج اور جنرل میتھیوز کو سرنگا پٹم پہنچایا جائے اور انہیں قید میں رکھا جائے۔

جنرل میتھیوز اس شرمناک شکست اور گرفتاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ قید کے دوران بیمار ہوا اور کچھ دنوں بعد مرگیا۔

انگریزوں نے ٹیپو پر الزام لگایا کہ اس نے میتھیوز کو زہر دے کر مار ڈالا۔ یہ قرارداد بھی پاس کی کہ ٹیپو سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔ کرنل کیمبل نے ٹیپو سے الجھنے کی کوشش کی لیکن مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور صلح کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہوگیا جس میں طے پایا کہ فریقین نہ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے اور نہ ایک دوسرے کے دشمن کی مدد کریں گے۔

یہ تھا معاہدہ بنگلور۔ اس کی نقل جب انگلستان پہنچی تو وہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس شکست کا داغ دھونے کے لیے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہوئیں۔ گورنر مدراس اور گورنر جنرل کو فوری طور پر انگلستان واپس بلا لیا گیا۔

ایک ایسے شخص کو گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ جنوبی ہند میں اچھی طرح قدم جما

کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے راہ ہموار کرے گا۔
وہ قوم جو تجارت کی غرض سے آئی تھی اب ہندوستان پر قبضے کے لیے اپنی فوجیں اتار رہی تھی۔
اس نئے گورنر جنرل کا نام کارنوالس تھا۔ اس نے انگلستان سے روانہ ہوتے وقت کہا تھا کہ وہ ٹیپو سلطان کو نیست و نابود کر دے گا۔
رچرڈ ویلزلی اس وقت پارلیمنٹ کا ایک رکن تھا اور اپنے لیے آگے بڑھنے کا راستہ بنا رہا تھا۔ اسے ہندوستان کے معاملات سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ ان ہونے والی تبدیلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اکثر تنہائی میں سوچتا تھا کہ اگر وہ ہندوستان میں ہوتا تو کیا کرتا۔
کارنوالس کے ہندوستان پہنچتے ہی معاہدۂ بنگلور اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ وہ یہ اعلان کر کے آیا تھا کہ ٹیپو کو نیست و نابود کر دے گا لیکن اس معاہدے کی موجودگی میں وہ ٹیپو پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ایسا رویہ اختیار کیا ایسے حالات پیدا کرنا شروع کر دیے کہ یا تو ٹیپو خود اس معاہدے کو توڑ دے یا پھر کوئی ایسی غلطی کرے کہ اسے حملہ کرنے کا جواز مل جائے۔ اس نے مرہٹوں اور نظام کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ٹیپو کو اپنے اتحادیوں کی فہرست سے خارج کر دیا۔
یہ تیور دیکھ کر ٹیپو کو یقین ہو گیا کہ کارنوالس اس سے جنگ ضرور کرے گا۔ اس نے بھی اپنے اتحادی ڈھونڈنے شروع کر دیے۔ اس نے شہنشاہ دہلی کو متعدد خطوط لکھے جن میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے مدد مانگی تھی۔ مغلوں کا حال یہ تھا کہ مرہٹے ان کے سروں پر ناچ رہے تھے۔ خزانہ خالی تھا اور وہ انگریزوں کے مقروض تھے جس کا کھا رہے تھے اس سے لڑ کیسے سکتے تھے۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد ٹیپو نے عمائدین سلطنت کو جمع کیا۔ اس مجمع میں اس نے اعلان کیا۔
”شہنشاہ دہلی عملی طور پر بے بس اور ناکام بادشاہ رہ گیا ہے لیکن اب تک خطبہ جمعہ میں اس کا نام پڑھا جاتا ہے جب کہ خطبے میں اس حکمران کا نام شامل کرنا چاہیے جو بالکل آزاد اور خود مختار ہو اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں ہمارا نام بطور سلطان پڑھا جائے۔“
کارنوالس ٹیپو کو گھیرنے کے لیے جو جال بچھا رہا تھا اس میں ایک یہ واقعہ بھی تھا۔ اس نے اسے ٹیپو کی بغاوت کا نام دیا۔ ریاست میسور کے ہمسایوں کو یہ کہہ کر اکسایا گیا کہ ٹیپو آہستہ آہستہ ان کی ریاستوں کو ہڑپ کر لے گا۔ اردگرد کے علاقوں میں بغاوت کے بیج بو کر ٹیپو کو اس میں الجھا دیا۔ تا کہ وہ اکیلا بھی پڑ جائے اور کمزور بھی ہو جائے۔ مرہٹوں اور نظام دکن کے ذریعے اس پر بار بار حملے کروائے گئے۔
ٹیپو بڑی جواں مردی سے ان طاقتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔
ٹیپو کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ کمپنی سے جنگ کرے۔ وسیع ذرائع، نظام دکن اور مرہٹوں کی مدد نے ٹیپو کو شکست سے دوچار کر دیا۔ بنگلور کو اتحادیوں نے فتح کر لیا۔
یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اسی دوران ٹیپو کے سب سے بڑے دشمن کارنوالس کو انگلستان واپس بلا لیا گیا۔
کارنوالس کی جگہ سر جان شور ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا۔
کارنوالس سات سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس مدت میں اس نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر کمپنی کو مسلط کر دیا۔ مغل شہنشاہ کا خراج بند کر دیا۔ وزارت انگلستان کی مدد سے ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کیا۔ فرانسیسیوں کو ہندوستان سے بالکل نکال دیا۔
رچرڈ ویلزلی اس وقت تک برطانوی پریوی کونسل میں داخل ہو چکا تھا۔ وزیراعظم انگلستان سے اس کی واقفیت گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے جوہر پوری پارلیمنٹ اور خود وزیراعظم پر کھل چکے تھے۔ شاہی خاندان کی محفلیں اس کے قہقہوں سے آباد ہو رہی تھیں۔ اس کی نکتہ سنجی اور بے پناہ مطالعہ کے سب قائل ہو رہے تھے۔ وہ ہندوستان کبھی نہیں گیا تھا لیکن جب وہ ہندوستان کی سیاست کے بارے میں تقریر کرتا تو ایک ایک مقام کی نشاندہی اس طرح کرتا جیسے وہ ان تمام مقامات کی سیر کر آیا ہے۔

☆......☆

اس کی گرل فرینڈ فرانسیسی دوشیزہ اب بھی اس سے شادی کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی رہتی تھی لیکن ویلزلی نے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ اس آزاد سوسائٹی میں کوئی قانون تو ایسا نہیں تھا کہ اس غیر قانونی میل جول پر ویلزلی گرفت میں آتا لیکن بہر حال ایک اخلاقی دباؤ اس پر ضرور تھا۔ بعض بے تکلف دوست انگشت نمائی کر رہے تھے۔ خود وہ دوشیزہ اصرار کر رہی تھی کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ وہ اب یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی تعلیم

ادھوری ہے یا اسے اپنی ترقی کے لیے راستے تلاش کرنے ہیں۔ وہ اب ایک باعزت اور پُرتعیش زندگی گزار رہا تھا۔ اسے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم سے شادی کرلوں۔"

"یہ تم مجھ سے محبت کے اظہار کے لیے کرو گے یا کسی مجبوری کے تحت۔"

"یہ محبت کا اظہار بھی ہے اور مجبوری بھی۔ مجبوری یہ ہے کہ ہمارے بچے بھی ہوگئے ہیں۔ انہیں باپ کا نام دیا جانا ضروری ہے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں اس کا احساس ہو گیا۔"

اس نے شادی کرضرور لی تھی لیکن اس کے دوستوں کا اب بھی خیال تھا کہ وہ اپنے بچوں کو باپ کا نام دینے کے بعد اس عورت سے علیحدگی اختیار کرلے گا۔

☆......☆

انگریزوں کو معلوم تھا کہ اگر وہ سلطان پر غالب آگئے تو دکن میں ان کا تسلط ہوجائے گا۔ نظام کو وہ پہلے ہی خرید چکے تھے۔ مرہٹے بھی ان کی مٹھی میں تھے۔ ایک سلطان میسور ہی رہ گیا تھا جو کسی طرح قابو میں نہ آتا تھا۔ اس کی تازہ فوجی بھرتیاں بھی انگریزوں کو دہلائے دے رہی تھیں۔ فرانس اور افغانستان سے ٹیپو کی مراسلت بھی انہیں پریشان کررہی تھی۔ جاسوسوں نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ ٹیپو ایران سے بھی انگریزوں کے خلاف ساز باز کررہا ہے۔

یہ تمام خبریں انگلستان پہنچ رہی تھیں جو کچھ ہورہا تھا اسے سرجان شور کی کمزوری سمجھا گیا اور اسے واپس بلالیا گیا۔

اس اثناء میں یہ خبر بھی ملی کہ دوسو فرانسیسی فوجی عہدے دار ٹیپو کی مدد کے لیے سرنگا پٹم پہنچ گئے ہیں۔ اب حکومت انگلستان کو ایسے آدمی کی ضرورت پیش آئی جو فرانسیسیوں کا بدترین دشمن ہو۔ کارنوالس کو آمادہ کیا گیا کہ وہ اس عہدے کو دوبارہ قبول کرلے اور ویلزلی کو مدراس کی گورنری پیش کی گئی جو اس نے فوراً قبول کرلی۔

مارکوئیس ویلزلی مدراس جانے کے لیے دربار شاہی میں دوامی سلام کرنے حاضر ہوا۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ آئرلینڈ میں تبدیلیوں نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ کارنوالس کو فی الحال وہاں سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔

اب یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا کرنا چاہیے۔ اسے ایک ہفتہ شاہی محل میں گزارنا پڑا۔ یہ ایک ہفتہ اس بحث میں گزرا کہ کسے گورنر جنرل مقرر کیا جائے اور بالآخر یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں نپولین کے اثر و رسوخ کو روکنے کے لیے ویلزلی سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں اسے گورنر جنرل مقرر کردیا گیا۔

اس تقرری کو وہ اپنی قابلیت سے زیادہ اپنی قسمت کا کھیل کہتا تھا۔ گورنر جنرل کارنوالس کو بنایا جارہا تھا لیکن یہ پھل عین وقت پر اس کی گود میں آگرا۔

اس کی بیوی کو یہ خبر اخبارات کے ذریعے پہنچی۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ جاگتی آنکھوں سے ہندوستان جانے کا خواب دیکھنے لگی۔ وہ ہندوستان جائے گی اور وہ بھی لیڈی ویلزلی کی حیثیت سے۔

ویلزلی جب برطانوی امراء کی ضیافتوں سے فارغ ہونے کے بعد گھر پہنچا تو اس کی بیوی اس سے سخت ناراض تھی۔

"جو خبریں آپ کی زبانی سنتی مجھے اخباروں سے معلوم ہوتی ہیں۔"

"وزیراعظم مجھے اپنے پہلو سے ہٹنے نہیں دے رہے تھے ورنہ یہ خبر سنانے کے لیے میں بھی بے تاب تھا۔"

"دوامی ضیافتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ہر لارڈ اپنی لیڈی کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ ہمارا گھر یہیں ہے اور آپ کو میرا خیال تک نہ آیا۔"

"بس کچھ معروفیات ایسی رہیں۔"

"آپ کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ ہندوستان جانے کے لیے کتنی تیاری کرنی پڑے گی۔ ہمارے پاس وقت ہے بھی یا نہیں۔"

"وقت کا کیا ہے مجھے چند جوڑے کپڑے کے رکھنے ہوں گے اور بس۔"

"آپ کے لیے بہت وقت ہوگا لیکن مجھے تو تیاری کرنی ہوگی۔ پرانے کپڑے میں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گی۔ نئے کپڑے بنانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ بچوں کی تیاری الگ کرنی ہوگی گھر کا کچھ سامان بھی میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"تمہیں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ تم میرے ساتھ نہیں جارہی ہو۔ میں اکیلا جارہا ہوں۔ حکومت یہاں تمہارا پورا خیال رکھے گی۔ میں بھی تمہاری خبر گیری کیے بغیر کہاں رہ سکوں گا۔"

وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا کہ وہ ناراض ہو کر اٹھ گئی ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر سسکیاں بھر رہی ہے۔

وہ بھی اس کمرے میں پہنچ گیا۔ ”تم سمجھتیں کیوں نہیں۔ ہندوستان کے حالات انگریزوں کے لیے سازگار نہیں۔ نامعلوم میری مصروفیات کی نوعیت کیا ہو۔ تم وہاں نہیں یہاں محفوظ ہو۔ بچوں کی تعلیم کا بھی حرج ہوگا۔“

”میں تمہارے بغیر.....“

”میرے بغیر رہنا ہوگا کیونکہ میں بھی وہاں تمہارے بغیر رہوں گا۔ تم مجھے خوشی سے رخصت کرو یا نہ کرو۔ مجھے اکیلے جانا ہوگا۔“ وہ جانتی تھی کہ وہ جس بات کا ارادہ کرلیتا ہے اسے کر کے رہتا ہے۔ اب ضد کرنا بے کار ہوگا۔

وہ اس شان سے جہاز میں سوار ہوا جیسے گورنر نہ ہو کسی رفیع و وسیع سلطنت کا بادشاہ ہو۔ اس کی یہ وضع قطع ہمیشہ سے تھی۔ چال ڈھال لب و لہجہ سب کچھ شاہانہ تھا۔ جب وہ پارلیمنٹ کا رکن تھا اس وقت بھی اس کا یہی حال تھا اور اب تو وہ گورنر جنرل ہو کر جا رہا تھا۔

وہ پہلے مدراس پہنچا اور وہاں کے گورنر سے حالات معلوم کرنے کے بعد کلکتہ روانہ ہوا۔ مدراس سے کلکتہ تک وہ ٹیپو کو شکست دینے کی ترکیبیں سوچتا رہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ٹیپو سے جنگ آزما ہونے کے لیے تنہا کمپنی کی فوجیں ناکافی ہیں۔ نظام کو اپنے ساتھ ملائے بغیر ٹیپو سے جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ نظام اپنی سپاہ کو منظم کرنے کے لیے فرانسیسی افسروں سے کام لے رہا ہے اور یہ بھی اسے معلوم تھا کہ ٹیپو کا فرانسیسی افواج سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ وہ ٹیپو کو تو نہیں روک سکتا تھا لیکن نظام کو قابو میں کرنے کے لیے اس نے ایک مراسلہ جاری کیا۔

”تمام ہندوستانی ریاستوں کو اپنی امداد کے لیے انگریزی افواج اپنی حدود ریاست میں رکھنی ہوگی۔ کوئی ریاست غیر برطانوی افسروں کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ جہاں جہاں فرانسیسی افواج ہیں انہیں نکال دیا جائے۔ ایسی ریاستوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی جہاں فرانسیسی افواج ہوں گی۔“

اس حکم نامے کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ ٹیپو سلطان اس حکم کو ہرگز نہیں مانے گا اور اس کا یہی انکار اس پر حملے کا بہانہ بنالیا جائے گا۔

یہ حکم نامہ آزاد ریاستوں کو فنا کرنے کی طرف پہلا قدم تھا جس کا سب سے پہلا شکار نظام دکن کو ہونا پڑا۔

نظام ابتدا میں تیار نہیں ہو رہا تھا لیکن بالآخر نظام اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

معاہدے کی شرط یہ تھی کہ نظام دکن کو چھ ہزار سپاہ کی امدادی فوج دی جائے جس کے مصارف وہ خود اٹھائیں۔ اس فوج کے ساتھ توپ خانہ بھی ہو اور اس کے افسر انگریز ہوں۔ فرانسیسی فوج کے افسر یک قلم موقوف کر دیے جائیں۔ نظام الملک آئندہ کسی فرانسیسی کو ملازم نہ رکھیں اور نہ کسی اور یورپین کو جب تک کہ کمپنی کی اجازت حاصل نہ کرلی جائے۔

مرہٹوں میں یہ افواہ پھیلا کر انہیں مضطرب کر دیا کہ والی افغانستان، ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جو مرہٹوں کے مقبوضات ہیں وہ خطرے میں ہیں چنانچہ مرہٹوں نے بھی انگریزوں سے معاہدہ کرلیا۔

یہ ویلزلی کی ذہانت ہی تھا کہ اس نے دو بڑی طاقتوں کو اس طرح خرید لیا کہ وہ بے بس ہو گئے۔ ظاہر میں اپنا تحفظ نظر آیا مگر باطن میں بے آسرا ہو گئے۔

ویلزلی نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ اودھ کی سرحد پر مرہٹوں کے مقبوضہ علاقے تھے۔ اس نے اپنی ایک فوج اس سرحد پر بھیج دی اور جواز یہ پیش کیا کہ افغانستان حملہ کرنے والا ہے اس لیے یہ فوج اودھ کی حفاظت کے لیے ہے۔

جب یہ تمام امور سرانجام پا چکے تو اس نے ٹیپو کو اکیلا کر کے اس کے نام ایک نہایت ہتک آمیز مکتوب لکھا۔

”آپ انگریزوں کے دشمن فرانسیسیوں سے جو خط کتابت کر رہے ہیں اس سے ہم بھی واقف ہیں۔ ان تمام نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی جو آپ کر رہے ہیں۔ صلح نامہ کارنوالس بھی ختم ہو سکتا ہے۔ انتشار اور بد نظمی بھی پیدا ہو سکتی ہے اور آپ کے مذہب کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

ابھی اس خط کا جواب آیا نہیں تھا کہ اس نے اپنی فوج کو میسور پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا اور خود بھی میدان جنگ سے قریب ہونے کے لیے مدراس پہنچ گیا۔

وہ مدراس میں تھا کہ اسے ٹیپو کی طرف سے خط کا جواب موصول ہوا۔

”میرا دلی مقصد یہ ہے کہ میں نے جو معاہدہ کیا ہے اس پر قائم رہوں اور اسے مستحکم کروں۔ میں اس وقت جل میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں سوائے اس کے کہ کبھی بھی

شکار کو نکلتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں آنے دیں گے۔"

ویلزلی کا دل تو کیا صاف ہوتا اس نے ایک اور خط ٹیپو کو لکھا اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ خط کا جواب ایک دن کے اندر اندر آنا چاہیے۔

یہ خط اتنا اہانت آمیز تھا کہ ٹیپو نے اس کا جواب تک دینا گوارا نہیں کیا۔

خط کا جواب نہیں آیا تو ویلزلی نے اپنی فوجوں کو مملکت خداداد میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔

جنرل ہیرس برطانوی فوج کی کمان دار اعلیٰ تھا جس کی کمان میں اکیس ہزار فوج تھی۔ حیدرآباد سے اٹھارہ ہزار سپاہ بھیجی بمبئی سے جنرل اسٹوارٹ چھ ہزار فوج کے ساتھ آگیا۔ مرہٹے بھی انگریزوں کی مدد کو آگئے۔

انگریزی افواج۔ تین طرف سے سرنگا پٹم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سلطان کے جنرل ان کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔ یہ سب ایک سازش کے تحت ہو رہا تھا۔ کچھ وطن پرست دستے تھے جو انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن ان کی بساط کیا تھی۔ یہ رنگ ڈھنگ ہرگز اُمید افزا نہیں تھے۔ وہ خود گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے جاں نثار اس کے ساتھ تھے۔ وہ یلغار کرتا ہوا نکلا اور ایک جگہ پہنچ کر انگریزوں کا راستہ روک لیا۔

غدار اس وقت بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ ٹیپو کے لشکر کو اس مقام پر لے گئے جو انگریزی توپ خانے کی زد میں تھا۔ گولوں کی باڑھ چلی اور ٹیپو کے لشکر کو شدید نقصان پہنچا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر لشکر کو یکجا کیا اور دھاوا بول دیا لیکن اسی وقت اسے خبر پہنچی کہ جنرل اسٹوارٹ سرنگا پٹم کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس نے تھوڑی سی فوج اس محاذ پر چھوڑی اور خود سرنگا پٹم پہنچ گیا۔

انگریزی فوج کا دوسرا حصہ جنرل ہیرس کی سرکردگی میں آگیا۔ اسٹوارٹ اور ہیرس نے مل کر ایک گنجان باغ میں ڈیرے جا لیے یہ مقام قلعے کی فصیل سے بالکل نزدیک تھا۔ یہاں سے نہایت موثر گولہ باری کی جا سکتی تھی۔

انگریزوں کو اس مقام تک لانے والا ایک غدار امیر تھا۔

اس وقت دارالسلطنت کا ہر امیر جڑیں کاٹنے میں مشغول تھا۔ یہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں سازشوں سے لڑی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوجوں نے چاروں طرف سے سرنگا پٹم کو گھیرے میں لے لیا۔

یہ حال دیکھ کر سلطان کے بعض امراء نے صلح کی تجویز پیش کی۔ ٹیپو انگریزوں سے صلح کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ ایک اور غدار میر صادق نے حق غداری ادا کیا۔ اس نے انگریزی کیمپ میں خبر پہنچا دی کہ ٹیپو صلح کا خواہش مند ہے۔ سخت سے سخت شرائط تحریر کیجیے گا اس وقت ٹیپو شکست سے دوچار ہے وہ ہر شرط مان لے گا۔

ٹیپو نے صلح کی تجویز پیش کی لیکن انگریزوں نے ایسی ذلت آمیز شرائط پیش کیں۔ جنہیں ٹیپو سلطان قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ان شرائط پر غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور تنگ آمد بہ جنگ آمد انگریزی افواج پر گولہ باری کا حکم دے دیا۔ جہاں توپیں نصب تھیں وہاں بھی غداروں کی کمی نہیں تھی۔ توپوں کے اندر مٹی اور روئی رکھ کر توپیں چلائی جانے لگیں۔ دوسری طرف سے انگریزی گولوں نے قلعے کی دیوار منہدم کر دی۔ اس موقع پر اس نے فرار کا منصوبہ بھی بنا لیا تھا۔ اتنے غداروں میں رہ کر جنگ کیسے جیتی جا سکتی تھی لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور قلعے میں داخل ہونے والی افواج سے مقابلے کے لیے پہنچ گیا۔

میسوریوں کا اتنا خون بہا کہ ویلزلی کی سوانح خون میں ڈوب گئی۔

کشتگان ویلزلی میں ٹیپو کی لاش بھی کہیں دبی پڑی تھی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایک مقام پر ٹیپو کی پالکی ملی۔ اس کے اندر کوئی مجروح لیٹا تھا۔ تلاش کرنے والوں نے سوچا یہی ٹیپو ہے۔ انہوں نے بندوقیں تان لیں۔

"مجھے مت مارو۔ میں ٹیپو نہیں ہوں۔ اس کا ملازم راجا خان ہوں۔" مجروح چیخا۔

"تیرا آقا کہاں ہے؟"

راجا خان نے اس مقام کی نشاندہی کی جہاں ٹیپو گرا تھا۔ پھر اسے شناخت کر لیا گیا۔

جب ٹیپو کی شہادت کی خبر جنرل ہیرس کو پہنچائی گئی تو وہ خوشی سے چیخ اٹھا۔ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔"

☆......☆

ٹیپو سلطان پر فتح پانے کے بعد ویلزلی نے حیدر علی کی اولاد میں سے کسی کو میسور کا حکمراں نہیں بنایا کیونکہ اسے یقین تھا کہ حیدر علی کے خاندان کا کوئی فرد بھی انگریزوں کا

دوست نہیں ہوسکتا۔ ویلزلی نے میسور کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ نظام کو بھی زمین کا تھوڑا سا حصہ مل گیا جو اس نے انگریزوں کی امدادی فوج کے اخراجات کے بدلے میں واپس کردیا۔ ویلزلی نے مرہٹوں کو بھی چند شرائط پر میسور کا کچھ حصہ دینا چاہا جو انہوں نے ان شرائط پر لینے سے انکار کردیا۔

ٹیپو کی بقیہ مملکت قدیم ہندو راجا کی اولاد کو دے دی گئی جنہیں حیدر علی نے بے دخل کردیا تھا۔ ہندو راجا کو گدی پر بٹھانے میں ایک سیاسی مصلحت تھی اس نے ہندوؤں کی تالیف قلوب مقصود تھی جو اسلامی حکومت سے نفرت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ اس بخشش پر ہندو راجا کا انگریزوں کا ممنون احسان ہونا لازمی تھا۔

ویلزلی کے ہندوستان میں آنے سے ایک سال پہلے یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ کمپنی کسی طرح ٹیپو سلطان کی طاقت کو اس طرح تہ وبالا کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے لیکن اس نے صرف دو ماہ میں نہایت سہولت سے اس مہم کو مکمل کرلیا۔ میسور کی تسخیر کے بعد صوبہ کرناٹک کی کامل مدافعت کی جاسکتی تھی۔ ٹیپو سلطان کے درمیان سے ہٹ جانے سے انگریزی تجارت کے وسیع ہونے کا امکان ہوگیا۔ کمپنی کی فوج کو بھی خوب ترقی دی جاسکتی تھی۔ نیا ملک ہاتھ آگیا تھا۔ سب سے بڑی بات انگریزوں کے حق میں یہ ہوئی کہ اس جنگ نے فرانسیسی اثر کو ہندوستان سے قطعاً زائل کردیا۔

سرنگا پٹم کی تسخیر کی خبر جب ہندوستان میں پھیلی تو برطانوی آبادیوں کے جوش مسرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ ویلزلی پر مبارک بادوں اور خطبات کی بارش ہونے لگی۔ اسے ایسے خطابات سے نوازا گیا جو اب تک کسی گورنر جنرل کے حصے میں نہیں آئے تھے۔ معلوم نہیں ان خطابات کی رفعت وشان کا سبب اس کی اولوالعزمی تھی یا ٹیپو کی دلیری و بہادری یا پھر دونوں کہ بہادر دشمن پر قابو پانے والا بھی بہادر ہوتا ہے۔

اس کی کوتج انگلستان پہنچی تو اس کی دانائی، قوت فیصلہ اور عزم کی تعریف کی گئی۔

''انگلستان ان تمام عظیم الشان واقعات کے بروئے کار آنے میں حضور کی تیز عزم وہمت اور دانائی کا رہن منت ہے۔''

اسے سینٹ پیٹرک کے خطاب کا ستارہ اور نشان پیش کیا گیا جو ٹیپو کے جواہرات سے بنایا گیا تھا۔ کمپنی کی طرف سے پانچ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ اس کے نام جاری کیا گیا۔ اسے تمام افواج بلاد ہند کا کیپٹن جنرل اور کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔

تحفے تحائف کی اس بارش نے اسے امیر ترین انگریز بنا دیا۔ اب اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ شاہانہ زندگی گزار سکتا تھا جو اس کے مزاج کا خصہ تھا۔ جب اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس وقت بھی وہ ظاہری شان وشوکت سے چھوٹا موٹا بادشاہ ہی نظر آتا تھا اور اب تو اس کے پاس دولت بھی تھی ناموری بھی۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے شاندار کوٹھی بنوائی۔ اس کا ایک دوست انگلستان سے اس سے ملنے آیا تو واپس جا کر اس کوٹھی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچے بغیر نہ رہ سکا۔

''اس کی کوٹھی کا محل وقوع اتنی عمدہ جگہ ہے کہ میں نے ایسی جگہ آج تک نہیں دیکھی۔ دریائے ہگلی کی سطح سے یہ قطع بہت اونچا ہے اور اس کے ایک وسیع قطعہ زمین پر وہ واقع ہے۔ اس کے دونوں طرف مندر، گاؤں اور اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ کشتیاں سبز رنگ سے رنگی ہوئی ہیں اور ان پر سنہری کام ہوا ہے۔ کشتی بانوں کی وردیاں سرخ انگارا ہیں۔ یہ دونوں رنگ بڑی بہار دکھاتے ہیں۔ کوٹھی کے چاروں طرف انگریزی وضع کا چمن ہے اور مکان یہاں کے موسمی اعتبار سے خوب ہے۔''

اسے انعامات بھی مل رہے تھے اور اعزازات بھی لیکن اس کے خیال میں جو خدمات اس نے انجام دی تھیں ان کے مقابلے میں یہ اعزازات بہت چھوٹے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوک یا انگریزی طبقہ امراء میں سے کوئی اعلیٰ مرتبہ اس کی خدمات کا صلہ ہے۔ وزیراعظم نے اسے لکھا کہ اس کو آئرلینڈ کا مارکوئیس بنا دیا گیا ہے۔ وہ اس خطاب سے خوش نہیں ہوا۔

آئرلینڈ کے طبقہ امراء کے مدارج میں ایک درجے کا بڑھنا، مارننگٹن سے مارکوئیس ہو جانا اس کے لیے کافی نہ تھا۔ خدمات تعریفوں اور تحائف کی اس بھیڑ میں ایک روز انگلستان سے اس کی بیوی کا خط آیا۔ ظاہر ہے یہ خط شکر آمیز شکوؤں سے بھرا ہوا تھا۔

''تمہاری شہرت اور بلندیوں کے جھنڈے بڑی دور تک لہراتے ہوئے دیکھ رہی ہوں لیکن افسوس کہ میں تم سے دور ہوں اب تو تمہیں فرصت مل گئی ہوگی۔ ٹیپو کو شکست دینے کے بعد تمہاری بہت سی مصروفیات ختم ہوگئی ہوں گی۔ کیا تمہارے پاس اب بھی اتنا وقت نہیں کہ میری عدم موجودگی کو

محسوس کرسکو۔ تم نے لکھا تھا تم نے جو محل بنوایا ہے۔ کیا اس میں ایک کمرا بھی میرے اور میرے بچوں کے لیے نہیں؟

میں یہ نہیں کہتی کہ یہاں مجھے کچھ میسر نہیں۔ میں شہزادیوں کی طرح رہ رہی ہوں۔ تم بھی میرا بہت خیال رکھ رہے ہو حکومت بھی اور تمہارے خطوط بھی مجھے تسلیاں دیتے رہتے ہیں لیکن میں تو اس وقت خوش ہوں گی جب تم مجھے اپنے پاس بلاؤ گے۔ مجھے تمہارا ہندوستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ضرور لکھو کب بلا رہے ہو۔ اگر انکار کرو گے تو بھی میں تمہاری ہوں۔"

ولیزلی نے پھر اسے ایک تسلی آمیز خط لکھ دیا۔ "تم سمجھ رہی ہو میں آرام سے ہوں۔ میری پریشانیوں کا تصور نہیں کرسکتیں۔ قدم قدم پر خطرات بکھرے پڑے ہیں جن سے مجھے لڑنا پڑتا ہے۔ فرصت کرو بہت جلد تمہیں بلانے کی کوشش کروں گا۔ بس دعا یہ کرو کہ میری سیاست کامیابی سے ہم کنار ہو۔

میں نے ہندوستان کی کچھ سوغات تمہیں بھیجی تھیں تمہیں مل گئی ہوں گی۔"

اس نے لکھا ضرور تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اسے بلا لے گا لیکن وہ اسے کبھی نہ بلا سکا۔

اس کے لیے جنوبی ہندوستان دلدل بھرا میدان بن گیا۔ ایک پاؤں نکالتا تھا تو دوسرا دھنس جاتا تھا۔ میسور پنجہ اقتدار میں آتے ہی اسے ان علاقوں کا خیال آیا جو انگریزوں کے مقبوضہ تھے لیکن حکومت دوسرے کر رہے تھے۔ سب سے اہم علاقہ تو کرناٹک ہی کا تھا۔ کلائیو کے ایک معاہدے کے مطابق شہری نظم و نسق کا کام نواب کے سپرد تھا اور مال گزاری کا وصول کرنا کمپنی کے ذمے تھا۔ اس دوعملی سے جہاں نواب کو ذمے داری دی وہاں اختیار چھین لیا اور جہاں کمپنی کو اختیار دیا وہاں اسے ذمے داری سے دور رکھا حکومت کی ذمہ داری نہ نواب لیتا تھا اور نہ کمپنی۔

ولیزلی ہندوستان آیا تو ابتری عام تھی۔ بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔

کمپنی نے اپنے اقتدار کی بنیاد کرناٹک ہی میں رکھی لیکن ولیزلی کے زمانے میں کمپنی کی پالیسی تبدیل ہوتے ہی کرناٹک کے حکمرانوں کی اہمیت بھی کم ہوگئی۔ ولیزلی نے کرناٹک پر قبضہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اس نے نواب کرناٹک کو خط لکھا اور بتایا کہ میسور سے جنگ ہونے کے باعث پچھلے عہد نامے کی رو سے کمپنی کے لیے لازم ہوگیا ہے کہ وہ کرناٹک کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نواب کے جرائم اس طرح بیان کیے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ انگریزوں کا دوست نہیں رہا۔ نواب نے ایک طویل مکتوب کے ذریعے ان جرائم کی تصدیق سے انکار کیا۔

ولیزلی کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ کرناٹک پر کمپنی کا قبضہ ہو لیکن جب تک نواب زندہ تھا وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ ولیزلی نے کرناٹک پر قبضہ کرنے کے جواز کے طور پر کمپنی کو ایسے خطوط بھی پیش کیے جو ٹیپو اور حیدر علی کے نام لکھے گئے تھے۔ ان خطوط سے بجز اس کے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی تھی کہ نواب کرناٹک اور ٹیپو کے درمیان مراسلت ہوتی تھی لیکن ولیزلی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نواب انگریزوں کا نہیں ٹیپو کا دوست رہا ہے۔

ولیزلی کی ساری قابلیت دھری رہ گئی۔ وہ نواب کرناٹک کے خلاف ایک ثبوت بھی حاصل نہ کرسکا لیکن قدرت اس پر مہربان تھی۔ نواب کا انتقال ہوگیا۔ گدی کے لیے نواب کے بیٹے اور بھتیجے میں تکرار ہوگئی۔ اس تکرار نے انگریزوں کے لیے کرناٹک کا فیصلہ آسان کردیا۔

ولیزلی نے دونوں کے سامنے چند شرائط رکھ دیں کہ جو ان شرائط کو قبول کرے گا اسی کو گدی نشین کردیا جائے گا۔ نواب کے بیٹے نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کردیا لیکن نواب کے بھتیجے عظیم الدولہ نے شرائط قبول کرلیں۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی شہری اور فوجی نظم و نسق کمپنی کے حوالے کردیا۔ اس کے بدلے میں اس کا وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ ولیزلی نے ایک اعلان کے ذریعے اس کی تصدیق کردی۔

"کرناٹک کو کمپنی کے ممالک محروسہ میں ضم کرکے ملکی و فوجی نظم و نسق کو کمپنی نے اپنے اختیار میں لے لیا ہے۔ آمدنی کا ایک خمس نواب کے نام کردیا گیا ہے۔ نیز اس کے تمام ایسے قرض جو تحریر میں موجود ہیں بتدریج ادا کردیے جائیں گے۔"

"تنجور اور سورت میں بھی تخت نشینی کے جھگڑے اٹھے تو ولیزلی نے کمپنی کے مفاد میں وہی فیصلہ کیا جو وہ کرناٹک میں کرچکا تھا۔ وہاں بھی دو دعویدار تھے۔ ولیزلی نے بعض شرائط کے ساتھ ایک کے حق میں فیصلہ کیا۔

"تنجور میں بھی معاملہ یہ درپیش تھا کہ آیا مرحوم راجا کا سوتیلا بھائی یا اس کا متبنیٰ کون زیادہ مستحق ہے؟ ولیزلی نے

بیٹی کے حق میں توثیق کی اور اس سے ایک عہد نامے پر دستخط کرا لیے۔ اس معاہدے کے تحت ملکی اور فوجی تنظیم کمپنی کی گورنمنٹ کے قبضے میں آ گئی۔

''سورت۔'' میں بھی اس قسم کی مشکلات پیش آئیں اور اسی طور سے ان کا بھی تصفیہ ہوا۔ یہ بندرگاہ اس وقت ہندوستان میں بحری تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور اس کی ظاہری شان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں تجارت وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ بے قیاس دولت ہے۔ بے شمار آبادی ہے اور خاص قسم کی عمل داری ہے۔ نواب اور انگریزی آبادی کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ نواب اور اس کے بیٹے کی وفات سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ اس معاہدے کے ساتھ اسے گدی پر بیٹھنا نصیب ہوا۔

سورت کے شہر، اس کے علاقے، دیگر مقامات، ماتحت ریاستوں کی مداخل کی تحصیل اور ان کا بندوبست دوامی طور پر کمپنی کے سپرد کیا جائے گا اور عام طور پر ریاست سورت اور اس کی ماتحت ریاستوں کی عدالت یا دیوانی و فوجداری اور اس کی ملکی و فوجی حکومت سب دوامی طور پر اور بلاشرکت غیرے کمپنی کو انتظام و انصرام کے لیے تفویض کر دی جائے گی۔

لارڈ ویلزلی نے نواب واجد علی شاہ اور وزیر سعادت علی خان کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک نیا معاہدہ کرے جس کی رو سے اسے گورکھپور، روہیل کھنڈ اور دوآبہ کو کمپنی کے حوالے کرنا تھا تاکہ ان علاقوں کی آمدنی سے ان انگریزی فوجوں کے اخراجات پورے کیے جائیں جو اودھ میں موجود تھیں۔ نواب وزیر نے اس معاہدے کے خلاف احتجاج کیا۔

ویلزلی نے پھر لکھا۔ ''انگریزی فوج کے تیرہ ہزار سپاہی اودھ کی حفاظت کے لیے ناکافی ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ نواب وزیر اپنی فوجوں کو توڑ کر اودھ میں مزید انگریزی فوج رکھے۔ نیز یہ کہ انگریزی فوجوں کے اخراجات کے لیے گورکھپور، روہیل کھنڈ اور دوآبہ کے علاقے کمپنی کے حوالے کر دیے جائیں۔ ان علاقوں کی آمدنی سے اودھ میں موجود انگریزی فوجوں کے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔''

یہ ایک نیا جال تھا جو نواب وزیر کے خلاف بچھایا جا رہا تھا۔ ویلزلی کمپنی کے مقبوضات میں برابر اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ نواب وزیر کرناٹک، تنجور اور سورت کی ریاستوں کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس نے زبردست احتجاج کیا۔ لکھنؤ کے انگریز رزیڈنٹ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ بھی معاملے کو یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ وہ گورنر جنرل کو خط لکھے گا۔ ادھر سے جو جواب آئے گا وہ نواب وزیر کو پہنچا دیا جائے گا۔

جب نواب وزیر کو یقین ہو گیا کہ اس کی شنوائی نہیں ہوگی تو اس نے مسئلہ سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ ''میں ان مصائب اور مشکلات سے عاجز آ گیا ہوں۔ میرے پاس ذمّہ دار صلح کار بھی نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ان معاملات سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤں۔

کرنل اسکاٹ کے لیے نواب وزیر کی طرف سے دی گئی یہ دھمکی حیرت ناک تھی۔ اس نے اس سلسلے میں ویلزلی کو خط لکھا کہ اب کیا ہونا چاہیے۔

ویلزلی نے لکھا۔ ''میں نہ تو یہ چاہتا ہوں اور نہ اسے پسند کرتا ہوں لیکن اگر یہ ہونا ہی ہے تو ایسی شرائط سے ہو جس سے برطانوی حکومت کو اطمینان کامل ہو جائے۔''

اس نے مزید انتظار کیے بغیر انگریزی فوج کو اودھ بھیج دیا اور نواب وزیر کو لکھ بھیجا کہ اس فوج کے اخراجات اسے برداشت کرنے پڑیں گے۔

عجیب زبردستی تھی۔ نواب وزیر نے گورنر جنرل سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اسے اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے مزید فوج دی جائے لیکن اس پر بھی زائد انگریزی فوج اودھ بھیج دی گئی۔ اخراجات کے لیے اودھ کے علاقے طلب کرنا پچھلے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔

ویلزلی نے کرنل اسکاٹ کو خط لکھا کہ میں نے نواب کے سامنے ایسا عہد نامہ پیش کیا ہے جو کہ تنجور کے راجا کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اگر وہ اس عہد نامے کو رد کر دے تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسے پھر بھی برطانوی فوج کی اضافی جمعیت کے اخراجات اٹھانے پڑیں گے اور ان اخراجات کی ادائیگی میں اسے دوامی طور پر اپنے ملک کا مطلوبہ علاقہ کمپنی کے زیر نگیں کرنا ہوگا۔ دوآبہ اسے کمپنی کے حوالے کر دینا چاہیے اور روہیل کھنڈ بھی۔

اسی قسم کا ایک خط اس نے نواب وزیر کو لکھا۔ نواب کی طرف سے اس کا جواب بھی آیا لیکن ویلزلی کی نیت خراب تھی اس نے خط کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا اور لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کو لکھ دیا کہ اگر نواب وزیر معاہدے پر دستخط نہ کرے تو اس مجوزہ علاقے کی فوری حوالگی کا مطالبہ کیا جائے۔ وہ اگر تیار نہ ہو تو برطانوی فوج بھیج کر ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے۔

نواب وزیر نے ریزیڈنٹ کے سامنے معاہدہ ماننے سے انکار کردیا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ آخری بار ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اب ویلزلی نے تہیہ کیا کہ خود لکھنو جا کر معاملات کا تصفیہ کرے گا۔ وہ روانہ بھی ہو گیا۔

اس کا سرکاری بجرا گومتی تک پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوا نواب نے شرائط منظور کرلیں اور عہدنامے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کے بعد اودھ کی رہی سہی آزادی بھی ختم ہو گئی۔

وہ لکھنو پہنچا تو اس کی مراد پوری ہو چکی تھی۔ اس نے نواب کو بلوا بھیجا اور نہایت عزت سے پیش آیا۔ دونوں میں روزانہ مشاورت ہوتی رہی۔ ان ملاقاتوں نے رہی سہی مشکلات کو بھی صاف کردیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد اس نے اپنی اس کامیابی کی اطلاع کمپنی کے ڈائریکٹروں کو ان الفاظ میں دی۔

"میرا ارادہ ہے کہ کمپنی کے ان مقبوضہ علاقوں میں بندوبست کے لیے فوراً عارضی حکومت قائم کردوں۔ یہ حکومت مشروطہ شراعت پر مشتمل ہوگی۔ ان افسروں پر جو کمپنی کے عدالتی، تجارتی اور مالی معاملات کا پورا تجربہ رکھتے ہیں اور لائق و مستعد ہیں ان کا صدر مسٹر ہنری ویلزلی کو بنانا چاہتا ہوں جس کی ذہانت اور استقلال کی بدولت اس قدر خیر و خوبی اور عجلت سے اتنے وسیع اور زرخیز علاقوں کا تصفیہ ہو گیا ہے۔"

☆......☆

فرانسیسی منصوبوں کو شکست دینے کے لیے قطعاً لازمی تھا کہ ہندوستان میں کوئی ایسی ریاست باقی نہ چھوڑی جائے جو برطانوی طاقت کے بل پر قائم نہ ہو یا جس کی سیاسی راہ و روش برطانوی اقتدار کے تحت ہی نہ ہو۔"

ویلزلی یہ کام بڑی خوبی سے کر رہا تھا اور اب تک کئی ریاستیں ہڑپ کر کے کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر چکا تھا۔ نظام سے معاہدہ کرنے کے بعد تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اب اس کے سامنے مرہٹے رہ گئے تھے۔

جب وہ وارد ہندوستان ہوا تھا اس وقت مرہٹوں کی داخلی سیاست میں بے چیدگیاں اور نااتفاقیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جسونت راؤ ہلکر اور دولت راؤ سندھیا میں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ بھونسلا اور گائیکوار کمپنی کی طرف زیادہ مائل تھے۔

ویلزلی نے ابتداء ہی میں چاہا تھا کہ وہ اس نااتفاقی سے فائدہ اٹھائے لیکن نانا فرنویس کے ہوتے ہوئے پونا دربار میں ویلزلی کی دال نہ گل سکی۔ نانا فرنویس اس بات کا سخت مخالف تھا کہ انگریزی فوج کو اس ملک میں جگہ دی جائے۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا رہا کہ جو کچھ بھی قوت پیشواؤں میں باقی رہ گئی ہے وہ انگریزی دست برد سے آزاد رہے۔

ویلزلی بھی میسور میں مصروف رہا۔ اس کے بعد بھی اس کو بہت سے کام درپیش تھے۔ جب وہ مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوا تو نانا فرنویس اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا تھا جو مرہٹوں کے آپس کے اتحاد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ ویلزلی بے بس تھا اور سوچا کرتا تھا کہ کیا مرہٹوں کو خاک میں ملائے بغیر انگلستان واپس چلا جائے گا؟

ویلزلی کی قسمت اچھی تھی۔ 1800ء میں نانا فرنویس اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی مرہٹہ سرداروں (پیشواؤں) میں مملکت کے لیے چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ سندھیا اور ہلکر پونا دربار کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ کامیابی کا رخ اکثر بدلتا رہتا۔ کبھی ہلکر فتح مند نظر آتا کبھی سندھیا بالآخر ایک فیصلہ کن واقعے نے تمام معاملہ ویلزلی کے قابو میں کردیا۔ ہلکر نے پونا کی لڑائی میں پیشوا اور سندھیا کی متحدہ فوجوں کو شکست دی۔ پیشوا باجی راؤ دوم نے بھاگ کر انگریزوں کے پاس پناہ لی۔

شکست خوردہ پیشوا کو یہ امید دلائی گئی کہ اس کو اس کی مملکت دلا دی جائے گی اگر وہ انگریزوں کی شرائط پر ان سے معاہدہ کرلے۔ پونا سے بھاگا ہوا یہ مرہٹہ اس جال میں گرفتار ہو گیا اور تقریباً انہی شرائط پر معاہدہ کرلیا جو انگریزوں نے دوسری ریاستوں کے ساتھ کیا تھا۔

اس معاہدے کی رو سے پیشوا باجی راؤ پابند ہو گیا کہ وہ کمپنی کی امدادی فوج رکھے گا، غیر برطانوی افسروں کو اپنی فوج میں ملازم نہیں رکھے گا۔ کمپنی کی اجازت کے بغیر کسی دیسی ریاست سے کوئی معاہدہ نہیں کرے گا۔ کمپنی کی امدادی فوج کے اخراجات کے لیے پیشوا احاطہ بمبئی کے بعض اضلاع کمپنی کے حوالے کرے گا۔

پیشوا باجی راؤ کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ غلامی کی کن زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اسے یہ اندازہ تو اس وقت ہوا جب وہ پونا گیا۔ اس نے دشمنی بھلا کر اپنے مرہٹوں ساتھیوں کو آواز دی۔ سندھیا اور بھونسلا کو پونا آنے کی دعوت دی۔ سندھیا اور بھونسلا اپنی فوجوں سمیت پونا روانہ

ہوئے ویلزلی نے انہیں دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ ان خطوط میں سندھیا اور بھونسلا کو پونا جانے سے منع کیا گیا تھا۔ ان خطوط کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ویلزلی کو جنگ کی تیاری کا وقت مل جائے۔

جب وہ مکمل تیاری کر چکا تو اس نے اپنے بھائی آرتھر ویلزلی کو جنگ اور صلح کے اختیارات دے دیے۔ آرتھر نے کمپنی کی فوجیں چھ مختلف محاذوں پر متعین کر دیں۔

آرتھر ویلزلی احمد نگر روانہ ہوا اور صرف چار روز بعد احمد نگر کا قلعہ اس کے قبضے میں تھا۔ یہاں سے وہ آگے بڑھا اور اورنگ آباد کی طرف چلا تاکہ کرنل اسٹیون سن سے مل سکے۔

سندھیا اور بھونسلا کو احمد نگر کی تسخیر اور آرتھر کے کوچ کی خبر ملی تو انہوں نے بھی جنگ کی تیاری کی۔

سندھیا کے یورپی افسروں نے غداری کی اور میدان آرتھر کے ہاتھ رہا۔

سندھیا اور بھونسلا کی کمپنی سے صلح ہو گئی۔ گجرات اور اڑیسہ پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔

اسی مہینے یعنی اگست 1803ء کو جنرل لیک کانپور سے روانہ ہو کر کمپنی کی سرحد تک جا پہنچا۔ جنرل لیک سندھیا کی مملکت پر حملہ آور ہوا اور پھر جنرل لیک علی گڑھ پر قابض ہو گیا۔ اب وہ لال قلعے کی دیواروں پر برطانوی پرچم لہرانے کے لیے دہلی کی طرف بڑھا۔ شہنشاہ شاہ عالم جنرل لیک کا طرف دار ہو گیا شاید اس لیے کہ وہ مسئلہ شہنشاہیت کا تھا۔ بہر حال انہیں اتنی رعایت ضرور مل گئی کہ جنرل لیک آگرہ روانہ ہوا اور آگرہ کے قلعے پر قابض ہو گیا۔

ہلکر جو اس وقت تک خاموش تھا اب اپنے طور پر انگریزوں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سب سے پہلے ان راجپوت ریاستوں پر حملے کیے جو انگریزوں کے تحت تھیں۔ ویلزلی نے بھی ہلکر کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

ہلکر کے علم میں تھا کہ سندھیا کو شکست اس لیے ہوئی کہ اس کی فوجوں کے یورپی افسران نے غداری کی تھی لہٰذا اس نے اپنی فوج کے تمام یورپی افسران کو قتل کرا دیا۔

ہلکر کی قوت ختم کرنے کے لیے ویلزلی نے تین مقامات پر فوجی اڈے قائم کیے۔

ویلزلی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ہلکر فتح و نصرت کا علم لہراتا ہوا متھرا تک پہنچ گیا۔ انگریز اتنے خوف زدہ تھے کہ ہلکر کے پہنچنے سے قبل ہی متھرا خالی کر گئے۔ وہ خوش تھا کہ متھرا اسے مل گیا لیکن انگریزوں نے اس کے دکنی اور مالوی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ ہلکر دہلی پہنچا لیکن اس سے پہلے ہی جنرل لیک دہلی فتح کر چکا تھا۔ وہ سہارن پور کی طرف گیا۔ جنرل لیک اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ہلکر سہارن پور جانے کی بجائے بھرت پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنرل لیک پیچھے پیچھے تھا۔ ہلکر اپنی فوج سمیت ڈیگ کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ یہاں سے نکل کر وہ بھرت پور کے قلعے میں چلا گیا۔ بھرت پور کے راجا رنجیت سنگھ نے ہلکر کا پورا ساتھ دیا۔ ڈیگ کو انگریزوں نے فتح کر لیا تھا۔ اب صرف بھرت پور راجا کی مملکت میں رہ گیا تھا۔

بھرت پور نہایت مستحکم قصبہ تھا۔ چھ میل سے زیادہ اس کا قطر تھا۔ توپ خانہ اور دفاعی مورچہ اچھا تھا۔

جنرل لیک ڈیگ کے قلعے سے نکلا اور بھرت پور پر حملہ آور ہو گیا۔ راجا نے بھرپور مقابلہ کیا۔ لیک نے تین بار حملہ کیا اور اسے ہر بار شکست ہوئی۔ وہ ہر بار ویلزلی کو "سب ٹھیک ہے" کا مراسلہ لکھ کر دھوکا دیتا رہا۔

جب وہ عاجز آ گیا تو راجا کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔

انگریزوں کی اس شکست کے بعد انگلستان میں ویلزلی کی پالیسیوں پر نکتہ چینی شروع ہو گئی اور اسے واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "جنگ سے ایسے وقت میں ہاتھ اٹھایا گیا جب کامیابی بالکل قریب آ گئی تھی۔"

یہ بات اس نے اس روشنی میں کہی کہ ہلکر کی قوت اتنی ٹوٹ چکی تھی کہ بہت جلد اس کا چراغ گل ہونے والا تھا۔ اس کے اتحادی یا تو بالکل کمزور ہو گئے تھے یا انہوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مرہٹوں کی کسی طاقت میں اتنا دم نہیں رہا تھا کہ انگریزوں کے مقابلے کی تاب لا سکے۔

ویلزلی نے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا۔ اس نے ٹیپو سلطان کی مملکت پر قبضہ جمایا۔ اس نے ہندوستان میں فرانس کے اثر و رسوخ کو مٹایا۔ نظام اور اودھ کو کمپنی کے زیر اثر کر دیا۔ اس نے پیشوا کو کمپنی کی امداد کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ سندھیا اور راجا برار کی قوت ویلزلی نے ہی ختم کی۔ کرناٹک، تنجور اور سورت کو کمپنی مقبوضات میں شامل کر کے ویلزلی نے ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کیا۔ اس نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کو ہندوستان کی سب سے بڑی قوت بنا

دیا۔

☆......☆

ویلزلی کو اب انگلستان واپس بلانے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن اس سے پہلے کچھ ایسے جواز فراہم کرنے تھے جن کی روشنی میں اس فیصلے کو صحیح ثابت کیا جاسکے یا اسے اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ یہ عہدہ خود چھوڑ دے۔ اس نے جن لوگوں کی تقرریاں کی تھیں انہیں ان کے عہدوں سے ہٹانا شروع کردیا گیا اور انگلستان سے ناقابل اور نااہل لوگ مقرر ہونے لگے۔ یہ اس کی تذلیل بھی تھی اور اس کی پالیسیوں کی ناکامی بھی۔ اس کے مقرر کردہ اہل افسران ایک ایک کرکے ہٹا دیے گئے۔ اس کے احکامات کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔ گورنر جنرل کی حیثیت سے وہ جن لوگوں پر اعتماد کرسکتا تھا ان سب کو اس کے قریب سے دور کردیا گیا۔ کمپنی کے ناظمین نہایت بے دردی سے اس کے احکامات میں کانٹ چھانٹ کررہے تھے۔

وہ اب تک ان حرکتوں کو برداشت کرتا رہا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے ذاتی اخراجات کی بھی بڑی سختی سے چھان بین کی جاتی ہے تو اسے حد اطاعت سے باہر قدم نکالنا پڑا۔

کلکتہ میں جو نیا گورنمنٹ ہاؤس اس نے بنوایا تھا وہ اس کے نزدیک اس عظیم طاقت کی عظمت اور وقار کا ضروری مظاہرہ تھا جو اب مشرق میں قائم ہوچکی تھی لیکن ناظمین اسے فضول خرچی سے تعبیر کرتے تھے۔

اس نے فورٹ ولیم کالج تعمیر کیا تھا تاکہ نئے آنے والے انگریزوں کی تعلیم کا بندوبست ہو۔ اس کی بھی مخالفت کی گئی اور اسے بند کرنے کے احکام آگئے۔

ایسے الزامات کو خاص طور پر اچھالا گیا جو ویلزلی نے مجلس سے خط کتابت کیے بغیر اپنی مرضی کے کام انجام دیے تھے خواہ وہ انگریزی قوم کے لیے کتنے ہی سودمند ہوں۔ ان میں فوجی افسروں کا تقرر بھی، ان کی تنخواہیں اور وظیفے بھی تھے۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے حکومت انگلستان کی منظوری حاصل کیے بغیر بعض بڑے بڑے معاملات میں خود ہاتھ ڈالا۔ خلافِ قانون اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے۔ تقررات اور قانون سے گریز۔

اس نے اپنا دفاع کرنا غیر ضروری سمجھا اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی جگہ کارن والس کا دوبارہ تقرر کیا گیا۔

کارن والس 30 جولائی 1905ء کو کلکتہ پہنچ گیا اور 15 اگست کو ویلزلی انگلستان روانہ ہوگیا۔ کلکتہ کی انگریزی آبادی نے اسے الوداع کہتے ہوئے اس کی خدمت میں شاندار ایڈریس پیش کیا۔

گزشتہ سات سال کے واقعات نے آپ کے زمانۂ حکومت کو یورپین طاقت کی تاریخ ہند میں اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے نہایت ممتاز کردیا ہے۔ زمانے اور ملک کی ضروریات کو جہاں آپ کام کرنے کے لیے بلائے گئے تھے آپ کی بالغ نظری نے جس طرح جانچا کام کے مواقع کو جس عجلت اور عزم کے ساتھ اپنے قبضے میں کیا۔ ہماری اصل قوت کا صحیح اندازہ اس کا استادانہ استعمال جس خوبی سے آپ نے کیا، ان چیزوں کے ساتھ ہماری فوج کا جوش و خروش اس کی تربیت اور اس کی ہمت نے مل ملا کر ان سلسلۂ واقعات کا ہمارے حق میں جو فیصلہ کیا اور اس مملکت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانوی اقلیم اور برطانوی نام کا ڈنکا جس شان و شوکت سے بجا دیا حق تو یہ ہے وہ سب آپ ہی کا خاصہ ہے۔

☆......☆

یورپ کے لوگوں کو ہندوستانی مسائل سے متعلق بہت ناقص معلومات حاصل تھیں۔ مرہٹوں سے جنگ کے متعلق انگلستان میں سکوت طاری تھا اور عہد نامہ اودھ کے متعلق غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ تمام معلومات اس کے بھائی آرتھر ویلزلی نے اسے فراہم کردی تھیں۔ ویلزلی اس خوش فہمی میں تھا کہ انگلستان پہنچتے ہی اس کی شہرت کے شایانِ شان اس کا استقبال کیا جائے گا اور اس کے وہاں پہنچتے ہی نقشہ بدل جائے گا۔ غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی اور اسے فتح ہوگی۔

پورٹ اسمتھ پر اترتے ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ گنتی کے چند دوست تھے جو اس کے استقبال کے لیے آئے تھے اسے غصہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی لیکن اس نے اپنی دونوں کیفیات پر قابو پالیا۔ مشرق میں جو اس نے شان و شوکت کی زندگی گزاری تھی یہ استقبال اس کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔

لندن پہنچتے ہی اسے اپنے دوست وزیراعظم ''ولیم پٹ'' کی یاد آئی جو نہ صرف بیمار تھا بلکہ موت کے بہت قریب تھا۔ وہ اس سے ملنے گیا۔ پٹ اسے دیکھ کر بہت مسرور نظر آتا تھا لیکن ویلزلی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ موت اپنا کام کررہی ہے۔ دو بڑے مدبروں کی یہ غم ناک

ملاقات تھی۔ ایک وسیع اقلیم پیدا کر کے اور اس پر حکومت کر کے واپس آیا تھا اور متمنی تھا کہ اپنے ملک کی رہبری کرے، دوسرے کے ہاتھ سے سلطنت کی باگ ڈور کھسکی چلی جارہی تھی۔

ویلزلی اپنا استقبال دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ حالات اس کے حق میں نہیں۔ اس کی زندگی کے کارناموں کی جانچ پڑتال اور تفتیش کی جانے والی ہے۔ اسے اُمید تھی کہ اسے پٹ کی حمایت حاصل ہوگی لیکن اسے اس حال میں دیکھ کر اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ پھر بھی اسے اُمید تھی کہ پٹ بہت جلد تندرست ہوجائے گا اور پٹ کی حمایت اسے حاصل ہو جائے گی۔ اس کے پوشیدہ دشمن بھی شاید پٹ کی موجودگی میں اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

دشمنوں کو یہ موقع جلد ہی مل گیا۔ پٹ کی وفات ہو گئی اور وہ ایک زبردست حامی سے محروم ہوگیا۔ بجائے اس کے کہ حکومت میں کوئی عہدہ اس کی نذر کیا جاتا اسے دارالعوام میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات پر گفتگو کرنی پڑی۔ اس کا ایک دشمن اس کی تاک میں تھا۔ اس کا نام پال تھا۔ جب ویلزلی گورنر جنرل تھا یہ شخص لکھنو میں تجارت کرتا تھا۔ جب ویلزلی نے انگریزوں کو وہاں سے نکالنا شروع کیا تھا تو یہ شخص بھی نکالا گیا تھا۔ وہ انگلستان آگیا تھا اور اتنی دولت جمع کرلی تھی کہ یہاں پہنچتے ہی اس نے پارلیمنٹ میں ایک نشست خرید لی۔ جب ویلزلی بھی انگلستان پہنچ گیا تو پال کے دل میں چھپی ہوئی نفرت باہر آگئی۔ اس نے چند اراکین کو اپنے ساتھ ملا کر کوشش کی کہ گورنر جنرل کو نشانہ ملامت بنا کر شہرت حاصل کرے۔ اس نے تحریک پیش کی کہ اودھ کے متعلق کاغذات پیش کیے جائیں۔ اس نے ویلزلی کی بداعمالیوں کی فہرست پیش کی اور ان پر بحث کی درخواست کی۔ اس کے ساتھ کئی لارڈ اور پرنس ملے ہوئے تھے لہٰذا یہ تحریک منظور کرلی گئی اور بحث شروع ہو گئی۔ کئی مہینوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ویلزلی کو بار بار اپنی صفائی میں تقریریں کرنی پڑیں۔ وہ ایک بہترین مقرر تھا۔ جب بولتا سننے والوں کو اپنے حق میں کرلیتا لیکن اس کے مخالف بھی کم نہیں تھے اور ایک نہیں کئی تھے لہٰذا یہ سلسلہ عرصے تک چلتا رہا۔ اس دوران اسے حکومتی عہدے پیش کیے گئے لیکن وہ چاہتا تھا پہلے الزامات کی صفائی ہوجائے اس کے بعد وہ کوئی عہدہ قبول کرے۔

وہ ان دنوں بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ اس پریشانی نے اس کی خانگی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ اس کی بیوی کے دل میں یہ بات بری طرح بیٹھ گئی تھی کہ ویلزلی اس سے محبت نہیں کرتا۔ اسی لیے اس نے اسے ہندوستان نہیں بلایا۔ اس نفرت کو بڑھانے میں ویلزلی کی سخت مزاجی نے بھی بڑا کردار ادا کیا جو پریشانی کے اس زمانے میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ویلزلی کو یہ شک بھی رہتا تھا کہ کہیں مخالفین اس کی اس زندگی کو نشانہ نہ بنائیں جو اس نے اپنی بیوی سے شادی سے پہلے گزاری تھی۔ وہ خود میں اتنی اخلاقی قوت نہیں پاتا تھا کہ شادی سے پہلے کی زندگی کا دفاع کرسکے۔ اس کے تینوں بچے شادی سے پہلے ہی ہوچکے تھے۔ وہ کسی کو کیا جواب دیتا۔ ایسے میں اس کی بیوی کا رویہ بھی مناسب نہیں رہا تھا۔ وہ بات بات پر اس سے الجھ جاتی تھی۔ پارلیمنٹ میں جو کچھ ہورہا تھا اس سے ناواقف نہیں تھی اور جب غصے میں ہوتی تو اسے طعنے دینے بیٹھ جاتی۔ ”تم اگر ایسے نہ ہوتے تو پارلیمنٹ میں الزام نہ لگتے۔“

”کیا مطلب۔ کیسے نہ ہوتے؟“

”ہندوستان میں رہ کر جو عیاشی کی ہے۔ اب اس کا جواب دینا پڑ رہا ہے۔ مجھے جھٹلا دو گے سب کو کیسے جھٹلاؤ گے۔“

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں نے ہندوستان میں عیاشی کی ہے؟“

”اگر عیاشی کرلی نہ ہوتی تو مجھے ہندوستان بلا لیا ہوتا۔ میں تو وہاں تھی نہیں مجھے کیا معلوم وہاں کیا کرتے رہے۔“

”مجھ پر کسی نے عیاشی کا الزام نہیں لگایا۔“

”خورد برد کا الزام تو لگا ہے۔ عیاشی کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تم نے کمائی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میری بیوی ہو کر تم مجھ پر ایسا گھٹیا الزام لگا رہی ہو۔“

”مجھے بھی افسوس ہے کہ یہ الزام لگانا پڑ رہا ہے۔“

”کلکتہ کے لوگ آج بھی مجھے یاد کرتے ہیں۔ میرا مجسمہ اب بھی وہاں نصب ہے۔ میں نے اپنے ہم وطنوں کو ایک نئی سرزمین تلاش کر کے دی ہے جہاں وہ کل حکومت کریں گے اور تمہاری نظروں میں میری یہ وقعت ہے۔“

”جو کچھ تم نے کیا اس کا مجھے کیا فائدہ پہنچا۔ میں تو یہ

جانتی ہوں کہ میری قوم کی تم نے بیخ کنی کی۔"

"یہ تم نہیں تمہارا تعصب بول رہا ہے۔ تم فرانسیسی ہو اسی لیے یہ طعنہ مجھے دے رہی ہو۔"

"جس وقت تم نے مجھ سے دوستی کی تھی اس وقت بھی میں فرانسیسی تھی۔ اس وقت تو تم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں تعصب کر رہی ہوں۔"

"میں نے تم سے صرف دوستی نہیں کی تم سے شادی بھی کی۔"

"صرف دنیا کا منہ بند کرنے کے لیے کیونکہ تم مجھے اپنی عیاشی کا شکار بنا چکے تھے۔ اگر دل سے شادی کرتے تو مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتے۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں ہندوستان نہیں لے جا سکتا۔"

"اس لیے نا کہ میں تمہارے گناہوں کی گواہ نہ بن جاؤں، گورنر جنرل صاحب!"

ایسے جھگڑے اب روز ہونے لگے تھے جو ہمیشہ بے نتیجہ ثابت ہوتے تھے۔ سیاسی جھگڑے کیا کم تھے کہ بیوی نے بھی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس نے تنگ آ کر اس رشتے کو خیر باد کہہ دیا اور علیحدگی اختیار کر لی۔

اس فرانسیسی دوشیزہ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد وہ یکسو ہو کر سیاسی مخالفین سے الجھ پڑا۔ اثر رسوخ اس کا بھی کم نہیں تھا اور پھر وہ خود بلا کا چرب زبان اور ذہین تھا۔ ہندوستان میں رہ کر جو خدمات اس نے انگریز قوم کے لیے انجام دی تھیں ان سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک ایک کر کے تمام الزامات رفع ہو گئے اور دارالشوریٰ میں ایک ریزولیشن کثرت رائے سے اس امر کا پاس ہو گیا کہ "ہندوستان میں اس کی پالیسی قابل تحسین رہی تھی۔"

الزام کے صاف ہوتے ہی اس نے اس سرکاری عہدے کو قبول کر لیا جو وزارت خارجہ میں اسے ملا تھا۔ اس نے خود بھی یہی چاہا تھا کہ اپنی خدمات امور خارجہ کے سپرد کرے گا لہٰذا جیسے ہی پارلیمنٹ میں اس کی بے گناہی کا رزولیشن پاس ہوا اس نے عہدہ سنبھال لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حکومت انگلشیہ نے ڈنمارک کے بیڑے کو بے رحمی اور سنگدلی سے گرفتار کر لیا تھا اور اب دارالامراء میں اس کارروائی پر اراکین کی رائے لی جا رہی تھی۔ ویلزلی نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے حکومت کے اس طرز عمل کی مدافعت کی اور اسے مردانگی سے تعبیر کیا اور بتایا کہ اس اقدام نے مملکت کو بڑی خونریزی سے بچا لیا اور نپولین کی کامیابیوں پر پہرہ بٹھا دیا۔ اس وقت تمام یورپ نپولین کے قدموں پر سر رکھے ہوئے تھا اور ویلزلی یہ کہہ رہا تھا۔

"ڈنمارک کے بیڑے کی گرفتاری ایک نادر روزگار کارنامہ ہے جس نے نپولین کے منصوبوں میں سے ایک منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ ہمیں ہسپانوی جنگ میں قطعی مداخلت کرنی چاہیے۔"

اس تقریر کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے طے کیا گیا کہ ہسپانیہ میں عملی کارروائی کی ضرورت ہے۔

اس فیصلے کا ہیرو وہ خود اور اس کا بھائی آرتھر ویلزلی ٹھہرے۔ آرتھر کو تو سپہ سالار افواج کر کے جزیرہ نما ہسپانیہ بھیج دیا گیا اور وہ خود شاہ ہسپانیہ کے دربار میں سفیر مقرر کر کے بھیجا گیا۔

انگلستان میں تیز ور اصلاح کاروں کی ضرورت تھی تاکہ جوش و خروش پیدا کر کے نپولین کی مدافعت کی تائید کریں۔ موجودہ وزیر خارجہ اس کا اہل ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ طے یہ ہوا کہ ویلزلی کو وزیر خارجہ مقرر کیا جائے۔ اسے باکمال عجلت طلب کیا گیا اور اس نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے حلف اٹھا لیا۔

لندن کی مجلس عام میں فوج کو واپس بلانے کے متعلق عرضداشت پیش کی گئی۔ ویلزلی تنہا اس مہم کا حامی تھا۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتا تھا کہ فوج واپس بلائی جائے۔

اس نے ہاؤس آف لارڈز میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "ہسپانیہ کی قسمت کے ساتھ انگلستان کی قسمت وابستہ ہے تو کیا ہمیں آخری دم تک اس کا ساتھ نہ دینا چاہیے؟ اگر حضرات آپ مجھ سے پوچھیں تو تاج کے مشیر کی حیثیت سے اپنے بادشاہ کی خدمت میں برابر یہی عرض کروں گا کہ اسپین کی اس کے وجود کے آخری لمحوں تک مدد جاری رکھی جائے۔"

اسے عوام الناس کے غضب کا بھی سامنا کرنا پڑا جو اس جنگ کے خلاف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہی اس جنگ کا سب سے بڑا حامی ہے لہٰذا اس کے گھر پر حملہ ہوا، کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے گئے۔

مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے استقلال نے کئی اور لوگوں کو بھی اس کے ساتھ ملا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے

بھائی آرتھر کی فوج کو بڑے پیمانے پر سامان خورونوش پہنچا دیا گیا جس کا وہ مطالبہ کرتا رہا تھا۔

نپولین نے اسپین اور پرتگال کو ملا کر اپنے بھائی جوزف کو بادشاہ بنا دیا۔ اس پر اسپین میں بغاوت ہو گئی۔ آرتھر ویلزلی نے پرتگال میں اپنی فوج اتار کر فرانسیسی فوج کو وہاں سے نکال دیا۔ اس شکست نے جرمنی اور آسٹریا میں نپولین کی مخالفت کو پہلے سے تیز کر دیا۔ ان حالات میں فرانس کے لیے لال قلعہ کی دیواروں پر اپنا جھنڈا لہرانا ناممکن تھا۔

اس فتح نے آرتھر ویلزلی کی توقیر کو عوام الناس کی نگاہ میں بہت بڑھا دیا۔ ویلزلی یہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس کی قوت فیصلہ جو اتنے عرصے تک مرکز بحث بنی رہی آخر سچی ثابت ہوئی۔

عوام کی رائے بھی یکسر تبدیل ہو گئی۔ دو سال پہلے یہی لوگ تھے جنہوں نے اس کے مکان کی کھڑکیاں توڑی تھیں اور وہی لوگ تھے جو اس کی گاڑی کو سینٹ پال کے گرجا گھسیٹ کے لے گئے اور پھر نعرۂ تحسین و آفرین کے ساتھ اس کے گھر واپس پہنچا گئے۔

اس کے بعد اس نے چند سال تک سیاسیات میں بہت کم حصہ لیا یہاں تک کہ اسے آئرلینڈ کے لارڈ لیفٹیننٹ کا عہدہ پیش کیا گیا جو اس نے قبول کر لیا حالانکہ اس وقت اس عہدے پر ہاتھ ڈالنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ ملک کی حالت ابتر تھی ہر طرف دنگا فساد برپا تھا۔ انتظام و انصرام درہم برہم تھا۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی لیکن اس کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ جب وہ آئرلینڈ میں داخل ہوا تو اس کے استقبال کا منظر دیدنی تھا۔ تمام فریقوں نے یک زبان ہو کر اسے خوش آمدید کہا۔ اس نے بھی ان سے چند وعدے کیے۔

''میں نے اپنے ملک کے مختلف عہدوں پر دور دراز ملکوں میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔ جہاں کہیں بھی قسمت نے مجھے پہنچایا ہے میں اپنے ملک یا خاندان کے لیے ننگ نہیں ثابت ہوا ہوں۔ اب اگر یہ تائید ایزدی اور یہ نوازش بادشاہ، میں نے آئرلینڈ میں امن و امان بحال کر دیا تو میری طویل خدمات مسرت، عزت اور حقیقی ناموری کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔''

آئرلینڈ پہنچنے کے بعد جب اس نے کام کا آغاز کیا تو پہلے مرحلے ہی میں اسے اندازہ ہو گیا کہ آئرلینڈ پر بغیر جبر و تشدد حکومت ناممکن ہے۔ اس نے وزارت داخلہ کو رپورٹ بھیجی۔

''مزید فوجی طاقت یا پولیس میں زیادتی و ترقی قانون بغاوت کی مدد کے بغیر کارگر ثابت نہ ہو گی اس مدد کے ساتھ مجھے یہ توقع قرین عقل معلوم ہوتی ہے کہ پھر امن و سکون نہ صرف بحال بلکہ تمام آئرلینڈ میں مستقل طور پر جاری و ساری ہو جائے گا۔''

اس کی سفارش پر قانون بغاوت منظور ہو گیا۔

اس قانون پر عمل کر کے وہ صرف ایک سال میں یہ رپورٹ دینے کے قابل ہو گیا کہ جرائم میں بہت تخفیف ہو گئی ہے۔

اس نے قانون بغاوت کی ایک سال کے لیے تجدید اور آئرلینڈ کے ججوں اور پولیس کی اصلاح کی پُر زور درخواست کی۔ فاقہ زدہ کاشت کاروں کے لیے امدادی راس المال قائم کیا۔ خود بہت بڑا چندہ دیا۔

اس کی یہ کوششیں اس وقت بے سود ہوگئیں جب رومن کیتھولک اور آئرلینڈ کے کلیسا کے پیرو کے درمیان ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ کئی روز تک آپس میں اور شاہی فوج سے لڑتے رہے۔ یہ ہنگامہ اتنا زبردست تھا کہ صرف فوج ہی اس پر قابو پا سکی وہ چونکہ کیتھولک فرقہ کے حق میں تھا اس لیے دوسرا فرقہ اس کی جان کا دشمن ہو گیا۔

وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تھیٹر رائل میں تماشا دیکھنے گیا۔ جب رواج کے مطابق ''خدا بادشاہ کو سلامت رکھے'' کا نعرہ بلند ہوا۔ وہ تعظیماً اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ بس اسی وقت اس کے کسی دشمن کا وار چل گیا۔ اس کے سر کا نشانہ لے کر کسی نے بوتل اس کی طرف اچھالی لیکن اس کے پستہ قد ہونے نے اسے بچا لیا۔ نشانہ چوک گیا اور وہ بچ گیا۔ وہ بچ ضرور گیا لیکن اس کا غصہ آسمان پر پہنچ گیا۔ اس نے پولیس کو حکم دیا اور بہت سے تماشائیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ لوگ حکومت کے خلاف سازش کر رہے تھے۔

ان لوگوں کا مقدمہ جب جیوری کے سامنے گیا تو گرینڈ جیوری نے بوتل توڑنے کے واقعے کو محض مذاق قرار دیا اور آئرلینڈ کے متعلق قانون بغاوت کو مسترد کر دیا۔ دارالعوام میں استغاثے کے خلاف ملامت کی تحریک پیش کی گئی۔

اس پر اور بھی کئی مصیبت ٹوٹتی لیکن ہوا یہ کہ حکومت

تبدیل ہوگئی اور اس کے دوست کیننگ کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اب وہ محفوظ تھا۔ نہ صرف محفوظ ہوگیا بلکہ نائب السلطنت بنادیا گیا۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان رسہ کشی اب بھی جاری تھی۔

یہ عرصہ بھی چار پانچ سال گزار کر ختم ہوا اور اس کا بھائی فرقہ پروٹسٹنٹ کی کامل فوقیت مان کر وزیراعظم کے عہدے پر براجمان ہوگیا۔

کیتھولک ویلزلی کے لیے یہ مکمل شکست تھی۔ پھر بھی وہ خاموش رہا کہ معاملہ ''بھائی'' کا تھا۔

توقع یہ کی جارہی تھی کہ تبدیلی وزارت کے موقع پر بڑے بھائی کو کوئی نہ کوئی بڑا عہدہ ضرور مل جائے گا لیکن جب ترتیب ارکان حکومت کا وقت آیا تو آرتھر نے بڑے بھائی (ویلزلی) کو نظرانداز کردیا۔

اس رویے کا اسے سخت افسوس ہوا۔ آرتھر اس کا وہ بھائی تھا جس کو اس نے ہندوستان میں ایسے ایسے مواقع دیے جن پر اس نے اپنی عظمت کے مینار تعمیر کیے۔ ایسی ناموری حاصل کی جس کی بنیاد پر اسے وزیراعظم بنا دیا گیا اور اس نے ویلزلی کو اپنی حکومت میں شامل تک نہیں کیا۔

ویلزلی نے اپنی سابقہ خدمات سے استعفیٰ دے دیا اور کھلے عام آرتھر کی مخالفت شروع کردی۔

دونوں بھائیوں کے درمیان یہ تنازع نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ حکومت ''لارڈ گرے'' کے ہاتھ میں آگئی اور ویلزلی شاہی محل کا میر سامان (لارڈ اسٹیورڈ) بنا دیا گیا اور پھر آئرلینڈ کا لارڈ لیفٹیننٹ بنا دیا گیا۔ گویا سابقہ عہدہ پھر بحال ہوگیا۔

اس کی عمر بڑھتی جارہی تھی۔ وہ پچھتر سال کا ہوگیا تھا کہ اسے غالباً بوڑھا سمجھ کر حاجب (لارڈ چیمبرلین) بنادیا گیا۔ اس نے اپنی قابلیت اور اعلیٰ شہرت کے باعث اس عہدے کو اپنی ذلت تصور کیا۔ وہ آئرلینڈ کی خدمت کے لیے میدان میں اترا تھا مگر اس سے یہ خدمت نہیں لی جارہی تھی۔ وہ مایوس ہوگیا اور رفتہ رفتہ عوامی زندگی سے دور ہونے لگا۔ دارالامرا میں جاتا ضرور تھا لیکن اس کے بعد اس نے کبھی تقریر نہیں کی۔ دربار شاہی میں جاتا تو بھی ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ غالباً وہ دن یاد کرتا رہتا تھا جب وہ ہندوستان میں تھا۔

اس روز وہ دربار شاہی سے واپس آیا تو کچھ زیادہ ہی اداس تھا۔ وہاں کوئی بات ایسی ضرور ہوئی تھی جس نے اسے رنجیدہ کردیا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ ایسے مواقع پر وہ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنا یہی فرض پورا کررہی تھی۔

ویلزلی نے پہلی بیوی سے علیحدگی کے بعد ایک امریکن عورت سے شادی کرلی تھی۔ یہ شادی نہایت کامیاب تھی۔ دونوں شادی کے بعد بہت خوش تھے۔

''کیا بات ہے آج آپ کی ظرافت کو کس کی نظر لگ گئی۔'' بیوی نے شوخی سے پوچھا۔

''اب شاید دنیا کو میری ضرورت نہیں رہی۔ کوئی مجھ سے کسی معاملے میں مشورہ تک نہیں کرتا۔''

''آپ کو اس کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔''

''مجھے نہیں میرے آئرلینڈ کو فکر ہے۔ میں اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ آپ کی نہیں ان لوگوں کی بدنصیبی ہے جو آپ سے کام نہیں لینا چاہتے لیکن آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو آپ کے ساتھ ہوں۔''

''یہ تم ہی تو ہو، تمہاری ہی خاطر میں کبھی کبھی ہنس لیتا ہوں۔ یا میری بیٹی ہے جو کبھی کبھی مجھ سے ملنے آجاتی ہے۔''

''اور وہ نظمیں نہیں ہیں جو شادی کے ابتدائی دنوں میں آپ مجھے سناتے تھے۔''

''وہ تو اب میرے ماضی کی طرح کہیں دفن ہوگئی ہیں۔''

''کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ اپنا شاندار ماضی دنیا کو دکھایا جائے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ آپ اپنی نظموں کو یکجا کرکے شائع کردیں۔ یہ بھی تو آپ کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔''

ویلزلی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ قائل ہوجاتا تھا بحث سے ہاتھ اٹھالیتا تھا البتہ یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ وہ مغلوب ہوگیا ہے۔

اس وقت بھی وہ خاموشی سے اٹھ کر مطالعہ گاہ میں چلا گیا تھا۔ چند روز نہیں گزرے تھے کہ اس کی بیوی نے اسے پرانے کاغذات کو الٹتے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی نگارشات کو جمع کررہا ہے بعد میں اس کی بیوی بھی اس کام میں اس کے ساتھ شامل ہوگئی۔

اس نے نہایت جانفشانی سے اپنی لاطینی اور انگریزی نظموں کو یکجا کرکے شائع کرا دیا۔ شوخی و رنگینی میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار ان لوگوں کے لیے حیران کن تھے جو یہ بھول چکے تھے کہ وہ شاعر بھی ہے یا نئے زمانے کے وہ انگریز جو یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ شاعر ہے۔

اس کا مجموعہ کلام ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا۔ یہ عام لوگوں کے لیے اس کی زندگی کا بالکل نیا پہلو تھا جسے سراہا گیا۔ اس کی اس کتاب نے دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ دیا کہ وہ اس کی کوئی اور کتاب بھی چھاپیں، اس سے ان کا مقصد یقیناً پیسا کمانا ہوگا لیکن اس کا فائدہ خود ویلزلی کو بھی پہنچ گیا۔

ایک صاحب مسٹر منٹگمری مارٹن نے اس سے درخواست کی وہ اسے اس کی ہندوستانی مراسلات شائع کرنے کی اجازت دے دیں۔ اس نے انہیں وہ تمام مراسلات فراہم کردیے جو اس نے گورنر جنرل کے زمانے میں مختلف مواقع پر حکومت برطانیہ کو لکھے تھے۔

اس کے یہ مراسلات شائع ہوئے تو بہت سے لوگوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس نے ہندوستان میں انگلستان کی سلطنت قائم کرنے میں کس قدر کوششیں کی تھیں۔

ان مراسلات کی مقبولیت اس قدر ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ناظموں کے لیے لازم ہوگیا کہ تلافی مافات کریں۔ دوسرے لفظوں میں ارباب بست وکشاد نے اس کی خدمات کا اعتراف کرلیا۔ اس کی مراسلات کے متعدد نسخے ہندوستان میں تقسیم کرنے کے لیے خریدے اور اس کے نام لکھے گئے خطوط میں اس کے کارناموں کو سراہا۔

ناظموں نے تحسین و آفرین پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جب انہوں نے سنا کو ویلزلی کی مالی حالت اچھی نہیں ہے تو ان کی مجلس نے بیس ہزار پاؤنڈ اس کی نذر کیے۔

اس کی زندگی کا آخری سال تھا کہ مجلس نے فیصلہ کیا کہ انڈیا ہاؤس میں اس کا بت (مجسمہ) نصب کیا جائے جو کمپنی کی شکر گزاری اور ستائش کی مستقل، نمایاں اور پبلک یادگار ہو۔

جس وقت یہ کوششیں کی جارہی تھیں اس وقت ہندوستان کا گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ تھا۔ اس نے اپنے عہد کے ابتدائی دنوں میں تعلیم اور آب پاشی کے امور کی طرف بہت توجہ دی۔ اس نے اودھ کے معاملات میں دخل دیا۔ ستارہ کے راجا کو گدی سے اتارا اور کرنول پر قبضہ کیا۔

یہ وہی پالیسیاں تھیں جو ویلزلی نے رائج کی تھیں اور اب وہ آکلینڈ کے دور حکومت میں جوان ہو چکی تھیں۔ کمپنی بھی اب ان پالیسیوں کی قائل ہو چکی تھی اور ویلزلی کو خراج تحسین پیش کررہی تھی۔ ویلزلی اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ دیر سے سہی لیکن اس کی زندگی ہی میں اس کے کارناموں کو سراہا گیا۔ اس نے ناظموں کے نام خط میں اپنی خوشی کا اظہار یوں کیا۔

''آپ کا عنایت نامہ پڑھ کر سب سے پہلا جذبہ جو میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ میں نے خدا کی درگاہ میں اس امر کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میری عمر کو انسانی فطرت کے معمولی حدود سے زیادہ دراز کیا تاکہ میں ایسے اعزاز و اکرام کو اپنے ہاتھوں سے لوں جس کی تاریخ میں اگر کوئی نظیر ہے تو شاذ و نادر ہی ہے۔ کاش کہ یہ میری یادگار جس کے ذریعے آپ میری خدمات کو سربلند اور ممتاز کررہے ہیں، آپ کے خیال کو اس معدن کی طرف مبذول کرے جہاں سے خدمات کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کاش یہ یادگار خیر خواہی کے اصول اور امن عامہ کے قواعد آپ کے دل میں راسخ کردے۔''

یہ بحث اب بھی کی جاسکتی ہے کہ کیا اس نے اپنے دور اقتدار میں ہندوستانیوں کے لیے ان اصول پر عمل کیا تھا؟

ویلزلی 26 ستمبر 1842ء کو 82 سال کی عمر میں انتقال کرگیا۔ وصیت کے مطابق اسے ایٹن میں دفن کیا گیا جہاں وہ اسکول واقع تھا جہاں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

اس کا بھائی آرتھر ویلزلی جس سے وہ آخری چند برسوں میں ناراض رہا تھا اس کے جنازے کے ساتھ سر جھکائے چل رہا تھا۔

وہ جری سپاہی (آرتھر ویلزلی) اپنے آنسوؤں کی زبانی اعتراف کررہا تھا۔

''زندگی میں مجھے جتنے اعزاز نصیب ہوئے ان موقعوں پر میں نے کبھی یہ عزت فراموش نہیں کی کہ میں لارڈ ویلزلی کا بھائی ہوں۔''

ماخذات

مارکوئیس ویلزلی

مترجم: ابن حسن

کمپنی کی حکومت، باری علیگ

مریم کے خان

اس نے اپنے وطنِ عزیز کی حرمت پامال ہوتے دیکھی تو سینہ سپر ہو گیا لیکن بزور بازو کچھ کرنے سے گریزاں رہ کر دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ٹھانی، اس لیے کہ احوالِ وطن عجیب رخ پر تھے، حوادث کی طوفانی موجیں ملک کی معیشت تو توڑ مروڑ گئی تھیں اور اس میں ہاتھ ملک فروشوں کا تھا، وہ اس ملک کو دیمک کی طرح چاٹ گئے تھے۔ ایسے نازک وقت میں اس نے ملک سنوارنے کا بیڑا اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ملک کی معیشت کو اوج پر پہنچانے پر کامیاب ہو گیا۔ ایک مسلمان ملک کا اس طرح ترقی کی سیڑھیاں طے کرنا یورپ کو کب گوارا ہے لیکن اس نے ان کی چالوں کو بھی ناکام کیا۔

اپنے ملک وملت کا نام اونچا کرنے والے رہنما کا تذکرہ خاص

تیسری دنیا کے اکثر ممالک جنہوں نے گزشتہ پچاس سالوں میں ترقی کی اور آج ان کا شمار ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے اگر ان کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو ایک چیز سب میں مشترک نظر آئے گی کہ انہیں ایک ایسا لیڈر ملا جس نے خلوص نیت، عقلمندی اور محنت سے دن رات کام کر کے اپنی قوم کی تقدیر بدل دی۔ انہوں نے اپنی قوم کو جہالت، غربت اور پسماندگی سے نکالا اور انہیں ترقی کی بلندیوں پر لے گئے۔ عجیب بات ہے کہ ایسے رہنماؤں اور ملکوں کی

اکثریت کا تعلق مشرقِ بعید سے ہے۔ ان میں جنوبی کوریا، سنگاپور اور ملائیشیا شامل ہیں۔ جاپان کا نام یوں نہیں لیا جا سکتا کہ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے بھی جاپان نہایت ترقی یافتہ ملک تھا اور اس کے پاس اعلیٰ تعلیم یافتہ ہنر مند افرادی قوت کی کمی نہیں تھی اس لیے اسے تو ترقی کی منازل طے کرنی تھیں۔

مگر مذکورہ تین ممالک دوسری جنگِ عظیم کی تباہی سے نکلے تو انہوں نے خود کو غربت، جہالت اور بھوک و بیماریوں میں گھرے پایا تھا۔ جنوبی کوریا نے تو جاپانیوں سے آزاد ہونے کے بعد پھر ایک جنگ بھگتی۔ امریکا اور سوویت یونین نے اپنی پہلی پنجہ آزمائی کے لیے ایشیا کی سرزمین چنی۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کا متحدہ کوریا دو حصوں میں بٹ کر شمالی اور جنوبی کوریا بن گیا اور یہ تقسیم آج بھی برقرار ہے۔ جنوبی کوریا جنگ کے بعد بتدریج ترقی کرتا رہا۔ ملک میں سیاسی استحکام نہیں تھا اور مسلسل جمہوری اور آمرانہ حکومتوں کی تبدیلی نے اس کی ترقی کی شرح کو بڑی طرح متاثر کیا تھا۔ 1960 کی دہائی میں اسے سابق میجر جنرل پارک چینگ ہی جیسا حکمران ملا۔ جس نے حکومت تو آمرانہ کی مگر اپنے ملک اور قوم کے مفاد میں اور اس نے جنوبی کوریا کو ایک عشرے میں ترقی پذیر سے ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ تقریباً ایسا ہی لی کوان نے سنگاپور میں کیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے ایک عشرے بعد جب برطانیہ نے سنگاپور کو داخلی خود مختاری دی تو یہاں سوائے ایک چھوٹے سے شہر اور چند دلدلی گاؤں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اپنے چھوٹے رقبے اور زندگی کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے سنگاپور نے ملائیشیا کی فیڈریشن سے اتحاد کر لیا مگر جلد ہی فیڈریشن نے اسے بیکار سمجھتے ہوئے الگ کر دیا اور تب لی کوان کی قیادت میں سنگاپور نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ٹھانی اور ایک ایسا کارنامہ کر دکھایا جس کی مثال جدید تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک ملک جس کا کل رقبہ پانچ سو مربع میل بھی نہیں ہے اور جس کے پاس نہ تو پانی ہے اور نہ ہی کاشت کے لیے زمین، جو چاروں طرف سے بڑے ملکوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس ملک کو صرف ایک خصوصیت حاصل ہے کہ یہ دنیا کی سب سے اہم بحری گزر گاہ پر واقع ہے اور دنیا کا چالیس فیصد بحری ٹریفک سنگاپور کی آبنائے ملاکا سے ہو کر گزرتا ہے۔ لی کوان نے صرف اسی ایک خصوصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سنگاپور کو نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک بنا دیا۔ یہاں کے باشندے فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا میں تیسرے نمبر پر ہیں۔

تیسرا ملک ملائیشیا ہے۔ انڈونیشیا کے ساتھ واقع یہ ملک جزیروں پر مشتمل ہے اور اس کی سرحدیں انڈونیشیا کے ساتھ تھائی لینڈ، سنگاپور اور برونائی سے ملتی ہیں۔ ملائیشیا کا ایک حصہ انڈونیشیا کے جزیرے جاوا پر ہے اور دوسرا حصہ ایشیا مین لینڈ کے دم نما حصے پر ہے جو برما اور تھائی لینڈ سے ہوتا ہوا ملائیشیا تک آتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ہزار چھوٹے بڑے جزائر ہیں جو ملائیشیا میں شامل ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اس سارے علاقے پر برٹش راج تھا۔ تاریخی لحاظ سے ملائیشیا الگ سے کوئی ملک نہیں تھا بلکہ انڈونیشیا، فلپائن اور پاپوانیوگنی کے ساتھ ایک ہی خطہ تھا۔ یہاں ایک جیسی نسل کے، ملتی جلتی زبانیں بولنے والے لوگ آباد تھے۔ نسلاً تقریباً سب ہان یعنی چینی نسل سے ہیں۔ بعد میں مذہبی تفریق سے الگ الگ شناخت کیے جانے لگے۔ جیسے مسلم، بدھسٹ اور ہندو وغیرہ۔ مسلمان اکثریت میں تھے مگر پسماندہ اور دورِ جدید سے نابلد تھے۔ اس لیے یورپی اقوام یہاں قابض ہو گئیں۔ پہلے پرتگیز آئے ان کے ساتھ ساتھ ڈچ اور آخر میں انگریز چلے آئے۔ انگریزوں نے اس علاقے کو اپنی روایتی۔۔ سیاست سے مختلف ملکوں اور اقوام میں تقسیم کر دیا۔

1959 میں ملائیشیا فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں ملائیشیا کے علاوہ، سنگاپور، برونائی اور سراوک کی ریاستیں شامل تھیں۔ مگر ایک ایک کر کے یہ ساری ریاستیں ملائیشیا سے الگ ہو گئیں یا ملائیشیا نے انہیں الگ کر دیا اور 1965 میں موجودہ ملائیشیا وجود میں آیا۔ سیاسی لحاظ سے یہ وقت ملائیشیا کے لیے نازک تھا۔ پرانے سیاست دان اور نئے سیاست دانوں میں کشمکش جاری تھی۔ اسی کشمکش کے دوران ایک سیاست دان نے نہ صرف سیاسی پارٹیوں بلکہ عوام کی توجہ بھی حاصل کی تھی۔ وہ بہت بے باک، ذہین اور لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے کا عادی تھا۔ اختلاف کرتے ہوئے وہ آگے موجود شخص کو نہیں دیکھتا تھا۔ اگر اسے کوئی بات غلط محسوس ہوتی تو وہ برملا اس کا اظہار کرتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ سیاست کے آداب کے منافی ہے جس میں دل کی بات ہمیشہ دل میں رکھی جاتی ہے اور جھوٹ کو سچ کی طرح بولنے کو سیاست سمجھا جاتا ہے۔ اسے اپنی روش کا نقصان بھی ہوا مگر اس نے اپنی روش نہیں چھوڑی تھی۔ وہ

جانتا تھا کہ دوسروں کے آگے جھک جانے والے کبھی لیڈر نہیں بن پاتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کا لیڈر بننا چاہتا تھا مگر اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم اور ملک کے لیے۔

☆☆☆

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ملائیشیا پر انگریزی راج کے سائے بہت گہرے تھے اور آزادی کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ انگریز دونوں ہاتھوں سے اس خطے کے وسائل لوٹ رہے تھے۔ ٹن، ربر اور قیمتی تعمیراتی لکڑی بے دریغ اور کوڑیوں کے مول یہاں سے نکال کر برطانیہ بھیج رہے تھے۔ اس وقت برطانیہ میں بنایا جانے والا فرنیچر ملائیشیا سے جانے والی ٹیک اور آبنوس کی لکڑی سے تیار ہوتا تھا۔ ملائی ربر نے یورپ اور برطانیہ کی صنعتی ترقی کو تیز کر دیا تھا کیونکہ اس سے پہلے ترقی یافتہ ملکوں کو کوئی انسولیشن میٹریل نہیں ملا تھا۔ ملائی ربر نے الیکٹرک سے لے کر آٹو موبائل تک ہر شعبے میں جدت پیدا کر دی تھی۔ جب تک پیٹرولیم سے مصنوعی ربر تیار نہیں ہوا تھا اس خطے سے جانے والا ربر ہی صنعتوں میں استعمال ہوتا رہا تھا۔

ملک کی دولت باہر جا رہی تھی اور مقامی لوگوں کو سوائے دو وقت کی روٹی کے اور کچھ نہیں مل رہا تھا۔ ملک کی نوّے فیصد آبادی اَن پڑھ تھی۔ ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھے۔ ترقی یافتہ علاقے بس وہی تھے جہاں انگریز خود رہتے تھے۔ باقی ملک اور کوالالمپور جو ملک کا سب سے بڑا شہر تھا کسی دیہات کا منظر پیش کرتے تھے۔ بھوک کے ساتھ بیماریاں عام تھیں اور ہر سال لاکھوں افراد وبائی بیماریوں کی نذر ہو جاتے تھے۔ زرد بخار اور ملیریا موت کی سب سے بڑی وجہ تھے۔ پیدا ہونے والے ہر دو میں سے ایک ہی بچہ جوانی کی عمر کو پہنچتا تھا۔ صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور زراعت پر انگریزوں کا مکمل قبضہ تھا۔ زمین کے اصل مالک صرف کاشت کار بن کر رہ گئے تھے۔ انگریزی اسکولوں میں صرف ان کے وفاداروں کے بچے پڑھ سکتے تھے اور ان کا بھی برین واش کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں میں شعور آرہا تھا۔

ایسے ہی لوگوں میں ایک محمد بھی تھا۔ برٹش ملایا کے صوبے کدھا کے چھوٹے سے قصبے آلور ستار کا رہائشی محمد سوشل اکنامکس کا ماہر اور ایک اسکول کا پرنسپل تھا۔ یہ اسکول بھی اسی نے قائم کیا تھا اور اس وقت اس کا نام آلور ستار گورنمنٹ انگلش اسکول تھا۔ محمد قدامت پرست مسلم تھا اور اس کا تعلق برصغیر سے تھا مگر کئی نسل پہلے اس کے آباؤ اجداد وہاں سے ہجرت کر کے ملایا میں آباد ہوئے تھے اور اب وہ ملائی قومیت کا ایک حصہ تھا۔ اس کی بیوی وان تاپوان مقامی نسل کی مسلمان تھی۔ دونوں کی ہی یہ دوسری شادی تھی اور دونوں کی سابق شادیوں سے نصف درجن بچے تھے۔ ملائی مسلمان ہمیشہ سے کثیر العیال رہے ہیں اور وہاں زیادہ بچے ہونا افتخار اور عزت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ان کے آپس میں صرف دو بیٹے تھے۔ ان میں سے دوسرا بیٹا 10 جولائی 1925ء کے دن پیدا ہوا اور باپ نے اس کا نام مہاتیر بن محمد رکھا۔ مہاتیر کے کاغذات میں اس کی تاریخ پیدائش 20 دسمبر درج ہے۔ لیکن ممکنہ طور پر یہ اس کے عقیقے اور نام رکھنے کا دن تھا جسے اس کی تاریخ پیدائش کے طور پر درج کر لیا گیا۔ مہاتیر ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوا تھا اور اس کے پہلے سے سات بہن بھائی تھے جن میں صرف ایک بھائی سگا تھا باقی سوتیلے تھے۔

قدامت پرست ہونے کے باوجود محمد تعلیم کے معاملے میں جدت پسند تھا اور اس وقت جب ملائیشیا میں لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کا کوئی رواج نہیں تھا مگر اس کی ساری بیٹیوں نے اسکول میں داخلہ لیا۔ گھر کا ماحول بہت زیادہ تعلیمی، مذہبی یا سیاسی نہیں تھا۔ محمد کے چند ایک دوست سیاست میں سرگرم تھے اور وہ ملائیشیا کو ایک آزاد اور خود مختار ملک بنانا چاہتے تھے۔ محمد ان سے اتفاق کرتا تھا مگر اس نے ذاتی طور پر کبھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا۔ وہ مذہب پسند تھا مگر اسے دوسروں پر ٹھونسنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو پوری مذہبی تعلیم دلائی اور اپنے عمل سے بھی تعلیم دی مگر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ مذہب پر اس طرح سے عمل کریں جیسے وہ کرتا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد مہاتیر نے اپنے گھر میں جو چیز سب سے زیادہ دیکھی وہ کتابیں تھیں۔

محمد نے ایک پورا کمرا کتابوں کے لیے مختص کیا ہوا تھا اور وہاں بچوں کو جانے کی محدود اجازت تھی۔ یعنی وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کسی کتاب کو چھیڑ نہیں سکتے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں کی طرح مہاتیر میں بھی جرات نہیں تھی کہ باپ کی کتابیں اس کی مرضی کے بغیر چھو سکے۔ مگر اسے یہ کتابیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ کھلونوں سے بھی زیادہ جن سے اس کے بہن بھائی کھیلتے تھے۔ جب وہ گھر میں ہوتا تو زیادہ تر کتابوں والے کمرے کے آس پاس رہتا تھا۔

ایک بار جب اس کے باپ نے اس سے کھلونے کا پوچھا تو اس نے کہا۔ "مجھے کتاب چاہیے۔"

محمد اپنے تین سالہ بیٹے کی فرمائش پر حیران ہوا جو ابھی اسکول جانے کی عمر کو بھی نہیں پہنچا تھا اور اسے حروف تہجی بھی ٹھیک سے نہیں آتی تھی اور وہ اس سے کتاب کی فرمائش کر رہا تھا۔ محمد نے پوچھا۔ "تم کتاب کا کیا کرو گے؟"

"میں پڑھوں گا۔" مہاتیر نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں پڑھنا نہیں آتا ہے؟"

"ابھی نہیں آتا ہے لیکن جب پڑھنا آئے گا تب میں پڑھوں گا۔"

مہاتیر کے جواب نے محمد کو احساس دلایا کہ اس کا بیٹا عام بچہ نہیں تھا۔ اس نے بچپن سے کتاب کو اپنا ساتھی منتخب کیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ آگے تعلیم کے میدان میں بہت اوپر تک جائے گا۔ محمد نے اسے اپنے ذخیرے سے تو کوئی کتاب نہیں دی مگر وہ اس کے لیے چند چھوٹی کتابیں لے آیا جن میں بچوں کے لیے تصویری کہانیاں تھیں۔ مہاتیر خوش ہو گیا اور وہ تقریباً سارا دن ان کتابوں میں مگن رہتا تھا۔ تصویروں کے ساتھ کہانیوں میں الفاظ بھی تھے۔ وہ اپنے بڑے بہن بھائیوں سے ان کا مطلب پوچھتا اور خود سے یاد رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے پورے پورے جملے یاد کر لیے اور انہیں پڑھ کر سنا بھی سکتا تھا۔ ایک بار جب اس نے باپ کے سامنے جملے سنائے تو وہ حیران ہوا تھا۔ اس نے مہاتیر سے پوچھا۔ "تمہیں پڑھنا آتا ہے؟"

مہاتیر نے انگریزی حروف تہجی کی شناخت سیکھ لی تھی۔ اس نے باپ کو پڑھ کر دکھایا تو محمد نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اگلے سال اسکول میں داخل کرائے گا۔ اس وقت بچوں کو چھ سات سال کی عمر میں اسکول میں داخل کرایا جاتا تھا مگر مہاتیر صرف چار سال کی عمر میں اسکول میں آ گیا۔ ابھی اس کی پانچویں سالگرہ میں چھ مہینے باقی تھے۔ محمد کے باقی بچے بھی اسی کے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ وہ روز چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا کر اور بڑے بچوں کو پیدل لے کر اسکول جاتا۔ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مہاتیر آگے اسٹینڈ پر بیٹھتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی ہوتا تھا اور پیچھے اسٹینڈ پر اس کا ایک سوتیلا بھائی اور سوتیلی بہن بیٹھے ہوتے تھے۔ گھر سے اسکول ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا اور اس کے چار بڑے بہن بھائی یہ فاصلہ پیدل طے کرتے تھے۔ سات سال کی عمر میں مہاتیر بھی پیدل اسکول آنے جانے لگا۔ اب محمد صرف بیٹیوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر لاتا تھا اور بیٹے پیدل جاتے تھے۔

محمد نے انہیں خاص طور سے خبردار کیا ہوا تھا کہ وہ جھاڑیوں اور پانی والی جگہوں سے گزرنے سے گریز کریں کیونکہ ان کے علاقے میں زہریلے سانپوں کی بہتات تھی۔ یہ خاص طور سے پانی میں اور چھوٹی جھاڑیوں میں چھپے رہتے تھے اور بے خبری میں نزدیک آنے والے کو ڈس لیتے تھے۔ اس وقت ملایا میں موت کا تیسرا بڑا سبب زہریلے سانپوں کا ڈسنا تھا۔ باپ کی ہدایت کے مطابق اسکول جاتے ہوئے وہ جھاڑیوں اور پانی والی جگہوں سے دور رہتے تھے۔ صاف اور سیدھے راستے پر چلتے۔ اس کے باوجود آئے دن ان کا واسطہ سانپوں سے پڑتا تھا۔ تقریباً روز ہی راستے میں سانپ ملتا جو ایک سے دوسری جگہ جا رہا ہوتا تھا۔ مہاتیر اور اس کے بہن بھائی سانپ کے گزرنے کا انتظار کرتے اور جب وہ گزر جاتا تو پھر آگے جاتے تھے۔

ایک دن وہ سب اسکول جا رہے تھے کہ مہاتیر کی بڑی بہن ی آن کا پاؤں راستے میں موجود ایک چھوٹے سے گڑھے میں گیا جس میں بارش کا پانی جمع تھا۔ اسے خیال نہیں تھا کہ اتنے سے پانی میں سانپ ہو سکتا ہے۔ اتفاق سے اس کا پاؤں سیدھا سانپ کے سر پر گیا اور اس نے تلملا کر ی آن کی پنڈلی کو اپنے بل میں جکڑ لیا۔ یہ دو وفٹ سے زیادہ لمبا سانپ تھا اور اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ ی آن تکلیف سے چلانے لگی مگر اس نے سانپ کے سر سے پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔ سارے بہن بھائی اس کے گرد جمع تھے اور ڈر کے مارے کوئی اس کے قریب نہیں جا رہا تھا۔ ی آن کو خوف تھا کہ اگر اس نے سانپ کے سر سے پاؤں ہٹایا تو وہ اسے ڈس لے گا۔ اس لیے وہ اس کے سر سے پاؤں نہیں ہٹا رہی تھی۔ وہ بڑے بھائیوں سے کہہ رہی تھی کہ اسے بچائیں مگر وہ سانپ سے ڈر رہے تھے۔ مہاتیر آٹھ برس کا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے تقریباً جوان بھائی ہمت نہیں کر رہے ہیں تو اسے غصہ آیا اور اس نے ی آن کے نزدیک آ کر اس کی پنڈلی سے لپٹے سانپ کے بل کھولنا شروع کیے اور ی آن سے کہا۔ "پاؤں سے کس کر دبائے رکھو۔"

ی آن نے سر ہلایا اور اپنا پورا زور پاؤں پر ڈال دیا۔ مہاتیر کو بل کھولنے میں سخت مشکل ہو رہی تھی کیونکہ سانپ بہت طاقتور تھا اور جکڑ اس کی مضبوط تھی مگر کسی نہ کسی طرح

مہاتیر نے سانپ کے بل کھول لیے اور ی آن کی پنڈلی آزاد ہو گئی۔ مگر سانپ کا خطرہ اب بھی تھا۔ ی آن اپنے پاؤں کی گرفت ختم کرتی تو سانپ اسے یا مہاتیر کو ڈس سکتا تھا۔ مہاتیر نے سانپ کو لمبائی میں کھول کر اس کی دم مضبوطی سے پکڑ لی اور ی آن سے کہا۔ "جب میں کہوں تو پاؤں ہٹا لینا۔"

جیسے ہی مہاتیر نے کہا ی آن نے سانپ کے سر سے پاؤں ہٹا لیا اور مہاتیر نے سانپ کو رسی کی طرح گھما کر دور جھاڑی میں اچھال دیا۔ ی آن نے ڈر کر چیخ ماری تھی مگر سانپ سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد بہن بھائیوں پر مہاتیر کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور پہلے اسے چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا تھا تو اب بہن بھائی اسے برابر کی اہمیت دینے لگے۔ بعد میں ایک موقع پر مہاتیر نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں اسے اپنی زندگی کا سب سے خوفناک اور اہم واقعہ سمجھا تھا لیکن جب میں سیاست میں آیا تو مجھے آئے دن ایسے ہی حالات سے واسطہ پڑنے لگا۔ اگر میں دم چھوڑتا ہوں تو مسئلہ حل نہیں ہوتا اور اگر سانپ کو دور نہیں پھینکتا ہوں تو وہ مجھے یا کسی اور کو کاٹ لے گا۔ یہ واقعہ شاید میری سیاسی تربیت کے لیے ہی رونما ہوا تھا۔"

تعلیمی میدان میں اس کی کارکردگی ویسے ہی سب سے بڑھ کر تھی اور اس کی ذہانت اور سخت محنت کی وجہ سے محمد اسے باقی بچوں کے مقابلے میں ترجیح دینے لگا تھا۔ وہ اسے خود پڑھاتا تھا اور اسے نصاب کی تیاری میں مدد دیتا، ساتھ ہی اس نے مہاتیر کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کی کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ یہ اجازت چھٹے گریڈ میں پوری کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لانے پر ملی تھی۔ محمد کی لائبریری میں کتابوں کی تعداد کئی ہزار تھی اور اسکول سے آنے کے بعد مہاتیر کا زیادہ وقت وہیں گزرتا تھا۔

اسکول پرنسپل ہونے کے باوجود محمد مالی لحاظ سے بہت مضبوط نہیں تھا۔ تنخواہ کے علاوہ اس کی کچھ زمین تھی سال کے سال اس سے کچھ رقم مل جاتی تھی۔ مگر اس کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ آٹھ بچوں کے ساتھ اس کے کچھ رشتے دار بھی اسی پر انحصار کرتے تھے اور محمد باقاعدگی سے ان کی مالی مدد کرتا تھا اس لیے مہاتیر نے بچپن سے ایک متوازن معاشی زندگی دیکھی تھی جس میں فراغت کم تھی لیکن تنگی بھی زیادہ نہیں تھی۔ انہیں کھانے کو اچھا اور پہننے کو مناسب لباس ملتا

تھا۔ اسکول سرکاری تھا اور تمام خرچ برٹش حکومت اٹھاتی تھی۔ جب محمد نے یہ اسکول قائم کیا تو اس کے پاس اسے چلانے کے لیے وسائل نہیں تھے اس لیے اس نے اسے برٹش حکومت کے حوالے کر دیا اور اس کی خدمات کے صلے میں اسے یہاں کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ مگر مہاتیر کا گھرانا آس پاس کے غربت زدہ گھرانوں سے بہت بہتر تھا۔

بیروزگاری عام تھی کیونکہ انگریزوں نے زرخیز زمینوں پر قبضہ کر کے ربڑ، پام آئل اور کوکا کے باغات لگائے تھے۔ چاول جو مقامی آبادی کی خوراک تھی اس کے لیے کم زرخیز زمین چھوڑی تھی۔ ملک میں ڈیری اور گوشت کی شدید قلت تھی۔ مہاتیر کو یاد ہے کہ اس کے گھر تقریباً ہر دوسرے دن کچے کیلے کا سالن بنتا تھا۔ حالانکہ یہ غریب کی ترکاری شمار ہوتا تھا۔ ملک کی ستر فیصد عوام اسی پر گزارا کرتی تھی۔ اگرچہ ملائیشیا اور اس کے آس پاس پانی اور سمندر تھا۔ مچھلی کی بہتات تھی مگر زیادہ تر مچھلی ہانگ کانگ اور جاپان برآمد کر دی جاتی تھی۔ مقامی طور پر مچھلی مہنگی تھی۔ خاص طور سے سمندری مچھلی تو عیاشی میں شمار ہوتی تھی۔ لوگ زیادہ تر اپنے تالابوں میں پلنے والی مقامی اقسام کی مچھلیاں کھاتے تھے جو ذائقے میں کم تر اور بے قیمت ہوتی تھیں۔

گندم اور دالیں نہایت مہنگی تھیں اور امرا کی خوراک میں شامل تھیں۔ غیر مسلم پھر بھی گوشت کھا لیتے تھے کیونکہ خنزیر اور دوسرے جانور جو حلال نہیں ہوتے ہیں وہ دستیاب تھے لیکن گائے، بھینس اور بکرے وغیرہ کا گوشت نایاب تھا۔ یہ زیادہ تر انگریزوں کے لیے مخصوص تھے۔ ڈیری کی قلت کی وجہ ان فصلوں کی کمی تھی جو ان جانوروں کی خوراک بنتی ہیں۔ مہاتیر کو نہیں یاد کہ اس نے کبھی دودھ والی چائے پی ہو۔ ان کے گھر میں ہمیشہ سیاہ قہوہ بنتا تھا اور عام طور سے بغیر شکر کے پیا جاتا تھا۔ لڑکپن کی عمر میں جب لڑکے اپنے آپ میں مگن ہوتے ہیں وہ اپنے اردگرد کا مشاہدہ کرتا اور یہ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا کہ اس کی قوم جو زمین کی مالک ہے وہ بدحالی سے دوچار ہے اور غاصب انگریز اعلیٰ درجے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بہترین گھروں میں رہتے ہیں جو ہر سہولت سے مزین ہے۔ ٹرین میں فرسٹ کلاس ڈبوں میں صرف انگریز سفر کر سکتے تھے اسی طرح بحری سفر میں کشتیوں اور بحری جہازوں کا فرسٹ کلاس حصہ انگریزوں کے لیے تھا اس میں کوئی ملائی باشندہ سفر نہیں کر سکتا تھا۔

ناانصافیاں دیکھ کر بہت سے مقامی لوگوں کی طرح

مہاتیر کا دل بھی کڑھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا اور جاپانی طوفان کی طرح برٹش کالونیوں پر چڑھ دوڑے اور ان کا نعرہ آزاد ایشیا تھا تو ہر جگہ مقامی لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ مہاتیر بھی ایسا سمجھنے والوں میں سے ایک تھا مگر جلد اسے اور اس کے ہم وطنوں کو پتا چل گیا کہ وہ ایک استعمار کے چنگل سے نکل کر دوسرے استعمار کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔ جاپانیوں کا رویہ فاتحین کے بجائے لٹیروں جیسا تھا اور انہوں نے جزائر انڈو ملایا پر قبضہ کرتے ہی یہاں موجود ہر قابلِ ذکر چیز جاپان منتقل کرنا شروع کر دی۔ ربر، ٹن، پیٹرولیم، تعمیراتی لکڑی، اجناس اور کوئلہ بلا معاوضہ جاپان جانے لگا۔ کھیتوں، کانوں اور ملوں میں کام کرنے والے جاپانیوں کے غلام بن گئے تھے۔ انہیں صرف کھانے کو دیا جاتا تھا۔

جاپانیوں نے تمام برٹش ادارے بشمول تعلیمی ادارے بند کر دیے تھے اور ان میں محمد کا اسکول بھی شامل تھا۔ اسکول بند ہوا اور اس کی تنخواہ بھی بند ہوئی تو مہاتیر کا گھرانا بھی معاشی بدحالی کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے بڑے بھائی پہلے معاشی تگ و دو میں مصروف تھے۔ ایسے میں پندرہ سالہ مہاتیر نے بھی مناسب سمجھا کہ گھر بیٹھنے کے بجائے کچھ کرے اور اس نے تجارت کا انتخاب کیا۔ اس نے اپنی تجارتی سرگرمیوں کا آغاز کافی کی فروخت سے کیا اور گھر گھر جا کر کافی بیچنے لگا۔ مگر کافی کے خریدار محدود تھے خاص طور سے مقامی لوگوں کو کافی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور انگریز ہی کافی پیتے تھے اس طرح جاپانی بھی کافی کے شوقین تھے۔ مگر انہیں کافی کے دام دیتے ہوئے موت آتی تھی۔ جب اس سے کام نہیں چلا تو اس نے پھلوں سے بنی ہوئی مٹھائیاں فروخت کرنا شروع کر دیں۔ اس سے اس نے کچھ رقم کمائی جو اپنے باپ کے حوالے کر دی۔

جب جاپانی ملایا پر قابض ہوئے تو مہاتیر اسکول کے آخری سالوں میں تھا اور جاپانیوں کے قبضے کے دوران اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ چار سال بعد جب جاپانی ملایا سے پسپا ہوئے اور انگریز واپس آئے تو انہوں نے بند ہو جانے والے تعلیمی ادارے دوبارہ کھولے۔ مہاتیر نے بھی اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کیا اور بہت اعلیٰ نمبروں کے ساتھ اس نے ہائی اسکول پاس کیا۔ جن دنوں وہ فارغ تھا اور کمانے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا اس کا بہت سی جگہوں پر جانا ہوا اور اس نے دیکھا کہ اکثر ملائی افراد بیماریوں کا شکار تھے۔ معمولی سے امراض بھی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتے تھے۔ مہاتیر یہ سب دیکھ کر سوچتا کہ کیا وہ ان لوگوں کے لیے کچھ کر سکتا ہے؟

تب اسے ڈاکٹر بننے کا خیال آیا مگر اس وقت ملائیشیا میں ایک بھی میڈیکل کالج نہیں تھا۔ اس پورے خطے کا واحد میڈیکل کالج سنگاپور میں کنگ ایڈورڈ ہفتم کالج تھا۔

یہ جگہ آلورستار سے زیادہ دور نہیں تھی مگر سنگاپور انگریزوں کے زیرِ انتظام ایک الگ ملک تھا۔ تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کے بعد اس نے باپ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو خلافِ توقع محمد نے اس کی پوری حوصلہ افزائی کی اور اس سے کہا کہ اسے ڈاکٹر بننے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ اسے مہیا کرے گا۔ یہ سن کر مہاتیر پُرجوش ہو گیا اور اس نے دن رات ایک کر کے ہائی اسکول کے امتحان میں اتنے اچھے نمبرز حاصل کیے کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کیونکہ یہ ادارہ انگریزوں کے زیرِ انتظام تھا اس لیے یہاں سے سند لینے والے ڈاکٹرز پر برٹش آرمی میڈیکل کور میں کچھ عرصے کی ملازمت لازمی ہوتی تھی۔ مہاتیر کو ملازمت سے چڑ تھی اس نے پندرہ سال کی عمر میں بھی ملازمت کرنے کی بجائے اپنا کام شروع کیا تھا۔ مگر یہاں مجبوری تھی اگر وہ آرمی کی ملازمت سے انکار کرتا تو اسے میڈیکل کالج میں داخلہ ہی نہیں ملتا۔

مہاتیر نے یہاں چار سال تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد آرمی میڈیکل کور میں ہاؤس جاب پر آ گیا۔ اس وقت کوریا میں جنگ جاری تھی اور اس کا نام بھی آیا تھا مگر عین وقت پر اس کا نام اس دستے سے نکال دیا گیا جو کوریا جا رہا تھا۔ مہاتیر نے سکون کا سانس لیا۔ وہ جنگ سے خائف نہیں تھا مگر وہ اپنے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ سنگاپور میں تھا۔ سنگاپور انگریز راج سے آزادی کے قریب تھا۔ سنگاپور نے لی کوان کی قیادت میں اندرونی خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ البتہ ملائیشیا پہلے ہی مکمل آزادی حاصل کر چکا تھا۔ 1956 میں ملائیشیا نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی اور اگلے سال مہاتیر نے آرمی میڈیکل کور چھوڑ کر وطن واپس آنے کے بعد نجی پریکٹس شروع کر دی۔ وہ خوش تھا کہ اب اپنے ہم وطنوں کی خدمت کر رہا تھا۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ اسے اس کی پسندیدہ بیوی مل گئی تھی۔

سنگاپور میں قیام کے دوران اس کی کئی بار لی کوان سے ملاقات ہوئی اور مہاتیر نے اسے بہت بالغ نظر اور عملی آدمی پایا تھا۔ اس کے عزائم بہت بلند تھے۔ البتہ وہ قوم پرست چینی تھا۔ جب سنگاپور میں سوائے ایک شہر اور بندرگاہ کے اور کچھ نہیں تھا۔ تب بھی لی کوان اسے دنیا کا ترقی یافتہ اور ماڈل ماڈرن ملک بنانے کی بات کرتا تھا۔ مہاتیر کے خیال میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ لیکن وہ لی کوان کے بلند حوصلے اور اس کے اندازِ سیاست سے متاثر ہوا تھا۔ ایک موقع پر اس نے مہاتیر سے کہا۔ "سیاست اور جمہوریت ہی اس خطے کی تقدیر بدل سکتی ہے لیکن وہ سیاست اور جمہوریت جو ہمارے اپنے انداز کی ہو۔ ہمیں انگریزوں کی سیاست اور جمہوریت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔"

سیاست سے اسے صحیح معنوں میں دل چسپی سنگاپور میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ وہ طالب علمی کے دور میں بھی وہاں سیاسی اجتماعات میں شرکت کرتا تھا اور ایک بار اسے مباحثے میں حصہ لینے کی پاداش میں کالج انتظامیہ کی طرف سے وارننگ بھی ملی تھی۔ اس کے بعد اس نے مباحثوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا مگر سیاسی اجتماعات میں شرکت کرتا تھا۔ جس مباحثے میں شرکت پر اسے وارننگ ملی تھی۔ وہ جاپانیوں کے ملایا سے پسپا ہونے اور انگریزوں کے دوبارہ آنے کے بعد یہاں غیر ملائی افراد کو شہریت دینے پر احتجاج کے لیے ہوا تھا اور مہاتیر اس کا شدید حامی تھا کہ ملایا میں غیر ملائی افراد کو بسانا بند کیا جائے۔ انگریز برِصغیر سے محنتی افرادی قوت یہاں لا رہے تھے اور اسے یہاں کی شہریت بھی دے رہے تھے۔ اس کے بعد مہاتیر نے کالج کے میگزین میں ایک مضمون لکھا جس میں کھل کر ملائیشیا کے حقوق کی بات کی۔ جیسے انگریزوں سے آزادی اور ملائی کو سرکاری زبان کی حیثیت دینا وغیرہ۔ اگرچہ شروع میں وہ حامی تھا کہ آزادی کے بعد غیر ملائی افراد کی شہریت ختم کر دی جائے گی مگر بعد میں وہ اس کا مخالف ہو گیا۔ اس کے خیال میں ملائیشیا میں بسنے والا ہر فرد نسل سے قطع نظر ملائشی تھا۔ یوں مہاتیر نے ملائی سے ہٹ کر ملائشی کی نئی اصطلاح نکالی تھی جس سے مراد ملائیشیا کی شہریت رکھنے والا فرد تھا چاہے اس کا تعلق کسی بھی نسل، ذات اور مذہب سے ہو۔

سنگاپور میں اس کی ملاقات جس دوسری شخصیت سے ہوئی... اس نے مہاتیر کی زندگی پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ ستی حسما محمد علی تھی۔ مہاتیر کی مستقبل کی بیوی۔

اس وقت وہ اس کی کالج فیلو تھی۔ دبلی پتلی نازک اندام ستی خوب صورت اتنی نہیں تھی لیکن اس کی خوب سیرتی اور ذہانت نے مہاتیر کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ تعلیمی اور دیگر مصروفیات نے انہیں مستقبل کے بارے میں زیادہ سوچنے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب میں لگ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جلد واپس چلا جائے گا اور شاید پھر وہ ستی سے دوبارہ ملاقات بھی نہ کر سکے۔ اس لیے اس نے واپسی سے ایک سال پہلے ستی کو پروپوز کیا اور دونوں کے گھر والوں کی رضامندی سے انہوں نے 1956 میں شادی کر لی۔ اسی سال جس سال ملائیشیا ایک آزاد ملک بنا۔

مہاتیر نے ستی کو پسند کیا تھا مگر وہ روایتی محبت کرنے والا شخص ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک زندگی کا اصل مقصد اپنے ملک وقوم کے کام آنا تھا۔ ملائیشیا واپس آنے کے بعد جب مہاتیر میڈیکل پریکٹس میں مصروف تھا تب بھی اس کی توجہ اس طرف رہی کہ وہ اپنے ملک اور لوگوں کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ وہ سرکاری نوکری حاصل کر سکتا تھا مگر اسے نوکری کرنا پسند نہیں تھا اس لیے اس نے نجی پریکٹس شروع کی اور آلور ستار میں اپنا کلینک کھول لیا۔ اس وقت ڈاکٹروں کی اتنی کمی تھی کہ آلور ستار میں ان کے سوا اور کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس لیے اس کی پریکٹس چل نکلی اور جلد مہاتیر کی آمدنی اتنی ہو گئی کہ اس نے اپنے اور گھر والوں کے لیے ایک بڑا سا گھر بنا لیا۔ اس نے اضافی آمدنی کئی ایک کاروبار میں لگائی اور اس کے پاس باورچی، مالی، ملازم اور ایک شوفر بھی تھا جو اس کی نئے ماڈل کی پونٹیاک کیٹلینا چلاتا تھا۔ مہاتیر نے یہ قیمتی کار خاص طور سے آرڈر دے کر منگوائی تھی۔

اپنی ذاتی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بہن بھائیوں اور دوسرے رشتے داروں کو نہیں بھولا تھا۔ غریب رشتے داروں کی مدد کرنا دیرینہ ملائی روایات میں شامل تھی۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ ان رشتہ داروں کے لیے مخصوص کرتا تھا جو غربت کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ سنگاپور میں تعلیم اور آرمی میڈیکل کور میں ملازمت کے دوران اس نے سیکھا تھا کہ علاج سے زیادہ پرہیز اور احتیاط لوگوں کو بیماری اور اس سے ہونے والی اموات سے بچاتی ہے۔ اس لیے اس نے آلور ستار میں ایک مہم شروع کی اور چند رضا کاروں کے ہمراہ لوگوں میں صحت کا شعور اجاگر کرنے لگا۔

وہ ہفتے میں ایک بار ان رضا کاروں کے ہمراہ نزدیکی

دیہات میں جاتا اور وہاں کے لوگوں کو سکھاتے کہ عام بیماریوں سے کیسے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ صفائی رکھنے اور گندگی کو ٹھکانے لگانے سے ان کا ماحول کیسے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس کی اس مہم کا اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور چند سالوں میں آلورستار اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بیماریوں سے ہونے والی اموات میں چالیس فیصد کی آئی تھی۔ مہاتیر نے ملیریا اور زرد بخار کے خلاف مہم چلائی جو مچھروں کے کاٹنے سے پھیلتا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی لوگوں کے ساتھ مل کر ٹھہرے پانی پر ادویات کا چھڑکاؤ کرتے تھے جو مچھروں کے لاروے ختم کر دیتی تھی۔ یہ کام وہ سب اپنے طور پر کرتے تھے اور حکومت ان کی کوئی مدد نہیں کرتی تھی۔ مہاتیر اس صورتِ حال سے مایوس تھا اسے معلوم تھا کہ حکومت کی مدد کے بغیر وہ صورتِ حال کو بہتر نہیں بنا سکتے تھے۔ ایسے میں سیتی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مقامی سیاست میں متحرک ہو۔ اسی صورت میں وہ اپنی آواز حکومتی ایوانوں تک پہنچا سکتا تھا۔

سیاست میں وہ پہلے ہی دل چسپی رکھتا تھا۔ اس لیے سیتی کا مشورہ اسے اچھا لگا۔ نظریاتی طور پر وہ یو ایم این او کا حامی تھا۔ یونائیٹڈ ملائیز نیشنل آرگنائزیشن، ان لوگوں نے قائم کی تھی جنھوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے عملی جدوجہد کی تھی۔ وزیر اعظم عبدالرحمٰن تنکو ان کا لیڈر تھا۔ آزادی کے بعد ہونے والے پہلے الیکشن میں یو ایم این او نے کلین سویپ کامیابی حاصل کی اور ملک کی واحد جماعت کے طور پر سامنے آئی۔

مہاتیر محمد نے محسوس کیا کہ یو ایم این او ہی وہ پلیٹ فارم ہے جس سے وہ اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کر سکتا ہے۔ فردِ واحد کے طور پر وہ صرف آلورستار ہی نہیں بلکہ کدحا کے پورے صوبے میں مقبول اور جانی پہچانی شخصیت تھا۔ اس کی ماں وان کا تعلق ریاست کے قدیم شاہی خاندان سے تھا اور اس ناطے بھی اس کی یہاں بسنے والوں کے دلوں میں عزت واحترام تھا۔ محمد نے آلورستار کا اولین اسکول قائم کیا اور پھر اسے ہائی اسکول کے درجے تک پہنچایا۔ آج یہ سلطان عبدالحمید کالج ہے۔ اس میں تین ہزار سے زیادہ طلبا پوسٹ گریجویٹ کی سطح تک تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ محمد بھی معاشرے کا جانا پہچانا اور باعزت نام تھا۔ یہ سب ورثے میں مہاتیر کو ملا جس نے اپنی صلاحیتوں سے اس عزت و احترام میں اضافہ کیا۔ اس لیے جب وہ سیاست کے لیے یو ایم این او میں شامل ہوا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

یو ایم این او مکمل جمہوری پارٹی تھی اور اس کا ہر عہدیدار مخصوص طریقے سے چن کر اوپر آتا تھا۔ پارٹی میں تقرری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اگر کسی عہدیدار کے خلاف کوئی شکایت آتی یا اسے منتخب کرنے والے دس فیصد افراد اس کے خلاف درخواست دیتے تو اس وقت تک عہدے پر کام کرنے سے روک دیا جاتا جب تک وہ دوبارہ سے منتخب نہیں ہوتا تھا۔ اوپر جانے کا واحد طریقہ عوامی مقبولیت تھی اور یہ مہاتیر کے پاس تھی۔ اس نے بہت تیزی سے ترقی کی اور جب 1959 میں آزاد ملک کے دوسرے الیکشن ہوئے تو مہاتیر کدحا صوبے میں پارٹی کا چیئرمین تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ اس کی پارٹی کے سربراہ اور ملک کے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن سے بعض امور پر اختلافات تھے۔ تنکو کا تعلق بھی کدحا ہی سے تھا۔

اختلاف کی جڑ آزادی کے بعد تنکو کا ملک میں برطانیہ اور دولت مشترکہ کی فوج کو قیام کی اجازت دینا تھا۔ مہاتیر اس کا شدید مخالف تھا۔ اس کے نزدیک کوئی ملک اس وقت تک آزاد شمار نہیں ہوتا ہے جب تک اس کی سرزمین پر غیر ملکی افواج موجود ہوں۔ اس نے پارٹی کے ہر فورم پر اس کے خلاف آواز بلند کی اور احتجاجاً الیکشن میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اختلاف کی دوسری وجہ مہاتیر کی طرف سے پیش کیا جانے والا منصوبہ تھا جس کے تحت پارٹی صرف ایک خاص تعلیمی قابلیت کے فرد کو ہی ٹکٹ دے گی اس سے کم تعلیم والا پارلیمنٹ کا رکن بننے کا اہل نہیں ہوگا۔ تنکو عبدالرحمٰن نے مہاتیر کا یہ پلان نامنظور کر دیا۔ مہاتیر کے خیال میں کم تعلیم یافتہ لوگ جب معمولی ملازمت کے اہل نہیں ہو سکتے ہیں تو وہ پورے ملک کی نمائندگی کے اہل کیسے ہوں گے اور وہ کیسے قانون سازی میں حصہ لیں گے۔

اگر مہاتیر الیکشن میں حصہ لیتا تو اس کا منتخب ہونا یقینی تھا۔ اس وقت اس کے کچھ ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی الگ سیاسی پارٹی بنا لے مگر مہاتیر نے اسے سیاسی اخلاقیات کے منافی قرار دیا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس کا اختلاف ایک فردِ واحد سے ہے پوری پارٹی سے نہیں ہے اور فردِ واحد ہمیشہ نہیں رہے گا اس لیے وہ پارٹی سے اپنا تعلق اور وفاداری ختم نہیں کرے گا۔ اپنے اصولوں کی خاطر مہاتیر نے زندگی کے پانچ بیش قیمت سال

پارلیمنٹ سے باہر گزار دیئے۔ مگر اس کے نزدیک یہ اصول پر قائم رہنے کی بہت معمولی سی قیمت تھی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ درست تھا۔ اس فارغ وقت میں مہاتیر نے ملائیشیا فیڈریشن کا بہ غور جائزہ لیا اور اس نے محسوس کیا کہ سنگاپور کی فیڈریشن میں موجودگی ملائیشیا کی ملائی اکثریت کے لیے ایک چیلنج تھی۔ اس وقت تک سنگاپور مضبوط معاشی حیثیت کا حامل تھا اور اس پر چینی اثرات نمایاں تھے۔ چینی سے مراد چینی نژاد افراد کے جو سنگاپور سمیت پورے مشرق بعید کے ہر ملک میں موجود ہیں اور ان کی مکمل وفاداری اپنی کمیونٹی سے ہوتی ہے۔ مہاتیر نے ایک اخبار میں آرٹیکل لکھا۔

"سنگاپور کی فیڈریشن میں موجودگی کا مطلب ہے کہ جلد یا بدیر ملائیشیا کی سیاست میں چینی فیکٹر اہمیت اختیار کر جائے گا اور ملائی اکثریت کی اہمیت کم ہو جائے گی کیونکہ چینی فیکٹر زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ دولت مند اور زیادہ مضبوط ہے۔ کم تعلیم یافتہ اور کمزور ملائی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے سنگاپور کو فیڈریشن سے الگ کر دینا ہی ملائی عوام کے مفاد میں ہے۔ میں ملائی عوام کو یقین دلاتا ہوں۔ جس دن میں پارلیمنٹ میں داخل ہوا سب سے پہلے یہی مسئلہ اٹھاؤں گا۔"

پانچ سال بعد 1964 کے جنرل الیکشن میں مہاتیر با آسانی سلطان ستار کے کوٹے کی سیٹ پر پارلیمنٹ ممبر منتخب ہو گیا۔ اس نے حکمران پارٹی کے لیے مخصوص بنچوں میں اپنے لیے پیچھے کی ایک نشست کا انتخاب کیا۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ وہ حکمران جماعت کا حصہ ہے لیکن بہت سے امور میں وہ اس سے اختلاف رکھتا ہے۔ حسبِ وعدہ اس نے اولین دن ہی سنگاپور کی فیڈریشن میں موجودگی کا سوال اٹھایا اور اس معاملے پر ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ جو اس کے مخالف تھے وہ بھی اس تقریر کے بعد اس کے حامی بن گئے۔ اس نے اپنے سیاسی استاد لی کوان پر شدید تنقید کرتے ہوئے اسے چینی فیکٹر کا ایجنٹ قرار دیا۔ ساتھ ہی اسے اینٹی ملائی اور اینٹی ملائیشیا بھی کہا۔ اس وقت لی کوان کی نہ صرف ملائیشیا بلکہ ساری دنیا میں بہت عزت تھی اور لوگ اس کے ویژن سے متاثر تھے۔ کسی نے آج تک اس پر اتنی سخت تنقید نہیں کی تھی۔ مہاتیر نے کہا۔

"اگر سنگاپور فیڈریشن سے الگ نہیں ہوا تو وہ وقت دور نہیں جب اس ایوان میں کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوگا اور ملایا کے عوام بے بس ہو جائیں گے۔"

مہاتیر کی تگ و دو رنگ لائی اور ابھی اسے پارلیمنٹ میں آئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ پارلیمنٹ نے متفقہ ووٹ سے سنگاپور کو فیڈریشن سے الگ کر دیا اور سنگاپور کے ارا کین نے غیر حاضر رہ کر اس فیصلے پر پہلے ہی مہر ثبت کر دی تھی۔ یوں ملائیشیا کی فیڈریشن ان تمام ملکوں سے الگ ہو گئی جن سے اس نے اتحاد کیا تھا۔ ممکن ہے اگر یہ ممالک آج ملائیشیا کے ساتھ ہوتے تو وہ کہیں زیادہ ترقی یافتہ ملک ہوتا۔ مگر اس کا بھی امکان تھا مہاتیر کے اندیشے کے مطابق یہاں چینی غالب آجاتے۔ اس وقت ملائیشیا میں چینی نژاد افراد کل آبادی کا ایک تہائی تھے اور سنگاپوری چینی نژاد آبادی سے مل کر یہ تعداد مزید بڑھ جاتی تھی۔ سنگاپور مسلسل چینی نژاد افراد کو اپنے ہاں بسا رہا تھا۔ تاکہ مسلم اور ہندو آبادی کی برتری کو کم کیا جائے۔ اس وقت سنگاپور کی آبادی میں مسلم تیس فیصد تھے اور سنگاپور کا ایک صدر بھی مسلمان رہا تھا۔

فیڈریشن سے علیحدگی نے دونوں ملکوں کی آبادی کے نسلی تناسب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ آج ملائیشیا میں چینی نژاد افراد ایک چوتھائی سے کم رہ گئے ہیں۔ اگرچہ یہ معیشت اور تجارت میں چھائے ہوئے ہیں مگر سیاست میں ان کا اثر بہت کم ہے۔ دوسری طرف سنگاپور میں مسلم آبادی اب صرف بیس فیصد ہے۔ یعنی دونوں ملکوں سے مخصوص نسل اور مذہب کے لوگوں نے ترک وطن کیا۔ سنگاپوری ملائی مسلمان لازمی ملائیشیا آئے اور سنگاپور میں دوسری نسلوں کے مسلمان رہ گئے۔ لیکن ملائیشیا سے جانے والے چینی نژاد افراد نے زیادہ تر امریکا اور یورپ کا انتخاب کیا۔ مشرق بعید اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والے چینی نژاد افراد ایک منصوبے کے تحت مین چائنا سے چینی نژاد افراد کو اپنے پاس بلاتے اور آباد کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی تعداد بڑھا کر اپنی کمیونٹی کو مضبوط کرتے ہیں۔ یہ ان کا وطیرہ ہے اسی وجہ سے دنیا کے ہر قابلِ ذکر شہر میں چائنا ٹاؤن ضرور ملے گا۔ جہاں چینی نژاد افراد اپنے رسم و رواج کے مطابق رہتے ہیں۔

مہاتیر محمد نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ اگر سنگاپور فیڈریشن کا حصہ رہا تھا تو اس کے راستے چینی نژاد افراد مسلسل ملائیشیا میں آکر آباد ہوں گے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب ملائی لوگ ان کے مقابلے میں اقلیت میں چلے جائیں گے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ منچوریا، تبت اور مشرقی

ترکستان میں چینیوں نے ایسا ہی کیا اور وہاں اتنی زیادہ تعداد میں چینیوں کو آباد کیا کہ مقامی آبادی اقلیت میں چلی گئی اور چینی نژاد افراد اکثریت میں آگئے۔ سنگاپور آج چین سے باہر سب سے زیادہ چینی نژاد لوگوں کا تناسب رکھنے والا ملک ہے۔ کیونکہ نصف صدی میں یہاں چینیوں کو منصوبے کے تحت آباد کیا گیا ہے۔ اس لیے مہاتیر نے سنگاپور کی علیحدگی کو اپنا اوّلین سیاسی مشن قرار دیا اور اس پر عمل درآمد کرکے رہا۔ یہ معمولی فیصلہ نہیں تھا اور مہاتیر نے اس فیصلے سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کرکے بتا دیا تھا کہ اسے ابھی بہت آگے جانا ہے۔

مگر فی الحال اسے اپنے فیصلے کی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ 1969 میں ہونے والے الیکشن میں حیرت انگیز طور پر پان ملائیشین اسلامک پارٹی کے یوسف راوا نے اسے شکست دے دی۔ مہاتیر کی اس شکست میں آلور ستار میں آباد چینی نژاد افراد کے ووٹ نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے سیکولر ہوتے ہوئے بھی اسلامی پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دے کر کامیاب کرایا۔ مگر مہاتیر کے لیے یہ شکست غیر متوقع نہیں تھی اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کے حلقے میں چینی نژاد افراد کی خاصی تعداد ہے اور اس نے اپنے حلقے میں ہی اس خطرے کو محسوس کیا تھا۔ مہاتیر نے بچپن سے دیکھا کہ تجارت اور معیشت پر چینی نژاد چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے ملائیوں کے لیے سوائے معمولی ملازمتوں کے اور کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ ملائیشیا کی آزادی میں بھی ان کا کردار اچھا نہیں تھا اور وہ انگریزوں کی مدد سے آگے آئے تھے اس لیے ان کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔

انگریزوں نے یہاں بھی تقسیم کرو اور حکومت کرو والی پالیسی اپنائی تھی۔ یہاں بھی حکومت انہوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے انہیں پسماندہ رکھ کر چینی اور انڈین نژاد افراد کو آگے آنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ملائی مسلمانوں نے اپنے طور پر جدوجہد کی اور اوپر آئے۔ مہاتیر اس کی ایک مثال ہے۔ انگریزوں سے چھٹکارے کے بعد انہوں نے خود کو دوسری اقوام کے برابر لانے کے لیے کسی منفی حربے کی بجائے محنت اور تعلیم کا راستہ اختیار کیا۔ کھلی سیاست اور کھلی معیشت رکھ کر بھی ملائیشیا آج دنیا کی قوت خرید کے لحاظ سے دنیا کی اٹھائیس ویں بڑی معیشت ہے۔ آغاز میں ملائی افراد کی آبادی کم تھی۔ خود ملائیشیا کی آبادی بھی ایک کروڑ سے کم تھی۔ اس لیے حکومت نے آبادی بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی اور دنیا کے ان چند ملکوں میں سے ایک بن گیا جہاں خاندانی منصوبہ کا مفہوم الٹا لیا جاتا ہے۔ وزیراعظم بننے کے بعد مہاتیر نے آبادی میں اضافے کے لیے ہر اضافی بچے پر ماں باپ کو زیادہ الاؤنس دینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محض پچاس برس میں ملائیشیا کی آبادی تین کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے۔

چینی افراد کے انخلا اور اس کے نتیجے میں آبادی میں کمی سے ملکی معاشی ترقی کی رفتار کم ہوئی۔ اس لیے آبادی میں اضافے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چینی اور انڈین نژاد افراد کے مقابلے میں ملائیوں نے اس پالیسی کا خیر مقدم کیا اور اکثر ملائی خاندان پانچ یا زیادہ بچے رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں چینی اور انڈین خاندان دو تین بچے رکھتے ہیں۔ اس لیے بھی آبادی میں ان کا تناسب کم ہوا۔ ملک میں ملائیوں کا تناسب بڑھانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے حکومت نے قوانین میں تبدیلی کی اور ملائیشیا میں پیدا ہونے والے کسی بچے کو صرف اسی صورت میں شہریت کا حقدار سمجھا جاتا ہے کہ جب اس کے ماں باپ دونوں ملائشی ہوں۔ اگر ماں باپ میں سے ایک غیر ملکی ہو تو بچے کو شہریت نہیں ملے گی لیکن اگر دو ملائشی افراد کا بچہ بیرونِ ملک پیدا ہوگا تو اسے شہریت مل جائے گی۔ اس میں ملائی اور غیر ملائی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

یہاں سے مہاتیر کے لیے مشکل دور شروع ہوا۔ ایسا مشکل دور ہر بڑے سیاست دان اور رہنما کی زندگی میں آتا ہے اور یہ مشکل دور اسے آگے لے جاتا ہے۔ چینی ووٹرز نے بہت ہوشیاری سے یو ایم این او اور پی اے ایس میں اپنے ووٹ ان امیدواروں کو دیے جو چینی نژاد افراد کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس الیکشن کے نتیجے میں لارگو حکومت وجود میں آئی اور ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ فسادات پھوٹ پڑے۔ مسلح چینیوں نے ملائی آبادیوں پر حملے کیے اور نتیجے میں سینکڑوں افراد ہلاک ہوئے اور کاروبار تباہ ہوئے۔ تنکو عبدالرحمٰن وزیراعظم تھا۔ مہاتیر نے ان فسادات اور ملائی افراد کی جان و مال کو پہنچنے والے نقصان پر احتجاج کرتے ہوئے حکومت کو اس کا ذمے دار قرار دیا۔ اس نے تنکو کو ایک خط لکھا جو کچھ عرصے بعد منظر عام پر آ گیا اور اس خط میں اس نے تنکو سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا تھا۔

مہاتیر نے کدھا کے چینی نژاد آبادی کے تیور بھانپ

لیے تھے اور اس نے ایک سال پہلے ان فسادات کی پیش گوئی کر دی تھی۔ جب وہ پارلیمنٹ میں تھا مگر اس وقت بھی حکومت نے کوئی توجہ نہیں دی اور جب یہ فسادات رونما ہوئے تو وہ حکومت کو اس کا ذمے دار قرار دینے والا یو ایم این او کا واحد رہنما تھا۔ اختلافات اتنے زیادہ ہوگئے تھے کہ اب مہاتیر کا پارٹی میں رہنا مشکل نظر آرہا تھا۔ اس سال کے اختتام سے پہلے مہاتیر کو پارٹی کی سپریم کونسل سے نکالا گیا اور پھر اسے پارٹی سے بھی نکال دیا گیا۔ یہ سائنو ملائی تنازعے کا عروج تھا۔ مگر اکثریتی آبادی کو صرف ایک رہنما میسر تھا اور باقی سب اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ مہاتیر مسلسل احتجاج کر رہا تھا اور حکومت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس پر سرکاری حکام نے تنکو عبدالرحمٰن سے اس کی گرفتاری کی اجازت مانگی مگر اس نے مہاتیر کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس سے نئے فسادات پھوٹ پڑیں گے اور اس بار ملائیوں کی طرف سے چینیوں پر حملے ہوں گے۔

ایک طرف سیاسی افراتفری جاری تھی اور اسی افراتفری کے دوران مہاتیر محمد نے اپنی پہلی کتاب ”دی ملائی ڈلیما“ لکھی۔ اس کتاب میں اس نے اپنا نظریہ مکمل کر بیان کیا۔ وہ ملائی قوم کو صرف معاشی لحاظ سے اوپر نہیں دیکھنا چاہتا تھا بلکہ وہ ان کو معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے بھی بلند دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کتاب میں افسوس کا اظہار کیا کہ ملائی لوگ بھی چینی نژاد افراد کی طرح صرف دولت اور معیشت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ اپنی معاشرتی اور مذہبی اقدار چھوڑتے جا رہے ہیں۔ کتاب میں توقع کے عین مطابق تنکو عبدالرحمٰن کی حکومت اور طرز سیاست پر شدید تنقید کی گئی تھی اور نتیجے میں اس کی کتاب پر پابندی لگ گئی۔ یہ پابندی 1981 تک برقرار رہی جب تک مہاتیر وزیر اعظم نہیں بن گیا تھا۔ مگر اس پابندی سے فرق نہیں پڑا تھا۔ سنگاپور جس کا مہاتیر شدید مخالف رہا تھا وہاں یہ چھپتی رہی اور غیر قانونی طور پر پورے ملائیشیا میں بکتی رہی۔ ایک وقت آیا کہ ملائیشیا میں یہ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن گئی تھی۔ مزے کی بات ہے کہ مہاتیر وزیر اور نائب وزیر اعظم بن گیا مگر وہ اپنی کتاب سے پابندی نہیں اٹھوا سکا تھا۔

پابندی کے دنوں میں کیونکہ وہ اخبار میں بھی نہیں لکھ سکتا تھا اس لیے اس نے تنکو حکومت کے خلاف چھوٹے مضامین لکھنا شروع کر دیے جو پمفلٹس کی صورت چھپ کر پورے ملک میں پھیلتے رہے۔ عوام مہاتیر کے ہم نوا تھے اور بالآخر اس کے دباؤ پر تنکو کو 1970 میں وزارت اعظمیٰ سے استعفا دینا پڑا۔ اسے صرف وزارت اعظمیٰ سے ہی ہاتھ نہیں دھونا پڑے تھے بلکہ پارٹی میں اس کی قوت بھی ختم ہوگئی تھی۔ تنکو بے شک ملائیشیا کی آزادی کا ہیرو تھا مگر جہاں تک انتظامی صلاحیتوں کی بات تھی تو وہ عام سا سیاست داں تھا جس کے پاس نہ کوئی وژن تھا اور نہ ہی ملک کو تیزی سے ترقی دینے کی صلاحیت تھی۔ اس نے طویل عرصے تک وزیر اعظم کا دفتر اپنے پاس رکھا لیکن اس کے دور میں ملک نے نہایت معمولی سی ترقی کی۔ کرپشن اور اقربا پروری عام ہوئی۔ سرکاری فنڈز اور باہر سے آنے والی امداد غیر ضروری منصوبوں پر خرچ کر دی گئی اور غریب عوام کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اگرچہ ملائیشیا نے تعلیمی میدان میں ترقی کی اور شرح خواندگی بیس فیصد سے بڑھ کر اسی فیصد تک جا پہنچی تھی لیکن ملک میں اعلیٰ تعلیم کی شرح بہت کم تھی۔ اچھے کالجز اور یونیورسٹیوں کی کمی کا یہ عالم تھا کہ ملائیشیا کے شہزادے اعلیٰ تعلیم کے لیے اس زمانے میں پاکستان آتے تھے۔

یہی حال صنعت کاری کا تھا۔ ملک کی زرعی پیداوار اور معدنیات خام حالت میں ہی برآمد کر دی جاتی تھیں جس سے بہت معمولی زر مبادلہ ملتا تھا۔ ملک میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر تھے مگر ان کی دریافت اور ان سے فائدہ اٹھانے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ کوالالمپور بہ مشکل ہی بڑا شہر کہا جا سکتا تھا۔ باقی شہروں کی حالت دیہات سے مختلف نہیں تھی۔ عوام کا معیار زندگی ویسا ہی تھا جیسا کہ آزادی سے پہلے تھا۔ مہاتیر کو یہ دیکھ کر سب سے زیادہ افسوس ہوتا تھا کہ جو ملائی معاشی اور معاشرتی لحاظ سے اوپر جاتے تھے۔ وہ اپنے ہم نسلوں کی مدد کرنے کے بجائے ان سے فاصلہ پیدا کر لیتے تھے اور وہ زیادہ تر چینی کمیونٹی سے گھلنا ملنا پسند کرتے تھے۔ بلکہ ملائی افراد نے ان سے رشتے لینا دینا بھی شروع کر دیے تھے جس پر عوامی دباؤ کے بعد تنکو کی حکومت نے پابندی لگائی تھی۔ ملائی لڑکیاں اپنی کمیونٹی کی بجائے چینی اور انڈین لڑکوں سے شادی کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ ملائیوں میں غربت تھی۔

تنکو عبدالرحمٰن روایتی سیاست داں تھا جس کا اصل مقصد کسی صورت بھی اقتدار سے چمٹے رہنا ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے سمجھوتے کرتا ہے۔ تنکو نے بھی سمجھوتے کیے۔ نتیجے میں اس کی حکومت عوام کے لیے کچھ نہ کر سکی اور بالآخر

اسے حکومت سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد عبدالرزاق حسین نے وزارت اعظمیٰ سنبھالی اور وہ مہاتیر کے حامیوں میں سے تھا۔ اس نے مہاتیر کو مجبور کیا کہ وہ پارٹی میں واپس آئے اور سیاست میں بھرپور حصہ لے۔ مہاتیر کو بھی سوائے تنکو عبدالرحمٰن کے اور کسی سے مسئلہ نہیں تھا اس لیے اس نے پھر سے پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ دو سال بعد 1973 میں اسے سینیٹر مقرر کیا گیا۔ عبدالرزاق کی حکومت میں پارٹی میں واپس آتے ہی مہاتیر بہت تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ اسی سال وہ واپس سپریم کونسل میں آیا اور جلد اسے عبدالرزاق کی کابینہ میں جگہ مل گئی اور اسے وزیرِ تعلیم مقرر کیا گیا۔ یہ مہاتیر کی پسندیدہ وزارت تھی۔

اگلے سال 1974 میں وہ پھر قومی اسمبلی میں واپس آیا۔ کدھا سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے رکن کو یانگ پاسو نے استعفا دے دیا اور مہاتیر اس کی نشست پر الیکشن جیت کر قانون ساز ادارے کا ممبر بن گیا۔ وزیرِ تعلیم کے طور پر اس نے سب سے پہلے یونیورسٹیوں میں اصلاحات کیں کیونکہ پچھلے دو عشروں میں ملائیشیا میں درجنوں یونیورسٹیاں قائم ہوئی تھیں لیکن ان کا تعلیمی معیار بہت پست تھا۔ مہاتیر نے معیار کی پستی کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی اور اس کی سفارشات کی روشنی میں سب سے پہلے یونیورسٹیوں پر پابندی لگائی کہ وہ طلبا کی سیاسی سرگرمیوں میں شمولیت کم کریں۔ اس وقت طلبا سیاسی سرگرمیوں میں بہت متحرک تھے اور ان کی توجہ تعلیم پر کم تھی۔ مگر طلبا یونین کی طاقت سے وہ نہ صرف پاس ہو جاتے تھے بلکہ بیرونِ ملک سے آنے والی اسکالرشپ حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہتے تھے۔

مہاتیر محمد کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی کی اکیڈمک کمیونٹی کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی مگر وہ اپنی اصلاحات پر ڈٹا رہا اور اس نے یونیورسٹیوں کو ہدایت کی صرف ان طلبا کو بیرونِ ملک کے اسکالرشپ فراہم کیے جائیں جو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے ہیں۔ اس طرح اسکالرشپ مستحق طلبہ کو ملتیں اور طلبہ میں سیاسی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی بھی ہوتی۔ یونیورسٹی کی حدود میں سیاسی اجتماعات پر پابندی لگائی اور تقریبات کے لیے مخصوص ہال طلبہ یونین کے لیے بند کر دیے۔ ساتھ ہی تعلیمی اوقات میں کسی قسم کی سیاسی یا غیر تعلیمی سرگرمی پر پابندی لگا دی تھی۔ مہاتیر کی اصلاحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونیورسٹیوں اور اکیڈمک تعلیمی اداروں میں وسیع پیمانے پر تعلیمی سرگرمیاں شروع ہو گئیں اور کلاسوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا سلسلہ رک گیا۔ جس نے تعلیمی سرگرمیوں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مہاتیر نے اسکول کی سطح پر تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے ایک منصوبے کا آغاز کیا۔ اس کے تحت اسکولوں کو بہتر عمارات، فرنیچر، سہولیات اور اساتذہ کی فراہمی شروع کی گئی۔ ٹیچرز کی تنخواہیں ان کی قابلیت سے مشروط کر دی گئیں نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تعلیم کے شعبے میں آنے لگے۔ مہاتیر نے پرائمری تعلیم لازمی کرنے کا قانون پاس کرایا۔ جو والدین اپنے بچوں کو اسکول میں داخل نہیں کراتے تھے ان کو سزا اور جرمانہ کیا جا سکتا تھا۔ جب کئی سو والدین جیل گئے اور انہیں ہزاروں رنگٹ کے جرمانے بھرنے پڑے تو قانون پر خود بہ خود عمل کیا جانے لگا۔ 1977 تک ملائیشیا کے سو فیصد بچے پرائمری تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہائی اسکول تک تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی صدی کے آغاز سے قبل ملائیشیا میں ہائی اسکول کی سند حاصل کرنے والے طلبہ کا تناسب پچانوے فیصد ہو گیا جو ترقی یافتہ ممالک سے کم نہیں ہے۔

ایک طرف مہاتیر تعلیمی اصلاحات کے پروگرام پر عمل پیرا تھا تو دوسری طرف وہ پارٹی میں اوپر آنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ پارٹی میں تین نائب صدور کا انتخاب ہونے والا تھا اور یہ انتخاب مستقبل کی لیڈرشپ کا فیصلہ کرتا۔ مہاتیر بھی اس کی دوڑ میں شامل تھا۔ اس انتخاب کی وجہ یہ بھی تھی کہ وزیراعظم عبدالرزاق اور اس کے نائب حسین عون کی صحت گر رہی تھی اور لگ رہا تھا کہ جلد یا بدیر اپنا دفتر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انتخاب میں تین افراد منتخب ہوئے۔ ان میں ملاکا کا سابق وزیر اعلیٰ غفار بابا، تنکو حمزہ جو ایک دولت مند تاجر اور کلنتن کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تیسرا فرد مہاتیر محمد تھا۔ ادھر ان تینوں کا انتخاب عمل میں آیا اور ادھر وزیراعظم عبدالرزاق دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کا نائب حسین عون خود بہ خود نیا وزیراعظم بن گیا اور اب اس کے لیے مشکل ترین مرحلہ اپنے لیے ایک نائب وزیراعظم کا انتخاب کرنا تھا۔

اس دوڑ میں تنکو حمزہ مضبوط اُمیدوار تھا۔ لیکن وہ نوجوان تھا اور ناتجربے کار تھا۔ دوسری طرف غفار بابا تجربے کار تھا مگر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا اور نہ ہی انگریزی روانی سے بول سکتا تھا۔ ایسے میں مہاتیر ایک قدرتی انتخاب

بنتا تھا۔ وہ تجربے کار تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ملکی اور بین الاقوامی امور پر اس کی نظر گہری تھی۔ حسین عون کی نظر میں وفاقی وزیر غزالی شفیع بھی تھا۔ وہ قابلیت اور مہارت میں مہاتیر کے قریب آتا تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ عبدالرزاق کے برعکس حسین سے مہاتیر کے تعلقات کبھی بہت گہرے نہیں رہے اور حسین عبدالرحمٰن ٹنکو کا بڑا مداح تھا۔ اس کے خیال میں آزادی کے لیڈر کی حیثیت سے عبدالرحمٰن اس انجام کا مستحق نہیں تھا جو اسے مہاتیر کی مخالفت کی وجہ سے بھگتنا پڑا تھا۔ ٹنکو ابھی حیات تھا مگر وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ اپنی زندگی میں اپنے سب سے بڑے مخالف کو اپنے ہی عہدے پر دیکھنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

یہ تمام معاملات مہاتیر کی نظر میں تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ نائب وزیراعظم کے طور پر اس کی تقرری کا امکان بہت کم ہے۔ اس لیے جب اسے نائب وزیراعظم بنانے کا اعلان کیا گیا تو اسے حیرت آمیز خوشی ہوئی تھی۔ اس وقت مہاتیر کو صحیح معنوں میں پارٹی میں اپنی مقبولیت کا احساس ہوا۔ یہ یقیناً درمیانے درجے کی لیڈرشپ اور کارکنان کا دباؤ تھا جو حسین اسے اپنا نائب بنانے پر مجبور ہوا۔ اس فیصلے کے پس پشت جو بھی وجوہات ہوں مگر یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ملائیشیا کا اگلا وزیراعظم مہاتیر ہی ہوگا۔ نائب وزیراعظم کے طور پر مہاتیر کا کیریئر ایک ایسے موڑ پر آ گیا تھا جہاں ملک کا اعلیٰ ترین عہدہ اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ حسین عون کی صحت مسلسل گر رہی تھی اور ایسے میں اگر مہاتیر چاہتا تو سپریم کونسل کی مدد سے اسے ریٹائرمنٹ پر مجبور کر سکتا تھا اور خود اس کی جگہ وزیراعظم بن جاتا۔ مگر سازشیں اور جوڑ توڑ مہاتیر کا مزاج ہی نہیں تھا۔

وہ سیاست میں بھی دل کی بات کھل کر کہنے والا اور بے باک سیاست دان تھا۔ اس کی بنیادی وجہ وہی تھی جو اس قسم کے نایاب سیاست داں کی طرزِ سیاست کی ہوتی ہے۔ انہیں قوم سے کچھ لینا نہیں ہوتا ہے وہ قوم کو دینے والے رہنما ہوتے ہیں۔ اس لیے مہاتیر کی ساری توجہ ان ذمے داریوں پر تھی جو اسے سونپی گئی تھیں۔ وزیرِ تعلیم کے بعد اسے وزیرِ تجارت وصنعت بنایا گیا۔ تعلیم کی حد تک مہاتیر نے ملائیشیا کا قبلہ درست کر دیا تھا اور اس کے دور میں ہی ملائیشیا اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں اس خطے میں سنگاپور کے بعد نمایاں ملک بن گیا تھا۔

اس دوران میں جب کہ مہاتیر سیاست میں ترقی کر رہا تھا اس نے آس پاس کے ترقی یافتہ ملکوں، یورپ اور امریکا کے کئی دورے کیے اور اس نے وہاں ہونے والی ترقی کے اسباب پر غور کیا تھا۔ خاص طور سے اس نے صنعتی ترقی پر غور کیا اور ہر جگہ اس نے محسوس کیا کہ بھاری صنعتیں ہی کسی ملک کی صنعتی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اس لیے وزیرِ صنعت وتجارت بنتے ہی اس نے سب سے پہلے بھاری صنعتوں پر توجہ دی۔ اس نے ملک کی پہلی ہیوی انڈسٹری پالیسی بنائی اور ایک سرکاری کارپوریشن ایچ آئی سی او ایم قائم کی۔ اس کا مقصد بھاری صنعتوں میں سرمایہ کاری کو فروغ دینا اور اس سلسلے میں نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ اس نے خاص طور سے ان صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جو ملائیشین برانڈ بناتیں۔ جیسے کار انڈسٹری جو ایک مکمل ملائیشیا ساختہ کار تیار کرے۔ آج ملائیشیا جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو مکمل طور پر گاڑیاں بنا رہا ہے۔ خاص طور سے اس کی لگژری کلاس کار پروٹون اب عالمی مارکیٹ میں اپنی جگہ بنانے لگی ہے۔ اس کا معیار کسی طرح جدید ممالک کی کاروں سے کم نہیں ہے۔

مہاتیر کی پالیسیوں کا نتیجہ شاندار نکلا اور ملک میں تیزی سے بھاری اور اعلیٰ صنعتیں قائم ہونے لگیں۔ اس نے صنعت کے قیام میں بیوروکریسی کا کردار نہایت محدود کر دیا اور کوئی بھی صنعت قائم کرنے کے لیے ون ونڈو آپریشن متعارف کرایا۔ بہت سی صنعتوں کو لائسنس فری کر دیا اور انہیں صرف قواعد وضوابط کی پابندی کرنا ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ محض تین سال میں ملائیشیا میں بیرونی سرمایہ کاری دس گنا بڑھ گئی۔ بیرونِ ملک سے آنے والی زیادہ تر سرمایہ کاری ان صنعتی پارکس میں آئی تھی جو آئی ٹی اور الیکٹرانکس کی ہائی ٹیکنالوجی مصنوعات کی تیاری کے لیے بنائے گئے تھے۔ دنیا کی تمام کمپیوٹرز اور الیکٹرانکس بنانے والی کمپنیوں نے یہاں اپنے مینوفیکچرنگ پلانٹس لگائے۔ کوالالمپور کو فری پورٹ بنایا گیا اور یہاں کسی قسم کی ڈیوٹی اور ٹیکس کے بنا ساری دنیا سے چیزیں آنے اور جانے لگیں۔

مہاتیر نے اس دور میں بے پناہ محنت کی اور اس کا بیشتر وقت غیر ممالک میں اپنی وزارت اور ملائیشیا کی صنعتی اور تجارتی پالیسیوں کی پروموشن میں گزرتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس مہاتیر نے نائب وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے فرائض پر توجہ نہیں دی۔ وہ یہاں بھی کام کرتا رہا اور اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کے ساتھ ساتھ

وہ حسین عون کو تجاویز بھی پیش کرتا رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہ بااختیار نائب وزیر اعظم نہیں تھا اور حسین پر اس کا اثر بہت کم تھا۔ اس کی بے شمار بے باک تجاویز وزیر اعظم نے مسترد کر دی تھیں۔ مہاتیر سے سرد مہری اور دوری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے دونوں حریف غزالی اور تنکو حمزہ حسین کے مشیر خاص بن گئے تھے اور ان کی تجاویز وہ فوراً مان لیتا تھا۔ اس سے بعض اوقات مہاتیر کو اپنے امور میں دشواری پیش آتی تھی لیکن اس نے ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ اختلافی امور کو تنازعہ بنانے کی بجائے درگزر کر کے اس نے متبادل طریقوں سے اپنا کام چلایا۔ اس کی وزارت میں بھی مداخلت کی جاتی رہی خاص طور سے اس کی سرمایہ کاری کے لیے اوپن پالیسی پر شدید تنقید کی گئی اور اسے مقامی صنعتوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ وہ بہ مشکل حسین کو قائل کر سکا کہ اوپن پالیسی کے بغیر معیشت ترقی نہیں کر سکے گی۔ ملائیشیا چھوٹا ملک ہے اور مقامی وسائل اتنے نہیں ہیں کہ بڑے کارخانے اور پروجیکٹس بنائے جائیں۔ یہ سب بیرونِ ملک سے آنے والی سرمایہ کاری سے ہی ممکن تھا۔ خوش قسمتی سے بات حسین کی سمجھ میں آگئی اور وہ خود بھی بیرونی سرمایہ کاری کا حامی تھا اس لیے مہاتیر کی پالیسی پر عمل درآمد جاری رہا۔

حسین کی صحت گرتے گرتے اس حد تک آپہنچی تھی کہ اب اس کے لیے روزمرہ کے امور انجام دینا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا اور آفس عملاً مہاتیر چلا رہا تھا۔ شروع میں حسین کے مہاتیر سے تعلقات اچھے نہیں تھے اور اس کی بنیادی وجہ بیان کی جا چکی ہے کہ مہاتیر نے تنکو عبدالرحمٰن کی شدید مخالفت کی اور اسے وزارت عظمٰی سے استعفا دینے پر مجبور کیا۔ وہ حسین کا رول سیاسی لیڈر تھا۔ لیکن جیسے جیسے نائب وزیر اعظم کے طور پر اور پھر وزیر صنعت و تجارت کی حیثیت سے اس کی کارکردگی اور خلوص نیت حسین کے مشاہدے میں آتی رہی۔ اس کے دل میں مہاتیر کے لیے موجود جذبہ ختم ہوتا گیا۔ مہاتیر نے اپنے خلاف ہونے والے جوڑ توڑ کا جواب کبھی سازشوں سے نہیں دیا اور نہ ہی وہ روایتی سیاست دانوں کی طرح مکر و فریب میں شامل ہوا۔ اس کے مخالفین اس کے منہ پر کچھ کہتے تھے اور اس کے پیٹھ پیچھے کچھ اور کہتے تھے۔

اس کے برعکس مہاتیر کی دوسروں کے بارے میں ہمیشہ ایک ہی رائے ہوتی تھی۔ جو ان کے منہ پر بھی ہوتی تھی اور پیٹھ پیچھے بھی۔ جس شخص نے عروج کے دور میں ملائیشیا کے بابائے قوم کو نہیں چھوڑا اور اصولی بنیادوں پر اس سے شدید اختلاف کیا اور پارٹی سے نکالے جانے سے لے کر مختلف نوع کی پابندیوں تک سب برداشت کیا۔ وہ کسی چھوٹے درجے کے لیڈر کے لیے کیوں منافقت کا مظاہرہ کرتا؟ اپنی راست بازی اور خلوص و لگن سے بالآخر مہاتیر نے حسین جیسے سخت شخص کے دل میں بھی جگہ بنالی اور جب اس نے وزارت عظمٰی سے ریٹائر ہونے کا اعلان کیا تو ساتھ ہی مہاتیر کو اس منصب کے لیے ملک کا قابل ترین شخص قرار دیتے ہوئے اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ حسین عون نے اپنی آخری سرکاری تقریر میں اسے اس کی وزارتوں اور اصولی سیاست کے حوالے سے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

16 جولائی 1981 کے دن مہاتیر نے وزیر اعظم کا منصب سنبھالا۔ وہ ملائیشیا کا چوتھا وزیر اعظم بنا۔ اس نے سب سے پہلے ایکس نقاط پر مبنی ملک کی پہلی سیکیورٹی پالیسی جاری کی۔ مہاتیر کمیونزم اور کمیونسٹوں کا سخت نقاد رہا تھا اور عبدالرحمٰن تنکو سے اس کے اختلاف کی ایک وجہ تنکو کا کمیونزم اور سوشلزم کے لیے نرم رویہ تھا۔ اسی وجہ سے ملک کو ایک نیم مسلح کمیونسٹ بغاوت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جب کمیونسٹوں نے ملائیشیا میں گوریلا جنگ شروع کرنے کی کوشش کی تو حکومت نے انہیں سختی سے کچل دیا تھا۔ اس کے بعد کمیونسٹوں نے مسلح جدوجہد کی کوشش تو نہیں کی لیکن انہوں نے یو ایم این او سمیت مختلف پارٹیوں میں اثر و نفوذ اور میڈیا میں گھسنا شروع کر دیا۔ مہاتیر نے سیکیورٹی ایکٹ میں ان کی سازشوں کا مکمل سدباب کیا تھا اور یہی سیکیورٹی ایکٹ بعد میں دہشت گردی کے خلاف بھی نہایت موثر ثابت ہوا۔ جب پڑوسی ملک انڈونیشیا میں دہشت گرد اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے اور ان کی موجودگی کا پتا بالی بم دھماکوں کے بعد چلا تو ملائیشیا پہلے ہی اس معاملے میں مستعد تھا اور اس نے کسی کو یہاں جڑ ہی بنانے نہیں دی۔ دہشت گردوں کی راہ میں سیکیورٹی ایکٹ دیوار ثابت ہوا تھا۔

سیکیورٹی ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس کے تحت موثر کارروائیاں کی گئیں اور ایک صحافی صمد اسماعیل اور حسین دور کے ایک نائب وزیر عبداللہ احمد کو زیر زمین کمیونسٹ سرگرمیوں کے الزام میں معطل کر دیا گیا اور انہیں دوبارہ بھی پارٹی یا حکومت میں کوئی عہدہ نہیں دیا۔ مہاتیر کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ آنے والے وقتوں میں دہشت گردی

ایک بڑا مسئلہ ثابت ہوگی۔کمیونسٹوں کا ناقد ہونے کے باوجود اس نے مغرب کی افغانستان میں مداخلت کی حمایت نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب ان کا مطلب نکل جائے گا تو وہ افغانیوں کو آپس میں لڑتا بھڑتا چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یہ مسئلہ سلگتا ہوا آتش فشاں بن جائے گا۔مہاتیر نے پاکستان سے اچھے تعلقات کی وجہ سے اس مسئلے پر ایک غیر جانبدارانہ پوزیشن لی تھی البتہ وہ افغانستان سے روس کے فوری انخلا کا زبردست حامی تھا۔افغانستان کے مسئلے پر ایک امدادی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کھل کر کہا کہ اگر روس افغانستان سے فوجی شکست کھا کر نکلا تو یہ اس پورے خطے کے لیے آنے والے دنوں میں وسیع تباہی کا سبب بنے گا۔ مہاتیر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ یہ خطہ آج بھی آتش فشاں بنا ہوا ہے اور اس کے سرد ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے ہیں۔

ملایا کا خطہ روایتی طور پر کئی سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا اور اس پر مختلف شاہی خاندان حکومت کرتے رہے تھے۔ جب یورپ والوں نے یہاں قبضہ کیا تو انہوں نے سلطانوں کو برائے نام اقتدار پر برقرار رکھا اور ان کی مدد سے حکومت کرتے رہے۔ سب سے آخر میں انگریز آئے اور انہوں نے بھی ان ریاستوں کو برقرار رکھا۔ جب انگریز یہاں سے جاتے ہوئے اقتدار ریاست والوں کے سپرد کر گئے تو انہوں نے بھی ملایا کے ان روایتی سلطانوں کو برقرار رکھا اور یہ اپنی ریاست کے حکمران ہونے کے ساتھ پانچ سال کے لیے باری باری ملک کے شاہ بنتے تھے اور انہیں ہیڈ آف دی اسٹیٹ کا خطاب دیا گیا۔اس حیثیت سے انہیں محدود اختیارات حاصل تھے لیکن اپنی ریاست میں ان کے اختیارات خاصے زیادہ تھے۔ان میں سے بہت سے اختیارات عوامی مفاد کے خلاف تھے۔

اپنی حکومت کے ابتدائی دو سال مہاتیر نے اپنی ساری توجہ اپنی قوت بڑھانے، یو ایم این او میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے اور 1982 میں ہونے والے انتخابات میں پارٹی کی فتح پر مرکوز رکھی تھی۔ جب مہاتیر وزیر اعظم بنا تو سلطان یانگ دی پرچون ہیڈ آف دی اسٹیٹ تھا۔1983 میں اس کی جگہ پیرک کا سلطان ادریس شاہ دوم ہیڈ آف دی اسٹیٹ بنا۔اس وقت ایک جدید ریاست کی حیثیت سے ملائیشیا میں یہ سوال زور پکڑ گیا تھا کہ جمہوری اور شاہی نظام

ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں؟ جب کہ سلطانوں کو عوام پر بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ جوہور کے سلطان اسکندر پر چند سال پہلے ہونے والے ایک قتل عام کا الزام آتا تھا۔ اس کی اور ادریس شاہ کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ اسکندر پر جس قتل عام کا الزام تھا اس کے زیادہ تر شکار ادریس شاہ کی ریاست کے سابق باسی تھے جو اسکندر کی ریاست میں جا کر آباد ہوئے تھے۔

مہاتیر نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ان سلطانوں کے اختیارات میں کمی کی جائے اور انہیں کم سے کم عوامی حقوق کے معاملے میں آزاد نہ چھوڑا جائے۔ اس نے پارلیمنٹ میں ایک قرارداد پیش کی جس کی رو سے کوئی بھی ریاستی حکمران ایسا بل پاس نہیں کر سکتا تھا جس کی منظوری پندرہ دن کے اندر ملائیشیا کی پارلیمنٹ سے نہ لی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مذکورہ ریاستی بل خود بہ خود کلِ عدم ہو جائے گا۔ اس طرح مہاتیر نے ان سلطانوں کی ازخود اختیارات حاصل کر لینے کی راہ مسدود کر دی کیونکہ وہ آئے دن اپنی مرضی سے ریاستی آئین میں ترامیم کرتے رہتے تھے۔ نائب وزیراعظم کے طور پر مہاتیر نے سلطانوں کے اختیارات کم کرنے کے لیے متعدد آئینی سفارشات حسین کو پیش کیں مگر اس نے انہیں مسترد کر دیا۔ مہاتیر شاہی خاندانوں کا مخالف نہیں تھا لیکن اسے ان کے عوام پر اختیارات قابلِ قبول نہیں تھے۔

اس نے جو آئینی ترامیم پیش کی تھیں ان میں ہیڈ آف دی اسٹیٹ سے ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار لے کر وزیراعظم کو دینے کی ترمیم بھی شامل تھی۔ ظاہر ہے یہ ساری ترامیم سلطانوں کے ہاتھ کاٹ دینے کے مترادف تھیں اور ان کا صدیوں سے اس علاقے میں جو اقتدار تھا وہ ان ترامیم کے بعد برائے نام رہ جاتا اس لیے سلطانوں کے سربراہ احمد شاہ آف پی ہانگ نے تمام سلطانوں کی حمایت سے ان آئینی ترامیم کو مسترد کر دیا۔ مگر مہاتیر نے اس مخالفت کی پروا نہیں کی اور ترامیم کو پارلیمنٹ میں پیش کر دیا جہاں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے اسے بھاری اکثریت سے منظور کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطانوں کے ستائے عوام بھاری تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے اور وہ آئینی ترامیم کو مسترد کرنے پر سلطانوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ پریس اور میڈیا نے حکومت کا مکمل ساتھ دیا۔ اپوزیشن احتجاج میں شامل تھے۔

دوسری طرف ملائی عوام کی ایک بڑی اقلیت جس میں یو ایم این او کے رہنما کمیونسٹ اور چینی نژاد افراد شامل تھے سلطانوں کی حمایت کر رہی تھی مگر یہ واضح تھا کہ عوام اور سیاست دانوں کی اکثریت اب سلطانوں کو صرف آئینی حکمران دیکھنا چاہتی تھی اور انتظامی اختیارات صرف اپنے چنے ہوئے حکمرانوں کے پاس چاہتی تھی۔ پانچ مہینے پر محیط ہنگاموں اور پُرتشدد احتجاج کے بعد مہاتیر اور سلطان ایک معاہدے پر آمادہ ہو گئے جس کے تحت ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو ایمرجنسی کے نفاذ کا اختیار مل گیا مگر سلطانوں کی ازخود آئینی ترامیم کا اختیار ان سے چھن گیا اور اگر پارلیمنٹ کسی ریاست کے بارے میں کوئی قانون پاس کرتی تو سلطان کو اسے مسترد کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ یوں صدیوں بعد ملائی عوام کو سلطانوں کے تسلط سے نجات ملی اور ان کے تمام حقوق انہیں مل گئے اب کوئی سلطان ان کا کوئی حق سلب نہیں کر سکتا تھا۔

مہاتیر کے اقتدار کے یہ ڈھائی سال مشکل تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے حکومتی ذمے داریوں میں کوئی کوتاہی کی اور وہ جو منصوبے ذہن میں لے کر آیا تھا ان کے نفاذ میں سستی کی ہو۔ سیکیورٹی ایکٹ کے بعد اس نے اپنے پیشرو سے بالکل مختلف معاشی پالیسی تشکیل دی۔ اس پالیسی کا محور ان علاقوں کو ترقی کے لحاظ سے اولیت دینا تھا جو اپنے انفرااسٹرکچر اور اکیڈمک سرگرمیوں کے لحاظ سے آگے تھے۔ یہ بہت سیدھی سی پالیسی ہے جو علاقے آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہے ہوں مرکزی حکومت انہیں سپورٹ کرے۔ اس سے نجی شعبے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں امریکا نے بھی پالیسی اختیار کی تھی۔ اس پر عمل کرتے ہوئے امریکا کی مغربی ریاستیں کم وسائل کے باوجود اپنے انفرااسٹرکچر اور انسانی وسائل کو ترقی دے وفاقی حکومت سے زیادہ فنڈز حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ مہاتیر نے اسے بومی پترا (ملائیشیا ملائی اور انفرادیت کے لیے) کا نام دیا۔

اس کے تحت اس نے سرکاری کارپوریشن کی نج کاری کی تاکہ حکومت تاجروں اور صنعت کاروں کی مدد کرے نہ کہ ان سے مقابلہ کرے۔ مہاتیر نے ان صنعتوں کو خاص اہمیت دی جو ملائیشین برانڈ لا رہی تھیں۔ جیسے آٹو انڈسٹری تھی۔ ستر کے عشرے میں ملائیشیا میں ویہنڈرا انڈسٹری کا نام و نشان نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ حکومتی حوصلہ افزائی پر پروزہ

ساز ادارے وجود میں آنے لگے۔ مہاتیر کی نئی پالیسی نے اس صنعت کو مہمیز کیا اور نوّے کے عشرے کے آخر تک ملائیشیا تمام اقسام کی آٹو موبائلز ملک میں تیار کرنے لگا تھا۔ نئی صدی کے آغاز میں ملائیشیا آٹو انڈسٹری بین الاقوامی مارکیٹ میں حصہ لینے کے قابل ہو چکی تھی اور اب الیکٹرانکس کے بعد آٹو موبائل ملائیشیا کی اہم برآمدات میں شامل ہیں۔ مہاتیر نے بھانپ لیا تھا کہ آٹو انڈسٹری کے بغیر ملک بھاری صنعت کاری میں آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔

پچھلے دو وزرائے اعظم نے ملک میں سرکاری شعبے میں کارپوریشنوں کی بھرمار کر دی تھی اور جب مہاتیر محمد کو اقتدار ملا تو تقریباً سب ہی سرکاری کارپوریشنز بھاری خسارے میں جارہی تھیں۔ ان کا خسارہ حکومتی بجٹ پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ مہاتیر نے پریس، ٹریڈ یونینز اور اور اپنی پارٹی کے سیاست دانوں کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر نہایت تیز رفتاری سے سرکاری تجارتی اداروں کو نجی شعبے میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ائر لائنز، بینک، یوٹیلٹی ادارے، انرجی کارپوریشنز اور ٹیلی کمیونیکیشنز کارپوریشنوں کو نجی شعبے کے حوالے کیا اور نوّے کی دہائی میں اس کی رفتار پچاس ادارے فی سال بنتی تھی۔ جو نجی شعبے کو فروخت کیے گئے۔ اس سے بجٹ خسارے میں بہت تیزی سے کمی آئی اور حکومت کو ترقیاتی کاموں کے لیے اضافی رقوم ملنے لگیں۔ مہاتیر کی نج کاری پالیسی تیسری دنیا کے ان ملکوں کے لیے ایک مثال ہے جو اسی سرکاری کارپوریشنوں کے بوجھ تلے دب کر اپنی عوام کے لیے کچھ نہیں کر پاتے ہیں۔

مہاتیر نے صرف ادارے فروخت نہیں کیے بلکہ ان کی بولی کا نظام بہت شفاف بنایا اور صرف ادارے فروخت کیے۔ ان سے منسلک وہ مراعات جو انہیں سرکاری ادارہ ہونے کی حیثیت سے ملی تھیں۔ وہ واپس لے لیں جیسے زمین اور یوٹیلیٹیز کی سبسڈی کے ساتھ فراہمی۔ اس نے ادارے اور ان سے متعلقہ دوسری چیزیں الگ الگ فروخت کیں یا انہیں حکومتی تحویل میں رکھا۔ جن لوگوں نے یہ ادارے خریدے ان کی کاروباری صلاحیت جانچی کہ وہ یہ ادارے چلا بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ حکومت نے نگران مقرر کیے جو فروخت ہونے والی انڈسٹری یا کارخانے کی کارکردگی پر نظر رکھتے تھے اور اگر خریدار اسے چلانے سے یا نفع بخش بنانے سے قاصر ہوتا تو اس سے ادارہ یا انڈسٹری واپس لے کر دوبارہ فروخت کے لیے پیش کی جاتی تھی۔ ناکام مالک کو نہ صرف بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا بلکہ اسے آیندہ کے لیے کسی بھی نج کاری میں شمولیت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یہ سخت قواعد و ضوابط تھے جس کی وجہ متعدد ادارے اور کارخانے یو ایم این او کے ملائی حامیوں کو بغیر کسی اوپن ٹینڈر کے فروخت کیے گئے۔ مہاتیر کا مقصد ملائی نسل کے افراد کو معاشی طور پر آگے لانا تھا۔ اس کی ایک مثال ملک کے لیے نہایت اہم شمالی جنوبی شاہراہ تھی۔ یہ اعلیٰ درجے کی موٹروے تھی جو تھائی لینڈ کے پاس سے ہو کر سنگاپور تک جاتی تھی۔ اسے ایک بزنس وینچر کو دے دیا گیا جس میں یو ایم این او کے متعدد چھوٹے کاروباری شامل تھے۔ مگر جو ادارے اس طرح اوپن ٹینڈر کے بغیر دیے گئے۔ ان پر بھی قواعد و ضوابط لاگو ہوئے اور اگر انہیں چلانے والے ناکام رہے تو ان سے فروخت شدہ ادارے واپس لے لیے گئے۔ مہاتیر حکومت کی اس پالیسی کا نتیجہ ریونیو میں ڈرامائی انداز میں اضافہ اور روزگار کے لاکھوں نئے ذرائع کی صورت میں نکلا۔ ان اداروں اور صنعتوں میں جو افراد کام کرتے تھے ان کے مفادات کا بھی پورا خیال رکھا گیا تھا۔

سابق حکومت نے جاپان کی مٹسوبشی کے تعاون سے ملائیشیا میں پروٹون کار مینوفیکچرنگ انڈسٹری لگائی۔ مگر یہ خسارے کا سودا ثابت ہوئی اور اس کی تیار کردہ کاروں کی مانگ کم تھی۔ مگر جب اسے ایک ملائی وینچر کے ہاتھوں فروخت کیا گیا تو یہ انڈسٹری منافع بخش اور بہت تیزی سے عالمی معیار کی آٹو انڈسٹری بن گئی۔ یہی نہیں بلکہ مٹسوبشی سے جان چھڑانے کے بعد اس نے اپنے ماڈلز متعارف کرائے جو مکمل طور پر ملائیشیا میں تیار ہوئے تھے۔ مہاتیر نے اس انڈسٹری کے لیے ان نئے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان انجینئرز اور بزنس مینوں پر بھروسا کیا تھا جو بیرونِ ملک سے پڑھ کر اور اس کام کا تجربہ لے کر آئے تھے۔ وہ مہاتیر کے اعتماد پر پورے اترے اور انہوں نے مختصر سی مدت میں ملائیشیا کو آٹو موبائل کے شعبے میں بیرونی آٹو موبائلز سے نجات دلا دی۔ اسی طرح ملائیشیا ہائی ٹیک انڈسٹری میں بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔

اپنے اقتدار کے ابتدائی برسوں میں مہاتیر کو پان اسلامک پارٹی یعنی پی اے ایس کے خطرے کا سامنا تھا۔ اس نے اس کا تدارک بڑی حکمتِ عملی سے کیا۔ اس پارٹی نے 1970 میں یو ایم این او کی حکومت میں شمولیت اختیار کی اور اس کے لیڈر یوسف راوا نے مہاتیر کو اس کی قومی اسمبلی کی

نشست سے محروم کر دیا تھا۔ پی اے ایس کا مقصد ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ اور یہاں بسنے والے مسلمانوں کی زندگی کو اسلام کے مطابق بنانا تھا۔ مہاتیر نے اس خطرے کو شدت سے محسوس کیا اور اس نے مسلم ووٹروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے متعدد اقدامات اٹھائے۔ ان میں ایک بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام بھی تھا جہاں اسلام کی تعلیم سرکاری سرپرستی اور نگرانی میں دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ریاستوں کو اسلامی نظام سے متعلق دستور سازی کی اجازت دی گئی۔ مہاتیر ملائیشین اسلامک موومنٹ کے سربراہ انور ابراہیم سے بہت متاثر تھا۔ اس کی کوشش سے وہ اور اس کی پارٹی یو ایم این او کا ایک حصہ بن گئی۔

مگر دوسری طرف مہاتیر نے شدت پسندوں کی سختی سے مخالفت کی اور ان سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا۔ جیسے ابراہیم لیبیا جو ایک معروف اسلام پسند لیڈر تھا۔ 1985ء میں مسلح مقابلے میں پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ ابراہیم طاقت کے زور پر ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے نوجوانوں میں خاصا اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اسی طرح ایک انتہا پسندانہ خیالات کا پرچار کرنے والی اسلامی تنظیم ال ارقم اور اس کی قیادت پر پابندی لگا دی گئی۔ ایک اور اسلامی لیڈر اعشاری محمد کو انٹرنل سیکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا تھا۔ مہاتیر کے ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1986ء کے الیکشن میں پی اے ایس کو عبرت ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ قومی اسمبلی میں اس کی چوراسی میں سے تراسی نشستیں یو ایم این او نے حاصل کر لیں اور پی اے ایس کے پاس صرف ایک نشست باقی رہی تھی۔

حکومتی کامیابیوں سے قطع نظر مہاتیر کی سیاسی مشکلات کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے وزیراعظم بننے کے بعد موسیٰ ہتیم کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ وہ اس کا ساتھی تھا اور مہاتیر اس پر بھروسا کرتا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا آپس کا تعلق کمزور ہوا اور موسیٰ نے نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے استعفا دے دیا۔ 1987ء میں پارٹی کے نئے الیکشن ہو رہے تھے۔ ایسے میں مہاتیر کا پرانا حریف تنکو حمزہ پارٹی صدارت کا امیدوار بن کر سامنے آیا۔ وہ اگرچہ مہاتیر کی کابینہ میں شامل تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ مہاتیر کی وجہ سے اس کا کیریئر ختم ہو رہا ہے اور اس نے موقع پاتے ہی مہاتیر کے نئے مخالف موسیٰ ہتیم سے اتحاد کر لیا۔

مہاتیر نے اس سیاسی چال کا جواب بھی سیاست سے دیا۔ اس نے اپنے پرانے حریف غفار بابا کو ساتھ ملا لیا اور اب پارٹی کی صدارت اور نائب صدارت کے لیے وہ اس کی ٹیم کا حصہ تھا۔

پریس نے مہاتیر اور غفار بابا کو ٹیم اے اور حمزہ و موسیٰ کو ٹیم بی کا خطاب دیا تھا۔ مہاتیر کو پریس و میڈیا کی وسیع حمایت کے علاوہ اسکندر کی حمایت بھی حاصل تھی۔ دوسری طرف ٹیم بی کو یو ایم این او میں صرف ایک قابل ذکر لیڈر عبداللہ بداوی کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے باوجود مہاتیر 718 کے مقابلے صرف 761 ووٹ لے کر کامیاب ہو سکا۔ البتہ اس کا نائب غفار بابا نے موسیٰ کو بھاری مارجن سے شکست دی تھی۔ اس شکست نے مہاتیر کو احساس دلایا کہ وہ پارٹی میں اتنا مقبول نہیں ہے جتنا کہ اس کا خیال تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کابینہ سے ان سات وزیروں کو فارغ کیا جنہوں نے ٹیم بی کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف تنکو حمزہ نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ ابھی یہ مشکلات جاری تھیں کہ ہائی کورٹ نے ایک فیصلے میں یو ایم این او کو ایک غیر قانونی جماعت قرار دے دیا کیونکہ اس کے کچھ حصے قانون کے لحاظ سے رجسٹرڈ نہیں تھے۔

اس فیصلے کے خلاف اپیل میں جانے کے بجائے مہاتیر اور اس کے ساتھیوں نے فوری نئی جماعت کی تشکیل کی اور اسے یو ایم این او کے نام سے ہی رجسٹرڈ کرانے کی درخواست دی۔ وہ یو ایم این او ملائیشیا کا نام چاہتے تھے مگر ان کی یہ درخواست مسترد ہو گئی کہ یہ نام پہلے ہی تنکو حمزہ کی بنائی جانے والی نئی سیاسی جماعت کو دے دیا گیا تھا۔ اس سیاسی جماعت کو سابق وزرائے اعظموں تنکو عبدالرحمٰن اور حسین کی حمایت حاصل تھی جو اس وقت حیات تھے۔ اس بحران میں پارٹی ایکٹ سیکشن 46 نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مہاتیر نے اسے تو پارلیمنٹ سے تبدیل کرا لیا مگر اب وہ عدلیہ کے خلاف ہو چکا تھا جس نے ٹیم بی کی حمایت میں فیصلہ دیا اور پوری پارٹی کو ہی غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔

اس نے پارلیمنٹ سے ایک آئینی ترمیم کرائی جس کی رو سے عدلیہ سے کسی بھی معاملے کو ری ویو کرنے کا اختیار ختم کر دیا گیا اور اب عدالت فیصلے پر فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اب عدالت صرف اسی معاملے کو دیکھ سکتی تھی جو پارلیمنٹ کی طرف سے اسے بھیجا جائے۔ یوں مہاتیر نے پارلیمنٹ کو

عدلیہ پر فوقیت دے دی تھی۔ اس پر سپریم کورٹ کے صدر صالح عباس نے ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو ایک احتجاجی خط بھیجا۔ اور مہاتیر نے اسے اس کے عہدے سے ہٹا دیا۔ اس نے ایک جوڈیشنل کمیشن بنایا جس نے صالح عباس پر فرد جرم عاید کی اور سپریم کورٹ کے جن پانچ ججوں نے اس کی حمایت کی انہیں بھی اس کے ساتھ ہی فارغ کر دیا گیا۔ ایک سپریم کورٹ بنچ تشکیل دیا گیا جس نے ٹیم بی کی اپیل خارج کر دی اور مہاتیر کو اجازت دی کہ وہ یوایم این او کا نام سیاسی پارٹی کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ مہاتیر کو فتح ملی تھی مگر پریس اور قانون کے ماہرین نے اسے ملائیشیا میں آزاد عدلیہ کی تباہی قرار دیا تھا۔

ایک طرف یہ بحران جاری تھا تو دوسری طرف مہاتیر نے انٹرنل سیکیورٹی ایکٹ کا ہتھیار لے کر اپوزیشن کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ اس نے سب سے پہلے ملک کے اسکولوں میں مینڈرین زبان کو ممنوع قرار دیا اور ان چینی اسکولوں میں بھی اب ملائی زبان میں پڑھانے کا حکم دیا۔ اس پر ملائیشین چائنیز ایسوسی ایشن اور گیراکان جو پہلے مہاتیر کے اتحادی تھے اس سے الگ ہو کر اپوزیشن پارٹی ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی کے احتجاج میں شامل ہو گئے۔ مہاتیر نے بے دریغ انٹرنل سیکیورٹی ایکٹ استعمال کیا اس کے تحت اپوزیشن کے ایک سو انیس اہم رہنما گرفتار کر کے بغیر کسی قانونی کارروائی کے جیل میں رکھے گئے۔ تین اہم ترین اپوزیشن کے اخبارات بند کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی یوایم این او کے نوجوان لیڈرز کو بھی گرفتار کیا گیا۔ جبر اور سخت ہاتھ استعمال کر کے مہاتیر احتجاج کو دبانے میں کامیاب رہا تھا مگر اسے اس کی قیمت صحت کی صورت میں دینا پڑی۔ مسلسل کام اور دباؤ نے اس کے دل پر اثر کیا اور 1987 میں اسے ہارٹ اٹیک ہوا۔

اس وقت ملائیشیا میں صحت کی سہولتیں اتنی جدید نہیں تھیں اور مہاتیر کو بیرون ملک لے جانے کا مشورہ دیا گیا مگر اس نے یہ مشورہ مسترد کر دیا اور اپنا علاج ملائیشیا میں ہی کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ملائیشیا کے دولت مند علاج کے لیے سنگاپور اور دوسرے ملکوں جاتے تھے مگر جب مہاتیر نے اپنے ڈاکٹروں اور اسپتالوں پر بھروسا کیا تو صورت حال بدل گئی۔ اب دولت مند ملائیشیا میں علاج کرانے لگے تھے اور اس سے صحت کے شعبے میں پیسا آیا جس سے اس کا معیار بلند ہوا تھا۔ آج ملائیشیا جنوب مشرقی ایشیا میں علاج معالجے کی بہترین سہولتیں رکھنے والا ملک ہے اور اس کی سو فیصد آبادی کو علاج کی سہولت حاصل ہے۔ جو غریب علاج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے ہیں حکومت ان کے علاج کے سو فیصد اخراجات خود برداشت کرتی ہے۔ صرف ادا کرنے کے قابل افراد سے علاج کا بل وصول کیا جاتا ہے۔

نوے کا عشرہ ملائیشیا میں ترقی اور معاشی بحران کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مہاتیر کی بنائی ہوئی معاشی پالیسی کی مدت 1990 میں ختم ہوگئی تھی اور اس موقع پر اس نے آنے والے تیس سالوں کے لیے ایک بڑا معاشی پروگرام شروع کیا جس کے تحت ملائیشیا کو ایک مکمل ترقی یافتہ ملک کی صورت دینا تھی۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ہر سال سات فیصد کی شرح سے جی ڈی پی ترقی کرے۔ اس تیس سالہ ویژن کے تحت ملائیشیا میں ہائی ٹیک انڈسٹریز کا قیام اور ایسے بڑے پروجیکٹس شروع کیے جانے تھے جو ملکی ترقی کو دنیا کے سامنے اجاگر کریں۔ اگرچہ منصوبے میں موجود بیشتر اہداف حاصل نہیں کیے جا سکے۔ جیسے سلیکون ویلی کے طرز پر شمالی کوالالمپور میں ایک بہت بڑے ہائی ٹیک پارک ملٹی میڈیا سپر کوریڈور کا قیام سرمایہ کاروں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔ اسی طرح سراوک میں بننے والا بوکان ڈیم جس کی بجلی چین تک کو فراہم کی جاتی۔ اپنے بھاری اخراجات اور بعض دوسرے متنازعہ امور کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔

مگر 1997 تک ملائیشیا نے طے شدہ سات کے بجائے نو فیصد سالانہ کی رفتار سے ترقی کی اور غربت میں کمی بھی ہدف سے بڑھ کر حاصل کر لی جو پندرہ فیصد کے بجائے آبادی کا صرف نو فیصد رہ گئی۔ اسی وجہ سے مہاتیر نے 1995 کا الیکشن بھاری برتری کے ساتھ جیتا اس بار اس نے ریکارڈ تعداد میں ووٹ حاصل کیے تھے۔ مہاتیر کی اس کامیابی میں اس کے نائب وزیر اعظم انور ابراہیم کا بہت زیادہ ہاتھ تھا اور فنانس منسٹر کی حیثیت سے اس نے معاشی پالیسی میں بروقت تبدیلیاں کیں۔ خاص طور سے اس نے نقصان میں جانے والے منصوبوں پر بروقت سرمایہ کاری روک دی کیونکہ پیسے کا مسلسل نقصان ہی آنے والے معاشی بحران کی وجہ بنا تھا۔ اگر انور ابراہیم بریک نہ لگاتا تو بحران شاید ملائیشیا کو لے ڈوبتا۔

مہاتیر نے سیاحوں کو ملائیشیا کی طرف متوجہ کرنے کے متعدد اقدامات کیے اس نے بے شمار تفریحی مقامات پر

سرکاری سرمایہ کاری۔ ملائیشیا کے خوب صورت ساحلوں کی اس طرح سے پبلسٹی کی کہ ساری دنیا سے سیاح کھنچے چلے آئے۔ پہاڑی مقامات پر چھوٹے ریزورٹس کی حوصلہ افزائی کی اور پورے ملک میں سفر کو بہت آسان بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاحوں کی تعداد جو 1980 میں دس لاکھ سالانہ سے بھی کم تھی۔ 2000 میں ایک کروڑ سالانہ سے تجاوز کر گئی۔ کھیلوں کو فروغ دیا اور گرانڈ پری فارمولہ ون ریس میں ملائیشیا کو بھی شامل کیا۔ صرف اس گرانڈ پری کی وجہ سے ہر سال دو لاکھ افراد ملائیشیا کا رخ کرنے لگے تھے۔ یہ سیاح کوالالمپور کی ڈیوٹی فری شاپنگ سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور سالانہ اربوں ڈالرز کا سامان یہاں سے خرید کر لے جانے لگے۔

1997 میں آنے والا معاشی بحران اتنا شدید تھا کہ رنگٹ کی قیمت میں پچاس فیصد تک کمی آگئی اور آئی ایم ایف نے حکومت کو اخراجات کم کرنے اور انٹرسٹ ریٹ بڑھانے کا مشورہ دیا۔ مہاتیر نے اس پر عمل کیا مگر ایک سال بعد ہی اس نے انور کے مشورے پر پالیسی میں یوٹرن لیا اور سرکاری اخراجات بڑھانے کے ساتھ امریکی ڈالر کی رنگٹ سے شرح مبادلہ کو منجمد کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملائیشیا نے اپنے ہمسایہ ملکوں کے مقابلے زیادہ تیزی سے اور زیادہ جلدی معاشی بحران پر قابو پا لیا تھا۔ مگر حیران کن طور پر اس نے جس شخص کی مدد سے معاشی بحران پر قابو پایا تھا۔ یعنی انور ابراہیم اسے ہی اس بحران کا ذمے دار قرار دے کر اس نے فنانس منسٹری اور نائب وزیر اعظم کا عہدہ اس سے لے لیا۔ جلد انور ابراہیم اس کا سب سے بڑا مخالف بن گیا تھا۔

صرف سیاسی مخالفین ہی نہیں شاہ بھی اب مہاتیر کے خلاف تھے کیونکہ اس نے ان کے اختیارات میں کمی کی تھی۔ موجودہ تناؤ کی وجہ سلطان اسکندر کا بیٹا بنا جو ایک ہاکی پلیئر تھا اور مخالف کھلاڑی پر حملہ کرنے کی پاداش میں اس پر پانچ سال کی پابندی لگا دی گئی۔ اس پر سلطان نے تمام ریاستی ہاکی کلبوں کو ڈومیسٹک ٹورنامنٹ میں حصہ لینے سے روک دیا۔ ایک مقامی کوچ نے احتجاج کیا تو اسے شاہی محل طلب کر کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ قومی اسمبلی نے اس واقعے کی مذمت کی اور مہاتیر کو موقع مل گیا کہ وہ ملک میں ایمرجنسی لگانے کا اختیار ہیڈ آف دی اسٹیٹ سے چھین لے۔ پریس اور میڈیا پہلے ہی سلطانوں کے خلاف تھا۔ اس نے مہاتیر کا مکمل ساتھ دیا اور اس پر زور دیا کہ وہ ان سلطانوں کی دولت میں بھی کمی کرے۔ اس پر مہاتیر نے ان کے بلوں میں خاصی کمی کی۔ ایمرجنسی کا اختیار ختم کرنے پر پریس نے مہاتیر کو ملائیشیا کا بے تاج بادشاہ قرار دیا تھا۔

سلطانوں کے بعد وہ اپنے سب سے بڑے سیاسی مخالف انور ابراہیم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس پر بدعنوانی، نااہلی اور بدانتظامی کے الزامات لگا کر انٹرنل سیکورٹی ایکٹ کے تحت اسے گرفتار کر دیا پھر اس پر مجرمانہ حملے اور ناجائز جنسی تعلقات کا الزام لگایا۔ اسے سات سال کی سزا ہوئی۔ ایک اور مقدمے میں اسے چھ سال کی سزا ہوئی مگر وہ بعد میں ختم کر دی گئی۔ اس بار پریس اور میڈیا نے مہاتیر کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ انور کی حمایت کر رہا تھا اسی طرح عوام کا ایک بہت بڑا حصہ انور کا حامی تھا۔ مہاتیر کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ اسے نرمی برتنی چاہیے مگر اس نے انور کو سزا دلوا دی۔ اس پر ملکی اور بین الاقوامی دونوں طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا۔ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے انور ابراہیم کو ”بہت زیادہ قابل عزت لیڈر“ قرار دیا۔ حد یہ کہ ملائیشیا کے دورے پر آئے امریکی نائب صدر الگور نے بھی انور کی حمایت کی اور اس کی سزا کو غیر منصفانہ قرار دیا۔

انور ابراہیم کی بیوی وان عزیزہ نے ایک نئی سیاسی پارٹی تشکیل دی اور 1999 کے الیکشن میں حصہ لیا۔ یو ایم این او کو قومی اسمبلی کی اٹھارہ نشستوں اور دو ریاستوں میں اپنی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ 2002 میں مہاتیر نے اعلان کیا کہ وہ جلد سیاست سے ریٹائر ہو جائے گا اور اس نے جولائی 2003 اپنی ریٹائرمنٹ کے لیے چنا۔ اس کے بعد اس کا نائب عبداللہ بداوی وزیر اعظم بنا۔ سیاست سے کنارہ کش ہونے کے بعد مہاتیر نے ایک دانشور کی حیثیت سے سیاست دانوں اور عوام کے لیے کام کرنے والوں کی رہنمائی کی۔ اسے سیاست چھوڑے بارہ برس ہو چکے ہیں مگر آج بھی وہ ملائیشیا میں سب سے مقبول شخص ہے اور لوگ اس سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ اس میں خامیاں بھی تھیں مگر اس کی سب سے بڑی خوبی اپنے ملک اور قوم کے لیے اس کا بے پناہ خلوص تھا۔

نوے سالہ مہاتیر آج بھی صحت مند اور توانا ہے اور اس نے ایک نئے شعبے یعنی اداکاری میں طبع آزمائی کا فیصلہ کیا ہے۔ آنے والا وقت بتائے گا کہ وہ اس میں کتنا کامیاب ہوتا ہے۔

شاعرِ بنگال

سید زین مہدی

زبانِ اردو دیگر زبانوں کے مقابلے میں بہت کم عمر ہے۔ اسے جنم لیے وقت ہی کتنا گزرا ہے لیکن اردو شاعری کا دامن اس طرح لبالب بھرا نظر آتا ہے کہ ہم فخریہ رائج قدیم سے قدیم زبانوں کے مقابل اسے رکھ سکتے ہیں۔ اردو کے خزانے میں اضافہ دکن سے مالوہ تک اور پنجاب سے بنگال تک کے ادیبوں شاعروں نے کیا۔ ہر ایک نے اپنی سی کوشش کی بنگال نے نساخ جیسا استادِ فن دیا جس نے میر و غالب سے کم خدمتِ اردو نہ کی۔ ایک ایسا ہی نام وحشت کلکتوی کا بھی ہے جس کے اشعار ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔

سن اٹھارہ سو اکیاسی کے اٹھارہ نومبر کو حکیم غالب علی کے بیٹے شمشاد علی کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ شمشاد علی نے اس کا نام رضا علی رکھا۔

بنگال کے ہر مسلم گھرانے میں ایک رسم ہے کہ بچہ جب تک قرآن شریف نہ پڑھ لے کسی اور کام میں نہیں لگاتے ہیں۔ رضا علی کو بھی پہلے قرآن مجید کی تعلیم دلائی گئی۔ قرآن شریف کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی گھر پہ ایک دوسرے ماسٹر کا انتظام کردیا گیا۔ وہ اسے فارسی کی تعلیم دیتا تھا۔

گلستان' بوستان کو اسی نے پڑھایا۔ پھر دس سال کی عمر میں اسے مدرسئہ عالیہ میں داخل کرادیا گیا۔

اس مدرسے کو ایک تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے۔ A Short history of calcuta madrasa میں جسے کلکتہ مدرسہ میگزین نے 1933ء میں شائع کیا تھا' اس میں مندرج ہے اس مدرسے کو وارن ہسٹنگز نے مسلمانوں کی تحریک پر 1782ء میں قائم کیا تھا۔ یہیں مرزا قتیل کی زبان دانی کی بحث نے ایک ناخوشگوار رخ اختیار کیا تھا جس کے عواقب وقت آخر تک مرزا غالب کے لیے باعث کلفت رہے۔ اس واقعے کا احوال مولانا حالی نے "مجادلہ اہل کلکتہ" کے عنوان سے "یادگار غالب" میں اور غالب نے اپنے خطوط میں بیان کیا تھا۔ اسی مدرسے کے شعبۂ انگریزی (ڈیپارٹمنٹ آف انگلش) میں انہوں نے داخلہ لیا تھا۔ جب وہ چوتھی جماعت میں پہنچے تو ان کی تعلیمی نگرانی کا بار مولوی خلیل احمد کو سونپا گیا۔ مولوی صاحب کو بھی شعروشاعری کا شوق تھا۔ رضا علی ان کی نقالی کیا کرتے۔ انہی کے انداز میں دوستوں کو جمع کرکے شعر پڑھتے جب یہ خبر مولوی خلیل احمد تک پہنچی تو بجائے غصہ ہونے کے انہوں نے تعلیمی نصاب میں ایک مضمون کا اضافہ کردیا۔ اب وہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ شعروسخن کی تعلیم بھی دینے لگے تھے۔

آہستہ آہستہ رضا علی فنون لطیفہ میں طاق ہوگئے' انہی دنوں جب وہ میٹرک میں تھے انہیں غالب کے شاگرد سخن دہلوی کی "سروش سخن" کے مطالعے کا موقع ملا اور وہ 1896ء میں پہلی بار غالب کے کلام سے روشناس ہوئے' اس ایک کتاب نے ان پر جادو سا کردیا تھا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر غالب کا کلام پڑھتے گئے۔ اس کا سیدھا اثر ان کی ذہنی بالیدگی پر پڑا اور ان کے کلام میں غالب کی جھلک آنے لگی۔

مولوی خلیل احمد صاحب پر کبیرسنی کی چھاپ لگنے لگی تھی' اپنی مدد کے لیے اب وہ رضا علی کو بھی مشاعروں میں لے جاتے۔ تاکہ رات میں لوٹتے وقت تکلیف نہ ہو۔ ایسی محافل رضا علی کو بھی پسند تھیں کیونکہ وہاں انہیں بڑے بڑے کلام سننے کو ملتے اس طرح ان کے شوق کو مہمیز مل رہی تھی اور ذہن رواں ہوتا جارہا تھا اور اب ان کے کلام میں ندرت بھی آنے لگی تھی' وہ اعلیٰ خیالات کے مظہر شعر کہنے لگے تھے۔

ان دنوں کلکتہ مشرقی ہند کا ادبی مرکز تھا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوتے۔ ان مشاعروں میں سید بادشاہ نواب عظیم آبادی کے مشاعرے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ مشاعرے کو سننے کے لیے لوگ بنگال کے کونے کونے سے آتے۔ دراصل اس مشاعرے میں کئی صوبے کے شاعروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ شہر میں اتنا بڑا مشاعرہ ہو اور رضا علی نہ جائیں یہ ایک انہونی بات تھی۔ وہ بھی پہنچے ہوئے تھے۔ اس بار بادشاہ نواب نے صوبہ بہار کے علاوہ مشرقی ومغربی بنگال کے شعرا کو بھی دعوت دی تھی۔ انہی شعرا میں اردو کے اہم تذکرہ نگاروں میں سے ایک "تذکرہ سخن الشعراء" کے مصنف عبدالغفور خان نساخ کے صاحب زادے محمد مظہرالحق شمس فرید پوری بھی تشریف لائے تھے (نساخ کا تذکرہ غالب کے خطوط وحالی کے تذکرہ میں آچکا ہے، مکمل سوانح سرگزشت کے شمارہ فروری 2012ء میں دیکھ سکتے ہیں) شمس فرید پوری کی شاعری کے چرچے پورے ہندوستان میں تھے اور ان کا شمار صف اوّل کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ داغ کی ایک مشہور غزل

بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں تن کے بیٹھے ہیں

اس غزل کی تعریف دیگر شعراء کے علاوہ امیر لکھنوی نے بھی کی تھی۔ اسی زمین پر شمس فرید پوری نے بھی غزل کہی تھی

اگر اللہ نے چاہا تو اس کافر کو شمس اک دن
مسلماں کرکے انھیں گے برہمن بن کے بیٹھے ہیں

ایک بنگالی جس کی مادری زبان بنگلہ ہو وہ ایسا شعر کہے یہ سو فیصد باپ کی زبان دانی کا کمال تھا۔ خود نساخ جن کے خاندان بھر میں کوئی اردو بول بھی نہیں سکتا تھا ان کی شاعری کمال کی تھی ایسے باپ کا وہ بیٹا تھا تو کیوں نہ کمال دکھاتا، اسی لیے مقطع سن کر داغ دہلوی نے کہا تھا کہ میں بھی اس سے بہتر مقطع نہیں کہہ سکتا۔ ایک استاد کا شاگرد کے لیے ایسا جملہ! یقینا شاگرد میں کوئی خاص بات ہوگی۔ اور اس خاص بات نے خود کو پٹنہ بہار کے نواب جناب نواب عظیم آبادی کے مشاعرے میں منوایا۔ ان کی غزل حاصل مشاعرہ ٹھہری تھی۔ رضا علی بھی ان سے مرعوب ہوگئے تھے اور انہوں نے اسی وقت شمس فرید پوری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی ٹھان لی۔ ان تک پہنچنے کے لیے رضا علی نے تگ ودو بھی شروع کردی۔

زمانہ کوئی سا بھی ہو' مشہور شخصیت تک پہنچنے کے لیے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ شمس صاحب کے قریبی لوگوں میں سے ایک حبیب الحق خان صولت ان کے رشتے

دار تھے۔ وہ ایک ادبی رسالہ شمس کے مدیر بھی تھے۔ "شمس کلکتہ" کی دھوم پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے قلمی معاونین میں علامہ اقبال، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری ایسے قدآور قلم کار شامل تھے۔

رضا علی وحشت، حبیب الٰہی خان صولت سے ملنے گئے۔ صولت صاحب کو خبر تھی کہ رضا علی بھی ادب دوست ہیں۔ انہوں نے دل سے پذیرائی کی۔ جیسے ہی رضا علی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ صولت صاحب خوش ہو گئے اور انہیں لے کر شمس صاحب کے پاس پہنچے۔ شمس فرید پوری تصنیف و تالیف سے ہی فرصت نہ تھی پھر بھی انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ صولت صاحب کی فرمائش کو رد کردیں۔ انہوں نے رضا علی سے کہا "میاں، پہلے اپنا کلام تو دکھاؤ تب میں بتاؤں گا کہ تمہیں شاگردی میں لیا جائے یا نہیں؟"

رضا علی نے ایک موٹی سی کاپی بڑھا دی۔

شمس صاحب نے پہلے سرسری نظر ڈالی لیکن دو تین صفحے الٹتے ہی ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ انہوں نے اب بہ نظر غور دیکھنا شروع کردیا تھا۔ کلام کی ندرت نے انہیں باندھ لیا تھا۔

خدا گواہ کہ ہوں ترجمانِ دلِ وحشت
کہتے ہیں شعر نہیں، کی ہے شاعری میں نے

وہ سمجھ گئے تھے کہ ہیرا ابھی ناتراشیدہ ہے مگر انمول ہے اور انہوں نے اصلاح دینے کی ہامی بھرلی۔

شمس فرید پوری کی رہنمائی نے بہت جلد ان کے اندر چھپے جوہر کو اجاگر کرنا شروع کردیا۔ اب ان کے کلام کو جلا مل چلی تھی۔ حالانکہ ان کے کلام میں اب بھی میر و مرزا کا طرز تھا، مومن کا حسنِ بیاں تھا اور داغ کا رنگ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ غالب کی خصوصیات شعری وظیفہ سخن بنا ہوا تھا لیکن ایک انداز سے جدت و ندرت کی نئی راہیں بھی نکال رہے تھے اور یوں ان کے کلام میں ایک انفرادی شان پیدا ہوگئی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں انہوں نے خود کو منوا بھی لیا۔ جبھی تو نیاز فتح پوری سا نقاد بھی کہنے پر مجبور ہوگیا۔

"وحشت بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اردو غزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا اور خوش نما صورت سے استعمال کرنا وفارام پوری کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت پر آجاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کردیتا ہے لیکن وحشت کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کے یہاں یہ سب کچھ بہت تواری اور سلاست روی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں۔" (نگار لکھنؤ خاص نمبر 1941ء)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے الفاظ ہیں۔

"یوں تو وحشت کو غالب کا مقلد کہتے ہیں لیکن غالب کی یہ تقلید محض فارسی پسندی، مشکل تراکیب، عجیب و غریب خیال، پیچیدہ مضامین تک محدود نہیں اور دراصل غالب کی کم از کم اردو شاعری کا کمال ان چیزوں پر منحصر بھی نہیں، ایک چیز تو اس میں وہ ہے جسے غالب نے "سادگی ہائے تمنا" کہا ہے اور دوسری جدت خیال اور ندرت اسلوب ہے۔ جہاں غالب ان تینوں عناصر میں ایک توازن پیدا کرلیتے ہیں وہیں ان کا شعر الہام معلوم ہونے لگتا ہے۔ غالب کی تقلید کا جو دعویٰ کرے وہ ایسے ہی کلام کو سامنے رکھے تبھی کسی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ وحشت نے یہی شاہراہ اختیار کی۔" (مہرِ نیم روز 1957ء)

علامہ شبلی نعمانی جن کی نکتہ دانی اظہر من الشمس ہے، جن کا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے، وہ کلام وحشت کے بارے میں لکھتے ہیں "آپ کے (وحشت کے) کلام میں علی الاغلب جدت، ندرت اور چستگی ہوتی ہے۔ غالب و مومن کی ترکیبیں اور طرز آپ سے خوب چل پڑتی ہیں۔"

ان تینوں کی رائے بہ بانگ دہل کہہ رہی ہے کہ وحشت کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ واقعی انہوں نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان کے ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ گولڈ اسمتھ، کیٹس، جانسن، مکالے، ڈکنس، ٹھیکرے اور شیکسپیئر وغیرہ کے شعری اور افسانوی تخلیقات کو ازبر کرلیا تھا اور ان پر عالمانہ گفتگو کیا کرتے تھے۔ اسی قابلیت کی وجہ سے انہیں لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے رکن خاص بنالیا تھا۔ علامہ وحشت کلکتوی کے شاگرد جناب وقار راشدی (کراچی) لکھتے ہیں "ان کا ذاتی کتب خانہ متعدد زبانوں کے علم و فنون سے متعلق ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھا۔ وفات سے کچھ دن پہلے اپنی نایاب و نادر کتابیں ڈھاکا یونیورسٹی لائبریری کی نذر کردی تھیں۔ کلکتے سے ڈھاکے کی ہجرت کے وقت بھی انہوں نے اپنی کتابوں کا بڑا حصہ کلکتہ یونیورسٹی لائبریری اور دلکشا لائبریری کو دے دیا تھا۔"

اسی مطالعے نے انہیں اتنا زیادہ آگے بڑھا دیا تھا کہ 1910ء میں انہیں امپیریل ریکارڈز ڈپارٹمنٹ کلکتہ کے شعبۂ فارسی میں "چیف مولوی" کے عہدے پر مامور کرکے

قدیم شاہی فارسی دستاویزات کے اندراج کی ذمے داری تفویض کردی گئی۔ اسی دوران کی بات ہے کہ کلکتہ کے مسلمانوں نے اسلامی کالج قائم کرنے کی تحریک شروع کردی۔ اس تحریک کا سہرا بنگال کے مشہور سیاسی رہنما شیر بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق کے سر تھا۔ انہی کی کوشش سے 1927ء میں اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ کالج کے قیام کے بعد اچھے اور قابل پروفیسروں کی تلاش شروع ہوئی اور اتفاق رائے سے انٹر پاس رضا علی کو بہ حیثیت اردو فارسی کا پروفیسر منتخب کرلیا گیا۔ یہ منصب معمولی نہ تھا۔ کالج کے لڑکوں کو فارسی، اردو کی تعلیم دینا جوئے شیر لانا تھا۔ انہوں نے دس سال تک اپنے فرائض منصبی کو نہایت حسن وخوبی اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیا۔ اس خدمت کے صلے میں حکومت نے انہیں 1924ء میں خان بہادر کا خطاب دیا۔ کچھ عمر کا تقاضا کچھ وقت کی کمی اور کچھ مطالعہ وخدمت ادب کی چاہت وہ 1936ء میں پنشن لینے پر مجبور ہوگئے۔

اس کی ایک وجہ رفیق حیات کے داغ مفارقت کے بعد کی تنہائی بھی تھی۔ زبیدہ خاتون 24 ستمبر 1931ء کو انہیں اکیلا چھوڑ کر دنیا سے منہ موڑ گئی تھیں۔ حالانکہ وہ چودہ بچوں کے باپ تھے۔ جن میں علی حسن، علی امام، علی اشرف اور چار صاحب زادیاں بقید حیات تھیں پھر بھی انہیں تنہائی کا عذاب بے چین کیے رکھتا۔ بیوی کے بغیر گھر سونا سا لگتا۔ انہوں نے قطعہ تاریخ کہی۔

آہ وہ میری رفیق زندگی
کر گئیں دنیا سے آخر انتقال
صدمہ غم سے ہوا ہے سینہ شق
ہوگیا دل خستۂ حزن و ملال
لکھ دیا وحشت در شہوار خلد
جب مجھے تاریخ کا آیا خیال

ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کی قابلیت کی دھوم قائم تھی۔ اسی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے 1940ء میں حکومت برطانیہ نے انہیں خان بہادر کا خطاب دیا۔

پنشن کے بعد وہ زیادہ عرصے تک تعلیمی ماحول سے دور نہ رہ سکے اور انہوں نے ایک بار پھر پروفیسر کا منصب قبول کرلیا۔ انہیں پھر سے اس میدان میں لانے کا سہرا میرابورن گرلز کالج کی انتظامیہ کے سر تھا۔ انہوں نے ہی التجا کرکے اپنے ہاں بلالیا تھا۔ 1942ء سے انہوں نے اس کالج میں طالبات کو اردو فارسی کی تعلیم دینا شروع کی۔ یہ وہ دور تھا جب کلکتہ تحریک پاکستان کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے پرچم تلے مسلمانان بنگال بھی ایک الگ مملکت کی مانگ کررہے تھے۔ نیشنل گارڈز کے جوان منظم انداز میں تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے۔ رضا علی جواب استاد کے دیے ہوئے تخلص کی وجہ سے اب وحشت کے نام سے مشہور ہوچکے تھے۔ انہوں نے بھی مسلمانوں کو پیغام عمل دینا شروع کردیا۔

لازم ہے کاروان رہے آپ مستعد
شرمندہ صدائے جرس کارواں نہ ہو

ان کی نظم "فغان مسلم" اتنی مشہور ہوئی تھی کہ اردو کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر بنگالی مسلمان بھی اسے بصد شوق پڑھتے۔ مسلمانان ہند کی زبوں حالی کی عکاس تھی وہ نظم۔

صدمہ ہائے تازہ سے ہے چشم مسلم خونچکاں
آج پھر وحشت نوا سنج فغاں ہوتے ہیں ہم

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ وحشت سے عمر میں سات سال چھوٹے تھے لیکن ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر ایک خاص انداز میں کیا ہے۔ تقریباً ہر روز مولانا ابوالکلام آزاد، اکبر الہ آبادی، نواب امداد امام اثر، نظم طباطبائی، مرزا محمد عسکری، مولانا محمد علی جوہر کامریڈ اخبار کے دفتر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ اس طرح وہ غیر محسوس انداز میں سیاست سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ حسرت موہانی سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے۔ ان کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے۔

یک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

اسی غزل میں یہ شعر بھی آیا ہے۔

ہیں شاد، صفی، شاعر یا شوق، وفا، حسرت
پھر ضامن ومحشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

مرزا یگانہ چنگیزی، نوح ناروی، جلیل مانک پوری، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خان اور سر عبدالقادر سے ان کے خاص مراسم تھے۔ سر عبدالقادر کے "مخزن" میں وحشت کا کلام، تحقیقی وتنقیدی مقالات بالالتزام شائع ہوتے تھے۔

علامہ اقبال بھی ان کے مداحوں میں تھے۔ اپنے ایک مکتوب میں وحشت صاحب کو لکھتے ہیں۔ "میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کا شوق رکھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں۔ دیوان تقریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاءاللہ آپ کی طبیعت تیز ہے اور فی زمانہ ایسا کم لوگ کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص

طور پر قابلِ داد ہے۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے سو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''

اسی طرح الطاف حسین حالی رقم طراز ہیں ''آپ کی طرز سخن سنجی دیکھ کر زمانہ کے انقلاب پر ایک مسرت انگیز تعجب کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ تکلف برطرف اگر مرزا غالب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے' مستثنیٰ کرلیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بے شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہوسکتا اور چونکہ ایشیا کی قدیم شاعری بظاہر چراغ سحری معلوم ہوتی ہے اور فارسی زبان ہندوستان سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جارہی ہے اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ آیندہ کیا اردو اور کیا فارسی دونوں زبانوں میں ایسے تنے دیوانوں کے شائع ہونے کی بہت کم امید ہے۔''

ماہنامہ اردوئے معلی علی گڑھ اپریل 1916ء کے شمارے میں حسرت موہانی لکھتے ہیں۔ ''مولا رضا علی وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعراء میں سے ہیں جن کے حسن کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔ جبکہ ناطق لکھنوی کی منظوم تعریف یوں ہے۔

اس شمع کے قربان ہو اے پروانو
یہ جوہر قابل ہے اسے پہچانو
اس رنگ کے سرمست نہ پاؤ گے کہیں
وحشت کی کرو قدر ارے دیوانو

عبدالحلیم شرر لکھنوی نے ماہنامہ ''دلگداز'' کے اپریل 1910ء کے شمارے میں لکھا تھا ''حضرت وحشت کے کلام میں خاص لطف ہے' پرانے مذاق کے نبھانے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں بھی پیدا کرنا وحشت کا خاص رنگ ہے۔''

اکبرالہ آبادی کہتے ہیں۔

دیوان سے وحشت کے ہے ہر طبع کو اک انس
دل کھل گئے ہیں رنگ معانی کے چمن سے

نیاز فتح پوری سا محقق و نقاد بھی ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا ''جناب وحشت کلکتوی اس دور شاعری کی ایک یادگار ہیں' میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں کیونکہ ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے تو لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے اس رنگ کے سامنے روح دوزانوں ہوتی ہے۔'' (مالہ وماعلیہ۔ نگار لکھنوی جون 1946ء)

شاد عظیم آبادی بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

صد حسنت و صد آفرین بر مصنف
کہ در جمع دیوان تحسن باکشیدہ

ڈاکٹر عندلیب شادانی لکھتے ہیں ''آج سے پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ میرا لڑکپن تھا۔ اس وقت لوگ عام طور پر یہ سمجھتے تھے اور میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا کہ دلی اور یوپی والوں کے علاوہ اردو زبان اور کسی کو نہیں آتی' نہ آسکتی ہے۔ شاعر ہونا تو دور کی بات چنانچہ اقبال مرحوم کی شاعری اور زبان کا مذاق اڑایا جاتا تھا اور ان پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن ہاں اس وقت شعراء میں جو لوگ سرفہرست آتے ہیں ان میں حضرت وحشت کلکتوی کا بھی شمار تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ بنگال نژاد اردو کے مرکزوں سے ہزاروں کوس دور رہ کر اردو کا نامور شاعر کیونکر ہوسکتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہ تھا' اس زمانے میں بھی جب اہل زبان کسی بیرونی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ساحر بنگالہ وحشت اپنی زبان دانی اور سخن سنجی کا لوہا منوا چکے تھے اور ان کی شہرت خود بنگال سے نکل کر بہار' یوپی کو تسخیر کرتی ہوئی لکھنو اور دلی سے لاہور جا پہنچی تھی در حقیقت بنگال میں اردو کا چراغ انہی کے دم سے روشن تھا۔''

وحشت کو معراج غم دوراں نے دی تھی۔ انہیں سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ ان کے بڑے صاحب زادے سید علی حیدر صغر سنی میں ہی مجنون ہوگئے تھے۔ انہیں ہر وقت ایک کمرے میں پابہ زنجیر رکھا جاتا تھا۔

جب اس لڑکے کے پیروں میں زنجیر ڈالی جارہی تھی تو اس نے علامہ کا ہی ایک شعر پڑھ کر سب کو رلا دیا تھا۔

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیر وفا ڈالی
تمہارے ہاتھ سے کیوں رشتہ مہر و کرم چھوٹا

وہ فورٹ ولیم کالج میں بھی پڑھانے جاتے تھے۔ وہاں انہیں انگریز افسران کو اردو کی تعلیم دینا ہوتی تھی۔ اس سبجیکٹ پر انہوں نے کتابیں بھی لکھیں جنہیں رومن رسم الخط میں شائع کیا گیا تھا تاکہ انگریز بہ آسانی پڑھ سکیں۔ رومن میں اردو انگریزی گرامر بھی لکھی تھی۔ وہ 17 نمبر ویسلی سیکنڈ لین سے ہر روز صبح نکلتے تو رات گئے ان کی واپسی ہوتی اور کبھی کبھی تو ساری رات مشاعرے میں کٹ جاتی۔

وہ دو نوکریوں کے بعد بھی خدمت ادب میں کوشاں رہتا

ہوئے شیر لانا تھا مگر علامہ وحشت کلکتوی ناممکن کو ممکن بنائے جا رہے تھے۔ ان کی دھوم چہار جانب پھیلتی جا رہی تھی۔ میر تقی میر کو غزل میں امتیاز ان کے درد انگیز اسلوب کی بنا پر اور اس سادگی بیان کی جو سہل ممتنع کا درجہ رکھتی ہے حاصل ہوا وہی تغزل کے تیکھے پن میں اور اظہار کی جدت طرازی اور لفظوں میں خوش ترکیبی مومن کے حصے میں آئی اور ان دونوں خصوصیتوں کا عکس وحشت کی غزلوں میں اتر آیا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں طوطی بنگالہ کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تھا۔

وہ بیک وقت فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ ہزار قسم کی پریشانیاں تھیں پھر بھی وہ تن من دھن سے گیسوئے اردو سنوارنے میں لگے ہوئے تھے۔

اگرچہ وحشت روایتی انداز میں غزل کہہ رہے تھے مگر نئے نئے تجربات بھی کر رہے تھے۔ بھی تو شرر لکھنوی جیسا محقق دلگداز کے اپریل 1910ء کے شمارے میں لکھنے پر مجبور ہوا۔ ''کلام میں جہاں الگ اور خاص لطف ہے پرانے مذاق کے نبھانے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں بھی پیدا کرنا حضرت وحشت کا خاص رنگ ہے۔''

وحشت کی شاعری میں ایک خاص بات آ چکی تھی کہ وہ دوراز کار باتوں، خیال آرائیوں اور مبالغہ آمیزیوں سے اجتناب و احتراز کرتے۔ ان کی شاعری جذبات فطری اور واردات قلبی کی شاعری کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

اور وہ واقعی میر کارواں بنتے جا رہے تھے۔ تلامذہ کی ایک قطار سی لگ گئی تھی۔ برصغیر کے علاوہ برما، سری لنکا، افریقا اور انڈونیشیا کی وادیوں تک ان کے شاگرد پھیل رہے تھے۔ فضل احمد کریم فضلی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں

''وحشت کے شاگردوں کی بڑی تعداد تھی۔ شاگردوں کے شاگرد تو اور بھی زیادہ تھے۔ جتنا وہ لوگ حضرت وحشت کا دلی احترام کرتے تھے اس زمانے میں شاید ہی کسی استاد کے شاگرد کرتے ہوں۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں میں کسب فن اور صحت زبان کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیتے تھے اور ان کا قریب قریب ہر شاگرد اپنی جگہ پر مذاق سخن کی ترویج کا مرکز بن جاتا تھا۔ بقول وفا راشدی

زندہ بنگال میں ہے اگر اردو
اک سبب اس کا ہے رضا وحشت

تلامذہ کی طویل فہرست میں سے چند نام یہ ہیں۔ میجر ابو جعفر کشفی، علامہ جمیل مظہری، پروفیسر عبدالقیوم، مسرت جمالی، ڈاکٹر اختر امام، سلیم اللہ فہمی، ظفر ہاشمی، امیر الاسلام شرقی، پروفیسر عباس علی خان بے خود، مولانا عابد دانا پوری، طاہری علی شاکر، آصف بنارسی، وفا راشدی وغیرہ وغیرہ۔

1926ء میں ان کے شاگردوں میں سے ایک شوق سندیلوی نے اپنی کتاب ''اصلاح سخن'' شائع کی۔ (شوق سندیلوی کا پورا نام عبدالعلی ہے اور وہ لکھنو کے قریب سندیلہ نامی قصبے کے تھے۔ اصلاح سخن میں بیک وقت ہندوستان کے بیالیس مشہور شعرا کی اصلاح کردہ غزلیں تھیں۔ ان اصلاحوں کی افادی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نیاز فتح پوری، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے علاوہ بھی کئی مشہور نقادوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے وحشت کی اصلاح کو سب سے زیادہ پسند کیا۔ شاید اس کی وجہ ان کی اصلاح کا انداز ہو۔ علامہ وحشت کلکتوی کے نزدیک اصلاح غزل کے خیالات کیا تھے اس کا اظہار وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

''اردو میں غزل فارسی کی اس صنف پر مبنی ہے۔ قدیم شعرا جیسے خاقان ظہیر فاریابی، انوری وغیرہ بھی غزلیں کہتے تھے لیکن بے نمک ہوتی تھیں۔ سعدی نے اس میں گھلاوٹ پیدا کی اور حافظ نے اسے معراج ترقی پر پہنچا دیا۔ اردو میں ولی نے بہت ہی دلکش غزلیں کہیں اور میر نے تو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ پھر ناسخ و آتش کا زمانہ آیا اور اسی زمانہ سے ایک ''لکھنو اسکول'' قائم ہو گیا۔ جس میں الفاظ کی رنگینی کو بڑا دخل رہا۔ دہلی میں ذوق، مومن اور غالب نے گلستان سخن کی باغبانی کی اور اپنے کمالات کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا پھر داغ، امیر اور جلالی کا زمانہ آیا۔ ان بزرگوں نے اس سخن کی خوب خوب خدمتیں کیں۔ یہ دور ابھی قائم ہی تھا کہ طبیعتیں غزل کے سماع سے متنفر ہونے لگیں اور حالی نے نمایاں طور پر اس کے خلاف آواز بلند کی اور وہ بالکل حق بجانب تھے۔ فرسودہ خیالات، اخلاق سوز اشارے اور مقلدانہ قافیہ پیمائی کب تک دلوں کو مائل کر سکتی تھی۔ انقلابات شروع ہو گئے۔ غزل کی صورت بدل گئی اور وہ مضامین جن پر غزل کا دارومدار تھا اب مکروہ سمجھے جانے لگے اور رفتہ رفتہ متروک ہو گئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس میں اتنی برائیاں پیدا ہو گئیں پہلے شعرا صاف صاف کہتے تھے اگر اشعار میں کوئی حسن نہیں ہوتا تھا تو وہ مہمل بھی نہیں ہوتے تھے۔ اب یہ بات نہیں ہے ان دنوں بہت سے اشعار ایسے سننے میں آتے ہیں جس میں الفاظ کی ترکیب بظاہر دلکش اور رنگین نظر آتے ہیں لیکن شعر کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور اگر ہوا بھی تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو بات کہی

ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے نشر کردہ نظمیں

حبیب خدا (نعت) تاریخ نشر 11 دسمبر 1951ء

یوم النبیؐ ہے مژدۂ راحت برائے دل
ہیں درد والے خوش کہ ملی ہے دوائے دل

......☆......☆......

رمضان المبارک (قصیدہ) تاریخ نشر 5 مئی 1952ء

مبارک ہو مسلمانوں کو ماہِ ذی وقار آیا
تمہیں جس ماہ کا تھا سال بھر سے انتظار آیا

......☆......☆......

عید قرباں (نظم) تاریخ نشر 12 ستمبر 1951ء

عید قرباں کیا ہے ابراہیم کی ہے یادگار
حکم قربانی ہوا جب از حضور کردگار
ذبح اسمٰعیل پر آمادہ تھے وہ ذی وقار
کہتے تھے مولا ہماری جان ہے تجھ پر نثار
حکم تیرا ہے تو اسمٰعیل ادنیٰ چیز ہے
کیا حقیقت اس کی ہے اے شاہ وہ کیا چیز ہے

......☆......☆......

قائداعظم (نظم) تاریخ نشر 25 دسمبر 1951ء

میرے ساقی مرے ساقی شراب روح پرور دے
یہ ٹھنڈی گرمیاں کیسی ادھر آ آتش تر دے
ہمیں ذکر محامد اس کا اب منظور ہے ساقی
کہ پاکستان جس کے فیض سے معمور ہے ساقی

شہید ملت (نظم) تاریخ نشر یکم جنوری 1952ء

طلب کرتی ہے تیری زندگی کچھ تجھ سے قربانی
سر تسلیم خم کر دے کہ اب سوچتا کیا ہے

گئی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ نظم کی جاتی۔ کسی استاد نے کہا ہے کہ ہر شعر کا مدعا ہونا چاہیے۔ ایک مکمل مضمون ہونا چاہیے۔ ان باتوں کا نقصان ظاہر کرنے کے لیے مثال کے طور پر اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن میں اس طریقے کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ میں نے اشارہ کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلے۔" (سالنامہ جدید اردو کلکتہ 1941ء)

اس عبارت سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وحشت کے ہاں اصلاح سخن کا وہی طریقہ ہے جو قدیم اساتذہ فن وسخن کی اصلاحوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ بقول وفا راشدی "انہوں نے کبھی شاعر کے خیالات کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں اور کسی کے احساسات کو ٹھیس نہ لگے۔ انہوں نے اصلاح دیتے وقت نہ بلاضرورت کہیں قطع وبرید کی اور نہ شان اصلاح ظاہر کرنے کی غرض سے کسی شعر کو بلاضرورت قلم زد کیا۔ انہوں نے کبھی یہ بات نہ کی کہ کوئی شعر بطور عطیہ دے دیا جائے۔ وہ ہمیشہ شاگردوں کو دوست سمجھ کر مشورہ دیتے تھے" بطور نمونہ چند اصلاحیں ملاحظہ ہوں۔

شوق سندیلوی۔

ہچکی کی صدا سب جسے سمجھے دم آخر
ٹوٹا تھا یہ قفل در زندان تمنا

علامہ وحشت۔

ہچکی کی صدا سب جسے سمجھے دم آخر
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندان تمنا

ماہنامہ روز کراچی 1957ء وحشت نمبر میں ڈاکٹر عندلیب شادانی علامہ وحشت کی اصلاح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میرے نزدیک اصلاح شعر کا بنیادی اصول صرف یہ ہونا چاہیے کہ شعر کے عیوب واسقام دور کردیے جائیں خواہ ان کا تعلق زبان کے محاورے اور روزمرہ سے ہو خواہ قواعد صرف ونحو سے خواہ فن عروض وقافیہ سے خواہ علم بدیع ومعانی بیان سے لیکن شاعر کے بنیادی خیال کو بدل دینا اصلاح نہیں شاگرد پر رعب جمانے کی احمقانہ کوشش ہے۔"

اصلاح کے معاملے میں وحشت اس نظریے کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ شاگرد کے شعر میں کم سے کم تصرف کیا جائے۔ وہ اس طرح اصلاح نہیں دیتے کہ شعر کی قلب ماہیت تبدیل ہوجائے اور اس کی تصنیف کا حق شاگرد کی بجائے حضرت استاد کو پہنچے۔ مثلاً

شوق سندیلوی۔

کوچۂ یار کا پابند بھلا جائے کہاں
قید جستجو مجھے گو پاؤں میں زنجیر نہیں

وحشت کلکتوی۔

کوچۂ یار کا پابند بھلا جائے کہاں
جستجو قیدی مجھے گو پاؤں میں زنجیر نہیں

علامہ وحشت اصلاح کے ساتھ نوٹ لکھ دیتے تھے تاکہ

شاگرد کو ہمیشہ کے لیے وہ بات یاد ہو جائے۔

آخری وقت میں کیا ساتھ نباہا دل نے
روٹھنا ان کا ادھر دم کا خفا ہو جانا

وحشت کلکتوی نے شوق سندیلوی کے اس شعر پر اصلاح کرنے سے پہلے ایک مختصر سا نوٹ لکھا پھر مصرع بدل دیا۔

علامہ تحریر کرتے ہیں "آخری وقت کون کسی سے روٹھتا ہے۔ اس وقت تو ضرور رحم آ جاتا ہے۔" بدلا ہوا مصرع یہ ہے

"وہ جو برہم تھے تو نازک تھا کچھ اپنا مزاج"

ان کی یہ سادگی صرف اصلاحِ سخن کے ضمن میں ہی نہیں، حقیقی زندگی میں بھی چھائی ہوئی تھی۔ اونچے سے اونچے انگریزی معاشرہ میں اٹھتے بیٹھتے رہے مگر اپنی وضع قطع کی خصوصیت برقرار رکھی اور ہمیشہ شیروانی، پاجامہ اور وہ بھی کھلی موری کا زیب تن کرتے رہے۔ سر کبھی ایرانی کبھی ترکی اور آخر عمر میں رامپوری ٹوپی سے ڈھکا رہتا۔ میر و غالب اور مومن اگر ان کے کلام میں نکھرتے رہے تو ان کا استغنا، متانت، سنجیدگی اور وقار ان کی شخصیت میں اجاگر رہے اور شرافتِ نفسی، منکسر المزاجی، فروتنی اور مرنجان مرنج ان کی اپنی طبیعت کا عطیہ ہا۔ رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہتے۔

صرف شاعری میں ہی نہیں، حقیقی زندگی میں بھی غالب کی جھلک نمایاں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ 1941ء میں جب فضلی برادرس یادگار مشاعرہ فلمانے لگے تو غالب کے کردار کے لیے انہیں راضی کیا گیا۔ انہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود احتراماً اس کردار کو قبول کر لیا۔ میک اپ اور اداکاری کے تھکا دینے والے مراحل سے گزرے اسی زمانہ میں ان کے بچپن کے دوست عثمان غنی صاحب نے عقد ثانی پر زور دیا اور انہوں نے غنی صاحب کی بیوہ سالی سے نکاح کر لیا۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ آزادی کے نعرے زور شور سے لگ رہے تھے۔ وحشت کا دل جو پہلے ہی مسلمانوں کی زبوں حالی پر افسردہ رہتا تھا۔ اب وہ دھیمے دھیمے سروں میں رسنے لگا۔

بالآخر مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن مل گیا یعنی آزادی کا سورج طلوع ہو گیا۔ ابھی آزادی کا سورج طلوع ہی ہوا تھا کہ کلکتہ آتش کدہ بن گیا۔ مسلمانوں کے گھر جلنے لگے۔ خونِ مسلم ارزاں ہو گیا اور تب وحشت کا قلم چیخ اٹھا۔

وطن میں ہمیں کیا امن کی صورت نظر آئے
دکھائی دے رہا ہو جب قفس شاخ نشیمن سے

ستم ہے آشنا بیگانگی اے باغباں تیری
ہوا خواہانِ گلشن ہی نکالے جائیں گلشن سے

آکاش وانی کلکتہ سے برابر ان کی تقریریں، نظمیں، غزلیں نشر ہوتی رہی تھیں۔ کلکتہ اب خالی ہونے لگا تھا۔ مسلمان جان بچانے کے لیے مشرقی پاکستان کی سمت بھاگ رہے تھے لیکن وحشت کو کلکتہ کی محبت دبوچے ہوئے تھی۔

1947ء کے فسادات کا زخم ابھی بھر نہیں پایا تھا کہ 1950ء میں پھر خون کی ہولی شروع ہو گئی۔ بچے کھچے مسلمانوں کی گردنیں پھر ریتی جانے لگیں۔ وحشت کے

وحشت کے متفرق اشعار

کسی کی محفل کا تمہ ہے نے محرک نالہ و فغاں ہے
فسانہ عشق سن رہا ہوں فسانہ غم سنا رہا ہوں

☆

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

☆

خدا سرسبز رکھے تجھ کو وحشت باغ عالم میں
تو کیا کیا طرز فن شعر میں ایجاد کرتا ہے

☆

فروغ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لیے

☆

ترے انداز سخن سے ہے یہ ظاہر
کہ مقدر ہے ترا غالب دوراں ہونا

☆

بغیر از درد وحشت کس کو ہوگی مجھ سے ہمدردی
بجز غم اور کس سے ہوگی غم خواری مرے دل کو

☆

طرز جدید میں ہے وہی شیوہ قدیم
بھرتے ہیں جام نو کو شراب کہن سے ہم

☆

پیچھے پیچھے تیرے ہوگا اہل فن کا قافلہ
وحشت اک دن تو ہی میر کارواں ہو جائے گا

کس طرح حسن زباں کی ہو ترقی وحشت
میں اگر خدمت اردوئے معلیٰ نہ کروں

☆

ہر شخص سے مانوس جو ہوتا نہیں وحشت
یہ ہے کہ کم آمیز ہے مغرور نہیں ہے

☆

ہمیں احساس تک نہیں ہے اپنی ذلت کا
بنایا ہم نے زیب طاق نسیاں نقش خودداری

☆

بہار گل متقاضی ہے خون بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینی چمن کے لیے

☆

ہے کام جو تجھ کو کرنا تجھی کو کرنا ہے
کسے پڑی ہے کہ کوشش کرے کسی کے لیے

☆

وحشت سخن و لطف سخن اور ہی شے ہے
دیوان میں یاروں کے تو اشعار بہت ہیں

☆

نہیں اب مجھے مناسب کہ چمن میں اور ٹھہروں
میرے ہم نشیں ہیں عاجز میری تلخی نوا سے

☆

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے بھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

بڑے بیٹے علی حیدر بے پناہ ہوگئے۔ وحشت کا دل ٹوٹ گیا اور وہ کلکتہ سے اوب گئے۔

اس کلکتہ سے جو عروس البلاد تھا۔ شہر نگاراں اور گہوارہ حسن وعشق تھا۔ جس کی ہر گلی وحشت کو پیاری تھی' جس کے چپے چپے سے وحشت کی دلی وابستگی تھی۔ جس کی تہذیب وثقافت کے وہ خود ایک ستون تھے جس کی محبت کی خاطر وہ زندگی بھر دولت ومنصب کی دعوتوں کو ٹھکراتے رہے تھے۔ آخر کار اسی کلکتہ کو چشم نم انہیں خیرباد کہنا پڑا۔

بہار آئی ہے اب مجھ کو نکل جانا ہے گلشن سے
باغباں خوش نہیں میرے نشیمن سے

وہ مئی 1950ء میں ڈھاکا منتقل ہوگئے۔ میمن پور ضلع کھلنا میں ان کے ایک صاحب زادے ایس ڈی او تھے۔ وہ انہی کے پاس چلے گئے۔

اس دور کا ذکر کرتے ہوئے احسن احمد اشک لکھتے ہیں
"51ء کی جولائی کی ایک شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ حضرت وحشت اسی شام اپنی پنشن لے کر کلکتہ سے ڈھاکا واپس آئے تھے۔ خیروعافیت دریافت کرنے کے بعد میں نے جوں ہی احباب کلکتہ کے متعلق دریافت کیا ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ گلوگیر آواز میں اپنا ہی ایک بہت پرانا شعر پڑھا۔

وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہل وطن
تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لیے

شاید کلکتہ والوں نے انہیں پاکستانی سمجھ کر پذیرائی سے گریز کیا ہو۔ اس ڈر سے ان کے قریب نہیں جا رہے ہوں کہ ہندوستانی پولیس انہیں بھی شک کی نگاہ سے دیکھے گی۔ کیونکہ اس دور میں ہی نہیں آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کو وہاں کی ہر کار شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ سمجھتی ہے کہ ان کے دل پاکستان کی محبت میں دھڑکتے ہیں۔ پھر اس دور میں تو بھارت کے شہروں اور دیہاتوں میں ایک بھگدڑ سی مچی تھی۔ جسے دیکھو وہی پاکستان کی جانب بھاگ رہا ہے۔ ہر مسلمان کا خیال تھا کہ ہند میں ہمارے لیے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم نے الگ ملک کا نعرہ لگایا تھا۔ اب ہمیں اپنا ملک مل چکا ہے۔ اس لیے وہیں چلے چلو۔ ہند سرکار تقریباً ہر مسلمان پر نظریں رکھے ہوئے تھی کہ کون کون پاکستان جا رہا ہے تاکہ ان کی املاک کو متروکہ قرار دے کر ہڑپ کرلے۔

وہ عرصہ سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ ڈھاکا آکر یہ مرض اور بڑھ گیا۔ مرض بڑھتا جا رہا تھا' کمزوری اتنی بڑھ چکی تھی کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا پھر بھی وہ خدمت ادب میں کوشاں تھے۔ بنگلہ میں اردو کے متعلق مضامین لکھنے کی ایک نئی طرح ڈال رہے تھے۔

اس حالت میں بھی وہ چھوٹی بڑی ہر قسم کی ادبی محفلوں میں پہنچنا ضروری سمجھتے۔ فرصت کے اوقات میں ادبیات کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا لیکن اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ ناول یا افسانے پڑھنے سے گریز کرتے۔ عندلیب شادانی کو اس کی وجہ ایک خط میں بیان کرتے ہیں کہ مختصر افسانہ پر میں کوئی رائے زنی نہیں کرسکتا اس لیے کہ میں افسانے کبھی نہیں پڑھتا۔ آپ فرماتے ہیں اور بجا فرماتے

ہیں کہ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کردے کہ پڑھنے والا افسانے کے مخصوص کرداروں کے ساتھ ہمدردی یا نفرت کرنے پر مجبور ہوجائے اور یہ شدت تاثر اس درجے پر پہنچ جائے کہ وہ افراد قصہ کے رنج وراحت کو اپنے رنج وراحت کی طرح محسوس کرنے لگے تو یہ افسانے کی معراج ہے۔ میں اندوہ والم کی داستان سے بری طرح متاثر ہوں اس لیے افراد کا قصہ کے فرضی اندوہ والم کو اپنے ذاتی سرمایۂ غم پر جو کچھ کم نہیں ہے اضافہ کرنا میں نے کبھی مناسب نہیں سمجھا۔"

وحشت کے ڈھاکا آجانے سے اردو کے فروغ کو جلا ملی تھی۔ اس کا ذکر جناب افسر ماہ پوری کچھ اس طرح کرتے ہیں

"ان کے قیام ڈھاکا سے گویا یہاں کی ادبی انجمنوں پر شباب آ گیا تھا۔ خصوصاً "دائرہ ادب" کی نشستوں کی زینت ورونق میں چار چاند لگ گئے تھے۔ جب کبھی ہم انہیں مدعو کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر جاتے وہ خود باہر تشریف لے آتے، ہمارا پُرجوش خیر مقدم کرتے' اندر لے جاتے تو پہلے ہمیں بٹھاتے پھر خود بیٹھتے' چائے پان سے تواضع کرتے' اٹھنے بیٹھنے میں سخت اذیت ہوتی مگر وہ اپنی وضع وشرافت کے نبھانے میں کوئی دقت محسوس نہ کرتے اور ہم شرم سے پانی پانی ہوجاتے جب تک ان کے ہاتھ پاؤں چلتے رہے انہوں نے اپنی شرافت سے نہ تو "دائرہ ادب" کی نشستوں کو محروم کیا اور نہ کسی اور مشاعرے کو۔ وہ بھی اس پابندی وقت ووضع کے ساتھ کہ دیر سے ہر آنے والا ان سے نادم ہوتا۔"

کلکتہ کو خیرباد کہنے سے آل انڈیا ریڈیو سے وحشت کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ڈھاکا آنے کے بعد ریڈیو پاکستان ڈھاکا کے ڈائریکٹر نے اصرار شروع کردیا۔ پہلے تو وحشت نے ریڈیو پر آنے سے انکار کیا مگر جب اصرار بڑھنے لگا تو انہوں نے پہلا پروگرام 18 اکتوبر 1950ء کو ریکارڈ کرایا جو اسی دن نشر ہوا۔ وہ روز عاشور تھا۔ اسی کی مناسبت سے انہوں نے واقعۂ کربلا پر ایک نہایت مؤثر مرثیہ پڑھا۔

بیعت کریں حسین یہ حکم یزید تھا
یہ حکم جب شہنشاہ دارین نے سنا
فرمایا ہم یزید کا مانیں گے حکم کیا
مالک خدا ہے اور ہیں ہم بندۂ خدا
حکم خدا ہے حق کی حمایت کریں گے ہم

ایذا کھنچیں گے پر نہ شکایت کریں گے ہم

اس کے بعد مولانا خود ریڈیو سے ایسے خوش ہوئے کہ عین حیات تک اپنی وضع خاص سے تعلق برقرار اور فیض جاری رکھا۔ بیسیوں پروگرام نشر کیے۔ دو درجنوں ریکارڈز اور سیکڑوں غزلیں اس فہرست سے الگ ہیں جو ان کے انتقال تک برابر نشر ہوتی رہیں۔ جو تقریریں، نظمیں، غزلیں ڈھاکا کے علاوہ دوسرے اسٹیشنوں سے نشر ہوتی رہیں یا دہرائی گئیں وہ بھی اس شمار سے باہر ہیں۔

اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے ان کی تقریروں کے کئی سلسلے نشر ہوئے جن میں تین سلسلے یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ ''زمانے کے انداز یہ بدلے گئے'' اس عنوان کے تحت تہذیبی و ثقافتی پروگرام اور قدیم و جدید شعر و ادب پر تنقید و تبصرے نشر ہوئے اس سلسلے کی پہلی تقریر 19 جنوری 1952ء کو نشر ہوئی تھی۔ ''مشرقی پاکستان کے قدیم اردو شعراء'' کے عنوان سے نشر ہونے والی اس تقریر میں علامہ وحشت کلکتوی نے ان شعراء و ادباء کا تذکرہ کیا تھا جن سے انہوں نے ملاقات کی تھی یا ان کا کلام پڑھا یا سنا تھا۔ اس یادگار سلسلے کی پہلی تقریر 29 فروری 1952ء کو ڈھاکا اور دوسرے اسٹیشنوں سے نشر ہوئی تھی۔ بنگال کے تاج الشعراء قاضی نذر الاسلام کی سالگرہ کے موقع پر 25 مئی 1952ء کو علامہ کا ایک انٹرویو نشر ہوا تھا جس میں انہوں نے نذر الاسلام کے تعلقات اور نظریات پر روشنی ڈالی تھی۔ اردو اور بنگلہ کے اتحاد کے سلسلے میں یہ انٹرویو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

''مجھے جناب نذر الاسلام کی ملاقات کا شرف کلکتے میں ہی حاصل ہوا تھا۔ کوئی آٹھ نو سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک فلم کمپنی فضلی برادرس نے جن کا اسٹوڈیو ٹالی گنج میں تھا، ارادہ کیا کہ ایک فلم بنائیں جس میں عالم ارواح کا ایک مشاعرہ دکھایا جائے۔ شعراء میں جہاں تک مجھے یاد ہے، مشاعرہ میں شرکت کرنے والے میر، غالب، مومن اور داغ قرار پائے اور ایسا انتظام ہوا کہ میر کا پارٹ نذر الاسلام صاحب کو دیا گیا۔ غالب کا اس حقیر کو، مومن کا ساغر نظامی کو اور داغ کا جگر مراد آبادی کو۔ غرض ہم سب اسٹوڈیو میں آموجود ہوئے اور میک اپ کے مراحل طے کیے گئے۔ شاعر نذر الاسلام کی شخصیت کو میں نے بہت جاذب پایا۔ میرا خیال تھا کہ اردو میں مکالمہ میر کے اشعار کا پر اثر طریقے سے پڑھنا نذر الاسلام کے لیے مشکل ہی ہوگا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ان کو اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ میر کے اشعار جذبات کی تصویریں ہیں ان کی اداکاری کے لیے نذر الاسلام ہی جیسا شخص چاہیے جس کو قدرت نے بلا کا حساس دل دیا ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اردو آپ نے کب سیکھی۔ انہوں نے ایسا جواب دیا کہ میں شرمندہ ہوگیا۔ کہا کہ میرا ہم وطن وحشت اردو کا مشہور شاعر ہے۔ اس کا کلام پڑھنے کے لیے اردو سیکھی۔'' اپنی بے بضاعتی پر مجھے خاص طور پر خجالت ہوئی کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپ کا کلام پڑھنے کو بنگلہ سیکھی ہے۔ مجھے نذر الاسلام سے مل کر میر کا یہ شعر یاد آیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

میں جتنی دیر تک ان کی صحبت میں رہا مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ ایک غیر معمولی انسان میری نظروں کے سامنے ہے۔ خاموش ہے لیکن اس کی خاموشی پر اسرار ہے۔ اس کی آنکھیں نیم وا سی ہیں لیکن جب وہ باتیں کرنے لگتا ہے تو ان میں عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

جب ہم لوگ اپنا اپنا پارٹ ادا کر چکے تو میں نذر الاسلام سے ہمکلام ہوا اور پوچھا کہ میر جس کا آپ نے پارٹ کیا، آپ کے خیال میں کیسا شاعر ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے زیادہ تر غالب کا مطالعہ کیا ہے اس سے میں زیادہ واقف ہوں اور اس کی شاعری کا دلدادہ ہوں لیکن میر کا کلام مجھے دیوانہ بنا دیتا ہے۔ دیوانہ تو خدا کے فضل سے میں ہوں ہی، میر میری دیوانگی میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ ایک اور پیر مغاں ہے جس نے اپنے میخانے کا دروازہ میرے لیے کھول رکھا ہے اور وہ حافظ شیرازی ہے۔ یہ کہہ کر ایک والہانہ کیفیت کے ساتھ حافظ کا مطلع دیوان پڑھا۔

الا یا ایہا الساقی اور کاسا و انا دلہا
کہ عشق آساں نمود اول و بے نقاد مشکلہا

اس ایک تقریر نے اردو داں طبقے کے سامنے بنگلہ کے اس مشہور شاعر جس نے اردو بنگلہ اتحاد کے لیے قیام پاکستان سے بھی کافی عرصہ پہلے کوشش شروع کردی تھی اس کی شخصیت کو صحیح طور پر پیش کردیا۔ نذر الاسلام جسے بنگلہ کا باغی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی ایسی سیکڑوں نظمیں ہیں جس کا مصرع اولیٰ یا مصرع ثانی اردو کا ہے۔

دنیا کے ڈور کو رے تا حرکیر تیز تلوار سے
کمال تو نے کمال کیا بھئی کمال تو نے کمال کیا
مصطفیٰ کمال پاشا نامی اس نظم کا ہر دوسرا مصرع اردو کا ہے۔ اس کی اسی تیز دماغی کو دیکھ کر بنگلہ کے ایک بڑے شاعر رابندرناتھ ٹیگور نے اپنی پوتی سے اس کی شادی کرادی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے سارے بچے (قاضی شبو شاچی سے نورالنہار تک) ہندو ہو گئے۔ کافی عرصہ بعد نورالنہار کو اپنا مذہب یاد آیا اور وہ حکومت بنگلہ دیش کی استدعا پر کلکتے سے اپنے بیمار باپ کو لے کر ڈھاکا آ گئی اور پھر اس نے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کر لی ورنہ قاضی نذرالاسلام کے سارے بچے آج بھی کلکتہ میں ہندو بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔

قاضی نذرالاسلام کے بعد وحشت نے ریڈیو پر پھر کوئی ایسی جامع تقریر نہیں کی۔ انہوں نے فرمائشی نظمیں ضرور پڑھیں۔

ریڈیو پاکستان سے مولانا کے تعلق کی مدت مختصر تھی لیکن اس مختصر مدت میں بھی یہ سمجھ لینا دشوار نہ تھا کہ استادِ فن کے علاوہ مولانا ایک غیر معمولی انسان بھی تھے۔

سرکاری ضابطے کی بھی سختی سے پابندی کرتے۔ کنٹریکٹ بھیجا جاتا تو اس کا جواب مقررہ وقت پر ڈاک سے واپس آ جاتا۔ مسودہ بھی وقت پر پہنچ جاتا۔ یاددہانی کی ضرورت نہ ہوتی۔ مسودہ اپنے ہاتھ ہی سے لکھتے۔ خوش خط بین السطور چھوڑ کر تاکہ ترمیم واضافے کی گنجائش رہے۔ مسودہ پڑھ کر وقت کا تعین کرتے کہ بعض اوقات ریڈیو والے بھی محجوب ہو جاتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ کلیم اللہ فہمی خود گاڑی لے کر مولانا کو براڈ کاسٹ کے لیے لے گئے گاڑی کوئی دو منٹ دیر سے پہنچی' مولانا روانہ ہو چکے تھے' وہ براڈ کاسٹ ہاؤس پہنچے تو دیکھا' مولانا سائیکل رکشا سے اتر رہے ہیں۔ انہوں نے صورتِ حال بیان کرتے ہوئے معذرت طلب کی' مولانا نے فرمایا ''کوئی بات نہیں' میں نے سوچا آپ کی بہ نسبت میرا وقت سے پہنچنا ضروری تھا اس لیے چل کھڑا ہوا۔''

مولانا کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ جس موضوع کے متعلق ذرا سا بھی تکلف ہوتا کہ اس کے ساتھ پورا انصاف نہ کر پائیں کے کبھی قبول نہ کرتے۔

مولانا حسرت موہانی کا انتقال ہوا تو ان کی زندگی اور شاعری پر تقریر کے لیے فہمی صاحب نے استدعا کی۔ خاصی دیر تک مولانا حسرت کی شاعری پر گفتگو کرتے رہے لیکن جب تقریر کے لیے چلنے کو کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ''حسرت میرے دوستوں میں تھے مگر ایک بہت بڑی حیثیت کے مالک تھے میں اب ضعیف العمر ہو چکا ہوں حافظہ کام نہیں کرتا چار پانچ گھنٹوں میں مجھ سے تقریر تیار نہ ہو سکے گی آپ اور کوئی انتظام کر لیجیے' یہاں ایسے اور بھی لوگ ہیں جو اس کام کے اہل ہیں۔''

حالانکہ وہ ایام علامہ پر بہت بھاری تھے۔ مالی مشکلات کا سامنا تھا اور آمدنی کے وسائل محدود تھے۔ لکھنے پڑھنے والے اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ جس شخص کا واحد مشغلہ لکھنا پڑھنا ہوا سے اپنی کتابیں کتنی عزیز ہوتی ہیں۔ کسی حال میں وہ انہیں علیحدہ کرنا گوارہ نہیں کرتا مگر مجبور انسان کیا کرے۔ مولانا کسی ایسی چیز کے مالک نہ تھے جسے بیچ کر اپنی ضروریات پوری کرتے۔ ان کی متاعِ عزیز نادر و نایاب کتابیں تھیں۔ انہوں نے صدر شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی کو لکھا کہ انہیں خرید لیا جائے۔ اپنی متاعِ عزیز کو فروخت کرنے پر تیار تھے مگر ایسی تقریر سے اجتناب تھا جس سے انصاف نہ کر سکنے کا خطرہ تھا۔

انتقال کے آخری دنوں میں جب مولانا بستر سے لگ گئے تھے تو ان کی غزلوں کی رائلٹی کی رقم فہمی صاحب خود ان کے گھر پہنچانے جایا کرتے تھے۔ ضابطے کی رو سے ایک ذمے دار افسر کے سامنے کاغذات پر مولانا کا دستخط کرنا ضروری تھا دو بار بڑی مشکلوں سے دستخط کر پائے۔ ہاتھ میں بے حد رعشہ آ چکا تھا۔

آخری بار تو دستخط کرنے سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ ہاتھوں سے گزر کر زبان پر بھی فالج کا اثر آ چکا تھا۔ بڑی مشکلوں سے سرگوشی کے انداز میں آواز نکلتی۔

مولانا اشاروں سے بتانا چاہتے تھے کہ اب وہ دستخط نہیں کر سکتے۔ فہمی صاحب نے بات سمجھ لی اور کہا کہ کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کے انگوٹھے کا نشان کافی ہوگا۔

1954ء کے اواخر میں مولانا اس حد تک ضعیف اور علالت کا شکار ہوئے کہ پہلے گھر سے باہر نکلنا بند ہوا اور پھر گھر میں بھی چلنا پھرنا دشوار ہو گیا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ریڈیو اسٹیشن تک ان کا تشریف لانا ناممکن تھا مولانا کے پرستاروں' دوستوں اور خیر خواہوں پر مولانا کی اس بے بسی کا جو اثر تھا ظاہر ہے لیکن ریڈیو والوں کو بھی اس کا صدمہ کم نہ تھا خاص طور سے 25 مارچ 1955ء کو جب ریڈیو نے ایک

مشاعرہ منعقد کرنے کا ارادہ کیا تو اس احساس نے کہ مولانا ڈھاکے میں موجود رہتے ہوئے بھی اس مشاعرے میں شرکت نہ فرما سکیں گے' ہر آنکھ کو اشکباری پر مجبور کر دیا۔

اس نازک موقع پر ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے اس گتھی کا جو فوری حل دریافت کیا اسے اب ایک تاریخی یادگار کی حیثیت حاصل ہے اور وہ یوں کہ مولانا کا کلام ان کے دولت کدے سے نشر ہوا اور مولانا نے اپنے بستر علالت سے اس مشاعرے میں شرکت کی۔ ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں شاید یہ واقعہ اپنی آپ مثال ہے اور شاید قدرت یہ فیصلہ بھی کر چکی تھی کہ اس واقعہ کو تاریخی اہمیت دے گی چنانچہ خلاف توقع یہ پروگرام مولانا کا آخری ریڈیائی پروگرام بھی ثابت ہوا۔

وحشت کے آخری سفر کی منظر کشی کرتے ہوئے افسر ماہ پوری لکھتے ہیں۔

''21 جولائی 1956ء (وفات 20 جولائی مطابق 11 ذی الحجہ 1375ھ بروز جمعہ گیارہ بجے شب) کی منحوس صبح تھی روزنامہ مارننگ نیوز آیا تو اس کے پچھلے صفحہ کے ایک گوشے میں خبر تھی۔ "Wahshat expires last night"

دل دھک سے رہ گیا۔ طبیعت متوحش ہو گئی۔ اسی اثنا میں عابد صاحب' نظیر صدیقی' عطاء الرحمٰن جمیل' سرور بارہ بنکوی وغیرہ آ گئے۔ ہم اکٹھے ان کی قیام گاہ پر تعزیت کو گئے نماز جنازہ ظہر کی نماز کے بعد ہونے والی تھی۔ طوطی بنگالہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا۔ ایک سناٹا سا تھا ایک ہو کا عالم تھا اور در و دیوار سے غم و اندوہ برستا تھا۔ جو دل تھا فگار تھا' جو آنکھ تھی اشکبار تھی۔

عاشق شعر و ادب کا جنازہ تھا دھوم سے اٹھا۔ جنازے میں ہر طبقے کے لوگ شریک تھے۔ سرکاری عہدہ دار' اخبار نویس' شاعر' ادیب' علامہ کے شاگرد اور ارادت مند۔ قبر کھدی تو پانی سے بھر گئی' دوسری کھدی تو وہ بھی پانی سے لبریز ہو گئی۔ تیسری کھدی تو اس کا بھی وہی عالم تھا۔ بنگال کی سرزمین پانی سے عبارت ہے چنانچہ ساحر بنگالہ کو کیلوں کے تنوں پر لٹا کر سپرد خاک کی بجائے سپرد آب و خاک کیا گیا۔ اس طرح بنگالہ میں اردو شعر و ادب کی ایک انجمن خاموش ہو گئی۔

مولانا کے ایک شاگرد علامہ جمیل مظہری جنہیں اس صدی کے بڑے شعراء میں شمار کیا جا رہا ہے (جن کا پٹنہ میں سو سالہ پھر ڈیڑھ سو سالہ جشن پیدائش جمیل مظہری کا انعقاد ہوا تھا) انہوں نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

ہم پر اک سایۂ دامان پدر تھے وحشت
جس پر آنچ آئے کوئی سینہ سپر تھے وحشت
شام کلکتہ با آواز حزیں روئے گی
تھی جو وحشت کے قدم سے وہ زمیں روئے گی

وحشت کا انتقال موسم برسات میں ہوا تھا جس دن کلکتہ خبر پہنچی وہاں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

وحشت کی تصنیفات و تالیفات کی اتنی طویل فہرست ہے جسے اتنے تھوڑے سے صفحات میں پیش نہیں کیا جا سکتا صرف چیدہ تصانیف کے بارے میں ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان کی تصنیف میں دیوان وحشت (مجموعہ کلام) ناشر ستارہ ہند پریس کلکتہ 1910ء' ترانہ وحشت (مجموعہ کلام) پہلے ایڈیشن کے ناشر مکتبہ جدید لاہور 1953ء' دوسرے ایڈیشن کے ناشر ابن حسن کراچی 1969ء' نقوش و آثار (مجموعہ کلام) ناشر مکتبہ عارفین' قرآن منزل ڈھاکا 1957ء اور تالیف کی فہرست میں ''دیوان نقش'' مع مقدمہ (شمس فرید پوری کا مجموعہ کلام) ''انگریزی اردو گرامر'' رومن رسم الخط میں انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے لکھی گئی گرامر۔ اس کے علاوہ چند اہم مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے' وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ماہنامہ تنویر المشرق کلکتہ مارچ 1908ء' ''عبدالحلیم عاصم'' مخزن لاہور کے شمارہ جون 1909ء میں ''شیخ مصلی حزیں'' مخزن لاہور کے شمارہ 1909ء ''شیخ علی حزیں'' لاہور کے شمارہ 1909ء میں ولی دکنی۔ اسی جریدے کے شمارہ 1910ء میں حالی کا تغزل۔ سالنامہ جدید اردو کلکتہ 1941ء میں ''اصلاح سخن''۔ ماہنامہ ماہ نو کراچی کے شمارہ اکتوبر 1950ء میں سید محمد آزاد۔ اسی جریدے کے شمارہ فروری 1951ء میں ''قاضی محمد صادق اختر'' شمارہ مارچ 1951ء میں عبدالغفور نساخ' ہفت روزہ خدمت' مشکری کے شمارہ جولائی 1956ء ''اردو کے چند بنگالی ادیب'' ماہنامہ مہر نیم روز کراچی 1957ء میں ''مشرقی پاکستان کے اردو شاعر'' اسی جریدے کے اسی شمارے میں ''شاعری اور ادب'' طبع ہوتے اس کے علاوہ بھی بے شمار مقالات و دیگر مضامین مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال

ارضِ پاک کو خدا نے بے شمار نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ قدرتی حسن سے اس طرح مالا مال کر رکھا ہے کہ اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی جو لوگ سوئٹزر لینڈ کے قدرتی حسن پر رطب اللسان رہتے ہیں انہیں سوات و مری و نتھیا گلی دیکھنا چاہیے جو سہارا ڈیزرٹ کی خاموشی کی تعریف کیا کرتے ہیں انہیں چولستان دیکھنا چاہیے جو نیپال کے ہمالیائی حسن کے گن گاتے ہیں انہیں بلتستان کی سیر ضرور کرنا چاہیے۔ اسی خیال کے تحت "سیرِ پاکستان" کے سلسلے کو شروع کیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں اب تک جتنی بھی تحریر شامل ہوئیں یہ تحریر ان سے ذرا مختلف ہے کیونکہ ندیم اقبال عالمی پیمانے کے عکاس ہیں۔ قدرتی حسن کی فوٹو گرافی میں ان کی شہرت بہت زیادہ ہے لیکن اب جب انہوں نے اپنے سیر کی روداد قلمبند کی تو ایک اور خوبی سامنے آئی کہ وہ منجھے ہوئے قلمکار بھی ہیں۔ نہایت پُرلطف انداز میں لفظوں سے عکاسی کرتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ فوٹو گرافر کے قلم کا شاہکار ایک پراثر رودادِ سفر کا آخری حصہ

میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گیئر بدلا اور ہم موت کی وادی میں جاتی...... جیسی سڑک پر آگے بڑھنے لگے۔ واقعی وہ راستہ ہی ایسا تھا کہ ہر قدم پر خدا یاد آ جائے۔ ایک اجاڑ، ویران، تنہا، سلگتا ہوا راستہ تھا۔

کہنے کو وہ ایک سڑک تھی مگر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سڑک نہیں تھی، سڑک تو کہیں اور ہوگی اور ہم بھول کر کہیں اور آ نکلے تھے۔ ایک بلند، سربہ فلک، خشک چٹان تھی، جس پر ہماری جیپ چڑھنے کے لیے بھرپور زور لگا رہی

تھی۔ راستے پر اردگرد، دور دور تک پتھر ہی پتھر تھے۔ راستہ بھی پتھریلا تھا۔ سبزے کا ایک تنکا بھی نہ تھا۔ کوئی گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس ویرانے کے پیچھے سرسبز وادیاں اور برفانی اہرام ہوں گے۔

ہر طرف ایک قبرستان جیسی خاموشی تھی اور صرف جیپ کے انجن کی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اچانک اس شہرِ خموشاں میں زندگی داخل ہوئی اور وہ ہمارے اداس و افسردہ چہروں پر پھیلتی چلی گئی۔ وہ ایک چکوروں کا گروپ تھا جو شاید پتھروں کے پیچھے آرام کر رہا تھا اور اب جیپ کے شور سے گھبرا کر ہمارے آگے آگے نچلی پرواز کرتا ہوا اڑنے لگا تھا۔ انہیں دیکھ کر ہم سب کے چہرے پہ چھائی نحسی اور تناؤ جو ہو گیا تھا، ان کی جگہ شگفتگی نے لے لی تھی۔ میں خود بھی انہیں شگفتہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو چکور ہے۔'' شاہ جی کی مسرت بھری آواز ابھری۔

''جی نہیں الو ہے۔'' شاہد نے سرگوشی میں کہا لیکن یہ آواز شاہ جی کی سماعت تک پہنچ گئی۔ انہوں نے غصیلے لہجے میں کہا:

''الو اور چکور میں تجھے فرق نہیں پتا۔ یہ چاندنی رات میں چاند کو چھونے کے لیے اڑتا جاتا ہے۔ بڑا عاشق مزاج پرندہ ہے۔''

''اسی لیے تو الو کہا۔ عقل سے کام لیتا تو عشق میں گرفتار نہ ہوتا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

''الو کو چکور الو ہی نظر آتا ہے۔ عقلمند کو نہیں۔ کیسا پیارا پرندہ ہے۔'' شاہ جی کے لہجے سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ ہم باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک ڈرائیور نے بریک لگا دیا اور باہر چھلانگ لگا کر اتر گیا۔ ہم حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے کہ ڈرائیور نے دوڑ لگا دی۔

اس طرح یکایک دوڑ لگا دینے کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔ کبھی وہ پتھروں کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی پتھروں سے نمودار ہو جاتا۔ ہم حیرانگی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھوں میں ایک چکور تھامے نمودار ہوا۔ چکور کو اس نے اپنی سیٹ کے نیچے رکھا اور بولا۔ ''گلگت میں اس کے اچھے دام ملیں گے۔''

اس کی بات پر شاہ جی بھنا گئے۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولے۔ ''ہم چکور پکڑنے نہیں آئے ہیں۔ سیدھے سیدھے چلو۔''

کہیں وہ کچھ اور نہ بولیں اس خیال سے میں نے کہا۔ ''ہاں چکور بہ آسانی بک جائے گا۔ اس طرح تمہیں کچھ پیسے مل جائیں گے۔''

ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کی اور دوبارہ اسی سڑک پر بڑھنے لگا۔ یہ سارا تماشا چند منٹ میں تمام ہوا۔ شاہ جی خوش نہ تھے کہ سفر کے آغاز پر ہی پرندے کو پکڑ کر ڈرائیور نے بدشگونی کی ہے لیکن وہ کچھ بول کر بات بڑھانا بھی نہیں چاہتے تھے اس لیے خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے لیکن چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ بھرے بیٹھے ہیں۔

تانگو کی جانب جاتی ہوئی وہ نام نہاد سڑک آہستہ آہستہ اوپر چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سڑک پر بکھرے کئی پتھر اتنے بڑے تھے کہ جیسے ہی جیپ کے ٹائر ان پر آتے تو جیپ دو دو فٹ اوپر بلند ہو جاتی۔ اس پورے سفر میں جیپ راستے پر کم اور ہوا میں زیادہ بلند رہی۔

ہم جتنا بلندی کی طرف جا رہے تھے، راستہ تنگ پڑتا چلا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چٹان کے اوپر کھدی ایک لکیر ہے جس پر ہم بڑھتے جا رہے ہیں۔ شاہراہ ریشم کافی دیر تک ہمیں نظر آتی رہی اور پھر وہ بھی غائب ہو گئی۔ اب ہم دنیا سے کٹ چکے تھے۔ میں بائیں جانب بیٹھا تھا اور گہرائی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ خوف اب میرے ذہن سے میرے بدن میں منتقل ہو چکا تھا اور چیونٹیوں کی مانند ہر موئے تن میں رینگ رہا تھا۔ راستہ اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ جیپ کا بایاں وہیل بالکل کنارے پر چل رہا تھا اور میرے پسینے سے شرابور ہاتھ، مضبوطی سے سامنے لگے ہینڈل کو تھامے ہوئے تھے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ میں ڈائناسار کے دور کے بڑے بڑے پرندوں پر سوار ہوں بلکہ ان کے پنجوں میں جکڑا پرواز کر رہا ہوں یا میں رائے کوٹ نالے کے اوپر پیرا گلائیڈنگ کر رہا ہوں۔ پیرا گلائیڈنگ تو پھر بھی محفوظ ہوتی ہے مگر یہ سفر ایسے تھا کہ اگر کوئی ایک زور کا جھٹکا لگتا تو میں اپنی سیٹ سے سیدھا ہزاروں فٹ نیچے نالے میں جا گرتا۔ ان حالات میں لوگوں کی خوف سے گھگی بندھ جاتی ہے میری بھی گھگیاں بندھ گئی تھیں۔ میں نے اس کے بعد بہت سفر کیے، ٹریک کیے مگر آج بھی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس سے خوف ناک سفر میں نے نہیں کیا۔ ڈرائیور نے ایک اور کمال کر دیا۔ چلتے چلتے بریک دبایا، جیپ روکی اور بولا ''صاحب نیچے اترو۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں چونک گیا۔ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا "اترو صاحب۔"

ہم اس کے رحم و کرم پر تھے۔ حکم نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مجبوراً جیپ سے اترنا ہی پڑا۔

جیپ کھائی کے بالکل قریب کھڑی ہوئی تھی، اتنی قریب کہ ذرا سا دھکا اسے کھائی میں گرا سکتا تھا۔ وہاں کھڑے شخص کو پیچھے سے انگلی کے لمس سے بھی گرایا جاسکتا تھا۔ ڈرائیور کے دل میں کیا ہے۔ وہ کیوں مجھے نیچے اتار رہا ہے اسی نکتے پر غور کرتا ہوا میں نیچے اتر گیا۔

"صاحب! ادھر دیکھو۔" اس نے نیچے کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے نیچے دیکھا۔ گہری کھائی میں جس میں دریا کا پرشور پانی بہتا جارہا تھا مگر اس کا شور ہم تک پہنچ نہیں رہا تھا۔ میں ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ ڈرائیور کی آواز سماعت سے ٹکرائی "یہاں جیپ گرا تھا۔"

ہم سڑک کنارے دو قدم پیچھے ہٹ کر بہت نیچے اس جیپ کا ملبا دیکھنے لگے جو نالے کے آس پاس بکھرا دکھائی دیتا تھا۔ میں خوف اور وحشت سے لرزاں، ہزاروں فٹ نیچے وہ ملبا دیکھ رہا تھا۔

مجھ پر لرزہ طاری اس لیے تھا کہ میری سوچ اس بات پر اٹک گئی تھی کہ جب جیپ یہاں سے نیچے گر رہی ہوگی تو مرنے والوں کے ذہن کیا سوچ رہے ہوں گے اور جب وہ زمین سے ٹکرانے والے ہوں گے تو کیا سوچ رہے ہوں گے؟ یہ سوال اس لمحے میرے دماغ میں چپک کر بیٹھ گیا تھا۔ اس وحشت ناک سوال کا جواب صرف میرے رب کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں وہ بلندی دیکھتا اور یہی سوچتا تھا۔ شاہ جی فق چہرے کے ساتھ ڈبیا جیسی نظر آتی جیپ کو دیکھ رہے تھے۔ اشفاق اور شاہد، جو اپنے آپ کو کوہ پیما ثابت کرتے رہتے تھے، وہ بھی لڑکھڑا گئے تھے۔ ہمارے ڈرائیور نے جیپ پر بیٹھ کر وہ سب بتایا کہ وہ جیپ کس طرح گری ہوگی۔

ڈرائیور جیپ کو آگے پیچھے کر رہا تھا اور میرا دل ڈوب رہا تھا۔ ہر بار دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی تھی کہ ہماری جیپ اب گری کہ تب گری۔

میرے ذہن میں اگلے کئی دن تک یہ خیال اٹکا رہا کہ میں جیپ سمیت اس بلندی سے نیچے گر رہا ہوں۔ یہ خوف ناک خواب مجھے فیری میڈو میں بھی اپنے خیمے میں لیٹے رات کو آتے تھے اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ میرا جسم فیری میڈو کی خنکی میں بھی پسینے سے شرابور ہو جاتا تھا۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ میں موت سے نہیں ڈرتا تھا، بس اسی اذیت سے خوف زدہ ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے کوئی اس اذیت سے کیسے گزرتا ہوگا۔ آخر کار اسی کیمپنگ سائٹ کے مالک، رحمت نبی نے بہت دن بعد مجھے بتایا کہ گرتے ہی زمین سے ٹکرانے سے پہلے موت واقع ہو جاتی ہے۔ زمین پر کوئی زندہ شخص اتنی بلندی سے نہیں ٹکراتا، صرف مرا ہوا جسم ہی ٹکراتا ہے۔ یہ سب سن کر مجھے چین آیا کہ زمین پر ٹکرانے سے پہلے ہی "میں" مر چکا ہوں گا۔

جیسے ہی میں اپنی اذیت ناک موت کے احساس سے نکلا تو سکون میں آگیا اب مجھے صرف ان مرنے والوں کا افسوس تھا۔ پلٹ کر دیکھا۔ دیگر ساتھی بھی نیچے اتر آئے تھے۔ بت بنے، نالے کے ساتھ بکھری جیپ کو دیکھ رہے تھے۔ شاہ جی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک نیچے دیکھتے رہے پھر میرا بازو پکڑا اور چٹان کے سائے میں لے آئے "یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔ تم کو احساس کرنا چاہیے تھا کہ میرے سات چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میں واحد کفیل ہوں۔" شاہ جی کی شکایت، نمی کی صورت ان کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ وہ میرا بازو پکڑے بولتے جارہے تھے۔ "اگر مجھے کچھ ہو گیا تو ان کا کون نگہبان ہوگا؟"

مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ راستہ اتنا دہشت ناک ہوگا۔ اب وقت پلٹ نہیں سکتا تھا۔ میں نے شاہ جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "موت اگر یہاں لکھی ہے تو یہیں آئے گی اور ضروری نہیں کہ جو بھی یہاں سے گزریں، ان کی موت یہاں لکھ دی جاتی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ یہ پہلا جیپ حادثہ ہے جو اس راستے پر ہوا ہے۔ اس سے پہلے جب لوگ پیدل سامنے والے پہاڑ سے نانو جاتے تھے تو پانی نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوتے تھے۔ جیپ والے راستے کو بنے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ مجھے موت سے نہیں، اتنی بلندی سے گرنے سے خوف ستاتا ہے۔ میں نے انھیں رام کرنے کی خاطر کہا "خطرناک راستوں کی دہشت تو ہوتی ہے مگر موت لازمی تو نہیں ہوتی۔ آج سے چھ سال پہلے، میرا دوست نوید اپنے ایک سالہ بیٹے کو اپنے گھر کے صحن میں لیے لیٹا اسے کھلا رہا تھا۔ کسی کم بخت کی کلاشنکوف سے نکلی ہوئی

گولی پلٹ کر نوید کے دل میں اتر گئی۔ وہ تو اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ اور اطمینان سے تھا، پر موت نے اسے وہیں آ دبوچا۔" میرے الفاظ نے جادو سا اثر دکھایا۔ شاہ جی کی میرے بازو پر گرفت نرم پڑ گئی اور وہ سیدھا جیپ میں جا بیٹھے۔ میرے الفاظ سے شاید شاہ جی کی تسلی ہو گئی تھی مگر میری اپنی قطعاً نہیں ہوئی تھی۔

مر جانے والوں پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم بوجھل دل کے ساتھ تاتو کو روانہ ہوئے۔ سورج زوال پذیر تھا۔ ہم جیسے جیسے اوپر جا رہے تھے، ویسے ویسے ہی گرمی نرم پڑتی جاتی تھی۔ ہوا چٹانوں کے پہلو سے ٹکرا کر ہمیں چھو رہی تھی مگر ہم افسردہ اور خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ابھی تو ہمارے ساتھ کچھ ہوا بھی نہیں تھا پھر بھی ہم ڈر گئے تھے اور جو ابھی ہونے والا تھا، اس کا تو ہمیں اندازہ ہی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور کن کن مراحل سے گزارنے والا ہے۔

ہم خاموشی سے سفر کر رہے تھے، جیسے سب نے موت کی آہٹ سن لی ہو۔ فیری میڈو اور نانگا پربت پہنچنے کا ایڈونچر فنا ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمیں دور کچھ سبزہ کے آثار نظر آئے۔ وہ تاتو گاؤں تھا۔ جیسے جیسے ہم گاؤں کے قریب ہوتے گئے تو روڈ کی دہشت دور ہوتی چلی گئی۔

ہم اس عذاب سے نکل آئے جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ہم پر مسلط تھا۔ اشفاق اور شاہد کی زبانیں بھی کھلیں اور وہی شیناز زبان کے الفاظ ان کی زبان سے بہنے لگے۔ شاہ جی کے چہرے کا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ حفاظتی ہینڈل سے اتر چکے تھے۔ میں نے دور آبادی پر نظریں جما دیں۔

گاؤں کے کچے گھروں کی چھتوں پر چڑھے بچے ہمیں دور سے دیکھ رہے تھے اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ہماری جیپ آہستہ ہونے لگی پھر گاؤں کے کنارے بہتی ایک پرشور ندی کے پاس جا رکی۔ ہم نیچے اترے تو سب خوب چہک رہے تھے، جیسے نانگا پربت سر کر آئے ہوں۔ شاہ جی خوشی سے ہر ایک کے گلے لگ رہے تھے۔ ڈرائیور کے تو گرویدہ ہو گئے۔ "کیا زبردست ڈرائیور ہو تم! اس پل صراط سے جیپ نکال لائے۔ ایک بار پھر گلے ملو۔"

ڈرائیور مسکرا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "واپسی کب ہوگی؟ کہو تو میں تاتو آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"

شاہ جی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ہم پیدل ہی جائیں گے۔ آٹھ میل ہی تو ہے۔" پھر میری جانب تائیدی انداز میں دیکھ لے۔ "ہم ٹریکنگ پر آئے ہیں تو جیپ کیوں استعمال کریں۔ ہم پیدل ہی واپس آئیں گے۔"

میں چپ ہی رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی میری طرح دوبارہ سے اس راستے پر جیپ کا ہولناک تجربہ نہیں دہرانا چاہتے۔ اب ان کی بات بھی ماننی تھی مگر یہ خون آشام راستہ دن میں تندور کی طرح دہکتا ہے۔ راستے میں پانی کا نام و نشان نہیں اور نہ کہیں سایہ ہے۔ آٹھ میل کا سفر تقریباً چھ گھنٹے میں مکمل ہوتا ہے۔ میں نے سوچا ابھی آگے تو چلیں۔ واپسی پر دیکھ لیں گے اگر قسمت میں حادثہ لکھا ہے تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔ یوں بھی ہم گناہ گار انسان ہیں کوئی اولیاء اللہ تو نہیں کہ مستقبل میں جھانک لیں۔ قبل از وقت حادثات کی نوعیت کو بھانپ لیں۔ اس لیے ہم نے ڈرائیور کو ہدایت دینے سے گریز کیا۔

ڈرائیور نے ہمیں گاؤں سے دائیں جانب ایک اوپر چڑھتے راستے کی جانب اشارہ کر کے بتا دیا تھا کہ یہ دو تین گھنٹوں میں فیری میڈو پہنچا دے گا۔ میں ایک اناڑی، جاہل، احمق تھا۔ یہ نہ سمجھ سکا کہ اتنے وقت میں ایک کوہستانی ہی پہنچ سکتا ہے۔ ہمارے شہری جسم ان پہاڑی راستوں کے عادی نہیں ہوتے اور نہ ہم کوئی بوجھ اٹھا کر چلنے کے عادی ہیں اور اگر ایسا کوئی مرحلہ آ بھی جائے تو راستے میں رکتے زیادہ ہیں۔

دن ڈھلنے میں ایک دو گھنٹے تھے۔ شام اتر رہی تھی۔ ہمارے سامنے ایک جنگل تھا اور کندھوں پر رک سیک کا بوجھ۔ میں جیپ کے سفر سے نجات پر خوش تھا اور ڈرائیور کے جھانسے میں آ کر ہم اس ٹریک پر چڑھ گئے۔ ندی کو پار کیا اور چہکتے چہکتے اس ٹریک پر روانہ ہو گئے۔

وہ ایک چوڑا راستہ تھا۔ دائیں جانب بلند ہوتا، پائن کے درختوں سے ڈھکا پہاڑ تھا اور بائیں جانب ایک دم نیچے گرتی کھائی تھی۔ ہم بلندی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے، ابھی بہت تھوڑا راستہ طے ہوا تھا، صرف پانچ منٹ گزرے تھے کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ راشن کا تھیلا اٹھائے میں فیری میڈو نہیں پہنچ سکوں گا۔ چڑھائی کی وجہ سے سانس پھولنے لگا تھا۔ دو مہینے کی صبح کی دوڑ اور ورزش کسی کام نہیں آ رہی تھی۔ رک سیک میں دنیا کی ہر ضرورت کا سامان ٹھونسا ہوا تھا۔ کمر دوہری ہوتی جا رہی تھی۔ تبھی ایک چڑ کی مکروہ آواز گونجی اور سب کی نظریں میری طرف گھوم گئیں۔

"کم کھایا کرو۔ مال پرایا صحیح مگر پیٹ تو اپنا

ہے۔'' کہتے ہوئے شاہ جی آواز کی سمت معلوم کرنے کی خاطر مڑے۔ مجھے رک سیک کے ساتھ اٹھائے کپڑے کے تھیلے سے نکل کر بکھرے سامان کو سمیٹتے دیکھ کر پشتا گئے اور جلدی سے بولے ''ارے یہ کیسے پھٹ گیا... میں تو شاہد کی کارستانی سمجھا تھا۔''

''آواز ہی ایسی تھی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کپڑا کمزور تھا ناں۔'' کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔ اور قدم آگے بڑھا دیے۔

پانچ منٹ بعد میں نے پہلا پڑاؤ کیا۔ ایک پتھر کے کنارے، ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اوپر سے آتی ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے لگا۔ ہوا میں برف کی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی گو کہ برفانی چوٹیاں ابھی دور تھیں۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ فیری میڈو کی طرف تاتو سے دو راستے جاتے ہیں۔ ایک چوڑا اور آرام دہ ہے مگر طویل ہے اور جنگل سے گزرتا ہے۔ دوسرا ایک قدرے مختصر سا ہے جو ایک دیوار سے لگی سیڑھی کی طرح ایک پہاڑی پر اٹھتا چلا جاتا ہے اور تکلیف دہ بھی ہے۔

ہم نے اپنے بوجھ کی وجہ سے چوڑا اور آسان راستہ چنا۔ میں نے یہ سوچا کہ وقفے وقفے سے کچھ آرام کر کے ہم فیری میڈو پہنچ جائیں گے مگر یہ خیال نہ آیا کہ کچھ دیر میں رات ہمیں اسی جنگل میں آدبوچے گی۔ اگر ہم تاتو میں کیمپ لگا کر رات گزار لیتے تو یہ آسانی سے فیری میڈو پہنچ سکتے تھے۔ اگر ہم کسی مقامی سے مشورہ کر لیتے تو شاید یہ مصائب مقدر نہ ہوتے مگر ہم نے تو کسی سے علیک سلیک بھی نہیں کیا تھا اور منہ اٹھا کر جنگل میں گھس گئے تھے۔

یہ غلطی ہم کر چکے تھے اس لیے اس کا خمیازہ بھی اٹھانا تھا۔ ہم کچھ دیر سستانے کے بعد دوبارہ روانہ ہوئے۔ اب شام کے سائے ہم سے بلند ہو کر پہاڑوں پر چڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں میرا بوجھ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ میں نے زبان پر تالے ڈال رکھے تھے مگر چہرہ ننگا تھا۔ اندر کی کیفیت چہرے سے ہویدا تھی۔ اشفاق اور شاہد نے چہرہ پڑھ لیا اور میرا سامان آپس میں بانٹ لیا اب میری پیٹھ کا بوجھ قدرے کم ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے پورے سفر میں میرا بہت خیال رکھا تھا۔ میری مرضی اور خوشی کے آگے وہ دونوں بچھ جاتے تھے۔ میں تاحیات ان دونوں کا مشکور رہوں گا۔

میرے سامان کا بوجھ تو انہوں نے بانٹ لیا تھا مگر اپنے وجود کا بوجھ تو مجھے گھسیٹنا ہی تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جنگل میں داخل ہوئے اور سبک رفتاری سے رات ہم پر قہر کی صورت ٹوٹ پڑی۔ وہ ایک گھنا جنگل تھا جہاں دن میں بھی روشنی کم پڑتی ہوگی۔ شاید اسی لیے اب تک کوئی جاندار نظر نہیں آیا تھا۔ کسی انسان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اب ہم ایک اندھیرے غار میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم نے ٹارچیں نکال لیں۔ اس وقت ہمیں راولپنڈی میں ان لڑکوں کی نصیحت یاد آ گئی کہ فیری میڈو جاتے ہوئے ٹارچ اور ایکسٹرا بیٹریاں ضرور رکھنا۔ اس رات جب ہم موت کے منہ میں پہنچ چکے تھے بچے تو اس میں اللہ کی مدد کے ساتھ ان ٹارچوں کا کمال بھی تھا۔

ٹارچوں کی روشنی کچھ ہی دیر میں معدوم ہو گئی۔ اس کی روشنی کہیں اندھیرے میں گم ہو جاتی تھی۔ آسمان نظر نہیں آتا تھا کہ کوئی چاند ہے یا نہیں کیونکہ آسمان مکمل طور پر درختوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔ راستے میں درخت گرے پڑے تھے۔ ہم درخت پھلانگتے اپنے اندازے سے آگے چلتے جا رہے تھے۔ ہمیں کوئی اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہم اپنے ٹریک سے بھٹک چکے ہیں۔ کیونکہ ٹارچ کی روشنی چند فٹ بعد تاریکی میں کھو جاتی تھی۔ کبھی ہم کہیں اوپر چڑھ رہے ہوتے اور کبھی کسی ڈھلوان پر پھسل رہے ہوتے۔ ہم سب خاموش تھے اور اپنی جانیں بچانے کی فکر میں غلطاں تھے۔

شاہد ایک خوف زدہ ہرن کی طرح ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔ اسماعیل خوف زدہ کم اور خفا زیادہ دکھتا تھا۔ اشفاق ہمیشہ کی طرح متوازن تھا۔ میں اپنے آپ کو سب کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ اشفاق بولا کہ لگتا ہے کہ اس جنگل سے نکلیں گے تو فیری میڈو آ جائے گا۔

''معلوم نہیں وہ آئے گا یا نہیں؟'' شاہ جی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ساری کوفت دور ہو گئی۔

''یہ تو کسی لڑاکا بیوی کی طرح پھول رہے ہیں۔'' اشفاق نے دبی آواز میں کہا۔ اگر یہ جملہ شاہ جی تک پہنچ جاتا تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا جو ایک تنے کو اچک کر پھلانگ رہے تھے۔

ہر طرف تاریکی تھی۔ اب مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم اپنا راستہ کھو چکے ہیں، کیونکہ ہم ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چل رہے تھے جو ہم نے خود ہی بنا لیے تھے۔ اس

راستے پر بے تحاشا ٹہنیاں بکھری پڑی تھیں، جن میں ہمارے بوٹ پھنس رہے تھے۔ ہم پر تھکاوٹ اور خوف، دونوں مل کر حاوی ہو چکے تھے۔ باتیں کم کرتے اور ادھر ادھر خوف زدہ ہو کر زیادہ دیکھتے۔ بلند پہاڑ ایک جانب تھے اور ان پر پگڈنڈیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ ہم سینڈریلا کی طرح جنگل میں سیر نہیں کر رہے تھے بلکہ اس سیاہ رات میں بھٹک کر ادھر اُدھر اپنی جان بچانے کے لیے بے مقصد دوڑ رہے تھے۔

شاہ جی کسی طرح گرتے پڑتے میرے پاس آئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ "ندیم! کسی طرح یہاں سے ایک بار نکال لو مجھے۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

میں انہیں جھوٹی تسلیاں دینے لگا، جبکہ تسلیوں کی ضرورت خود مجھے زیادہ تھی۔ میں اندر ہی اندر ٹوٹ گیا تھا مگر اپنے اندر کے خوف کو ظاہر نہیں کر رہا تھا کیونکہ سب نے اس وقت مل کر مجھے ٹیم لیڈر سمجھ لیا تھا اور ہر کوئی میری جانب دیکھ رہا تھا، صرف اشفاق کے اوسان بحال تھے۔ وہ مسلسل کہہ رہا تھا کہ ہم کہیں نہ کہیں ضرور نکلیں گے۔

گھنا جنگل، مہیب اندھیرا، گہری خاموشی اور راستہ کوئی نہیں۔ مجھے کسی جنگلی جانور کا ڈر نہیں تھا کیونکہ کوئی سامنے آجاتا تو ہم خوب شور مچا کر اس کو ڈرا کر بھگا سکتے تھے۔ مجھے اندیشہ ایک ہی تھا کہ ہم جن راستوں پر چل رہے ہیں یا جو پگڈنڈیاں ہمارے راستے میں آرہی ہیں، ان کے آس پاس کہیں کوئی کھائی نہ ہو؟ اور اگر ہے تو زیادہ گہری نہ ہو۔

پھر ایک ایسا راستہ آ گیا جس پر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا کیونکہ ایک جانب تو پہاڑ تھے اور دوسری جانب کھائی مگر وہ کتنی گہری ہے؟ اس کا اندازہ نہ تھا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ ہم میں سے کوئی اس میں گر گیا تو کتنا نیچے گرے گا؟ اس لیے کہ کچھ اندازہ نہیں تھا۔ نیچے گھپ اندھیرا تھا اور قبر جیسی ٹھنڈک ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہاں اب نہ تو کوئی ہماری مدد کو آسکتا تھا اور نہ ہم کہیں پناہ لے سکتے تھے۔ ایک مایوسی اور بے چارگی میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہمیں چلتے ہوئے چار گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ جب کہ ڈرائیور نے بتایا تھا کہ ٹریک تین گھنٹے سے کچھ ہی زیادہ کا ہو گا۔ ٹائم دیکھا تو رات کے دس بج رہے تھے۔

پھر ایک ایسا اندھا موڑ آیا، جہاں میں نے اپنا سامان پھینکا اور ہتھیار ڈال دیے۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو سامنے پندرہ سے بیس فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی ایک پگڈنڈی تھی۔ ایک جانب ستر کے زاویے پر اٹھتا پہاڑ اور دوسری جانب کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹارچ بھی جلاتے تو روشنی کچھ فاصلے پر کہیں کھو جاتی تھی۔ اس پل صراط پر کنکر بکھرے پڑے تھے، جو پاؤں سے کھسک کھسک کر کسی اندھی وادی میں گر رہے تھے۔ بائیں جانب پہاڑ کا سہارا بھی نہیں لے سکتے تھے کہ اپنا بوجھ اس پر ڈال لیتے تو وہ ردِعمل میں اندھیری کھائی میں دھکیل دیتا۔

میں نے ان راستے پر گزرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ میرے بس سے باہر تھا۔ اس سے پہلے میں زندگی میں کبھی اتنا لاچار اور بے بس نہیں ہوا تھا۔ واپسی بھی اب ممکن نہیں رہی تھی اور میں یہ یقین کر چکا تھا کہ یہاں سے میں زندہ نہیں گزر سکتا۔ شاہ جی سر جھکائے کھڑے تھے۔ نیلی پی کیپ انہوں نے پہن رکھی تھی اور مسلسل عربی میں کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔ اشفاق نے ایک دو بار اس پگڈنڈی کو ہر زاویے سے جانچا اور پھر تلے انداز میں پار اترتا چلا گیا۔ پھر اشفاق نے بھی اس کی تقلید کی۔ میرے حساب سے وہ ان راستوں کے عادی ہیں اور اپنا جسمانی توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔

اشفاق نے پار پہنچ کر کہا۔ "راستہ اتنا مشکل نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔"

میں اس سے متفق نہ تھا کیونکہ پار جا کر ہر ایک حوصلہ ہی دیتا ہے مگر ڈوبنے والے کو حوصلہ نہیں مدد بچاتی ہے۔ اشفاق اور شاہد میری تسلی کے لیے پھر واپس آئے اور میرا بوری جیسا رک سیک اٹھا کر دوبارہ پار اتر گئے۔ وہ مجھے تسلیاں دیتے تھے مگر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ سردی اتر رہی تھی۔ کہر چھاتی جا رہی تھی اور میں عجیب کشمکش میں بیٹھا تھا۔ وہ پندرہ فٹ مجھے پندرہ بیس میل لگ رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر شاہ جی بھی پار اتر گئے۔ میرے پاس کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ میں ادھر اکیلا بیٹھا رہوں۔ میں ان لمحوں، دنیا کا بزدل ترین شخص بن چکا تھا اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی بھی نہ تھی۔ پھر میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس یقین کے ساتھ اس راستے پر قدم رکھ دیے کہ آج میرا اس اندھی کھائی میں گرنا لازمی ہے۔ میں نے اذیت سے بچنے کے لیے ایک طرح سے اس پر دوڑ لگا دی اور معجزہ ہوا کہ میں پار کھڑا تھا۔ سب تالیاں بجا رہے

تھے اور مجھ سے گلے مل رہے تھے۔ میں بھی حیرت اور سکون سے کھڑا وہ راستہ، اندھیرے میں نظر نہ آنے والی کھائی، درختوں کے ہیولے، پہاڑ اور اپنے دوستوں کو دیکھتا رہا۔

ہم آگے بڑھے تو خوف ذہن سے اتر چکا تھا۔ میں بے خوف اور نڈر چلتا رہا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ کتنا اور بھٹکنا نصیب میں ہے۔ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک موڑ آئے۔ جہاں اشفاق بھی سوچ میں پڑ جاتا تھا مگر میں ان کو پھلانگتا چلا گیا، میرا خوف معدوم ہو چکا تھا اور اب میں مار خورہنا ہوا تھا۔ چلتے چلتے رات کے بارہ بج گئے تھے اور کہیں کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ تبھی شاہد کی خوشی بھری آواز ابھری۔ اس نے تاریکی میں ایک پگڈنڈی تلاش کر لی تھی، جو ایک چٹان سے جڑی بہت اوپر اٹھ رہی تھی، وہاں برف کی ٹھنڈک ہمارے پہلو کو چھو رہی تھی۔

ہم اندازے سے اس پگڈنڈی پر چڑھنے لگے۔ ہماری ٹارچیں روشن تھیں۔ کوئی ہمیں بلندی سے دیکھتا تو اس کو تین روشن دھبے تیرتے نظر آتے۔ ہم تھک چکے تھے۔ بھوک ختم ہو گئی تھی اور میرا خوف بھی ختم ہو چکا تھا۔ پھر میں نے بہت اوپر کسی چٹان کے کونے پر روشنی دیکھی۔ پہلے وہم لگا مگر پھر محسوس ہوا کہ کوئی الاؤ روشن ہے۔ ذرا اور اوپر چڑھے تو محسوس ہوا کہ کچھ آوازیں بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اب اندازہ ہوا کہ وہاں واقعی کوئی الاؤ ہے اور کچھ لوگ اس کے اردگرد بیٹھے باتیں کررہے ہیں۔

ہم نے جیسے صدیوں بعد کوئی آواز سنی تھی۔ سب خوشی اور مسرت سے چلانے لگے۔ شاہ جی مدد مدد کی صدائیں دے رہے تھے۔ اشفاق اور شاہد خوشی سے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔

ہماری چیخ پکار اوپر پہنچی تو وہاں پر دو ٹارچوں کی روشنی نیچے جھکی۔ وہاں سے ایک آواز آئی۔ ”وہیں رکیں خبردار آگے کوئی نہ آئے۔ آگے خطرہ ہے۔“

ہم سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ خوف نے پھر سے گردن دبوچ لی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم ایک لمحے میں حاتم طائی والے شہر خموشاں میں آگئے ہیں جہاں کا ہر انسان پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کیونکہ ہم سب بھی پتھر کے مجسمے کی طرح ایستادہ ہو گئے تھے۔ کسی کے بھی بدن میں جنبش نہ تھی۔ شاید سب یہی سمجھ رہے ہوں کہ وہ کھائی کی منڈیر پر کھڑا ہے اور ذرا سا ہلا کہ نیچے گرا۔ جہاں کی زمین ہمیں نیچے میں موت ہی سہارا دے گی۔

ابھی ہم سہمے سہمے سے کھڑے تھے کہ دو ٹارچیں نیچے اترنے لگیں۔ اب ہم ہمہ تن گوش اور نظر نواز بنے ساکت کھڑے تھے۔ روشنیاں قریب آئیں تو دیکھا کہ وہ کوہستانی تھے، چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے کہ یہ کون ہیں، کہاں سے بھٹک کر آگئے۔ ایک نے کہا۔ ”کیا نانگا پربت کے بیس کیمپ سے آرہے ہیں۔“

شاہ جی نے کہا۔ ”نہیں۔ ہم تو تاتو سے فیری میڈو جارہے ہیں۔“

”کیا..... فیری میڈو۔“ ایک بولا۔ ”یہی تو فیری میڈو ہے۔“

فیری میڈو کا نام سن کر میرا کمان کی طرح تنا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ جگہ جس کے میں نے برسوں خواب دیکھے تھے، میرے قدموں تلے تھی۔ وہ مقام جس کے لیے میں نے اپنے علاوہ تین اور بے گناہ زندگیاں داؤ پر لگا لی تھیں۔ اس کی ہوائیں مجھے چوم رہی تھیں۔ اسی ہوا میں کھڑا میں سانس لے رہا تھا۔ سکون کا ایک دریا سا میری رگوں میں اترتا چلا گیا۔ میں مکمل طور پر پرسکون ہو گیا۔ پوری طرح اب میں شانت تھا۔

ہمارا سامان ان دونوں مقامیوں نے اٹھا لیا۔ وہ دونوں ہمیں کوئی رحمت کے فرشتے نظر آرہے تھے۔ یہ کوہستانیوں کی مہمان نوازی تھی۔ ایک اخلاقی برتری ان کو ہمیشہ حاصل رہی ہے کہ یہ بے لوث ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں سنبھال سنبھال کر آگے بڑھنے لگے۔ ایک سہارا ملنے پر ہم بھی محتاط چلنے لگے۔ میں اردگرد نانگا پربت دیکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر اس گھپ اندھیرے میں ٹارچ کی روشنی سے آگے کچھ نہیں دکھتا تھا۔

ہم ایک لکڑی کی بار سے گزرے اور اس الاؤ کی جانب بڑھتے گئے جہاں کچھ سائے خاموش بیٹھے ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک الاؤ درمیان میں روشن تھا، جس کے شعلے ناگوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سی روشنی میں میں ان کو دیکھ رہا تھا جو خاموشی اور حیرت سے بت بنے ہمیں تک رہے تھے کہ یہ کون پاگل ہیں جو آدھی رات کے بعد فیری میڈو کی تنہائی میں داخل ہوئے ہیں اور وہ بھی نانگا پربت کی جانب سے۔ اس لیے کہ ہم رائے کوٹ گلیشیر کی جانب بھٹک کر چلے گئے تھے، جہاں آج تک کوئی مقامی بھی نہیں گیا تھا۔

آگ کے گرد بیٹھنے والوں میں چند غیر ملکی خواتین

تھیں، کچھ گورے اور ایک دو مقامی تھے۔ سردی برس رہی تھی اور آگ کی تپش میں سب آسودہ تھے۔ ہم بھی الاؤ کے گرد، لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ گئے۔ کسی نے پوچھا تو ہم نے تاتو سے لے کر اب تک کی داستان مختصر کر کے سنائی۔

میرے خاموش ہونے پر ایک گورا حیرت سے چیخ پڑا۔ ”تاتو سے شام چار بجے کے بعد فیری میڈو کے لیے نکلنا، یقینی موت کو دعوت دینا ہے۔ یہ تو ہر کتاب میں لکھا ہے۔“

میں اسے کیا بتاتا کہ یہاں کوئی کتاب کا قانون نہیں چلتا اور یہ کتابیں صرف آپ کے ہاں ہی ملتی ہوں گی۔ ہماری کتابیں سچ بتاتی ہیں لیکن ہم ان پر یقین نہیں کرتے۔

ہم الاؤ کے گرد بیٹھے تھے اور ہماری بصارت چند ساعت بعد مکمل طور پر ختم ہو جاتی تھی۔ ایک حد کے بعد اندھیری قبر تھی، جس میں کچھ دکھائی یا سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک پُراسرار ماحول تھا، جس میں ہم آگ تاپتے اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ میں اردگرد دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نانگا پربت کے لمس کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چوٹی میرے سامنے چند قدم دور ہو گی۔ چاہوں تو آگے بڑھ کے اس کو چھو بھی سکوں گا۔

اتنے میں ایک شخص اندھیرے سے اچانک نمودار ہوا، جیسے ڈریکولا اچانک کسی فلم میں اپنے شکار کے پیچھے آ کھڑا ہوتا ہے۔ شاہ جی کی خوف سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور میں خود بھی تھوڑا سا کانپ گیا۔ اس نے ایک ٹرے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور اس پر چار کافی بھرے مگ بھاپ اڑا رہے تھے۔ گرم کافی کا ایک ایک گھونٹ ہمیں آبِ حیات لگا۔ وہ راجیو خان تھا۔ اس کیمپنگ کا منیجر، باورچی، چوکیدار اور سب کچھ۔ راجیو خان ہم سے کھانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہی ہمیں نیچے سے اوپر لے کر آیا تھا۔ ہم نے اس سے کھانا بنانے کی درخواست کی اور وہ جس طرح اندھیرے میں نمودار ہوا تھا، اسی طرح اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

اب میں نے اردگرد کا بغور جائزہ لیا تو دیکھا کہ ان گوروں کے ساتھ مقامی بھی ہیں۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ فیصل آباد سے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام نوید ہے، دوسرے کا شہزاد، تیسرے کا مرزا اور چوتھے کا وسیم ہے۔ ساتھ میں تھامس بھی ہے جو جرمنی سے آیا ہے اور وہاں کسی اسکول میں موسیقی پڑھاتا ہے۔

ایک سرخ رنگ والا مقامی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رحمت نبی تھا، اس کیمپنگ سائٹ کا مالک۔ اس کا ذکر کتابوں میں بہت پڑھا تھا ہر کوہ پیما نے اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ اس سے پہلی ملاقات تھی۔ دو سال بعد کا ذکر ہے کہ میں گلگت آیا ہوا تھا۔ وہیں کے ایک ہوٹل کے کمرے میں دعوت تھی۔ بہت سے شرفاء شریک تھے۔ میں بھی تھا اور رحمت نبی بھی تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے چاند چھلکتا تھا اور رحمت نبی موج میں تھا۔

تھامس اپنے چمکیلے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ تھامس ہر سال اپنا خیمہ لے کر نکل پڑتا تھا۔ پچھلے تین سال اس نے نیپال اور تبت میں گزارے تھے۔ وہ باقی کے دنوں میں فیری میڈو کا ہمارا ساتھی رہا اور پھر وہ ڈیرہ اسماعیل خان میرے پاس کچھ دن ٹھہرا تھا۔ وہاں شاہ جی نے اس کے لیے ڈیرہ کی مشہور دھادنی کا بندوبست سندھ کنارے کیا تھا۔ وہ جتنے دن ہمارے ساتھ رہا، ہر دن کوئی نہ کوئی دعوت ہوتی تھی۔ جب وہ ڈیرہ سے گیا تو اس کا پیٹ خراب ہو چکا تھا۔ پاکستانی کھانے ہضم کرنا مغربی اقوام کے بس کی بات نہیں۔ جرمنی سے وہ مجھے خط لکھا کرتا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے جرمنی آنے کی دعوت دی تھی جو میں نے اس لیے قبول نہیں کیا کہ اس وقت میرا ویزا کیا، پاسپورٹ ہی نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک سال میں جرمنی کے کنارے زیورخ میں تھا۔ جرمنی میں قدم رکھ نہیں پایا تھا کیونکہ ایک لمبا سفر مجھے تھکا چکا تھا اس لیے جرمنی کا پروگرام موخر کر کے میں زیورچ سے جہاز پکڑ کر لندن آ گیا تھا۔ اس طرح دوبارہ دید شنید کے اقدام پر خط کھینچ گیا تھا مگر آج جب یہ تحریر کاغذ پر منتقل ہو رہی ہے تو مجھے تھامس یاد آ رہا ہے۔

تھامس واپس جاتے ہوئے، مجھے اپنا پیلے رنگ کا خیمہ، جو فیری میڈو میں لگا تھا، آدھی قیمت پر دے گیا تھا۔ وہی خیمہ کینیڈا کی کیمپنگ میں بھی میرے ساتھ ساتھ رہا۔

کچھ ہی دیر میں سب اٹھ کر اپنے خیموں میں سونے چلے گئے۔ ہمیں بھوک نے آ گھیرا تھا۔ رحمت نبی کے ساتھ میری گفتگو جاری تھی، ذکر فیری میڈو اور نانگا پربت کا تھا جو اس اندھیرے میں ہمیں نظر نہیں آتی تھی۔ ہمیں تو صرف الاؤ کے آس پاس ہی نظر آتا تھا، جس میں میں ایک لکڑی کی باڑ دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہم بیٹھے تھے، یہ کیمپنگ کا ایک کونا تھا، جہاں لکڑیوں کا الاؤ جل رہا تھا اور ہم اب سکون اور شانتی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ تک بھول چکے تھے کہ کچھ دیر

پہلے ہم غلطی سے موت کے منہ میں پہنچ گئے تھے۔ زندگی تھی کہ بچ کر آ گئے۔

کیا فیری میڈو ویسا ہی ہے جیسا میں نے سنا ہے یا باتیں بنی ہوئی ہیں۔ مجھے اس کے حسن کو جانچنے کے لیے صبح کا انتظار کرنا تھا۔ اس وقت فیری میڈو کے چاروں جانب سیاہ اندھیرا اترا ہوا تھا۔ آسمان تاروں اور چاندنی کے بغیر بے رونق تھا۔ ہمیں رات کے تیسرے پہر بھوک ستا رہی تھی۔ شاہ جی نے مجھے کہنیاں مارتے ہوئے کہا کہ کھانا کب تک تیار ہوگا۔ کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ زندہ سلامت پہنچنے کی خوشی میں، ہم رات کا ڈنر بھول چکے تھے۔ راجیو خان جب کافی کے مگ اٹھانے آیا تو اس سے پھر کسی نے پوچھا کہ کھانا کب تک تیار ہوگا؟ وہ یہ کہتا ہوا ایک بار پھر اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ ''ابھی کچھ دیر میں تیار ہو جائے گا۔''

اشفاق اور شاہد اپنی ٹارچیں لے کر خیمے ایستادہ کرنے چلے گئے۔ فیری میڈو کی اندھیری کیمپنگ میں مجھے دو روشنی کے دھبے دور سے نظر آ رہے تھے اور ان دونوں کی آوازیں تیرتی میری جانب آ رہی تھیں۔ کافی دیر سے وہ دونوں خیمے لگانے میں مصروف تھے مگر ان سے یہ کام ہو نہیں پا رہا تھا۔ یہ بات مجھے دیر سے معلوم ہوئی کہ وہ دونوں ہیں تو گلگت ہنزہ کے رہنے والے مگر یہ کام یعنی ٹریکنگ، کیمپنگ وغیرہ۔ انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیے۔ میں نے ان کو کوہ پیما کا درجہ دے دیا تھا اور شروع سے وہ یہ درجہ برقرار رکھنے کے چکر میں میرے ساتھ خوار ہو رہے تھے۔ میں ان کا ٹیچر تھا اور وہ میرے سامنے جی جی کرتے رہتے تھے مگر یہ ٹریکنگ میری طرح ان کا بھی شعبہ نہیں تھا۔ ان دونوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ ان دونوں کی رہنمائی اور سہارا نہ ہوتا تو میں اس سرزمین پر اکیلا شاہ جی کے ساتھ کبھی گھسنے کا نہ سوچتا۔

کیمپ فائر کی جگہ پر میں، شاہ جی اور رحمت نبی بیٹھے تھے۔ رحمت نبی نے فیری میڈو کو بسایا ہے۔ جن دنوں میں فیری میڈو گیا تھا، اس وقت رحمت نبی نے لکڑی کے کیبن نہیں بنوائے تھے۔ فیری میڈو میں ایک کچن تھا اور ایک بار لگی ہوئی تھی۔ ایک دن رحمت نبی کسی سے کہہ رہا تھا کہ تم اس کے خیمے کی جگہ تبدیل کر دو کیونکہ تین دن سے ایک ہی جگہ پر لگا ہوا ہے اور نیچے کی گھاس دب رہی ہے۔ میں یہ سن کر رحمت نبی سے بڑا متاثر ہوا کہ وہ نیچر سے بہت پیار کرتا ہے اور یہ فیری میڈو کا حسن خراب نہیں ہونے دے گا مگر اب سننے میں آیا ہے کہ وہاں لکڑی کے کیبن بن چکے ہیں

اور اس کا وہ قدرتی حسن نہیں رہا جو پہلے ہوتا تھا جس طرح کسی خوبصورت منظر کو چیئر لفٹ تباہ کر کے رکھ دیتی ہے، اسی طرح بیابانوں کا حسن جاتا رہتا ہے اگر وہاں گھر بن جائیں۔ میں ایک بار انڈیا میں کسی جھیل کنارے ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ جھیل کا حسن لافانی تھا مگر اس ہوٹل کی شاندار عمارت، جھیل کے حسن پر حاوی نظر آتی تھی جھیل کا حسن دب گیا تھا۔ وہ ایک اچھا ہوٹل تھا مگر غلط جگہ بن گیا تھا۔ بعد میں سنا تھا کہ اخبارات نے بھی اس خامی کی نشاندہی کی تھی۔ کئی ایک تحریریں شائع ہوئی تھیں مگر یہ تو پاکستانی علاقہ ٹھہرا۔ اس دور افتادہ علاقے پر کون اپنا سر کھپائے۔

فیری میڈو کو ملک سے باہر تو جانا جاتا تھا مگر پاکستان میں اس کو متعارف مستنصر حسین تارڑ نے کیا ہے۔ میں بھی ان کی کتاب ''نانگا پربت'' پڑھ کر ان کے پیچھے پیچھے یہاں آ پہنچا تھا اور آج رحمت نبی سے پوچھ رہا تھا۔ ''تارڑ صاحب کا خیمہ کہاں لگا تھا۔''

رحمت نبی نے اندھیرے میں کہیں اشارہ کیا۔ ''اس پہاڑی کے نیچے۔''

اندھیرے میں کوئی پہاڑی دکھائی دیتی تھی اور نہ نانگا پربت۔ کچھ دیر میں راجیو ایک بار پھر اندھیرے سے نمودار ہوا، اور بولا۔ ''کھانا تیار ہے۔''

اسی وقت سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میرے بدن میں خنکی دوڑتی چلی گئی۔ الاؤ ٹھنڈا پڑنے سے پہلے، رحمت نبی اس میں اور لکڑیاں جھونکتا تھا۔ اس کے ہاتھ دہکتے کوئلوں کے اوپر تھے، جن کو وہ گرم رکھتا تھا۔ شاہ جی باقاعدہ سے کپکپاتے ہوئے ڈنر کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

شاہد اور اشفاق کافی دیر بعد خیمے لگانے سے فارغ ہوئے تھے۔ شاہ جی میرے کان میں بولے۔ ''لگتا ہے کہ کوئی مرغ پلاؤ یا کوئی بکرا وغیرہ بنایا ہے راجیو نے۔''

''فیری میڈو میں کھانا تو زبردست بنتا ہوگا۔'' میں بھی اسی خیال سے اٹھا۔ رحمت نبی نے ایک اور سگریٹ سلگا لی۔ راجیو خان کی رہنمائی میں ہم چاروں اندھیرے میں ٹکّ ٹوئیاں مارتے ایک لکڑی کے کیبن میں داخل ہوئے۔

کیبن کے اندر کا ماحول باہر سے جدا تھا۔ اندر لالٹین کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ لکڑی کی میز کی دونوں جانب بینچ رکھے تھے۔ اندر موسم قدرے گرم تھا اور بدن کو قرار مل رہا تھا۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور اوپر توے پر گرم روٹیاں بن رہی تھیں۔ گندم کی سوندھی سوندھی مہک پورے کیبن میں

پھیلی تھی۔ لکڑی کی دیواریں، چھت، بینچ اور میزیں تھیں۔ دیواروں کے ساتھ ٹریکنگ کا سامان ترتیب سے رکھا تھا۔ کچھ رک سیک پڑے تھے۔

مرغ یا بکرے کے ذکر سے میری بھوک بھڑک اٹھی تھی۔ راجیو نے پہلے پلیٹیں سجائیں اور پھر گرم گرم روٹیاں آئیں۔ شاہ جی اور ہم سب گندم کی مہک سے بے تاب ہو رہے تھے مگر پھر ہمارے سامنے بکرے یا مرغ کڑھائی کی بجائے، خشک دال رکھی گئی تو ہم ایک لمحے کے لیے صدمے اور شاک میں آگئے۔ آفٹر شاک اس وقت شروع ہوئے، جب کچھ کنکر اس خشک دال کے ساتھ دانتوں تلے آنا شروع ہوئے۔ شاہ جی دبے لفظوں میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں کچھ کھانے کو مل گیا۔ اگر وہ یہ کہتے کہ ابھی کچھ نہیں مل سکتا ہے تو پھر ہم کیا کرتے۔''

شاہ جی سر ہلا کر رہ گئے۔ مگر چہرہ اندرونی جذبات کی غمازی کرتا رہا۔

پھر بھی ہم نے پیٹ بھر کر کھایا۔ باہر سرد ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ کیبن کا دروازہ اس ... زور سے ہلتا کہ محسوس ہوتا نانگا پربت طوفانوں کی زد میں ہے۔

کھانے کے بعد ہم دوبارہ کیمپنگ سائٹ میں کیبن سے باہر نکل کر آئے تو ایسا لگا کہ پھر اسی اندھیری قبر میں اتر آئے ہوں۔ الاؤ بجھ چکا تھا۔ کچھ چنگاریاں جگنو کی طرح بھڑک رہی تھیں۔ رحمت تی کہیں جا چکا تھا۔ میں بدنصیب فیری میڈو میں ہوتے ہوئے بھی نانگا پربت کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ تھکاوٹ سے پلکیں نہیں کھلتی تھیں۔ راجیو کی رہنمائی میں ہم اپنے خیموں تک آئے۔ فضا میں صرف ہوا کا شور گونجتا تھا اور ہمارے خیمے زور زور سے لرزتے تھے۔ ہم نے میٹرس بچھائے اور اس پر سلیپنگ بیگ سیدھے کر لیے۔ راجیو خان خیمے کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑا اسی انتظار میں تھا کہ شاید ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔

''کچھ لکڑیاں ہوں گی۔'' میں نے راجیو خان سے پوچھا۔

وہ حیرت سے بولا۔ ''اس وقت لکڑیوں کا کیا کرنا ہے صاحب؟''

''میں کچھ دیر کیمپنگ فائر کے ساتھ اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں۔'' میں ٹینٹ سے باہر نکل کر، اسی کونے میں واپس جا رہا تھا۔

''اس وقت بڑی سردی ہے، صاحب۔'' راجیو خان نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نانگا پربت سے رات کے آخری پہر برفانی ہوائیں چلتی ہیں۔''

''نانگا پربت ہے کدھر؟'' میرا بس چلتا تو میں نانگا پربت کے آگے چراغاں کر لیتا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ میں اس قاتل پہاڑ کے سامنے ہو کر بھی اس کو دیکھ نہ سکوں۔

''ادھر ہے۔'' راجیو خان نے شاید کسی جانب اشارہ کیا تھا۔ نانگا پربت کہاں دکھتا، میں تو اس گھپ اندھیرے میں اس کے اشارے کی سمت بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ ''صاحب! ابھی آپ سو جائیں، صبح کو نانگا پربت دیکھ لینا۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''آپ جان بچا کر اس موت کے جنگل سے نکلے ہیں اس جنگل سے زندہ نکلنا، کسی معجزے سے کم نہیں۔''

وہ لکڑیاں لینے پھر اندھیرے میں ہمارے سامنے ہی ایک دم غائب ہو گیا، صرف اس کی آواز مجھ تک پہنچی تھی۔ ''صاحب! جلدی سو جانا۔ کل آپ کو بیس کیمپ بھی جانا ہے۔''

نانگا پربت کے بیس کیمپ۔ یہ الفاظ میری سماعت پر کافی دیر تک حاوی رہے۔ میں دو سال سے اس ٹرپ کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی ایک دن میں نانگا پربت کے بیس کیمپ کے لیے فیری میڈو سے نکلوں گا۔ نانگا پربت میرے سامنے ہوگا اور وہاں سے اترتے ادلانچ اور ان کی گڑگڑاہٹ ہو گی۔ کوئی دھواں دھار ماحول ہوگا اور میں فیری میڈو سے بیال کیمپ تک بچھے راستے، جنگل، ندیاں۔ ان سب میں، اکیلا گھوموں گا۔ نہ مجھے واپس جانے کی جلدی ہوگی اور نہ پیچھے میرا کوئی انتظار کرتا ہوگا۔

میں اور شاہ جی بہت دیر تک آگ جلائے کیمپ فائر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہم کافی... دیر وہاں بیٹھے رہے۔ شاہ جی کا خوف زائل ہو چکا تھا۔ وہ اب ایک نارمل انسان تھے جو ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ ''ندیم، میں کئی بار اپنے بچوں کی فکر میں تم سے ناراض ہوا ہوں۔ پر جب کوئی خطرہ ٹل جاتا ہے تو میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ یہ سب میں کیسے دیکھتا اگر آپ مجھے اپنے ساتھ نہ لاتے۔ میں سب کو بتاؤں گا کہ میرا دوست مجھے کن خوبصورت مقامات پر لے گیا تھا۔''

شاہ جی اپنی دھن میں بہتے رہے۔ آگ دھیمی پڑتی تو

میں اور لکڑیاں اس میں جھونک دیتا۔ شرارے بلند ہوتے اور ہمارے چہرے، اس کی لو میں دمک اٹھتے۔ شاہد اور اشفاق، دونوں کی آوازیں ہم تک تیرتی پہنچتیں۔ وہ بھی اپنا دکھ درد بانٹ رہے تھے۔ خوشیاں اور شادمانی کے لمحے بیان کرتے تھے، کیونکہ ان کے دبے دبے قہقہے ہم تک آرہے تھے۔ ٹارچ ان کی روشن تھی اور خیمے کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ شاہ جی نے ایک سگریٹ سلگائی اور بولے۔ ''یہ ختم ہوجائے تو سوتے ہیں۔''

اتنے میں ایک برفانی جھونکا کہیں سے آیا اور میں کپکپا گیا۔ اب یہاں سے اٹھے بغیر چارہ نہ تھا ورنہ قلفی بن جاتے۔

رات ایک ڈراؤنے خواب میں گزری کہ جیسے میں اسی جیپ کا مسافر ہوں جو حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیپ تاتو ٹریک پر سے پھسلتی نیچے رائے کوٹ نالے میں گر رہی ہے۔ میں کھلی آنکھوں سے، اس بلندی سے خود کو گرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میری چیخیں میرے حلق میں دب گئی ہیں۔ کئی بار میں پسینے میں شرابور، اس دہشت سے اٹھ گیا تھا۔

تیز ہواؤں سے میرے خیمے کا پردہ لرز رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی جنگلی جانور اندر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں ڈر سے خیمے کی زپ بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ جیپ کا گرنا اور خیمے کے پردوں کا کسی انجانی مخلوق کی حرکت سے لرزنا اور کسی اجنبی، ان سنی آوازوں کا آنا مجھے جگا گیا۔ ایسا بار بار ہوتا رہا اور صبح ہوگئی۔

میں نے اس خوف کا ذکر کسی سے نہیں کیا تاکہ کوئی مجھے بزدلی کا طعنہ نہ دے۔ میں خوف میں تھا کہ رات کون میرے خیمے کا پردہ ہلا رہا تھا۔ کوئی جانور تھا یا کوئی روح یا پریاں۔ فیری میڈو تو ویسے ہی پریوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ میں دو رات اسی خوف میں سویا اور تیسرے دن رحمت نبی نے میرا یہ خوف ختم کردیا کہ رات کو نانگا پربت سے آنے والے تیز جھکڑوں سے خیمے کا پردہ جب پھڑ کتا ہے تو ایسی ہی آوازیں آتی ہیں۔

اس صبح میں جلدی اٹھ بیٹھا۔ رات کو نیند نہ آسکی تھی اور مجھے باہر کا منظر دیکھنے کا اشتیاق زیادہ تھا۔ باہر ابھی اندھیرا تھا۔ میں نے ٹائم پیس پر وقت دیکھا تو صبح کے پانچ بجے تھے۔ میں سو بھی نہیں سکا تھا۔ شاہ جی کے خراٹے بلند ہورہے تھے۔ میں نے جرابیں چڑھائیں، گرم جیکٹ پہنی اور اونی ٹوپی سر پر رکھی اور پھر خیمے کے چنگل سے آزاد ہوکر باہر آگیا۔

میں نے سوچا تھا کہ نانگا پربت تو فیری میڈو کے صحن میں ہوگا۔ میں ایک دھندزدہ، خواب ناک اور دھواں ہوتے ماحول میں نانگا پربت کے روبرو بیٹھوں گا۔ میرے اور نانگا پربت کے درمیان کوئی حائل نہیں ہوگا۔ پہاڑ کی ڈھلوانوں سے تودہ کھسکے گا اور میں اس کی گونج سنوں گا۔ ایک خواب ناک ماحول، جس میں خواہشیں تمام ہوتی ہیں، آرزوئیں تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ خواب، تعبیر میں بدلتے ہیں۔ میں نانگا پربت کے فریزر میں قید ہوں گا، جہاں اس کی ٹھنڈک میرے بدن کو یخ کرے گی اور میں اپنی تمام تر جیکٹس، اونی ٹوپیاں، موزے۔ سب پہن کر اس کے سامنے بیٹھ کر کافی پیوں گا۔ بادل میرے اردگرد، میرا ہار بننے کے لیے نانگا پربت سے اتریں گے مگر یہ سب نہیں تھا۔ نانگا پربت میلوں دور تھا۔ میرے اور نانگا پربت کے بیچ بہت کچھ تھا اگر یہ سب کچھ درمیان میں نہ ہوتا تو آج فیری میڈو کہیں زیادہ حسین ہوتا۔

☆......☆

منظر آپ پر کبھی اچانک اترتا ہے اور کبھی آہستہ آہستہ آپ میں سرائیت کرتا ہے۔ منظر کوئی اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے اپنانے یا ٹھکرانے کی حس آپ میں ہوتی ہے۔ آپ کس طرح منظر میں اترتے ہیں یا کس طرح منظر آپ میں داخل ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ اب مجھے اپنی نگاہ سے فیری میڈو اور گردونواح کو دیکھنا تھا۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں اس میں کچھ ڈھونڈ نکالنا چاہتا تھا۔ روم کے تردی فوارے کے بارے میں پڑھ پڑھ کر پاگل ہوگیا تھا۔ جب پہنچا تو ایک تنگ سا چوک تھا اور سامنے ایک فوارہ تھا، جو اب مرمت کے لیے بند تھا۔ اس کے پیچھے چند مجسمے تنگ دھڑنگ ایستادہ تھے۔ فوارے کی زمین پر چوہے دوڑتے تھے۔ سیاحوں کا ہجوم تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے دیکھنے نہیں، اس میں سے کچھ نکالنے آئے ہیں۔ اس تنگ سی جگہ میں سیاح، ایک دوسرے کو دھکیلتے، آگے بڑھ بڑھ کر کوئی چیز ڈھونڈتے تھے۔ میں نے تبرک کے طور پر کچھ تصاویر لیں اور روایت کی پابندی کرتے ہوئے اس میں کچھ یورو کے سکے پھینک دیے تاکہ کوئی پوچھے تو قسم کھا سکوں۔ میں تردی فوارے پر ٹھہرا نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو وقت نہیں دیا۔ اسی لیے

تریوی فوارے کی نسبت مجھے روم کی وہ تنگ گلی زیادہ پسند آئی، جہاں میں ایک ریسٹورنٹ کی گلی میں رکھی کرسیوں پر بیٹھا، پیزا کھا رہا تھا اور ایک ماں اور اس کا بیٹا میرے سامنے کوئی مدھر دھن اپنے سازوں پر چھیڑ رہے تھے۔

یہی حال میرا فیری میڈو کے ساتھ ہو جاتا اگر میں وہاں کچھ دن نہ رکتا۔ ورنہ فیری میڈو کا اپنا حسن اور نانگا پربت کے مرعوب کر دینے والے نظارے میں نہ دیکھ سکتا اگر اسے میں اپنا کچھ وقت نہ دیتا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا پہلا تاثر کچھ اچھا نہیں تھا۔ مجھے وہاں نہ وہ سب کچھ دکھلائی دیا اور نہ محسوس ہوا، جو میں پڑھ کر اور محسوس کر کے آیا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نانگا پربت کے برفانی اہرام ہوں، ساتھ رائے کوٹ گلیشیر ہو اور فیری میڈو کا سیاہ جنگل ہو اور وہاں کوئی طلسم نہ ہو؟ اس طلسم کا کھوج لگانے کے لیے مجھے یہاں کچھ دیر رکنا تھا۔

میں نے فیری میڈو اور نانگا پربت پر ایک نظر ڈالی۔ نانگا پربت کی آغوش سے نکلتے گلیشیر کو دیکھا جو بہتا، پھیلتا فیری میڈو کے پہلو میں آ یا رکا تھا۔ سامنے ایک جنگل تھا، جہاں سے گزر کر مجھے نانگا پربت کے بیس کیمپ جانا تھا۔ ہماری کیمپنگ سائٹ ابھی سائے میں تھی۔ خیمے کے مکین ابھی سوئے تھے۔ نانگا پربت کی چوٹیاں سنہری ہو رہی تھیں، کیونکہ انہوں نے اپنی بلندیوں کا فائدہ لیتے ہوئے سورج کو ہم سے پہلے دیکھ لیا تھا۔

میرے کیمپ کے پیچھے ایک پہاڑی تھی اور آج اس پر جو کیبن نظر آتے ہیں، ان دنوں نہیں تھے اور پہاڑی کے اوپر جنگل سا تھا۔ پیچھے دائیں جانب، پہاڑی سے لگ کر کیمپنگ کا وہ کچن تھا، جہاں کل رات ہم نے دال، چاول اور روٹی کھائی تھی اور اللہ کا شکر بجا لائے تھے۔ اس کیبن کی چھت سے دھواں باہر اٹھ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ کیمپنگ سائٹ کی باڑ کے باہر دائیں جانب سرسبز گھاس کے قالین تھے اور وہ اس مقام تک بچھے چلے گئے تھے، جہاں سے چند کچے گھر شروع ہوتے تھے۔ دائیں جانب ایک گہرائی میں رائے کوٹ گلیشیر خاموش لیٹا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور میری جیکٹ مجھے گرم رکھے ہوئے تھی۔ رنگ برنگے خیمے ایستادہ تھے اور ارد گرد مکمل خاموشی تھی جیسے ہر شے پر برس رہی ہو یا کہیں سے آ کر ٹھہر گئی ہو۔ محسوس یہ ہو رہا تھا کہ یہ سناٹا ازل سے یہاں آباد ہے اور نہ پہلے اس میں کوئی خلل ہوا تھا اور نہ کبھی کوئی ہوگا۔ مجھے کسی نے کہا تھا کہ گلیشیر کی برف کے ٹوٹنے اور چٹخنے کی گونج ہمیشہ فیری میڈو پر چھائی رہتی ہے۔ میں نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاید میری آمد کے احترام میں برف نے ٹوٹنے سے توبہ کر لی تھی، میرے ذہن میں دلچسپ جملہ گونجا۔

اتنے میں راجیو خان لکڑیاں لینے اپنے کچن کیبن سے باہر نکلا۔ مجھے باڑ کے ساتھ ٹیک لگائے دیکھا تو سیدھا میری جانب آیا۔

”صاحب، کیا جلدی اٹھ گئے؟ ابھی تو سوئے تھے۔“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

میں نے اپنا رات والا خوف و ڈر چھپا لیا اور نانگا پربت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”رات اسی کے خواب نظر آتے رہے۔ جلدی اٹھ گیا تاکہ سب سے پہلے میں ہی اسے دیکھوں۔“

”چلو اب تو دیکھ لیا۔ چائے تیار ہو رہی ہے۔ آپ پہلے چائے پی لیں۔“ راجیو خان بڑے خلوص سے بولا اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے وہی تجربہ ہوا جو نلتر جھیل کے کنارے بنے ایک کچے کمرے کے ہوٹل میں داخل ہونے پر ہوا تھا کہ میں ایک زمان و مکان سے نکل کر دوسرے میں آ گیا تھا۔ میں نے کیبن کا دروازہ بند کیا تو ایسے لگا کہ باہر کے سارے رابطے ٹوٹ گئے ہوں۔ کیبن کے اندر کا ایک قدم مجھے مکمل تنہائی میں لے آیا۔ لکڑی کی دیواریں، دروازے، میز، بینچ اور سب سے بڑھ کر اندر تیرتا دھواں جو ماحول کو خواب ناک بناتا تھا۔ کچن میں مٹی کے چولہے پر جست کی پتیلی سیاہ ہو رہی تھی اور پانی اس میں کھول رہا تھا۔ وہیں بیٹھ کر چائے پی۔ جسم میں جان سی پڑتی چلی گئی۔ اندر آگ کی حدت سے ماحول گرم ہو رہا تھا اور وہ ماحول میرے اندر اترتا چلا گیا۔ فیری میڈو پیچھے رہ گیا۔

اب مجھے فیری میڈو اپنی نظروں سے دیکھنا تھا۔ اب تک جو میں نے سمجھا تھا، وہ یہ تھا کہ فیری میڈو کا حسن اور دلکشی کا راز، تاتو تک کا جیپ ٹریک تھا۔ اتنا ہولناک سفر، جو آپ کو موت کا چہرہ دکھلا دے اور اس کے بعد یہ سبزہ زار کسی جنت سے کم نہیں لگتے۔ میں دھوئیں بھرے کچن میں گرم چائے پی رہا تھا اور اپنے اندر دوڑتے سکون، اطمینان اور ٹھہراؤ کو محسوس کرتا، اس سے لطف اٹھا رہا تھا۔

باہر کی دنیا میں ہمارا وجود خواہشوں اور ضرورتوں کا ایک ناسور ہوتا ہے جو ہر دم رستا رہتا ہے۔ نہ ہی اس کے زخم خود بھرتے ہیں اور نہ ہم اسے بھرنے دیتے ہیں۔ ایک موج

ہوتی ہے جس میں بجتے جا رہے ہوتے ہیں مگر یہاں میں خواہشوں کی موج سے باہر آ بیٹھا تھا۔ نانو کے جیپ ٹریک نے دنیا کے سمندر سے مجھے کسی اور جزیرے پر لا پٹخا تھا۔ اس کمرے کا دھواں بھرا ماحول اور اس کی حدت سے میرے اس ناسور پر مرہم رکھ دیا تھا۔

راجیو خان ایک خالص اور صاف دل انسان تھا۔ باہر کی ہوا اسے ابھی نہیں لگی تھی اور نہ اس نے وہ دوڑ دیکھی تھی جو باہر کی دنیا میں لگی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر مجھ سے پوچھتا۔ ''صاحب! کیسا لگا ہماری یہ جگہ۔''

''بہت زبردست راجیو۔'' میں کمرے کا دھواں اپنے اندر جذب کرتے ہوئے بولا۔

''کیا اتنی اچھی جگہ ہے۔'' اس نے پانی گرم رکھنے کے لیے ایک برتن بھڑکتی آگ پر رکھا۔

''ہاں! ہر نئی جگہ اچھی ہوتی ہے راجیو اگر اس میں تنہائی ہو۔ یہاں تو تنہائی کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے۔''

''وہ کیا ہے صاحب۔''

''معلوم نہیں۔ بس کچھ تو ہے۔''

''آپ لوگ جو باہر سے آتے ہیں، سب ایسی باتیں کرتے ہیں اور اس سے ہماری روزی چلتی ہے۔'' راجیو نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔

چائے پینے کے بعد میں ذرا چست ہوا اور کیبن سے باہر آ گیا۔ باہر وہی نانگا پربت تھا، جس کی چوٹیاں آسمانی روشنیوں میں اب بہت زیادہ چمک رہی تھیں۔ کیمپنگ سائے میں تھی اور مکمل خاموش۔ خیموں میں سب سو رہے تھے۔ رائے کوٹ گلیشیر خاموش لیٹا تھا گویا وہ بھی سو رہا تھا مگر اسے کچھ دیر بعد بیدار ہونا تھا، جب سورج کی تپش اس پر پڑتی۔ اس کی برف نے ٹوٹنا تھا، اسے چنگھاڑنا تھا، ڈکرانا تھا، ایک گہری گونج کے ساتھ۔ اس کا یہ معمول ہم اگلے چند دن تک دیکھتے اور سنتے رہے۔

خیموں کے پردے ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ ان میں سے کاہل جسم باہر نکلتے۔ پہلے نانگا پربت کو دیکھتے، پھر آس پاس اور پھر اوپر آسمان کی جانب اور پھر مڑ کر جنگل میں بنے، باتھ روم کی جانب چل پڑتے۔ مجھے تنہائی چاہیے تھی۔ اسی کی تلاش میں، میں کچن کے ساتھ کیمپنگ کے پچھلے سے باہر نکلا۔ پیچھے والی پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ایک راستہ اس جھونپڑے کے ساتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں،

میں اس پہاڑی کی بلندی پر تھا۔ کیمپنگ، کسی پرندے کی آنکھ سے دیکھتے منظر کی طرح میری نظروں کے نیچے بچھی تھی۔ نیچے رنگ برنگے خیمے لگے تھے۔ آٹھ دس خیموں میں، پاکستانی کوہ نوردوں کے تین خیمے تھے۔ دو میں ہم تھے اور تیسرا نوید، شہزاد، وسیم اور مرزا کا تھا۔ وہ چاروں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ باقی سارے غیرملکی تھے۔ تھامس جرمن تھا اور اس کا زرد خیمہ کیمپنگ کے کونے میں لگا تھا۔ جہاں ایک طرف رائے کوٹ گلیشیر تھا اور سامنے نانگا پربت تھا۔ باقی کچھ امریکی سیاح کے تھے جو ہم سے ایک فاصلے پر رہنا پسند کرتے تھے۔

ہزاروں میٹر بلند نانگا پربت، پندرہ سو میل لمبے کوہ ہمالیہ کے مغربی رخ پر واقع ہے اور معلوم نہیں کہ یہاں سے ہمالیہ شروع ہوتا ہے یا اختتام پذیر ہوتا ہے۔ میں اس پہاڑی سے نانگا پربت کی چمکتی چوٹیوں کو دیکھ رہا تھا۔ برف سے لدی نانگا پربت کی چوٹیاں، ازل سے ایسے ہی تھیں جیسے اب میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ موسموں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ اسے سنوارا ہے۔ موسم اسی کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں۔ اس کا برفانی قلعہ آہستہ آہستہ بلند ہوتا جارہا تھا۔ یہ سارے منظر پر حاوی ہورہا تھا۔ میرے اردگرد بلند درخت تھے اور میں مکمل تنہائی میں بیٹھا، ایک حیران کن منظر دیکھ رہا تھا۔ گو نانگا پربت کچھ فاصلے پر تھا مگر کھسکتا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا شاندار پھیلاؤ حیران کرتا تھا۔ گو یہ دنیا میں اونچائی میں نویں نمبر پر ہے مگر پھیلاؤ میں یہ کرۂ عرض میں پہلے نمبر پر ہے۔ میں ایک بار طیارے سے گلگت جارہا تھا تو پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہمارے دائیں جانب نانگا پربت ہے۔ میں نے دیکھا اور ایک سحر، دہشت، دبدبے میں آگیا۔ کئی کلومیٹر میں پھیلا برفانی علاقہ جو چڑھتے سورج میں نارنجی اور سفید نظر آتا تھا۔ اپنی عظیم ترین وسعت اور پھیلاؤ میں، ایک گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی دہشت مجھ تک طیارے میں در آئی تھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں دہل گیا تھا۔ اس تنہائی اور برفانی فصیلوں کے درمیان، ایک پُراسرار اور اجاڑ ویرانا تھا، جہاں خاموشی کا راج تھا۔

اگر کسی کو اس تنہائی میں دھکیل دیا جائے اور اس کے گرد میلوں برفانی دیواریں ہوں اور درجۂ حرارت منفی سے کئی درجے نیچے ہو، وہ یا تو فوت ہوجائے گا اور اگر بچ کر آگیا تو نیم پاگل ہوچکا ہوگا۔ کوہ پیما شاید، اسی لیے نیم پاگل ہوتے ہیں۔ وہ برفانی علاقہ جس کے اردگرد کوئی اور چوٹی نہیں بلکہ یہ پہاڑ کئی ایک چوٹیوں کا مجموعہ ہے اور اس کا حجم ایک سو میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ بادل اب اس کی چوٹیوں اور برفانی ڈھلوانوں پر تیرتے تھے۔ میں ایک سحر میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ اس کو جس طرح بیان کیا گیا تھا۔ یہ اس سے کہیں زیادہ حسین ہوچلی تھی۔ اس کے لیے میرے الفاظ کھوکھلے اور بے معنی ہوگئے تھے۔ وہاں سے اترتی خنک ہوائیں مجھ تک پہنچتی تھیں۔ درختوں کی ٹہنیاں بھی اس کی لپیٹ میں تھیں اور سرمستی میں جھوم رہی تھیں۔ رائے کوٹ گلیشیر ایک منجمد دریا کی طرح نانگا پربت کی گود سے نکلتا، یہاں تک آپہنچا تھا۔ گلیشیر کی دائیں جانب سیاہ جنگل تھا جس سے کل رات ہم جان بچا کر نکل آئے تھے۔ میں اس جنگل کو اچھی طرح جان چکا تھا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے سامنے چار مناظر مل کر ایک شاندار منظر پیش کررہے تھے۔ نانگا پربت، رائے کوٹ گلیشیر سیاہ جنگل اور فیری میڈوز۔ آسمان نیلا اور بادلوں سے مکمل صاف تھا۔ نانگا پربت۔ کلر ماؤنٹین کو فتح کرنے کے تین راستے ہیں۔ یعنی اس برفانی معبد میں گھسنے کے تین دروازے ہیں۔ ایک رائے کوٹ فیس۔ جو فیری میڈوز کے سامنے تھے۔ ایک دیامیر فیس اور سب سے خوبصورت چہرہ، جنوب میں وادی روپل سے نظر آتا ہے اور نانگا پربت کی بلند ترین چوٹی وہیں سے دکھتی ہے۔ روپل سے نانگا پربت کی برفانی دیوار جو ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہے، وہ آپ کے سامنے آتی ہے۔ یہ اس کا شاندار منظر ہے۔ کوہ پیما روپل فیس کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ یہ دوسرے دروازوں سے زیادہ آسان ہے، گو کہ طویل زیادہ ہے۔ چند سال پہلے اس کو سردیوں میں ایک غیرملکی ٹیم نے اسی روٹ سے سر کیا ہے۔

میں اوپر پہاڑی سے دیکھ رہا تھا کہ میری ٹیم ناشتے کا انتظام کررہی ہے۔ دور سے دیکھا تو شاہ جی شاہد کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں لارہے تھے۔ ہم کیمپنگ کے کچن کا ناشتا اور کھانا افورڈ نہیں کرسکتے تھے، اسی لیے ہم نے ناشتا اور کھانا خود ہی بنانے کا انتظام کیا تھا۔ میں پہاڑی سے نیچے اترا اور کیمپنگ کے میدان میں ایک بل کھاتی ندی میرے سامنے تھی اور نانگا پربت کی برف کا عکس، ندی کے شیشے جیسے پانیوں میں نظر آتا تھا۔ یہ ایک چراہ گاہ تھی جہاں پریوں کی بجائے چند بکریاں اور ایک دو گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ دائیں جانب چند جھونپڑے تھے جن میں مقامی لوگ رہتے ہیں۔ کیمپنگ سائٹ کے نیچے جنگل میں لکڑی کے باتھ روم

ہیں۔ ان کی کھڑکیوں سے جنگل کا منظر دکھائی دیتا ہے اور جنگلی پودوں، درختوں، ٹہنیوں اور پھولوں کی مہک ان کھڑکیوں سے اندر آتی ہے۔

رات جہاں ہمارا کیمپ فائر تھا، آج یہاں ہمارا ناشتا تیار ہو رہا تھا۔ شاہ جی آگ جلا رہے تھے، اشفاق ایک گوری عمر رسیدہ میم کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور تھامس اپنا چشمہ لگائے، کسی بھوکے فقیر کی طرح شاہ جی پر نظریں جمائے تھا۔ ہم بریڈ اور انڈوں کے آملیٹ سے ناشتا کررہے تھے۔ اردگرد رونق لگی تھی۔ تھامس ہمارے ساتھ شریک تھا۔ انگریزی اس کی ذرا کمزور تھی، اس لیے زیادہ وقت خاموش رہتا تھا۔ تھامس پچھلے چند دنوں سے ابلے آلوؤں اور جوس پر گزارا کررہا تھا۔ ہمارے پاس خوراک بہت زیادہ تھی اور ہم نے اس کو اپنے گروپ میں شامل کرلیا تھا۔ انڈوں سے مجھے یاد آیا کہ یہ تو ہم ساتھ نہیں لائے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شاہد نے کسی مقامی سے انڈے خریدے ہیں۔

شاہد نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو اشفاق نے بتایا کہ اس کو بخار ہے اور وہ خیمے میں لیٹا آرام کررہا ہے۔ یہ سب کل کی تھکاوٹ کا اثر تھا۔ آج ہم نے بیس کیمپ جانا تھا ہم پہلے ہی لیٹ ہوچکے تھے اور اب شاہد کو بخار تھا۔ اشفاق کی نظریں کچھ میموں پر تھیں اور کچھ چائے کے مگ پر تھی۔ موسم خوشگوار تھا اور خنک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ شاہ جی تھامس سے منہ پھیرے، اپنے ناشتے کی پلیٹ پر جھکے تھے۔ تھامس آنکھیں جھپکتا تھا۔ اشفاق نے ایک اور انڈا فرائی کیا اور کچھ بریڈ کے سلائس گرم کیے اور تھامس کے آگے رکھ دیے۔

"اس بندر کو میں سب سے پہلے کھلا چکا ہوں۔" شاہ جی غصے میں بولے۔ اس دوران تھامس نے نہایت ہی ادب سے وہ پلیٹ اشفاق کو واپس کردی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "میں لے چکا ہوں۔"

میں نے وہ پلیٹ لی اور سیدھا خیمے میں آیا جہاں شاہد آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ خیمے کا پردہ کھلا تھا اور دھوپ کی روشنی میں دیکھا اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور زردی تھی۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ماتھا اس کا تپ رہا تھا۔

"کچھ نہیں بس ذرا سی تھکاوٹ ہے۔" اس نے میری فکرمندی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"ہم بیس کیمپ کل چلے جائیں گے۔ سامنے ہی تو ہے۔" میں نے نانگا پربت کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

شاہد اٹھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ سے ناشتے کی پلیٹ لی اور کڑکتی آواز میں بول کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ "بس ابھی نکلتے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کا انتظار کررہا تھا۔"

اس کو ڈر تھا کہ کہیں ہم اسے چھوڑ کر نہ چلے جائیں اور مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ایک تو ہم اس کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے اور دوسرا اگر وہ جاتا ہے تو ہم بیس کیمپ نہیں جاسکیں گے۔ میں نے کچھ میڈیسن اس کو دیں۔ میں کچھ دیر میں ان کا اثر دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ یہ تھکاوٹ کا اثر ہے اور کوئی انفیکشن نہیں ہے۔ ٹھنڈی خنک تازہ ہوا اور دوائی کا اثر ایک گھنٹے سے پہلے نظر آنے لگا اور اب میں شاہد کو کیمپ فائر والی جگہ سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنا واک مین نکالے، ہیڈ فون کانوں سے لگائے ہمیشہ کی طرح نا آشنا زبان میں گانے سن رہا تھا۔

تھامس کہنے لگا۔ "تمہارا دوست بہتر ہو رہا ہے مگر سمجھ داری یہی ہے کہ اس کو بیس کیمپ نہ لے جاؤ۔ بیس کیمپ کا راستہ ٹیڑھا ہے، جو مشکل بھی ہے اور یہ نہیں جاسکے گا۔"

اصل میں تھامس بھی ہمارے ساتھ تیار ہوگیا تھا۔ مرزا، وسیم اور شہزادہ۔ سب ہمارے گروپ کو جوائن کرچکے تھے۔ میں نے تھامس سے کہا "اگر وہ جاسکتا ہے اور جانا چاہتا ہے تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ بیس کیمپ نہیں تو ہم یہاں کیمپ تک چلے جائیں گے۔"

بیس کیمپ تک جانا میرا ایک خواب تھا مگر ایک ساتھی جو میرے لیے اتنی تکلیف برداشت کرکے یہاں پہنچا تھا، اس کو میں اکیلا فیری میڈو میں نہیں چھوڑ سکتا تھا مگر شاہ جی شاید اسی لمحے کی تلاش میں تھے۔ "میں شاہد کے ساتھ رک جاتا ہوں اور آپ فکر نہ کریں، میں رات کے لیے مرغ پلاؤ بھی تیار کرلوں گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ شاہ جی اب بیس کیمپ سے کنی کترا رہے ہیں۔ میں نے شاہ جی کی طرف مسکرا کر کہا۔ "مگر شاہد تو جانا چاہتا ہے اور تیار ہو رہا ہے۔"

شاہ جی کا منہ لٹک گیا۔

اتنے میں شاہد تیار ہو کر باہر آگیا۔ "میں تو جا رہا ہوں۔ شاہ جی آپ اپنے چکر میں میرا بیس کیمپ تو خراب نہ کریں۔"

شاہ جی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وہاں برف ہے۔ دیکھ نہیں رہے اور ٹھنڈ لگ گئی تو نیچے پل تک خچروں پر لے جائیں گے۔"

"مجھے خچر یا تم پر سوار ہو کر جانا پڑا تو بھی میں بیس کیمپ ضرور جاؤں گا۔" شاہد اب کچھ غصے میں آرہا تھا اور شاہ جی اس کے تیور دیکھ کر اپنے بوٹوں کے تسمے جو وہ ڈھیلے کر چکے تھے، پھر سے کسنے لگے۔ تھامس کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آرہی تھیں۔ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دونوں جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب کچھ پلے نہ پڑا تو وہ نانگا پربت کی دھوپ میں چمکتی برفیں دیکھنے لگا۔

ہماری بحث جاری رہتی اگر مرسلین بیچ میں نہ آجاتا۔ اپنی ہلکی براؤن داڑھی اور سر پر ہیٹ لیے ہمارے ساتھ کیمپ فائر کے بیچ پر آبیٹھا۔ دبلا پتلا مگر کسرتی جسامت کا مالک، مرسلین ہمارے ساتھ بلا معاوضہ گائیڈ کے طور پر بیس کیمپ جانے کے لیے تیار تھا۔ فیصل، مرزا اور وسیم بھی اپنے چھوٹے رک سیک لٹکائے حاضر ہو گئے تھے۔ میں نے بھی خشک خوبانیاں، کریکر، ٹافیاں بیگ میں ڈالیں اور بیس کیمپ جانے کے لیے کمر کس لی۔ شاہ جی نے اپنی نیلی پی کیپ سر پر رکھی اور ٹہلنے لگے۔ شاہد اور شاہ جی میں کچھ ٹینشن چل رہی تھی اور وہ دونوں کھنچے کھنچے تھے۔

"ہم بیال کیمپ ہی جاسکیں گے۔ آپ لوگ بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ بیس کیمپ جانا ہو تو منہ اندھیرے نکلنا پڑتا ہے۔" مرسلین نے ہمیں آگاہ کر دیا۔

شاہ جی خوش ہو گئے۔ "چلو جان چھوٹی۔" کہہ کر وہ بہت مسرور نظر آرہے تھے۔

میں نے کہا۔ "شاہ جی۔ آپ تو کے ٹو پر چڑھنے آئے تھے اور یہاں بیس کیمپ تک جانے سے ڈر رہے ہیں۔"

شاہ جی نانگا پربت کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"کے ٹو اس جیسا ہولناک تو نہیں ہے۔"

"مگر آپ نے کے ٹو کہاں سے دیکھ لیا۔" شاہد نے پوچھا۔

"سگریٹ کی ڈبیا پر تو اس جیسا نہیں دکھتا۔" شاہ جی نانگا پربت کی توہین پر توہین کیے جا رہے تھے۔

"ادھر دیکھیں۔" میں نے چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ سورج کی کرنیں چوٹی سے ٹکرا کر چمک میں اضافہ کر رہی تھیں۔

سنہری کرنوں کو دیکھ کر شاہ جی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "مار اوے۔"

اس گونج نے سب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑا دی۔ ماحول کو بدل دیا۔ میں سمجھ گیا، جو کام ناممکن بن رہا تھا وہ ممکن بن گیا، شاہ جی نے سامان اٹھا کر کہا۔ "اب تو میں اور نزدیک سے دیکھوں گا۔" ساتھ ہی قدم بڑھا دیے۔

تھامس راضی نہیں ہو رہا تھا اور مسلسل کہہ رہا تھا کہ وہ بیس کیمپ تک جائے گا۔ مرسلین کہنے لگا۔ "بیال کیمپ جا کر فیصلہ کرلیں گے۔ پہلے یہاں سے تو نکلو۔"

اب مرسلین ہمارا دوست بن گیا تھا۔ وہ شاہ جی کی باتوں سے کافی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نانگا پربت کی برف پر سورج مسلسل برس رہا تھا اور اس کی برفیں لشکارے مارتی تھیں۔ اس نے بھی شاہ کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

ہم فیری میڈو سے نیچے اترے اور سیدھا اس جنگل میں آگھسے، جہاں کل رات پھنسے تھے۔ ہماری کل جنگل میں رات کو پھنس جانے کی خبر پورے فیری میڈو میں پھیل چکی تھی اور مرسلین بھی ہمیں بچ نکلنے پر داد دے رہا تھا۔ ہم نے اس جگہ کو دیکھا جہاں رات میں رکے تھے تو کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ گہری گہری کھائیاں تھیں۔ ذرا سی بے احتیاطی کسی میں بھی گرا سکتی تھی۔

ہم جیسے ہی جنگل میں داخل ہوئے تو روشنی کم ہو گئی اور اندھیرے کا گمان ہونے لگا۔ ماحول ایکدم بدل گیا۔ ہماری قینچی کی طرح چلتی زبانیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔ سورج کی کرنیں زمین تک بمشکل پہنچ رہی تھیں۔ جیسے ہم کسی قدیم معبد خانے میں آنکلے ہوں۔ ایک مکمل خاموشی میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔ سیکڑوں سالوں سے تنہا اور اپنی جگہ ایستادہ درخت سر اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ ہوا بند تھی اور ایک سردی کی لہر کہیں سے آکر ہمارے جسموں میں اتر رہی تھی۔ کئی درخت اپنی طبعی عمر کو پہنچنے کے بعد گر کر کھوکھلے ہو چکے تھے۔ زمین پر صدیوں سے گرے پتوں اور جنگلی گھاس نے جنگل میں ایک نرم فرش سا بنا دیا تھا۔ اپنی جڑوں سے علیحدہ ہوئے درختوں کے تنوں اور ٹہنیوں نے گرنے کے بعد عجیب وغریب شکلیں اختیار کرلی تھیں۔ ہر تنا، ٹہنی، پتھر اپنی جگہ نہایت موزوں دکھتا تھا کہ اگر ایک کو ہٹا دیا جائے تو فنکار کا سارا بنایا ہوا منظر ہی بکھر جائے۔ ہم تنوں کو پھلانگ کر عبور کرتے تھے۔ بولتے نہیں تھے، آہستگی سے چلتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں ہمارے بولنے سے یہ طلسم ٹوٹ نہ جائے۔

ہم ایک سرشاری کے عالم میں، ایک دوسرے سے دور ہٹ کر چل رہے تھے۔ ہر ایک تنہا ہوتا گیا۔ مکمل سکون اور آسودگی کا احساس تھا جو جسم کے روئیں روئیں میں دوڑتا تھا۔ پوری ٹیم بکھر چکی تھی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے نکلا تو تھامس، شاہ جی اور مرسلین ایک تنے پر بیٹھے نظر آئے۔ دھوپ ان پر پڑتی تھی۔ شاہ جی نے نانگا پربت کی جانب پیٹھ کر رکھی تھی۔ تھامس خلا میں گھور رہا تھا اور مرسلین مسکرا رہا تھا۔ ہم کچھ دیر اس تنے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میرے پاس اس منظر کی تصویر آج بھی موجود ہے، جس میں شاہ جی مرسلین سے پوچھ رہے تھے کہ بیال کیمپ سے واپس کب تک آجائیں گے؟

چلتے چلتے ہم جنگل کے بائیں کنارے پر آرکے۔ ساری ٹیم یہاں جمع تھی۔ وجہ سامنے تھی۔ ایک پتلی پگڈنڈی یکا یک سامنے آگئی تھی جو سیدھی نیچے اتر رہی تھی اور اس کھائی میں رائے کوٹ گلیشیر کا سلیٹی وجود، سیکڑوں میٹر نیچے لیٹا تھا۔ نانگا پربت سامنے دھوپ میں کسی آئینے کی طرح لشکارے مار رہی تھی۔ جس پر نگاہ ٹھہرنا محال ہو رہا تھا اور ہمیں اسی پتلی گلی سے نیچے اترنا تھا۔

”مرسلین بھائی! کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“ شاہ جی رازدارانہ لہجے میں بولے تھے۔

مرسلین نے بے پروائی سے کہا تھا۔ ”کوئی مشکل نہیں ہے۔ ہم تو ہر روز آتا ہے۔“

”لیکن ہم تو پہلی بار جا رہے ہیں۔“ شاہ جی بات کرتے ہوئے کانپ رہے تھے۔

شاہد نے ایک کنکر پوری قوت سے گلیشیر کی دنیا میں پھینکا۔ وہ کچھ دیر ہوا میں معلق رہا اور پھر اس دنیا میں کہیں فنا ہو گیا۔ ہم آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔ راستہ جتنا مشکل لگتا تھا، حقیقت میں زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ گرنے کا امکان کم تھا۔ ہم لڑکھتے، پھسلتے نیچے اترے، گلیشیر کسی وجہ سے بائیں جانب کھسکتا چلا گیا تھا اور ہم اس سے دور ہو کر نسبتاً ایک کھلے علاقے پر چلنے لگے۔ اب ہمارے آس پاس گنگناتی ندیاں تھیں، بے شمار پھول، پستہ قد درخت تھے۔ خنک ہوا نانگا پربت سے آرہی تھی، ہم اس میں خوش ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ ہمیں تنگ نہیں کر رہی تھی۔ آسمان صاف شفاف تھا۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آتا تھا، البتہ نانگا پربت کے کافی حصے پر دھند اتر رہی تھی۔ وہ ایک مقدس ہستی کی طرح پُرسکون تھا۔ اس کا حجم میری نگاہوں میں سما نہیں رہا تھا۔

دیکھنے والا یہ ضرور سوچتا ہوگا کہ روئے زمین پر کوئی چیز اپنے حجم میں کیا اتنا پھیلاؤ رکھ سکتی ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ اونچائی میں یہ پہاڑ دنیا میں نویں نمبر پر ہے مگر پھیلاؤ میں اس نے ایک سو کلومیٹر سے زیادہ رقبہ گھیرا ہوا ہے۔ آٹھ ہزار میٹر سے بلند پہاڑ دنیا میں چودہ ہیں۔ بیشتر کے بیس کیمپ جانے کے لیے آپ کو کئی دن پیدل کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے مگر نانگا پربت شاہراہ ریشم سے چند کلومیٹر، تاتو کی اندھی کھائی کے بعد ایک دم اوپر اٹھتا جاتا ہے اور زمینی سطح سے اتنی قریب دنیا میں کوئی بلندی نہیں ہے۔ یہ بے پناہ پھیلاؤ ناقابلِ یقین پھیلاؤ۔ اس میں کوئی رومانس نہیں، ایک وحشت ہے۔ پیار نہیں ایک قہر ہے۔ میں نے نانگا پربت کے متعلق بہت پڑھا ہے۔ دنیا میں دستیاب بہت سی فلمیں دیکھی ہیں۔ ہرمن بوہل کی Naanga Pilgrimage Parbt کو پڑھا ہے۔ میسنر کی ڈاکومنٹری دیکھی ہے جس میں ہیبت ناک اور رونگٹے کھڑے کردینے والے مناظر ہیں اس قاتل پہاڑ کی حوصلہ شکن کھائیاں ہیں، چکنی سپاٹ ڈرا دینے والی چوٹیاں ہیں۔ اس پہاڑ کو ایسے انداز سے دکھاتے ہیں کہ اسے دیکھ کر اس کے قریب پھٹکنے کے لیے بھی شیر کا جگرا چاہیے۔ یہ ایک یقینی قتل گاہ ہے۔ اس کی برفانی تنہائیوں میں، منفی چالیس سے نیچے کا درجۂ حرارت، بلندی کی وجہ سے آپ کے ریفلیکشن اور ردعمل کا کمزور پڑنا، دماغ کی سوچنے کی رفتار اتنی کم ہو جانا کہ وہ آپ کو پاگل بنا دیتا ہے، شدید ڈپریشن کی کیفیت، آکسیجن کی قلت سے جسم کی کمزوری اور اس میں اکتاہٹ کی کیفیت۔ یہ سب عوامل ہیں پھر بھی اس کی چوٹی پر چڑھ کر لوگ اپنا جھنڈا وہاں گاڑ دیتے ہیں۔ حیرانی تو میسنر پر ہوتی ہے جو اکیلا، ہاں بالکل اکیلا۔ ان چودہ چوٹیوں پر بغیر کسی آکسیجن سیلنڈر کے پہنچ گیا تھا۔

میں ایک ندی کنارے بیٹھا، اسی نانگا پربت کو دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھی آگے نکل چکے تھے۔ میں کچھ تنہائی اور خلوت چاہتا تھا، شاہ جی مجھے جانتے تھے، اس لیے سب کو ہانکتے ہوئے مجھ سے دور لے گئے تھے۔

میں اکیلا رہ گیا تھا کیونکہ میں اسے اپنی آنکھ، اپنی سوچ اور نظر سے دیکھنا اور پرکھنا چاہتا تھا۔ جو مجھے حجم میں دنیا کی سب سے بڑی ایک برفانی چٹان کی صورت نظر آتا تھا۔ میں غور کرتا تھا۔ دیکھتا تھا اور اس طلسم میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔

تھا۔ یہ تو ایک پہاڑ ہے۔ اس جیسے اور سینکڑوں ہیں جو اس زمین پر میخ گاڑے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کن کن مختلف چیزوں سے مزین ہے۔ سمندر دیکھیں تو پہاڑوں کے دل دہل جائیں۔ ریگستان دیکھیں تو انسانی ذہن ہی الٹا ہو کر رہ جائے اور بڑا اعظم انٹارکٹیکا جس کو عظیم میسنر اکیلے عبور کر چکا ہے۔ یہ دنیا کتنی بڑی ہے اور ایک زندگی اسے دیکھنے کے لیے کتنی مختصر ہے۔ ایک ذہن اس کا گھیراؤ کرنے کے لیے کتنا محدود ہے۔

وویگرون، سیٹلائٹ جب زمین سے لاکھوں میل دور سورج کے قریب پہنچا تو بتیس کا درجہ بنا کر اس نے زمین کی ایک تصویر لی۔ یہ کرۂ ارض سے ایک پیلے اور نیلے رنگ کا ایک معمولی چھوٹے دھبے کی صورت بمشکل دکھائی دیا تھا۔ سیگن نے اس پر ایک لافانی کتاب لکھی BluePale Dot وہ کہتا ہے۔ "اس نقطے کو دیکھو۔ وہ یہاں ہے، وہ میرا گھر ہے، وہ ہم سب ہیں۔ وہاں وہ سب ہیں جن سے آپ محبت کرتے ہیں، جن کو آپ جانتے ہیں، وہاں ہر کوئی ہے جس کے بارے میں آپ نے سنا ہے۔ ہر وہ انسان جو پہلے تھا اور اپنی زندگی گزار کر فانی ہوا۔ ہماری تمام تر خوشیاں اور دکھ، ہزاروں عقیدے، نظریات، معاشی طاقتیں، ہر طرح کا شکاری اور ذخیرہ اندوز، ظالم بھی اور مظلوم، کمزور بھی اور طاقتور، ہر طرح کے بہادر اور بزدل بھی ہر طرح کی تہذیب کا تخلیق کار اور پھر اسے برباد کر دینے والا بھی کوئی ہم جو کوئی ملک اور ان کے درمیان انسان کی کھینچی لکیریں، شہر اور شہروں کے درمیان فاصلے، گلیشیر اور بلند پہاڑ، پہاڑوں کے درمیان وادیاں، وادیوں میں موجود جانور، درخت، جنگلات، دریا، اور جھیلیں۔ سارے بادشاہ اور غلام، پیار کرنے والے لوگ، نفرت کے مارے اجسام، ساری مائیں اور والد، پُرامید بچے، تخلیق کار، مہم جو۔ سارے وہ جو اخلاق کا درس دینے والے ہیں اور وہ جو ان سے سیکھتے ہیں، سارے بددیانت سیاستداں، عظیم لیڈر، مذہبی رہنما اور گناہ گار۔ ہماری تاریخ کے اور اب کے موجود سب جانور، انسان، نباتات، ریگستان، سمندر، جنگلات، پرندے۔ یہ سب ایک پیلے نیلے نقطے میں ہیں جو اس کائنات میں، ایک ریگستانی ذرّے کی طرح ہے جو انتہائی مشکل سے نظر آتا ہے۔"

میں یہی کچھ بیٹھا سوچتا رہا اس جہاں میں ایک پیلا نیلا نقطہ ہے جو زمین کہلاتا ہے۔ اس میں یہ سب کچھ ہے۔ میں نانگا پربت کا عظیم حجم بھی ہے۔ اس جیسے اربوں، کھربوں بلکہ ان گنت ایسے اس جیسے اور نقطے ہیں اس جہاں میں اور اس جیسے اربوں، کھربوں اور بھی جہان ہیں۔ اس زمین اور سورج، چاند اور دوسرے سیاروں کی گردش تو ایک انتہائی محدود حصے میں ہے۔

یہ سب ایک ضابطے کے تحت ہو رہا ہے اور اس سے پرے کھربوں ایسے نظام چل رہے ہیں۔ یہ سب کیسے اور کیوں اور اس میں میری حیثیت اور میرا کردار کیا ہے۔ میں اس پیلے نیلے نقطے میں ایک ذرّے سے بھی کم ہوں۔ یہ سب تخلیق کرنے والا کوئی تو ہے۔ یہ سارا نظام ایسے تو کھڑا نہیں ہو گیا۔ کوئی ایک creator ہے۔ وہی خالق ہے۔ وہی اللہ ہے۔ کوئی اسے کوئی بھی نام دے دے۔ ہے وہی ایک، یکتا۔ اور وہ ایسا کہ میرے جیسے بے حیثیت کے دل کی بات بھی جانتا ہے اور جو اس سے مانگو تو سنتا ہے اور دیتا ہے۔ کیسا عظیم ہے میرا اور ہم سب کا رب۔ وہ بار بار اپنے بندے، ہم میں سے چنتا رہا اور ہمیں ان محترم پیغمبروں کے ذریعے بتاتا رہا ہے کہ میں ہوں تمہارا رب۔ یہ سب میں نے بنایا ہے۔ میرے ہی قانون سے یہ سب نظام چل رہا ہے۔ میرے شکر گزار بنو۔ میں اس پیلے نیلے نقطے کی طرح کھربوں نقطے رکھتا ہوں۔ جہاں تمہاری جنت بھی ہوگی اور جہنم بھی۔ یہ سب میرے لیے کچھ نہیں کہ میں انہیں برباد کر دوں اور دوبارہ بنا دوں۔ غور کرو میری اس کائنات پر جو میں نے تم پر عیاں کر دی ہے۔

میں بہت دیر ان بھیدوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ زبان پر وحدت اور اس کی عظمت کے کلمات تھے۔ میں اس بیابان میں نکلا تو قدرت کے رنگ نظر آئے۔ یہ شہروں کی گلیوں، محلوں اور آرام دہ گھروں اور دن رات کی بھاگ دوڑ میں نظر نہیں آتے اور نہ آ سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو بیابانوں، صحراؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے بیچ جانا پڑتا ہے۔ عرب کے بدو، ایمان لانے میں کیوں نہ ہچکچائے، کیونکہ وہ ریگستانوں کے باسی تھے۔ رسول اللہ نے جب توحید اور خالق کا بتایا تو وہ اس کی شان میں جھکتے چلے گئے۔ اس لیے کہ وہ اس کائنات کے راز، چاند تاروں کی گردش، آسمانوں میں پھرتے بادلوں کی حرکت۔ سب دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہے۔ رسول اللہؐ نے اس بھید سے جب پردہ چاک کیا تو وہ یقین کی منزل پر سرعت سے پہنچے اور ایسے سربجود ہوئے۔ ایسے اپنے یقین پر پورے اترے کہ آدھی صدی میں دنیا کا نقشہ بدل دیا۔

میرے اردگرد بہتے چشمے، گنگناتی ندیاں، رنگ برنگے پھول، پستہ قد درخت تھے اور خنک ہوائیں جھومتی ہوئی چلتی تھیں۔ میرے ساتھی کافی دور نکل چکے تھے۔ میں بھی اب نانگا پربت کی جانب منہ کر کے چل رہا تھا اور اچانک ایک ندی سامنے آگئی۔ اس میں پتھر دھرے تھے اور شاید میرے ساتھی بھی ان پر پاؤں رکھتے ہوئے پار گئے تھے۔ میں اکیلا تھا، اس لیے کچھ ڈرتا تھا۔ اردگرد دیکھتا تھا کہ کوئی ساتھ ہو تو یہ ندیا پار اترے۔ پھر ہمیشہ کی طرح اللہ کی مدد سے اس ندی کو پار کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بیال ندی تھی۔ دونوں جانب سے بےشمار چھوٹے ندی نالے، پہاڑوں سے اتر کر بیال ندی میں آملتے ہیں۔ پھر بیال ندی رائے کوٹ نالے میں جا گرتی ہے اور پھر وہ آگے چل کر سندھ کے پانیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔

کچھ دیر میں، میں برچ کے سفید درختوں کے جنگل میں داخل ہوا تو میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ شاہ جی بھی ایک سرمستی کے عالم میں تھا سی کو چھیاں ڈالے تھے۔ برچ کے درخت کی چھال، ایک کاغذ کی طرح، تہہ در تہہ اس کے تنے پر لپٹی ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ چلاس میں ابھی بھی برچ کے کاغذ پر لکھے نادر نمونے مل جاتے ہیں، کیونکہ کافی عرصہ تک اس کی چھال کاغذ کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ برچ کے درخت ختم ہوئے تو اب ہمارے سامنے، پہاڑ کے دامن سے لگا، ایک کشادہ اور میدانی راستہ تھا۔ ہری گھاس کے تختے تھے، بےشمار کاسنی اور پیلے پھول تھے اور بہتے پانی تھے۔ یہ ایک چراہ گاہ تھی۔ بائیں جانب، ایک بلندی پر چرواہوں کے جھونپڑے تھے۔ ہم ستانے کے لیے وہیں کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئے۔

کوئی درجن بھر بچے دیکھتے دیکھتے ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ میں نے خالی پلاسٹک کی بوتل کسی ایک بچے کو دی اور وہ لسی بھر کر لے آیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ لسی آبِ حیات ہے مگر یہ آبِ حیات مجھ سے نہ چڑھا سکا۔ شاہ جی نے بھی کوشش کی مگر وہ بھی راضی نہ ہوئے۔ اس کا ذائقہ کچھ عجیب تھا یا ہم اس ذائقے کے عادی نہ تھے ہم کچھ دیر آرام کرتے رہے۔ سورج سر پر تھا مگر خنک ہوا، ہماری جانب آتی تھی۔ چند اصحاب لیٹے تھے اور بقایا حضرات بیٹھ کر خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کافی دیر سے منظر ٹھہر سا گیا تھا۔ نانگا پربت پورے کینوس پر بھاری تھے

آگے ایک پگڈنڈی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھے اور ہم اس پر چڑھتے چلے گئے۔ اب ہم بلندی کی وجہ سے باقاعدہ ہانپنے لگے تھے۔ میں سب کی بات نہیں کر رہا صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔ ہم اوپر پہنچے تو کوئی منظر تبدیل نہ ہوا، بس یہ ہوا کہ نانگا پربت ہمارے روبرو آگیا۔ درمیان میں کچھ حائل نہ تھا۔ برف کے پہاڑ تھے، جن پر کہیں کہیں دھند لپٹی تھی اور جہاں دھند نہ تھی، وہاں برفیں سورج کی شعاعوں سے چکا چوند ہو رہی تھیں۔ ہم نے گہرے رنگوں کے چشمے لگائے ہوئے تھے مگر نظر پھر بھی نہ لگتی تھی۔ ہم کچھ آگے بڑھے تو دنیا کا ایسا ایک نظارہ دیکھنے کو ملا، جو ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گیا۔ پیچھے گھوم کر دیکھا تو کئی میل لمبا پہاڑی برآمدہ تھا، جس کے آخری کونے پر "راکاپوشی" اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اپنے سنگھاسن پر جمی بیٹھی تھی۔ اس ہمالیہ کے برآمدے کی دونوں جانب خاموش اور پرشکوہ برفانی پہاڑ تھے، خاموشیاں اور تنہائیاں تھیں۔ ایک طلسم تھا، ایک جادوگری تھی۔ جہاں ایک خلوت تھی، سناٹا تھا اور اداسی بھری تھی۔ ایک جانب نانگا پربت ایستادہ تھا اور دوسری جانب راکاپوشی تھی۔ دونوں بےبس محبوبوں کی طرح ایک دوسرے کو تکتے تھے کہ ہم کبھی مل نہ سکیں گے۔ کون سی سزا بھگت رہے تھے کہ ہزاروں سال سے آمنے سامنے، ایک دوسرے کو تکتے ہیں اور ملنے کی کوئی آس نہیں۔ یہ نظارہ آج کے دن کا انعام تھا میرے لیے۔

نانگا پربت کے راستے میں پڑتا آخری پڑاؤ۔ بیال کیمپ۔ جہاں ہم کچھ دیر پہلے پہنچے تھے۔ تاتو والوں کا سمر کیمپ، وہ سال میں ایک فصل یہاں اگاتے ہیں اور گرمیوں میں اپنے مویشی لے کر یہاں آجاتے ہیں۔ یہ تاتو والوں کی چراہ گاہ تھی۔ وہاں ان کے مویشی چرتے ہیں۔ بائیں جانب ایک بلندی پر ان کے کچھ جھونپڑے تھے۔ مویشی ادھر ادھر منہ مارتے تھے۔ ہم چھوٹی چھوٹی ندیاں پار کرتے، بیال کے آخری کنارے پر پہنچے۔ اس سے آگے نانگا پربت کا ویرانہ تھا۔ یہ بیال کی کیمپنگ تھی۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں ارزاں نرخوں پر آپ چائے اور کھانا خرید سکتے ہیں۔ ہم ایک گھنے اور ٹھنڈی ٹھار چھاؤں والے درخت کے نیچے لیٹ گئے اور وہ نیلا آسمان دیکھا، جو نانگا پربت کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی محیط تھا۔

اب ہم نانگا پربت کے عین نیچے تھے۔ دائیں جانب بیال ندی بہتی تھی اور ذرا بڑے بلند قامت پہاڑ تھے جن پر برفیں چمکتی تھیں۔ بائیں جانب بھی ایسے نظارے تھے اور

پہاڑ دامن تک سرسبز تھے اور چوٹیوں پر برف کا راج تھا۔ چاروں جانب پہاڑ تھے، درخت، ندیاں، نرم گھاس اور جنگلی پھول اور تنہائی کا راج تھا۔ چند چرواہے اپنے جانور ہانکتے تو کوئی آواز اٹھتی۔

میں نانگا پربت کی جانب منہ کیے نیم دراز تھا۔ ابھی گرم چائے پی کر تازہ دم ہوئے تھے۔ میں نے بیس کیمپ کی جانب دیکھا۔ مرسلین کہہ رہا تھا کہ اب دیر ہو چکی ہے اور بیس کیمپ تک جانے اور واپس آنے میں تاریکی کہیں آپ کو آ دھرے گی۔

کچھ لوگ میرے ساتھ بیال کیمپ میں ٹھہر گئے اور کچھ نانگا پربت کی جانب چل پڑے۔ سوائے تھامس کے کوئی بھی بیس کیمپ نہ پہنچ سکا اور اس کو بھی مرسلین نے رسوں کی مدد سے کھینچ کر پہنچایا اور وہ رات گئے، پیلا زرد ہوتا ہمیں فیری میڈو میں آملا تھا۔

میں نے ایک بار پھر چائے کا کہا۔ شاہ جی نے چائے کا کپ لا کر میری ہتھیلی پر رکھا۔ بھاپ اڑاتی چائے کی گرماہٹ میرے بدن میں اتری اور کچھ دیر کے لیے مجھے ان یخ ہواؤں سے نجات ملی جو نانگا پربت سے اب تیزی سے اتر رہی تھیں، میں اب تنہا ہو گیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ نانگا پربت کی بلندی میرے حواس پر طاری تھی اور جسم میں ایک خوف بھرتی تھی۔ اس کی ڈھلوانوں پر تیرتے بادل گھنے ہو رہے تھے اور شاید برس بھی رہے تھے یا پھر جھوم رہے تھے۔ سلور پیک پر سورج کی شعاعیں اب سنہری ہو رہی تھیں۔ میں اتنے سالوں بعد یہ سب لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں میرے پاس فلم کا کیمرا تھا۔ آج جو میرے پاس کیمرے، لنزیز اور فلٹر ہیں، اگر ان دنوں ہوتے تو میں ان لمحوں کو ایک شاندار مناظر میں قید کر لیتا۔ نانگا پربت میں خوبصورتی سے زیادہ خوف ہے۔ سناٹا اور تنہائی ہے۔ کوئی خوش کن منظر نہیں بلکہ ایک للکار سی ہے۔ ایک قہر کی دنیا ہے۔

اس کو سر کرنے کی پہلی کوشش برطانیہ کے اے۔ ایف ممری نے 1895ء میں کی۔ وہ دیامیر سائیڈ سے اس پر چڑھا مگر راستہ نہ ملا تو ناکام واپس ہوا۔ پھر روپل سائیڈ سے اس نے کوشش کی۔ راستہ بھی بنا لیا تھا۔ مگر وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت برفانی طوفان کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا۔ یہ اس قاتل پہاڑ کا پہلا شکار تھا۔ کئی سالوں تک پھر کوئی نہ آیا۔ پھر 1932ء آ گیا۔ جرمنی پر ہٹلر کی حکمرانی تھی اور نازیوں نے ایک ٹیم ولی مرکل کی قیادت میں، نانگا پربت کا غرور توڑنے بھیجی۔ نازیوں کو ایک دھن تھی کہ وہ ہمالیہ کو سر کریں۔ دیامیر سے وہ نانگا پربت پر چڑھائی شروع کرتا ہوا 23175 فٹ تک مرکل پہنچ جاتا ہے۔ رائے کوٹ پیک کے قریب اس کا کیمپ لگا تھا۔ اچانک اولانچ اٹھے اور چاروں جانب برفیں پھیل گئیں۔ ایک پورٹر ہلاک ہوا اور مرکل بمشکل جان بچا کر نیچے اترا۔ برٹش کے ساتھ جرمنوں کے حالات اتنے خراب نہیں تھے، اس لیے بمبئی سے برٹش کونسلر بھی اس ٹیم کے ساتھ آیا اور ایک پاکستانی بھی اس ٹیم کا حصہ تھا۔ وہ نیچے اترے اور گلگت کو چلے۔ راستے میں کوئی حادثہ ہوا اور ایک ساتھی ہلاک ہو گیا۔ تب سے اس کو قاتل پہاڑ کہا جانے لگا۔ دو سال بعد، جولائی کے مہینے میں مرکل پھر مرنے آ پہنچا۔ آٹھ کلمبرز تھے۔ ایک تو شروع ہی میں نمونیا کا شکار ہو کر مر گیا۔ اب یہ لوگ روپل فیس سے چڑھ رہے تھے۔ نانگا پربت کوئی نو سو فٹ رہ گئی تھی کہ کوئی برفانی طوفان اٹھا اور مرکل ہمیشہ کے لیے برف میں دفن ہو گیا۔ اس کی لاش چار سال بعد ملی۔ 1937 میں نو جرمنوں سمیت ایک تجربہ کار ٹیم اسے سر کرنے پہنچی۔ اس ٹیم میں صرف ایک جرمن زندہ بچا۔ اس نے خود اس برفانی تودے کو گرتے ہوئے دیکھا تھا، جو آرام کرتی ٹیم پر آ گرا تھا۔ سب ہلاک ہو گئے تھے۔ کل ملا کر سولہ افراد تھے اور یہ نانگا پربت کا سب سے بڑا شکار تھا۔ ایک پورٹر نے طوفان آنے سے پیشتر یہ بات کہی تھی کہ رات اس نے چند عورتوں کو کفن میں ملبوس، خیموں کے گرد ناچتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ پہاڑ منحوس، قاتل، کیا کچھ نہیں کہلوانے لگا۔

ایک اور ٹیم کہیں سے اگلے سال آ نکلی۔ روپل فیس سے چڑھائی کچھ آسان ہے مگر فاصلہ زیادہ ہے۔ یہیں سے وہ ٹیم آگے بڑھی اور پھر وہی طوفان۔ پورٹرز ڈرے ہوئے تھے۔ انہوں نے آگے جانے سے اس وقت انکار کر دیا، جب مرکل کی لاش انہیں، برف کے فریج میں نظر آ گئی۔ پھر ایک بار اور کوشش ہوئی مگر وہ بھی ناکام رہی۔ نانگا پربت اب تک 37 جانیں لے چکا تھا۔ عالمی جنگ شروع ہوئی تو یورپین نانگا پربت کو بھول کر ایک دوسرے کو آنکھیں دکھانے لگے۔ کئی سال وہ مرتے، مارتے رہے اور پھر 1953ء آ گیا۔

ڈاکٹر کوفر کی قیادت میں ایک ٹیم نانگا پربت کو سر کرنے پہنچی۔ گلگت میں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ رائے

کوٹ وادی میں ایک بڑا کیمپ لگایا گیا۔ بڑے بوڑھے اب بھی اس کیمپ کی رونقیں یاد کرتے ہیں کیمپ کے تیسرے دن چڑھائی شروع ہوئی۔ ٹیم نے 22640 فٹ کی بلندی پر کیمپ فائیو قائم کیا۔ یکم جولائی کا دن تھا جب ہرمن بوہل اور دوسرا کوہ پیما کیمپٹر آگے بڑھتے۔ نظریں ان کی چوٹیوں پر تھیں۔ بلندیوں کو وہ برفانی فصیلوں سے دیکھتے تھے۔ ہرمن بوہل کو گلے کی تکلیف تھی۔ وہ اپنی بیماری کو دیکھتا تو ایک تاریخی موقع گنوا دیتا۔ منزلوں کے قریب ہوں تو کبھی کبھی بڑے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ رات ایک بجے ہرمن نے کیمپٹر کے خیمے پر دستک دی تو وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ رات کی تاریکی میں برفانی ڈھلوانوں سے اٹھتے، گھنے بادلوں کو دیکھتا اور کہتا کہ اوپر جانا پاگل پن ہے۔ وہ منزل سے کچھ فاصلے پر لڑکھڑا گیا۔ آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ہرمن نے اپنا سلیپنگ بیگ کندھے پر رکھا اور اکیلے ہی نانگا پربت کی چوٹیوں کی جانب چڑھنا شروع کر دیا۔ آسمان پر پورا چاند نکل چکا تھا اور وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ دن نکل آیا اور پھر دوپہر بارہ بجے تک اس نے کافی فاصلہ طے کر لیا تھا۔ باقی ٹیم اس کا نیچے انتظار کر رہی تھی۔ سب خاموش اور خوف زدہ تھے۔ ہرمن تھک چکا تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ ایک جنون کی کیفیت میں تھا۔ وہ چوٹی سے تین سو فٹ نیچے کھڑا، اسے دھوپ میں چمکتا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط آہنی ارادے کے ساتھ آگے بڑھا۔ اسے اکیلے یہ پُر مشقت سفر کرتے انیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ شام کے سات بجے ہرمن بوہل نے ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا۔ دنیا کا پہلا انسان جس نے اس قاتل پہاڑ کی چوٹی پر اپنا پہلا قدم رکھا۔ یہ بلندی اس نے آکسیجن کے سلنڈر کے بغیر سر کی تھی۔ وہ تنہا تھا، چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ اس کی گونجیں برف میں دور تک پھیلتی چلی گئیں۔ ڈھلتے سورج کی کرنیں برف کو سنہری کر رہی تھیں۔ اس کے سامنے راکاپوشی کی چوٹی تھی۔ ایک فاتح اور کامرانی کا احساس، اس کی روح کو گرماتے تھا۔ وہیں اس نے جرمنی اور پاکستان کا جھنڈا اگاڑا تھا۔

وہ جب نیچے اتر رہا تھا تو اندھیرا پھیل رہا تھا۔ چوٹی کے نیچے اس نے ایک برفانی چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر، کھڑے کھڑے رات کا کچھ حصہ بسر کیا۔ پھر جیسے چاند طلوع ہوا تو اس نے اپنا نیچے جانے کا سفر پھر سے شروع کیا اور دوپہر ایک بجے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کیمپ فائیو میں اس عالی شان کامیابی کا جشن منایا۔ پورٹر بھی خوشی سے ناچ رہے تھے۔ وہ ایک سرد جشن تھا جو برفانی بلندیوں پر منایا جا رہا تھا اور پھر یہ بہادر اور جری انسان، چار سال بعد چوغالیزا کو سر کرتے ہوئے کسی برفانی کھائی میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔ نانگا پربت، قاتل پہاڑ کے ایک اور شکار نے اپنی کہانی ختم کر لی۔

نانگا پربت کی چوٹی اس کے بعد کئی مرتبہ سر ہوئی۔ پاکستانی اور کئی غیر ملکیوں نے اسے روندا۔ ہرمن نے اس کا غرور توڑ دیا تھا اس لیے وہ اب سپردگی کے عالم میں آ گئی تھی۔

ویسے تو بہت سے کوہ پیما اس کو سر کرنے آئے مگر مشہور کوہ پیما میسنر بھی 1971ء میں اپنے بھائی گنتھر کے ہمراہ اسے سر کرنے آیا۔ گنتھر اس مہم میں ہلاک ہوا اور ذمہ داری میسنر پر ڈال دی گئی کہ وہ اپنے بھائی کی جان بچا سکتا تھا۔ پچھلے دنوں میں میسنر کا ایک انٹرویو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ذکر پر پھوٹ پھوٹ کر رو دینے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ غلط ہے کہ وہ میری وجہ سے مرا۔ میرے خاندان والوں اور دوسروں نے مجھ پر غلط الزام لگائے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ سولو کلائمبنگ کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر بہت مضبوط ہونا ہوتا ہے۔ راک کلائمبنگ اور کوہ پیمائی ہمیشہ ناممکن ہوتی ہے۔ ایک مہم جو پہلے اسے ذہنی طور پر ممکن بناتا ہے تو تب کوئی بھی چیز ناممکن نہیں رہتی۔ میسنر دنیا کا واحد کوہ پیما ہے جس نے دنیا کی آٹھ ہزار میٹر سے بلند چودہ چوٹیاں، اکیلے اور بغیر آکسیجن سلنڈر کے سر کی ہیں۔ یہ کارنامہ ابھی تک کسی نے سرانجام نہیں دیا۔ میسنر اب اٹلی کے Dolmite پہاڑوں میں بنے ایک قلعے میں رہتا ہے۔ وہاں اس نے اپنا میوزیم بھی بنایا ہے۔ اس بار میں اٹلی گیا۔ میسنر وہاں نہیں تھا اس لیے میں ردم میں رہ گیا۔ ورنہ میں اس سے ضرور ملنے کی کوشش کرتا۔

☆☆☆

میں بیال کیمپ کی نرم گھاس پر لیٹا تھا، اسی نرم گھاس پر شاہ جی آنکھیں بند کیے سو رہے تھے۔ ہر طرف "فبای الاء ربکما تکذبان" کی تفسیر تھی، اسی لیے سونے سے پہلے "مار ادے" کا نعرہ وہ متواتر لگاتے رہے تھے۔ یہ نعرہ آج ان کے لبوں پر دن بھر رہا تھا۔ اشفاق اور شاہد دور لکڑی کی باڑ سے لگے بیٹھے، ہمیشہ کی طرح مسلسل اپنی زبان میں باتیں کرتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنے میں ایک زور دار

دار دھماکا ہوا، شاہ جی زمین سے قدرے بلند ہوئے اور پھر اسی جگہ پر آ گرے۔ اس خاموشی میں اس کان پھاڑ دینے والے دھماکے نے میرے حواس کچھ دیر کے لیے معطل کر دیے۔ کچھ معلوم نہ ہو رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے اور یہ دھماکا کہاں ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے؟ چاروں طرف دیکھا تو کوئی دھواں تھا اور نہ کوئی آگ تھی۔ نانگا پربت کی جانب سے آواز آتی تو سمجھ جاتے کہ کوئی برفانی تودہ گرا ہے۔ یہ آواز کسی اور جانب سے آئی تھی۔ کوئی زلزلہ تھا یا کوئی چٹان زمین بوس ہوئی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور چاروں جانب خوف سے دیکھ رہے تھے۔ اس دھماکے کے کچھ دیر بعد ایک گڑگڑاہٹ شروع ہوئی، جو آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ زمین تھرتھرانے لگی۔ ہم اپنی جگہیں چھوڑ کر خوف زدہ ہرنوں کی طرح چاروں جانب دیکھ رہے تھے کہ یہ بڑھتی ہوئی گڑگڑاہٹ کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ شور بڑھتا چلا گیا اور کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ہم اب باقاعدہ طور پر ڈر چکے تھے۔ یا اللہ یہ کیسا شور ہے جو ہمارے سامنے، کہیں سے اٹھ رہا ہے اور وجہ معلوم نہیں کہ کیوں اور کیسے اٹھا ہے؟

جو چرواہے اپنی بکریاں چرا رہے تھے، وہ اب اپنی بکریوں کو ہانکتے ہمارے بائیں جانب والی پہاڑی کی جانب بھاگ رہے تھے۔ ہمیں اس پہاڑی کی جانب دوڑنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی تھی، مگر ہم نے کسی ناگہانی آفت سے بچنے کے لیے، ان کی تقلید لازمی سمجھی اور اس پہاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ اب گڑگڑاہٹ اتنی بڑھ چکی تھی کہ زمین کانپتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم ہانپتے کانپتے اس پہاڑی پر کھڑے ایک دوسرے کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک گونج تھی جس کی شدت بڑھ رہی تھی۔ ہم کچھ مقامی لوگوں اور بے شمار بکریوں کے ہمراہ خوف زدہ کھڑے تھے۔ ٹانگیں خوف سے لرز رہی تھیں۔ شاہ جی کی نیلی پی کیپ ان کے سخت ہاتھوں کے چنگل میں تھی اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ دوڑ کس طرف کو لگانی ہے۔

میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو چرواہے نے جواب دیا کہ اوپر پہاڑ پر کسی جھیل کا بند اپنے پانیوں کے دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال گیا، پانیوں کے زور نے اسے اڑا کر رکھ دیا ہے۔ یہ دھماکا اسی بند ٹوٹنے کا تھا۔

"تو پھر یہ گڑگڑاہٹ کیسی ہے۔" میں نے پھر پوچھا تو کسی نے ہاتھ سے سامنے ایک پہاڑ کی بہت اونچی بلندی کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مٹی، پتھروں، سنگریزوں اور پانیوں کا ایک بہت بڑا ملغوبہ بلندی کی کسی گزرگاہ کے راستے بہتا ہوا تیزی سے نیچے چلا آ رہا ہے۔ ایک خوف کا عالم تھا اور ہمیں اب یہ ڈر تھا کہ یہ بیال کیمپ ہی جھیل نہ بن جائے۔ ہم بیال ندی کے دوسرے کنارے سے ذرا پرے، ایک پہاڑی سے اسے امڈتا ہوا آتا دیکھ رہے تھے۔

یہاں سے مجھے اس پہاڑ کی بلندی کا اندازہ ہوا۔ وہ ملغوبہ پہاڑ کی بلندی سے زمین کی جانب ہر چیز روندتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا جو ایک پتلی لکیر کی صورت نظر آ رہا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ شور سے بیال کیمپ تک کی ہر چیز دہل رہی تھی۔ اس پہاڑ کے دامن میں بیال ندی کسی دریا کے پاٹ کی صورت ایک بڑی چوڑائی میں بہہ رہی تھی۔ اس ندی تک آتے آتے، اس ملغوبہ کو آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس سے مجھے نانگا پربت کی بلندی کا اندازہ ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ پتھر اور سنگریزے ایک گارے کی صورت بیال ندی میں یلغار کرتے، اس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ندی کی سطح بلند ہوتی چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے کے مترنم، رم جھم کرتے شفاف پانی اب گدلے ہو کر بہہ رہے تھے۔ ندی میں زور کا سیلاب آ گیا تھا اور پانی کناروں سے باہر آنے لگا تھا۔

کچھ دیر میں سلائیڈنگ کا یہ شور تھما اور ہم دوبارہ بیال کیمپ کی گھاس پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر پہلے والی قیامت صغریٰ کو بھول کر میں نے نانگا پربت کو دیکھا۔ وہاں وہی ٹھہراؤ تھا۔ بادل ڈھلوانوں سے لپٹتے اوپر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہیں سے میں نے نوید اور مرزا کو دیکھا۔ وہ ایک پتلی سی پگڈنڈی پر چلے آ رہے تھے۔ پس منظر میں گلیشیر اور برف تھی، نانگا پربت کی بلندی تھی۔ اس پس منظر میں ان کی حیثیت بے معنی نظر آ رہی تھی، جیسے کسی بلند چٹان پر رینگتی دو چیونٹیاں۔ ان کی چال اور رفتار سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت تھکے اور نڈھال ہیں۔

کچھ دیر بعد جب وہ قریب آئے تو ان کے چہروں پر خوف تھا۔ نوید کے چہرے پر مدھم پڑتے سورج کی روشنی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "بہت اچھا کیا، جو نہیں گئے۔ بہت خطرناک راستہ ہے۔ ایک فٹ کی پگڈنڈی ہے اس پر چلتے ہوئے جس نے نہیں پھسلنا، وہ بھی پھسلتا ہے۔"

شاہ جی کسی فاتح کے انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ جو خطرہ ہم نے دیکھا ہے، اس کے

سامنے یہ کیا معنی رکھتا ہے۔ شاہ جی اب اپنے طور پر ایک مستند مہم جو بن چکے تھے۔ بعد میں وہ تھامس کو سب کچھ بتانے کی کوشش کرتے رہے اور تھامس سر ہلا ہلا کر یہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

☆☆☆

تھامس اور مرسلین ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ ہمیں اندھیرا اترنے سے پہلے فیری میڈو پہنچنا تھا۔ آتے وقت ہمارے ساتھ مرسلین تھا اور ہمیں کسی خطرے کا ڈر نہ تھا۔ جاتے وقت اندھیرا اتر رہا تھا اور ہمیں پھر کھو جانے کا ڈر تھا۔ جب فیری میڈو پہنچے تو ہماری ٹارچیں روشن تھیں۔ ہم اسی موت کے جنگل سے گزر کر آئے تھے، جہاں کل رات کھو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد شاہ جی نے کیمپ فائر والی جگہ پر آگ جلا کر اس پر دیگچا چڑھا لیا تھا۔ دیگچے کے نیچے، فیری میڈو کے جنگل سے اکٹھی کی گئیں لکڑیاں شرارے چھوڑتیں بھڑک رہی تھیں۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور کیمپنگ فائر والی جگہ پر رونق لگی تھی۔ ہمارے اور نوید مرزا کے گروپ کے علاوہ تھامس اور بہت سے مقامی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہلکی خنکی میں آگ سینکتے اور شعلوں کو لپکتا دیکھ رہے تھے۔ شاہ جی نے اتنے سارے لوگ اپنے اردگرد دیکھے تو بہت معتبر ہو گئے۔ چہرے پر سنجیدگی چڑھا لی، ایک متانت کے ساتھ سب کو کام پر لگا رہے تھے۔ پہلے تھامس نے اپنی ہیڈ لائٹ ان کے ماتھے پر چڑھا دی۔ اشفاق اور شاہد، جنگل سے لکڑیاں لائے تھے۔ نوید پیاز چھیل کر فارغ ہو چکا تھا۔ تھامس ٹماٹر کاٹ رہا تھا۔ شاہ جی ڈیرہ اسماعیل خان کا مشہور مرغ پلاؤ بنا رہے تھے۔ شاہد فیری میڈو کے گاؤں سے مرغیاں لے آیا تھا۔ میں اور رحمت نبی بڑی دلچسپی سے اپنا ڈنر تیار ہوتا دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی ٹیپ ریکارڈر پر حضرت سلطان باہو کا کلام، اقبال بانو کی آواز میں لگا لیا تھا۔ دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیا جانے ہو۔ رحمت نبی سر دھنتا تھا، مرزا کو حال پڑ رہے تھے، شاہ جی شلوار کے پائنچے چڑھائے دیگچے میں جھانکتے تھے۔ ایک موج میلا تھا یا کوئی شادمانی کی لہر تھی، جس پر سب تیر رہے تھے۔ اسی لمحے نانگا پربت پر کوئی ایک سایہ سا ابھر آیا ہمیں محسوس ہوا کہ کوئی چیز یہاں کہیں موجود ہے جو اس ماحول پر حاوی ہے۔ جس کو دیکھنے یہ سب دیوانے اتنے ناہموار راستوں سے گزر کر اس کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔

ایک شام تھی ٹھنڈک میں تنہائی جس کے خنک پو سے ہمیں بیدار رکھے ہوئے تھے، ورنہ ہم تو کب کے مدہوش ہو چکے ہوتے۔ اس خنکی کو آگ کے شعلے مدھم رکھے ہوئے تھے۔ ایک زندگی کا لمحہ تھا جو گھنٹوں طویل ہو گیا تھا۔ یا بہت سے لمحوں نے مل کر کوئی اسٹیج لگا رکھا تھا۔ یہ لمحہ کبھی بکھر کر قہقہوں میں بدل جاتا اور کبھی سمٹ کر دل میں آ بیٹھتا۔ مجھے اس کے بکھرنے کا کوئی خوف نہ تھا، کیونکہ وہ سمٹ کر میرے دل میں آ بیٹھتا۔ پھر وہ لمحہ ایک رت میں بدلا اور وہ رت ہی بدل گئی مگر ہمیشہ کے لیے اس دل میں ٹھہر گئی۔ اب بھی اس کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ وطن سے دور اپنے وطن کے صحرا، دریا، کھلیان، پہاڑ، جھیلیں، پیارے اور پیاروں سے بھی پیارے لوگ یاد آ رہے تھے۔ سمجھتا ہوں، بہت کچھ بدل گیا مگر میرے وطن کی زمین تو نہیں بدلی۔ اس پر تنا آسمان تو وہی ہے۔ تارے ویسے ہی ہیں جیسے پہلے دکھتے تھے۔ چاند ویسے ہی چمکتا ہے، جیسے پہلے چمکتا تھا۔ میرے شہر ڈیرہ کے ساتھ بہتے سندھ کے چوڑے پاٹ پر سورج ویسے ہی کرنیں بکھیرتا طلوع ہوتا ہے، جیسے پہلے طلوع ہوتا تھا۔

رات کھانے کے بعد بہت دیر تک میں، رحمت نبی اور شاہ جی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ راجو خان ہمارے لیے کافی بنا لایا تھا۔ ہم گرم کپ تھامے اس کی چسکیاں لیتے اور رحمت نبی کی داستانیں سن رہے تھے، جو ان پہاڑوں سے متعلق تھیں۔ خیموں والے بے سدھ سو رہے تھے اور ہم دبی دبی ہنسی ہنستے تا کہ کوئی بے آرام نہ ہو۔

رات اپنے خیمے میں گہری نیند سویا ہی تھا کہ محسوس ہوا کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ میں غنودگی میں کوئی آواز سن رہا تھا، جو میرا نام لیتی تھی، کسی اجنبی لہجے میں۔ تھوڑا سے دماغ بیدار ہوا تو ایسا لگا کہ تھامس ہے، جو مجھے جگا رہا ہے۔ پھر آنکھیں مل کر دیکھا وہ واقعی تھامس تھا۔ کچھ کہہ رہا تھا مگر میری سماعت صرف نانگا پربت سمجھ سکتی تھی۔ پھر وہ بولا۔

”باہر آؤ، پر جیکٹ ضرور پہننا۔“

میں باہر آیا تو صبح کا تارہ چمک رہا تھا۔ چاروں جانب تاروں کی روشنی پھیلی تھی۔ خیموں کے مکین نیند کی غفلت میں تھے۔ جنگل خاموش تھے، گلیشیر اپنی ازلی اداسی میں لپٹا تھا اور نانگا پربت کی برفانی دیوار تھی، اس پر تیرتے بادل اور اس کی چوٹیاں سنہری ہو رہی تھیں۔ ان چوٹیوں کے پیچھے سے سورج کی کرنیں جھانک رہی تھیں۔ ٹھنڈ سے بدن دوہرا ہوا جاتا تھا۔ تھامس کھڑا نانگا پربت کو دیکھ

رہا تھا۔ ایک تنہائی اور خلوت میں نانگا پربت کا یہ نظارہ پچھلے سب لمحات پر بھاری تھا۔ ہم نے آپس میں زیادہ بات نہ کی۔ میں نے اپنا کیمرا لیا اور کیمپنگ کے پیچھے والی پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ وہاں اور زیادہ مکمل تنہائی تھی۔ پہاڑی پر اونچے درخت تھے اور کچھ تنے زمین پر گرے پڑے تھے۔ میں وہیں کہیں بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں نانگا پربت پر تھیں۔ برف سے اٹھتی ہوائیں بلا روک ٹوک مجھ تک آرہی تھیں۔ اس وقت میں تھا، ہوائیں تھیں، آسمان تھا اور آسمان تک پھیلی نانگا پربت کی چوٹیاں تھیں۔ کیمرا کلک کلک کرتا چلا گیا۔

میں اس وقت پہاڑی سے نیچے اترا، جب خیموں والے ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ میں اپنے خیمے میں جا کر پھر لیٹ گیا۔ شاہ جی اٹھ کر اپنا تولیہ اور برش، پیسٹ لیے باہر جارہے تھے۔ پوچھا نہیں کہ میں کہاں سے آرہا ہوں۔ صرف سر ہلا کر مسکرا رہے تھے۔ یقیناً وہ ''مار دے'' کا نعرہ لگا کر آئے تھے۔ میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور پھر سے نیند میں چلا گیا۔

دوبارہ بیدار ہوا تو خیمے کے پردے دھوپ میں سفید ہورہے تھے۔ باہر نکلا تو دیکھا کئی ٹورسٹ جارہے ہیں۔ یہاں ہر کوئی واپس جانے کے لیے آتا ہے۔ جگہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو پر جانا تو پڑتا ہے۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، یہاں آپ رک نہیں سکتے۔ ان مقامات کی کشش چند دن کی ہوتی ہے۔ لطف اور راحت یہی ہے کہ آپ کچھ دن، زندگی کی پریشانیوں اور جھمیلوں سے دور ہو کر، یہاں کی آب و ہوا میں رچ بس کر چند یادگار لمحات گزاریں اور پھر ان یادوں کو ایک پوٹلی میں باندھ کر واپس چلے جائیں اور جب ضرورت پڑے تو تنہائی میں وہ پوٹلی کھول کر اپنی یادوں پر اپنے احساسات کا کچھ چھڑکاؤ کر لیا کریں۔ آج بھی دیکھا کہ کچھ سیاح اپنے رک سیک باندھے اپنے پورٹر لیے واپس جارہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ شام سے پہلے یہ جگہ دوسرے سیاحوں سے دوبارہ بھر جائے گی۔

اب ہم ایک ٹیم نہ رہے تھے۔ تھامس کی تنہا اور مرزا کی ٹیم مل کر ہم ایک بڑی ٹیم بن چکے تھے اور یہ بڑی ٹیم کیمپ فائر والی جگہ پر چولہا جلائے اپنا ناشتا تیار کر رہی تھی۔ شاہ جی نے اپنے آپ کو کک کا درجہ دے کر چولہا سنبھال لیا تھا۔ نانگا پربت سے ہمیشہ کی طرح پیٹھ موڑے، وہ انڈے فرائی کر رہے تھے۔ ساتھ میں آلو، انڈے بھی تیار کر رہے تھے۔ پراٹھے انہوں نے تیار کر لیے تھے۔ ساری ٹیم ان کے گرد گھیرا ڈالے، عدیدوں کی طرح بیٹھی، شاہ جی کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور شاہ جی نے متانت کا وہ خول جو کل رات پلاؤ بناتے چڑھایا ہوا تھا، اسے پھر سے کس کر چڑھا لیا تھا۔ کسی کو کسی چیز پر ہاتھ کیا کوئی میلی نظر بھی نہیں ڈالنے دے رہے تھے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ جب سب کچھ بن جائے، پھر ایک دسترخوان لگا کر، سب بیٹھ کر اکٹھے ناشتا کریں۔ یہ فلسفہ سب کی سمجھ میں آچکا تھا مگر تھامس کنفیوژ تھا کہ سب کو اکٹھے، مل کر اور ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے میں شاہ جی کو کیا ملے گا اور سب لوگ ایسا کریں کیوں؟

میں تھامس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بتا رہا تھا کہ یہ یہاں کی مسٹری ہے اور وہ اس پر زیادہ غور نہ کرے، بلکہ اس پر زیادہ توجہ دے، جس کے لیے وہ اتنی دور سے آیا ہے۔ میں بھی جان بوجھ کر شاہ جی کی اس خواہش کو ایک مسٹری بنا کر اسے امپریس کر رہا تھا۔

شاہ جی نے دسترخوان لگا لیا اور سب میرے سمیت ناشتے پر ٹوٹ پڑے اور شاہ جی خالی پلیٹ لیے، اس دسترخوان کے گرد بھاگتے رہے کہ وہ اپنا حصہ تلاش کر لیں مگر کامیابی ان کو کم نصیب ہوئی، کیونکہ اب کوئی بھی شاہ جی کو قریب نہیں پھٹکنے دے رہا تھا۔ رحمت نبی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، جب شاہ جی بے بسی سے سب کو ناشتا کرتے دیکھ رہے تھے اور ان کی اپنی پلیٹ میں پراٹھے کے چند نوالے تھے، وہ بھی انہیں تھامس نے کہیں سے جدا کر دیے تھے۔

ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ کوئی بولا۔ ''آج کا کیا پروگرام ہے۔''

کسی کونے سے جواب آیا۔ ''اب آج کے دن ہر کوئی آزاد ہے۔ جہاں چاہے جاسکتا ہے۔''

یہ سن کر سب خوش ہوئے۔ دھوپ پھیلی پڑ چکی تھی۔ وہ سب رنگ ڈھل چکے تھے، جن کو میں نے صبح کو دیکھا تھا۔ کچھ دیر میں ٹیم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اپنے اپنے گروپ بنا کر وہ گھاس پر لیٹے خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔

میں نے سب سے نظریں بچا کر کیمپنگ کے پیچھے والی پہاڑی کی راہ لی۔ ایک تو وہاں سایہ تھا اور میرے مطلب کی تنہائی اور خاموشی تھی۔ نانگا پربت میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں گرے تنوں کے سہارے نیم دراز، خنک ہوا میں سانس لیتا اور دھوپ چھاؤں کا کھیل دیکھتا رہا تھا۔ میری نگاہیں، پائن کے درختوں کے اوپر برڈ بلیو آسمان پر تھیں۔ کبھی آنکھیں بند کر لیتا اور کبھی نانگا پربت اور اس کے

آگے پیچھے نظاروں کو دیکھتا رہا۔اب فیری میڈو اور وہاں سے نانگا پربت کا حسن آشکارہ ہو رہا تھا۔منظر کھل رہے تھے اور دل و دماغ میں اترتے جا رہے تھے۔نانگا پربت پر بادل چھا رہے تھے اور کچھ دیر پہلے جہاں چٹانیں نظر آ رہی تھیں اب وہاں برف کا تازہ سنوف تھا۔ایک دھوئیں کی صورت بادلوں نے حلقے بنا رکھے تھے اور وہ نانگا پربت کے دامن سے چمٹ رہے تھے۔

رحمت نبی پیچھے کیمپنگ سائٹ میں کچھ خیموں کی جگہ تبدیل کروا رہا تھا، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ دو دن بعد اگر خیمے کی جگہ تبدیل نہ کی جائے تو خیمے کے نیچے گھاس دب جاتی ہے۔

کل ہمیں واپس جانا تھا۔ہمارا یہ ٹرپ اپنے اختتام کے قریب تھا۔گھر سے نکلے بہت دن ہو گئے تھے۔میری تین سالہ بیٹی قندیل مجھے یاد آ رہی تھی۔ان دنوں موبائل فون اور انٹرنیٹ کی وبا نہیں پھیلی تھی۔رابطے آسان نہیں تھے کہ انہیں فون کر کے بات کر لیتا۔موبائل اور انٹرنیٹ کی وبا تین سال بعد اچانک ایک صحرائی آندھی کی طرح آئی اور چھا گئی۔کچھ اس سے بہتر بھی ہوا مگر اس بہتری کے لیے ہم بہت کچھ کھوا بیٹھے ہیں۔اس کا احساس اس نسل کو اب نہیں ہو گا۔شاید بعد میں بھی نہ ہو۔

دن ڈھلنے کا احساس تک نہ ہوا۔میں کئی بار پہاڑی سے نیچے اترا مگر میرا ٹھکانا وہیں رہا۔شام سے پہلے میں اور شاہ جی فیری میڈو سے باہر نکلے۔چراہ گاہ عبور کر کے ہم جنگل میں جا نکلے، جہاں اندھیرا ہو رہا تھا۔چراہ گاہ میں دھوپ زرد تھی اور جنگل میں گھنے درختوں کی شاخیں سورج کی کرنوں کو زمین پر نہیں پڑنے دیتی تھیں، جہاں جابجا قدیم تنے بکھرے پڑے تھے۔پتے تھے جنہوں نے ساری زمین ڈھانپ لی تھی اور چرمر کرتی، ٹہنیاں اکڑی پڑی تھیں۔ ایک طلسم کدہ تھا، جو ہر بار ایک نئے روپ میں دکھتا تھا۔

جب آپ کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں تو یہی درخت آپ کے ساتھی بن جاتے ہیں۔آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔کسی جنگل میں درختوں سے مجھے ہمیشہ لہریں سی نکلتی محسوس ہوتی ہیں، جو بدن میں پڑی دکھ کی سلوٹوں کو نرمی سے دور کر دیتی ہیں۔ہوا جب ٹہنیوں اور پتوں سے ٹکراتی ہے تو کچھ مخصوص آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔یہ درختوں کی دعائیں ہوتی ہیں، ان کے لیے جو ان سے ملنے آتے ہیں۔یہ شجر بولتے ہیں۔اپنی سناتے ہیں اور آپ کی سنتے ہیں۔جنگل میں جنگل کی بولی چلتی ہے، جو میں سن تو سکتا ہوں، پر بول نہیں سکتا۔اسی لیے ہم دونوں خاموش تھے۔

میں جب امریکا آیا تو میری ایک جاب پر میرا باس پیٹر تھا۔ایک بار وہ تین دن کے لیے بھائی کو اپنی موٹر پر چھوڑنے لوزیانا گیا۔واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ یہ بارہ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے تم ایک دن پہنچے، دوسرا دن وہیں گزارا اور تیسرے دن واپس گھر آ گئے۔میں حیران تھا کہ اتنے لمبے سفر کے بعد میں تو دو دن تھکاوٹ اتارتا۔کہنے لگا، جو ایک دن تھا وہ ہم نے بھائی کے گھر کے پیچھے درختوں کے جھنڈ کے بیچ کرسیوں پر بیٹھے گزارا۔خاموش تھے کافی پی رہے تھے اور درختوں کی باتیں سن رہے تھے۔

ہم جنگل سے کسی اور طرف نکلے ایک ندی کے پار پل سے اترے تو سامنے ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔اس میں نانگا پربت کسی نیلاہٹ میں کھلی آئینہ کی مانند نظر آتا تھا۔شیشوں کی طرح کے پانی تھے۔پس منظر میں وہی جنگل تھا اور خاموشی پورے ماحول میں تیرتی پھرتی تھی۔شام کے رنگ بکھرے تھے۔کچھ دور نکلے تو ایک گاؤں سا تھا۔سرسبز کھیت تھے جن میں چھوٹی نالیوں میں پانی بہتے چکر رہے تھے۔میں انہی پانیوں کی مانند انہی سبزہ زاروں میں اپنی موج میں پھرتا رہا۔ایک ندی میں نانگا پربت کی چوٹی جھل مل کر رہی تھی۔میں کنارے بیٹھا گاؤں کے بچوں سے باتیں کرتا تھا اور نانگا پربت کا جھل مل کرتا عکس ندی کے پانیوں میں زیادہ شفاف دکھائی دیتا تھا۔ساتھ ایک جھونپڑا تھا، جہاں سے اٹھتا دھواں اترتی شام کی تنہائی میں گھل مل جاتا تھا۔معلوم نہیں ان جھونپڑے والوں کے کیا مسائل ہوں گے مگر مجھے وہ دنیا کی پرائم لوکیشن پر نظر آ رہا تھا۔مجھے ان مناظر کے کھو جانے کا غم تھا۔پڑھنے والوں کو شاید یقین نہ آئے مگر اس شام آنسوؤں کے چند قطرے میری آنکھوں میں بھر آئے تھے۔کل اس وقت میں یہاں نہیں ہوں گا اور یہ سب ادھر ہی رہ جائے گا۔کاش میں کوئی فلسفی ہوتا یا شاعر یا کوئی پینٹر ہوتا جو ہمیشہ کے لیے ان لمحات کو اپنے کینوس پر یا کاغذ پر صحیح معنوں میں اتار لیتا۔

واپس کیمپنگ میں آئے تو شام تیزی سے چراہ گاہ میں اتر رہی تھی۔راجیو کے کچن سے کچھ کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔آج رات ایک اداسی اور خوشی دونوں بدن میں ایک ساتھ دوڑ رہی تھیں۔اداسی ان مناظر کے کھو جانے کی تھی اور خوشی اپنوں سے ملنے کی تھی۔سب خاموش تھے۔تھامس کو خوراک کا ایک ذخیرہ دے دیا گیا جو میں لاد کر یہاں لے آیا

تھا۔ وہ سب کچھ پا کر حیران اور پریشان بیٹھا تھا۔ ہم بھی تو ایک ہفتے کا راشن لاد کر لے آئے تھے۔

صبح اٹھے اور ہمارا سامان جلد ہی پیک ہو گیا۔ الوداعی نظر نانگا پربت پر ڈالی اور گاؤں والے راستے سے لڑھکتے ہوئے دو گھنٹے میں تاتو پہنچ چکے تھے۔ وہ عقاب جو نانگا پربت پر اڑان بھرنے گیا تھا، لوٹ رہا تھا یہاں ایک کیبن اسٹور تھا۔ وہاں رکے اور پانی کی بوتلیں بھر لیں۔ جس راستے سے ہم جیپ پر آئے تھے، اب وہ ہم نے پیدل طے کرنا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ راستے میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے اور سنگلاخ چٹانیں بھاپ اگلتی ہیں۔ تاتو میں ہم کھڑے تھے تو مقامی لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ کئی ایک ملیریا بخار سے تپ رہے تھے اور نہ کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ دوا دارو۔ میں نے اپنا کلینک وہاں لگایا اور تمام میڈیسن ان میں بانٹ دیں۔

ہم تاتو سے نکلے تو سورج سوا نیزے پر تھا۔ خشک چٹانوں سے، زمین سے اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ ہم نے جہنم کا راستہ چن لیا تھا۔ پتھریلے، بنجر اور ویران راستے کے ہم سفر تھے، ایک صحرا تھا، جس میں ہم نے اپنے قدم رکھ لیے تھے۔ گرم لو کے تھپیڑے ہمارے منہ جھلساتے تھے۔ سر سے پاؤں تک ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ ہم چلتے تھے پھر رک سیک اتار کر آرام کرتے۔ تاتو نالہ کسی اندھی کھائی میں بہتا تھا۔ ہم پھر چل پڑتے پھر ہانپنے لگتے۔ مرزا کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی تھی اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ پورے راستے میں صرف ایک جیپ جاتی ہوئی ملی۔ ہم نے اس کی بہت منت کی کہ مرزا کو تیچے شاہراہ ریشم تک لے جائے مگر صاف انکار سن کر ہم بہت مایوس ہوئے۔ ہم نے جیپ والے کو تاتو میں انکار کر دیا تھا کہ ہم پیدل ہی راے کوٹ جائیں گے۔ یہ شاید اسی کی بددعا تھی کہ راستہ عذاب جاں بن گیا تھا۔

ہم ایک موڑ مڑتے تو دوسرا سامنے ہوتا۔ وہ لمبے عرصے تک چلتا اور جب اس کی دوسری جانب آتے تو پھر کوئی نیا موڑ۔ ہمارا پانی کا ذخیرہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ بوتلوں میں بند پانی بھی اب کھولنے والا تھا۔ ہمیں چلتے چلتے پانچ گھنٹے ہو گئے تھے اور دریائے سندھ یا شاہراہ ریشم کا فیتہ نظر نہ آتا تھا۔ شاہ جی بار بار پوچھتے کہ ہم بھٹک تو نہیں گئے؟ اب ہمیں کوئی پرواہ نہ تھی کہ ہم صحیح راستے پر چلتے ہیں یا بھٹک چکے ہیں۔ ہماری سوچیں خیالات سب اس ہولناک راستے نے چھین لیے تھے۔ ہم خالی دماغ لیے چلے جاتے تھے۔ پھر ایک موڑ آیا، جب شام اتر رہی تھی۔ دور بہت دور شاہراہ ریشم کا فیتہ پہاڑوں سے لپٹا دکھائی دیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی کسی خوشی اور مسرت کا اظہار نہ کیا، کیونکہ اب ہمارے احساسات بھی مر چکے تھے۔ بدن شل تھے، ٹانگیں مردہ، جسم لاغر اور مجروح تھے۔ سڑک تک پہنچتے پہنچتے ہمیں ڈیڑھ گھنٹا اور لگ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ گیراج بند تھا، جہاں سے ہم نے جیپ لی تھی۔ سڑک کے پار وہ اسٹور نظر آیا، جہاں سے ہم نے سامان خریدا تھا۔ وہاں پانی کا ایک گمزار کھاسب کو نظر آ گیا۔ ہم سب اس کی طرف ایک ساتھ لپکے۔ پچھلے آٹھ گھنٹے سے ہم ایک کچے اور بکھرے راستے پر چل رہے تھے اور جیسے ہی سب کے قدم شاہراہ ریشم کی تارکول والی سڑک پر ایک ساتھ پڑے سخت زمین کا ایک جھٹکا ہمارے دماغ تک ہلا گیا۔ وہ مٹکا چند لمحوں میں خالی ہو گیا تھا اور اب ہم سڑک کنارے لیٹے کسی جیپ کا انتظار کر رہے تھے جو ہمیں گلگت پہنچا دے ...... اور شاہ جی اسی ویران، تاریک پڑتے راستے کو آسمانوں میں کہیں کھو جاتے دیکھتے رہے تھے کہ ان کی زبان سے نکلا۔ ”مار دوے۔“

ہم نے ادھر ادھر دیکھا مگر ایسا کچھ نظر نہ آیا جسے دیکھ کر شاہ جی خوش ہوا ٹھے تھے۔ جنت نظیر مناظر اب تک ذہن پر ثبت تھے۔ نانگا پربت اور فیری میڈو کا حسن نگاہوں میں تھا اس کے مقابلے میں یہ اجاڑ بیابان، سنگلاخ پہاڑی راستے پر ایسا کیا نظر آ گیا اسی نکتے کی تلاش میں سب کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ تبھی دور سے آتی ایک کھٹارا جیپ نظر آئی جو دور تھی۔ اتنی دور جیسے افق کے پار۔

کو کہ جیپ ابھی بہت اونچائی پر تھی۔ یہاں تک آنے میں اسے کافی وقت لگتا پھر بھی واپسی کی سبیل تو تھی۔

”جانتے ہو۔“ شاہ جی نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ ”جب میرے بچے بڑے ہوں گے ان کے بچوں کو سامنے بٹھا کر میں کہوں گا۔ میں نے نانگا پربت دیکھا تھا۔

”اور ڈر سے کانپ گیا تھا۔“ کسی نے لقمہ دیا گو کہ آواز دھیمی تھی پھر بھی شاہ جی تک پہنچ گئی۔ وہ جھٹکے سے اٹھے۔ ہم نے سمجھا کسی کی شامت آئی مگر وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”ہم نے معاف کیا۔ اب ڈیرا پہنچ کر دعاوتی کا انتظام کروں گا۔ تم بھی آنا۔“ ان کا اشارہ مرسلین اور شاہد کی جانب تھا پھر وہ سامان سمیٹنے میں لگ گئے تاکہ جیپ میں سوار ہوتے وقت دقت نہ ہو۔

منظر امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا آٹھواں حصہ

تاریخ کا یہ سفر پانچ سو سال عیسوی میں داخل ہو چکا ہے۔ قارئین بھی سمجھ چکے ہوں گے کہ ہم اب اختتام کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں تو آیئے دیکھتے ہیں۔ 500 عیسوی سے 599 عیسوی تک کے اہم واقعات کیا کیا ہیں۔

اس صدی میں ضابطہ اخلاق وضع کیا گیا اور سوئی وین تی نے ازسرنو چین کو متحد کیا اور برصغیر کی صورت حال کچھ یوں تھی کہ 528 عیسوی میں راجا نرسم ہا گپتا اور پنجاب کے ایک بہادر سردار یسودھرمن نے جنگ کر کے ان کے بادشاہ کو

پنجاب سے نکال دیا۔
شوئی وین تی (541 عیسوی سے 604 عیسوی تک)
چینی شہنشاہ سوئی وین تی سینکڑوں برسوں سے تقسیم شدہ چین کو پھر سے متحد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ سیاسی یک جہتی جو اس نے قائم کی صدیوں تک باقی رہی جس کے نتیجے میں چین دنیا کے انتہائی طاقت ور ترین ممالک میں شمار ہونے لگا۔
سوئی وین تی سے پہلے کی صورت حال کچھ یوں تھی کہ ایک قدیم شہنشاہ شی ہوانگ تی نے تیسری صدی قبل مسیح میں چین کو متحد کیا تھا۔ اس کے خاندان 'چین' کو اس کی موت کے بعد تباہ کر دیا گیا۔
اس کے بعد ہان خاندان اقتدار میں آیا اس نے چین پر 206 قبل مسیح سے 220 عیسوی تک حکمرانی کی۔ "ہان" خاندان کے زوال کے بعد چین ایک طویل عرصے تک داخلی انتشار کا شکار رہا۔
سوئی وین تی کا اصل نام یانگ چین تھا۔
یانگ چین شمالی چین کے طاقت ور ترین خاندانوں میں سے ایک خاندان میں 541 عیسوی میں پیدا ہوا۔ چودہ برس کی عمر میں اس کی اولین فوجی تقرری ہوئی تھی۔
یانگ چین ایک قابل انسان تھا۔ اس نے اپنی ذہنی اور عسکری صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے 589 عیسوی میں پورے چین کی شہنشاہیت حاصل کر لی۔ اس نے بے شمار اصلاحات کیں۔
اس کی ایک اہم اصلاح سرکاری اہل کاروں کے انتخاب کے لیے امتحانات کا اجرا تھا۔ کئی صدیوں تک اس نظام نے چین کے ہر گوشے اور ہر طبقے سے ہونہار اور قابل لوگوں کو سرکاری ملازمتیں دے کر حکومت کو بہترین انتظامیہ دیا۔
اس کا ایک قدم یہ تھا کہ کوئی بھی گورنر اس صوبے میں تعینات نہیں ہو سکتا جہاں وہ پیدا ہوا ہے۔ یہ قدم اقربا پروری کو روکنے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔
اس شہنشاہ کا انتقال تریسٹھ برس کی عمر میں ہو گیا۔
خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے دوسرے بیٹے نے اسے زہر دے دیا تھا۔
اور اب 501 سے 599 تک کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔
آپ نے اس صدی اور گزشتہ صدیوں میں بھی عربوں کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا ہو گا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جزیرہ نما عرب اس زمانے میں دنیا کی اقوام کی کسی گنتی میں نہیں آتا تھا۔ سوائے قبائل کی جنگوں اور بت پرستی اور جاہلانہ عبادات اور رسومات کے وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔
وہاں ایک گہرا سناٹا تھا۔ یہ سناٹا معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی تھا۔ ایسا سناٹا جو کسی بڑے طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔
اور اس صدی یعنی 501 سے 594 عیسوی میں عرب میں اس ہستی کا ظہور ہونے والا تھا جس نے نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیا کی کایا پلٹ دی۔
اور یہ ہستی تھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔
آپ کی پیدائش 570 عیسوی میں ہوئی تھی۔
مائیکل ہارٹ نامی تاریخ دان لکھتا ہے "آپ نے عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا اور دنیا کے عظیم مذاہب سے ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور اسے پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ وہ ایک انتہائی موثر سیاسی رہنما بھی ثابت ہوئے۔ آج اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کے اثرات انسانوں پر گہرے سے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔"
یہ دنیا بڑے کرداروں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے انسانوں کی فکری اور ذہنی تربیت کی لیکن ننانوے فیصد لوگ ایسے ہیں جنہوں نے پہلے سے تربیت یافتہ اور تہذیب یافتہ ماحول میں جنم لیا جیسے ایتھنز، روم، مگدھ، چین وغیرہ۔
لیکن صرف آپ کی شخصیت ایسی ہے جس نے انتہائی نامہذب اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کے درمیان آنکھیں کھولیں اور ان ہی غیر مہذب لوگوں کو سدھار کر پوری دنیا کو حیران کر دیا۔
میں اس مضمون میں آپ کے حوالے سے زیادہ اس لیے تحریر نہیں کر رہا کہ آپ میں سے ہر شخص آپ کی سیرت مبارکہ سے اچھی طرح واقف ہے۔
ہم 501 عیسوی سے 599 عیسوی تک آ چکے ہیں اور اب تاریخ کے اس دور میں ہیں جو 600 سے شروع ہو کر 699 عیسوی تک ختم ہوتا ہے۔ یہ صدی بھی واقعات اور کرداروں سے بھری ہوئی ہے لیکن ہم صرف ان ہی واقعات اور کرداروں کا تذکرہ کر رہے ہیں جنہوں نے تاریخ عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

تاریخ کے اس حصے کا سب سے بڑا واقعہ تو یہی ہے کہ آنحضرتؐ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

ہم یہاں اسلامی تاریخ کے حوالے سے 600 عیسوی سے لے کر 699 عیسوی تک کے حالات مختصراً درج کر رہے ہیں تا کہ آپ ایک نگاہ میں ان کا جائزہ لے سکیں۔

یہ تحقیق مشہور مؤرخ کیرم آرم اسٹرنگ کی ہے اور کتاب کا نام ہے "مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال"

610 عیسوی۔ آپؐ پر پہلی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے دو برس بعد آپؐ تبلیغ کا آغاز کرتے ہیں۔

616 عیسوی۔ آپؐ کے پیروکاروں اور مکہ کے سرداروں کے درمیان تعلقات شکست و ریخت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ظلم و ستم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

620 عیسوی۔ یثرب (مدینہ) کے لوگوں نے آپؐ سے رابطہ کیا اور رہنمائی کرنے کی دعوت دی۔

622 عیسوی۔ کوئی ستر کے لگ بھگ مسلمان خاندانوں کے ہمراہ رسولؐ مکہ سے مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں اور مکہ کے سردار ان سے انتقام لینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہجرت سے سن ہجری کا آغاز ہوتا ہے۔

624 عیسوی۔ مسلمان جنگ بدر میں مکہ والوں کو ایک عبرتناک شکست سے دوچار کرتے ہیں۔

625 عیسوی۔ مسلمانوں کو مدینہ کے باہر احد کی جنگ میں مکہ والوں کی فوج کے ہاتھوں شکست ہو جاتی ہے۔

یہودی قبیلوں بنو قینقاع اور بنو نضیر کو مکہ والوں سے ساز باز کرنے پر مدینہ سے نکال دیا جاتا ہے۔

627 عیسوی۔ مسلمان جنگ خندق میں مکہ والوں کو شکست دیتے ہیں۔

628 عیسوی۔ آپؐ کی طرف سے امن کے لیے جرأت مندانہ پہل کے نتیجے میں مکہ اور مدینہ کے مابین معاہدۂ حدیبیہ عمل میں آتا ہے۔ اب انہیں عرب کے سب سے زیادہ طاقت ور انسان کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے اور بہت سے عرب قبائل آپؐ کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔

630 عیسوی۔ مکہ والے معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیتے ہیں۔ آپؐ مسلمانوں اور اتحادی قبائل کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں۔

مکہ اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے اور آپؐ کے لیے رضا کارانہ طور پر پھاٹک کھول دیئے جاتے ہیں۔ آپؐ بغیر خون بہائے اور بغیر کسی کو جبری مسلمان بنائے شہر حاصل کر لیتے ہیں۔

632 عیسوی۔ آپؐ کا وصال ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے۔

632 عیسوی سے 634 عیسوی۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو نہ ماننے والوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی ہیں۔ مرتد قبیلوں سے بھی جنگیں ہوتی ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ بغاوت پہ قابو پانے اور عرب کے سارے قبیلوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

634 عیسوی سے 644 عیسوی۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت قائم ہوتی ہے۔ مسلم فوج، عراق اور مصر پر حملہ کرتی ہیں۔

636 عیسوی۔ مسلمان یروشلم کو فتح کر لیتے ہیں جو اسلامی دنیا میں مکہ اور مدینہ کے بعد تیسرا مقدس ترین شہر مانا جاتا ہے۔

641 عیسوی۔ مسلمان شام، فلسطین اور مصر کو فتح کر لیتے ہیں۔ وہ سلطنت فارس کو شکست دے چکے ہیں۔

مسلمان فوجیوں کے رہنے کے لیے کوفہ، بصرہ اور فسطاط میں فوجی قصبے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ مسلمان فوجی مفتوحہ آبادی سے الگ رہتے ہیں (فوجی چھاؤنیوں کا تصور)۔

644 عیسوی۔ حضرت عمرؓ کو فارس کا ایک جنگی قیدی شہید کر دیتا ہے۔

حضرت عثمانؓ ابن عفان کو تیسرا خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے۔

644 عیسوی سے 650 عیسوی۔ مسلمان قبرص اور شمالی افریقہ میں تریپولی کو فتح کر لیتے ہیں اور ایران، افغانستان اور سندھ میں اسلامی حکومت قائم کرتے ہیں۔

656 عیسوی۔ کچھ لوگ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے۔

656 سے 660 عیسوی۔ پہلا فتنہ خانہ جنگی چھڑ جاتی ہے۔

656 عیسوی جنگِ جمل۔ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے تناظر میں حضرت علیؓ کے خلاف ایک لشکر کی قیادت کرتے ہیں مگر حضرت علیؓ کے ساتھی انہیں شکست دے دیتے ہیں۔

شام میں حضرت عثمانؓ کے رشتے دار حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ اختلاف کرنے والوں کی قیادت کرتے ہیں۔

657 عیسوی۔ دونوں فریقوں کے درمیان حسین میں ثالثی کی کوشش کی جاتی ہے۔ فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف ہوتا ہے اور حضرت معاویہؓ انہیں معزول قرار دیتے ہیں اور یروشلم میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔
681 عیسوی۔ حضرت علیؓ کو ایک خارجی انتہا پسند ابن ملجم شہید کر دیتا ہے۔
661 عیسوی سے 680 عیسوی۔ حضرت معاویہؓ اوّل کی خلافت۔ وہ اموی عہد حکومت کی بنیاد رکھتے ہیں اور اپنا دارالحکومت مدینہ سے دمشق منتقل کر دیتے ہیں۔
669 عیسوی۔ مدینہ میں حضرت حسنؓ وفات پا جاتے ہیں۔
680 عیسوی۔ یزید اوّل اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دوسرا اموی خلیفہ بن جاتا ہے۔
680 عیسوی سے 692 عیسوی۔ دوسرا فتنہ۔ ایک اور خانہ جنگی پھوٹ پڑتی ہے۔
کوفہ کے چند مسلمان جو اپنے آپ کو شیعانِ علی کہتے ہیں۔ وہ حضرت حسینؓ کے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت حسینؓ ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ ہو جاتے ہیں اور یزید کے فوجی انہیں راستے میں ہی کربلا میں شہید کر دیتے ہیں۔
حضرت عبداللہ بن زبیر عرب میں یزید کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔
683 عیسوی۔ یزید اوّل وفات پا جاتا ہے۔ اس کا بیٹا معاویہ ثانی فوت ہو جاتا ہے۔
مروان اوّل کے جانشین جو خلافت کا اموی دعویدار ہوتا ہے اور شامی اس کی حمایت کرتے ہیں۔
684 عیسوی۔ خارجی باغی وسطی عرب میں امویوں کی مخالفت میں ایک آزاد ریاست قائم کرتے ہیں۔
685 عیسوی (یہ دور 705 عیسوی تک رہا) عبدالملک کی خلافت جو اموی حکمرانوں کو بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
691 عیسوی۔ اموی افواج باغیوں کو شکست دیتی ہیں۔
692 عیسوی۔ اموی افواج ابن الزبیر کو شکست دیتی ہیں اور انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔
خانہ جنگی کے نتیجے میں بصرہ، مدینہ اور کوفہ میں ایک مذہبی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ بہت سے مکاتب فکر، سرکاری اور نجی زندگی میں قرآن کے بھرپور اطلاق کے لیے مہم چلاتے ہیں۔
یہ تھے اسلامی تاریخ کے وہ چند بڑے واقعات جو 601 عیسوی سے 699 عیسوی تک پیش آئے۔
اس صدی میں ہندوستان کی صورت حال یہ تھی کہ 622 عیسوی میں حاکم سندھ کے ایک برہمن وزیر چچ نے رانی سوہن دیوی کو تخت سے معزول کر کے خود قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے ملتان کو بھی فتح کر لیا۔ ملتان کو فتح کرنے کے بعد اس نے یہاں کی عملداری راجپوتوں کو سونپ دی۔
کچھ عرصے کے بعد چچ نے رانی سوہن دیوی سے شادی کر لی تھی۔
شمالی ہند میں ایک راجا پرلش چندر نے (606-648 عیسوی تک) دوسرے راجاؤں کو مطیع کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کی جو بنگال سے لے کر پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔
دکن میں متعدد ریاستیں بن گئی تھیں۔ جن میں مہاراشٹر کی ریاست جس پر چالوکیہ خاندان کے راجے حکومت کرتے تھے۔ بہت ممتاز جانی جاتی تھی۔
ہم تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے 699 عیسوی تک آ چکے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں 700 عیسوی سے 799 عیسوی تک کا جائزہ لینا ہے۔
ایک بار پھر یہ واضح کر دیا جائے کہ ہم نے تاریخ کے ان ہی بڑے واقعات کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے انسانی تاریخ پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رونما ہوئے ہوں۔
انسانی تاریخ بہت پھیلی ہوئی اور بہت وسیع ہے۔ ہزاروں لاکھوں عظیم لوگ پیدا ہوئے۔ ہزاروں تہذیبوں نے جنم لیا اور فنا ہو گئیں۔ ہزاروں داستانیں پروان چڑھیں۔ اگر ہم ان سبھوں کا تذکرہ کریں تو انسائیکلو پیڈیا کی درجنوں جلدیں بھی ناکافی ہوں۔
ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ رسم و رواج، ثقافت، تمدن، مذہب، فلسفیانہ خیالات، سائنس ٹیکنالوجی، فتح و شکست، ایجادات، ظلم و بربریت وغیرہ کے کیسے کیسے مراحل سے انسان گزرتا ہوا آج کے دور میں پہنچا ہے۔
ہم ان ہی واقعات کو سامنے رکھ کر یہ داستان ترتیب دے رہے ہیں۔ یعنی یہ کہانی اس لمحہ موجود کی ہے جس میں

ہم خود موجود ہیں۔
میری کوشش یہی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرتا چلوں اور انسانی فکر کے ہر پہلو کا جائزہ لوں۔ اب تک ہم 601 عیسوی سے 699 عیسوی تک آچکے ہیں۔
اب پیشِ خدمت ہیں 700 عیسوی سے لے کر 799 عیسوی تک کے اہم واقعات۔

700 عیسوی میں چین میں دو واقعات ہوئے۔ نمبر ایک چین میں سانچوں سے چھپائی کا آغاز ہوا اور دوم یہ کہ اس صدی میں تانگ بادشاہت کو عروج حاصل ہوا اور اس صدی میں مسلمانوں نے اسپین فتح کیا۔
اس طرف سندھ کی صورت حال یہ تھی کہ رائے چچ کی وفات کے بعد اس کا بھائی رائے چندر سندھ کے تاج و تخت کا والی قرار پایا تھا۔ وہ بدھ مذہب کا پیروکار تھا اور اس نے بزور قوت سندھ میں بدھ مذہب پھیلانا شروع کر دیا۔
ریاست قنوج کے سردار اور ستیان کے سردار نے مل کر سندھ پر حملہ کر دیا تھا لیکن رائے چندر نے اپنے قلعے وغیرہ بہت مضبوط کر لیے تھے۔ اس لیے وہ فوج واپس چلی گئی تھی۔
اس صدی میں چین میں سانچوں سے چھپائی کا آغاز ہوا۔
شنائی لون چین میں کاغذ ایجاد کر چکا تھا۔ سانچوں میں چھپی ہوئی کئی کتابیں دستیاب ہو چکی تھیں مگر عرب کی صورت حال کچھ یوں تھی۔
ہم نے اسلامی تاریخ کو 601 سے 699 عیسوی تک دیکھا تھا۔ اب اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ یعنی 701 سے 799 عیسوی تک۔

705 عیسوی سے 715 عیسوی۔ الولید کی خلافت۔
مسلمان افواج شمالی افریقا میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتی ہیں اور اسپین میں سلطنت قائم کرتی ہیں۔ خلیفہ الولید ہی کے دور میں عربوں نے سندھ پر حملہ کیا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے سے بہت پہلے ہی اسلام تاجروں، درویشوں اور صوفیوں کے ذریعے سندھ اور ہند میں داخل ہو چکا تھا اور مسلسل پھیل رہا تھا۔
سندھ کی صورت حال کا مختصر جائزہ کچھ یوں ہے۔
اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حجاج بن یوسف کو بلادِ اسلامیہ کے مشرقی ممالک کا والی مقرر کیا۔ حجاج نہایت سخت گیر اور جابر حاکم تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کے لیے ننگی تلوار کی طرح تھا۔ اس کی سفاکیوں کے پیشِ نظر مؤرخ اسے قصّابِ اسلام کہتے ہیں۔
حجاج بن یوسف نے بصرہ، کوفہ اور مکران کے بعد شر پسند عناصر کی جب سرکوبی کی تو دو بھائیوں محمد علافی اور معاویہ علافی نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔
پانچ سال کی کشمکش کے بعد معاویہ علافی تو قتل ہو گیا لیکن محمد علافی 500 عرب سپاہیوں کو لے کر مکران سے سندھ میں داخل ہو گیا اور راجا داہر کے یہاں پناہ لی۔
راجا داہر نے محمد علافی کو نہ صرف پناہ دی بلکہ باقاعدہ اپنے یہاں ملازم بھی رکھ لیا۔
اس پر حجاج بن یوسف نے خلیفہ عبدالملک کی خدمت میں درخواست کی کہ سندھ کا راجا مسلمانوں کی دشمنی میں حد سے بڑھ گیا ہے باغیوں کو پناہ دے رہا ہے، فوج کشی کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس دوران خلیفہ عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔
اس کے بعد ولید بن عبدالملک کی خلافت کا دور آیا۔
اس کے دور میں وہ واقعہ پیش آیا جس کے بعد مسلمان فوج سندھ میں داخل ہوئی۔
سری لنکا کے راجا نے آٹھ جہازوں کا ایک بیڑہ جس میں خلیفہ ولید کے لیے تحفے تحائف تھے اور بہت سے مسلمان تاجر بھی تھے ان میں عورتیں بھی تھیں، روانہ کیا لیکن سندھ کے ساحل پر اس بیڑے کو لوٹ لیا گیا اور عورتوں مردوں کو قید کر لیا گیا۔

قیدیوں میں سے قبیلہ یربوع کی ایک عورت بے اختیار پکار اٹھی "یا حجاج اغثنی" یا حجاج ہماری فریاد کو پہنچ۔
حجاج کو جب اس واقعے کی خبر ہوئی تو وہ جوش سے بے تاب ہو کر پکار اٹھا۔ "ہاں میں آیا"۔
اس نے پہلے راجا داہر کو ایک خط لکھا کہ قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ داہر نے جواب دیا کہ "ان ڈاکوؤں پر ہمارا اختیار نہیں ہے۔ تم ہی آزاد کرا سکتے ہو تو آ کر آزاد کرا لو۔"
بہر حال دو چار ایسے معرکے ہوئے جس میں حجاج کی فوج کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر حجاج نے محمد بن قاسم کا انتخاب کیا جو ایک ہوشیار اور بہادر نوجوان تھا۔
712 عیسوی بروز جمعہ محمد بن قاسم مکران اور ارمابیل کے راستے ہوتا ہوا دیبل پہنچ گیا اور یہاں سے سندھ کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
717 عیسوی سے 720 عیسوی۔ عمر ثانی (خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ) کی خلافت۔ پہلے خلیفہ جو اسلام قبول کرنے

والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔وہ مذہبی تحریک کے کچھ آئیڈیلز کے اطلاق کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

720 عیسوی سے 724۔یزید ثانی، ایک عیاش اور بدچلن شخص کی خلافت۔اموی حکومت کے حوالے سے شیعہ اور خوارج دونوں کا عدم اطمینان وسیع پیمانے پر نمودار ہوتا ہے۔

724 عیسوی سے 743 عیسوی۔ ہشام اول، ایک پُرخلوص مگر زیادہ آمر حکمران کی خلافت۔جو نیک مسلمانوں کو بھی دشمن بنالیتا ہے۔

728 عیسوی۔حدیث کے عالم، مذہبی مصلح اور صوفی حسن البصریؒ کی وفات۔

حسن بصریؒ علمائے تابعین میں سے تھے اور عالم باعمل تھے۔

732 عیسوی۔ پوائیٹرز کی جنگ۔چارلس مارٹل اسپین کے مسلمانوں کی ایک چھوٹی حملہ آور جماعت کو شکست دیتا ہے۔اسی سال امام ابوحنیفہ فقہ کے مطالعے کی بنیاد رکھتے ہیں۔

ابوحنیفہؒ، حضرت امام اعظم اہل سنہ والجماعت کے جلیل القدر اور سب سے پہلے امام۔فارسی الاصل تھے اور تابعی تھے۔آپ نے چار ہزار مشائخ سے فقہ اور حدیث کی تعلیم پائی۔اسی سال محمد ابن اسحاق، رسول کریمؐ کی پہلی بھرپور سوانح حیات لکھتے ہیں۔

743 عیسوی سے 744 عیسوی۔عباسی شیعوں کے ساتھ مل کر لڑتے ہوئے ایران میں امویوں کے خلاف بغاوت کردیتے ہیں۔

743 عیسوی۔ولید ثانی کی خلافت۔

744 عیسوی سے 749 عیسوی۔ مروان ثانی خلافت حاصل کرلیتا ہے اور باغیوں کے خلاف اموی بالادستی کو بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کی شاہی افواج شیعی بغاوتوں کو دبا دیتے ہیں۔

749 عیسوی۔عباسی کوفہ فتح کرلیتے ہیں اور امویوں کو اقتدار سے بے دخل کردیتے ہیں۔

750 عیسوی سے 754 عیسوی۔ پہلا عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح اموی خاندان کے سارے افراد کو قتل کروا دیتا ہے۔

755 عیسوی سے 775 عیسوی۔ ابوجعفر المنصور کی خلافت۔وہ ممتاز شیعوں کو قتل کروادیتا ہے۔

756 عیسوی۔اسپین میں اموی پناہ گزینوں میں سے ایک اموی آزاد سلطنت قائم کرتے ہوئے عباسی خلافت کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔

762 عیسوی۔بغداد کی تعمیر جو نیا عباسی دارالخلافہ بن جاتا ہے۔

765 عیسوی۔شیعوں کے چھٹے امام جعفر الصادق کی وفات۔جو اپنے پیروکاروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی بنیاد پر سیاست سے کنارہ کش ہوجائیں۔

769 عیسوی۔حضرت امام ابوحنیفہؒ وفات پاجاتے ہیں۔

786 عیسوی۔ہارون رشید کی خلافت۔عباسی قوت و اقتدار کا نقطۂ عروج۔بغداد اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں ایک عظیم نشاۃ ثانیہ برپا ہوتا ہے۔

علم، سائنس اور فنون کے علاوہ خلیفہ فقہ کے مطالعے اور حدیث کی تدوین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

795 عیسوی۔مالکی فقہی مکتب کے بانی امام مالکؒ کی وفات کنیت آپ کی ابوعبداللہ اور نام مالک بن انس ہے۔آپ نے امام جعفر صادق کی بھی شاگردی کی ہے اور امام شافعی کے استاد ہیں۔

مدینہ منورہ میں علم حدیث کی تدوین اول آپ ہی سے ہوئی ہے۔آپ کی کتاب ''موطا'' علم حدیث میں بے مثال ہے۔

700 عیسوی سے 799 عیسوی تک ہوا اسلامی تاریخ کا مختصر جائزہ۔اسی زمانے میں چین میں تانگ بادشاہت کو عروج حاصل ہوا۔

اب ہم جائزہ لے رہے ہیں 800 عیسوی سے 899 عیسوی تک کا۔جب روم میں شارل میگن کی تاج پوشی ہوتی ہے اور بغداد میں ہارون الرشید کی خلافت قائم ہوتی ہے اور مسلم سلطنت کو عروج حاصل ہوتا ہے۔

ان واقعات کا جائزہ لینے سے قبل برصغیر کی طرف آجائیں۔دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں یہاں کی کیا صورت حال تھی۔

محمد بن قاسم صرف ایک فاتح کی حیثیت سے یہاں نہیں آیا تھا۔بلکہ اس نے یہاں اپنے تہذیبی نقوش بھی ثبت کیے تھے۔

چونکہ یہ عہد سلطنت عباسیہ کا تھا اور اس دور میں علوم و فنون کو بے پناہ پذیرائی مل رہی تھی اس لیے عربوں اور

ہندوستانیوں کے اختلاط سے علوم وفنون کی ایک دوسرے کے یہاں منتقلی کا عمل بھی جاری رہا تھا۔
علم ہیئت، علم نجوم، علم جوتش اور کیمیا کے علوم میں ہندوؤں کو مہارت حاصل تھی۔ ان علوم پر سنسکرت زبان میں کئی کتابیں تھیں۔
خلیفہ منصور کے زمانے میں سندھ کے ایک وفد کے ساتھ ایک مقتدر عالم علم ہیئت کی مشہور کتاب ''سرھانت'' اپنے ساتھ لایا۔
ابراہیم فرازی نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا اور اس کی غلطیاں درست کیں۔ ان کے علاوہ سندھ سے دانشور اور پنڈت بھی بغداد گئے۔ انہوں نے عباسی دارالترجمہ میں ملازمتیں کیں اور ہندی علوم پر مشتمل مختلف کتب کو عربی میں منتقل کیا۔ جن میں آریہ، جٹ اور کھنڈا کھنڈیک جیسی مشہور کتابیں تھیں۔
ہارون الرشید کے زمانے میں اہلِ عرب ہندی طب یعنی آیورویدک سے روشناس ہوئے۔ ایک مرتبہ خلیفہ بیمار ہوا تو ہند سے ایک طبیب مانک کو بھیجا گیا تھا۔
سنسکرت کی حکمت و دانش کی مشہور کتاب پنج تنتر کا عربی زبان میں ترجمہ کرکے اسے کلیلہ ودمنہ کا نام دیا گیا۔
801 عیسوی میں پہلی عظیم خاتون صوفی حضرت رابعہؒ بصری کی وفات ہوئی۔
809 عیسوی سے 813 عیسوی۔ ہارون رشید کے دو بیٹوں المامون اور الامین کے درمیان خانہ جنگی ہوئی۔ مامون اپنے بھائی کو شکست دیتا ہے۔
814 عیسوی سے 815 عیسوی بصرہ میں ایک بغاوت۔
813 عیسوی سے 833 عیسوی مامون کی خلافت۔
خراسان میں بغاوت۔
817 عیسوی۔ مامون شیعوں کے آٹھویں امام حضرت امام رضا کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے۔ 818 عیسوی۔ امام رضا وفات پا جاتے ہیں۔
833 عیسوی سے 842 عیسوی۔ المعتصم باللہ کی خلافت، خلیفہ ترک غلام سپاہیوں کا ایک ذاتی دستہ تشکیل دیتا ہے اور دارالخلافہ کو سامرہ منتقل کر لیتا ہے۔
842 عیسوی سے 847 عیسوی۔ الواثق کی خلافت۔
848 عیسوی۔ شیعوں کے دسویں امام علی الہادیؒ کو سامرہ میں عسکری قلعے میں قید کر دیا جاتا ہے۔
855 عیسوی۔ فقہ کے حنبل مکتب کے بانی امام احمد بن حنبل کی وفات۔
امام عبداللہ احمد بن حنبل۔ اہلِ سنت والجماعت کے چار مجتہد مطلق اور صاحب مذہب اماموں میں سے چوتھے امام ہیں۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی روایات کا ضخیم مجموعہ مسند امام احمد بن حنبل کے نام سے مشہور ہے۔ جو دس جلدوں میں ہے۔
861 عیسوی سے 882 عیسوی۔ معتز کی خلافت۔
الپتگین نے غزنوی حکومت قائم کی غزنی میں۔
882 سے 866۔ مستعین کی خلافت۔
886 سے 869 عیسوی۔ معتز کی خلافت۔ امیر سبکتگین نے افغان قبائل کو متحد کیا۔
868 عیسوی۔ شیعوں کے دسویں امام کی وفات۔ ان کے بیٹے حسن عسکری سامرہ میں قید ہوتے ہیں۔
869 سے 870 مہتدی کی خلافت۔
870 عیسوی۔ پہلے مسلمان فلسفی یعقوب ابن اسحاق الکندی کی وفات۔
874 عیسوی۔ گیارہویں امام سامرہ میں قید کے دوران وفات پا جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے صاحب زادے حضرت ابوالقاسم محمد غیبت میں چلے جاتے ہیں۔
اسی مناسبت سے انہیں امام غائب کہا جاتا ہے۔
842 عیسوی۔ المستعد کی خلافت۔
یہ تھا اسلامی تاریخ کا جائزہ۔ مختصر سا جائزہ شارلی مینگی کی بادشاہت قابل ذکر ہے۔ قرون وسطیٰ کا شہنشاہ شارلی مینگن (چارلس اعظم) ''فرانکس'' کا بادشاہ سیکسون کا فاتح مقدس سلطنت روم کا بانی اور یورپی تاریخ کے نمایاں ترین فرماں رواؤں میں سے ایک۔ اس نے بے شمار جنگیں لڑیں۔ فتوحات حاصل کیں۔ لیکن اس کے دور کا سب سے معروف واقعہ 800 عیسوی میں کرسمس کے دن روم میں رونما ہوا۔ اس روز پاپ لیوسوم نے اس کے سر پر تاج رکھا اور اسے تمام رومیوں کا شہنشاہ قرار دیا۔
تاریخ کا یہ سفر 899 عیسوی تک پہنچ چکا ہے۔ اب ہم اس سے آگے یعنی 900 عیسوی سے 999 عیسوی تک کا جائزہ لیتے ہیں۔
برصغیر پاک و ہند کی وسعت اس زمانے میں کابل

تک تھی اور ہندو راجا جے پال سیال کرت، ملتان، کانگڑہ اور جالندھر سے کابل تک قابض تھا۔

غزنوی خاندان کی فتوحات نے مسلمانوں کے لیے صحیح معنوں میں دروازے کھول دیے تھے۔

909 عیسوی۔ فاطمی شیعہ افریقا (تیونس) میں اقتدار پر قبضہ کرلیتے ہیں۔

910 عیسوی۔ پہلے وحدت الشہودی مومن حضرت جنید بغدادیؒ کی رحلت۔

جنیدؒ، ابو القاسم بن جنیدؒ، آپ کے آباؤ اجداد نہاوند کے رہنے والے تھے۔ ابوالقاسم سے فقہ پڑھا۔ اپنے زمانے کے شیخ تھے۔

922 عیسوی۔ وحدت الوجودی صوفی حضرت حسین المنصور کو جو حلاج (یعنی اون دھنکنے والا کے نام سے مشہور ہیں) بنیادی عقائد کے توہین کے الزام میں موت کی سزا دی جاتی ہے۔

انہوں نے عالم کیف میں ”انا الحق“ کا نعرہ لگایا تھا۔ انہیں بدعت کے الزام میں موت کی سزا دی گئی تھی۔

923 عیسوی۔ تاریخ نویس ابو جعفر طبری بغداد میں وفات پاجاتے ہیں۔

932 سے 934 عیسوی۔ قاہر کی حکومت۔

934 سے 940۔ راضی کی حکومت۔

934 عیسوی۔ امام غائب کا عالم غیب میں امامت کا اعلان کیا جاتا ہے۔

935 عیسوی۔ فلسفی حسن الاشعری کی وفات۔

912 سے 961 تک اسپین میں ایک حاکم مطلق خلیفہ عبدالرحمان ثالث کی حکومت ہوتی ہے۔

969 سے قرطبہ علم کا مرکز بن جاتا ہے۔

950 میں حلب میں فلسفی اور موسیقار ابونصر فارابی کی وفات ہو جاتی ہے۔

950 عیسوی میں ایران کے بارہ امامی شیعوں اور دیلم کے کوہ نشین مغربی ایران میں زور پکڑنا شروع کرتے ہیں۔

945 عیسوی۔ بو برادران، بغداد، جنوبی عراق اور اومان میں زور پکڑتے ہیں۔

شیراز کے مقابلے میں بغداد اپنی امتیازی حیثیت کھونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب کہ شیراز علم کا مرکز بننے لگتا ہے۔

983 عیسوی۔ بویہ کا اتحاد ٹوٹنے لگتا ہے۔

972 عیسوی۔ فاطمی اپنا دارالخلافہ قاہرہ منتقل کرلیتے ہیں۔ جو شیعی علم کا ایک مرکز بن جاتا ہے۔ فاطمی قاہرہ میں الازہر کا مدرسہ قائم کرتے ہیں۔

999 عیسوی میں محمود غزنوی شمالی ہندوستان پر مستقل حکومت قائم کرلیتے ہیں اور ایران میں سامانیوں کو بے دخل کردیتے ہیں۔

اور اب جائزہ ہے سن 1000 عیسوی سے 1099 تک کا۔

اس دور میں بھی بے شمار اہم واقعات رونما ہوتے ہیں۔ رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ حکمران کے تیور بدل چکے ہیں۔ ہتھیاروں میں تنوع آچکا ہے اس دور کے چند اہم واقعات۔

ولیم فاتح نے ہاسٹنگ کی جنگ میں کامیابی حاصل کی اور انگلستان پر قابض ہو گیا۔

ولیم فرانس کے قصبے نارمنڈی میں فلیس کا مقام ہے۔ وہیں 1027 عیسوی کو پیدا ہوا۔ وہ ایک ناجائز اولاد تھی۔ تاہم نارمنڈی کے ڈیوک رابرٹ اول کا واحد بیٹا تھا۔

1035 عیسوی میں۔ رابرٹ فوت ہوا لیکن وہ اس سے پہلے ولیم کو اپنا جانشین مقرر کرچکا تھا۔ اسی طرح آٹھ برس کی عمر میں ہی ولیم نارمنڈی کا ڈیوک بن گیا تھا۔

ملکی صورتحال اس کے خلاف تھی۔ کیونکہ وہ ابھی بچہ تھا۔ اس کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں۔ اس کے تین سرپرست موت کا شکار ہوئے۔

بالآخروہ تمام الجھنوں سے نکلتا چلا گیا اور 1066 عیسوی میں نارمنڈی کا یہ خواب ولیم انگلستان کا حکمران بننے کی خواہش میں چند ہزار فوجیوں کے دستے کے ساتھ خلیج انگلستان عبور کر گیا اور وہ اپنی کاوش میں کامیاب ہو گیا۔

پوپ اربن دوم (1042 عیسوی سے 1099 عیسوی)

آج پوپ اربن دوم سے زیادہ لوگ واقف نہیں ہیں لیکن یہ بہت ہی اہم شخص تھا۔ اربن دوم وہ شخص تھا جس نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دی اور یوں صلیبی جنگوں کا آغاز ہو گیا۔

یہ شخص فرانس میں پیدا ہوا۔ وہ فرانسیسی نوابوں کے خاندان کا تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1088 عیسوی میں بطور پوپ منتخب ہوا۔

جس واقعے کے حوالے سے تاریخ اسے جانتی ہے وہ

کچھ یوں ہے کہ 27 نومبر 1095 عیسوی کو اس نے فرانس کے شہر کلرمونٹ میں اہلِ کلیسا کا ایک بڑا اجلاس منعقد کروایا۔ اس نے ہزاروں کے ہجوم سے خطاب کیا۔ اس کے اس خطاب کا شمار تاریخ کے چند مؤثر ترین خطابات میں ہوتا ہے۔

اپنے اس خطاب میں اس نے عیسائیوں سے کہا کہ مسلمانوں (ترکوں) نے عیسائیوں کی سرزمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ مقدس مقامات کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف جہاد کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اس خطاب کے چند ماہ کے اندر پہلی صلیبی جنگ لڑی گئی۔

مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے سے اس صدی کے کچھ اہم واقعات اس طرح ہیں۔

1030 عیسوی تک شمالی ہندوستان پر محمود غزنوی کی حکومت رہی۔

1037 عیسوی۔ عظیم فلسفی ابنِ سینا (جنھیں مغرب میں Avicenna کہا جاتا ہے) میں وفات پا جاتے ہیں۔

1030 کی دہائی۔ سلجوق خراساں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ 1040 میں وہ غزنویوں سے مغربی ایران حاصل کر لیتے ہیں اور آذر بائی جان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

1055 عیسوی۔ سلطان طغرل بیگ عباسی خلفا کے نمائندہ کے طور پر بغداد سے سلجوق سلطنت پر حکومت کرتا ہے۔

1063 عیسوی سے 1073 عیسوی۔ سلطان الپ ارسلان کی حکومت۔

1065 سے 1067۔ بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوتا ہے۔

1073 سے 1092 عیسوی۔ ملک شاہ سلطنت پر حکومت کرتا ہے۔ نظام الملک وزیر ہوتا ہے۔ ترک فوجیں شام اور اناطولیہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔

1071 عیسوی۔ سلجوق فوجیں منزیکرت کی جنگ میں بازنطینیوں کو شکست دے دیتی ہیں۔ سلجوق اپنے آپ کو اناطولیہ میں مستحکم کرتے ہیں اور بحر ایجئین تک پہنچ جاتے ہیں۔ (1080 عیسوی)۔

سلجوقیوں کی فاطمیدی اور شام کے مقامی حکمرانوں سے جنگیں ہوتی ہیں۔

1094 عیسوی۔ بازنطین بادشاہ الیکسیئن اوّل اپنے علاقوں پر سلجوقیوں کے حملوں کے خلاف مغربی عیسائیت سے مدد مانگتا ہے۔ 1094 عیسوی۔ پوپ اربن دوم پہلی صلیبی جنگ کا پرچار کرتا ہے۔ 1099 عیسوی۔ صلیبی جنگ جو یروشلم کو فتح کر لیتے ہیں۔ 1090 کی دہائی میں اسماعیلی، سلجوقی بغاوت کا آغاز کرتے ہیں۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں مختلف ترک ریاستیں قائم ہو جاتی ہیں۔

اس دہائی میں صلیبی جنگ جو فلسطین، اناطولیہ اور شام میں حکومتیں قائم کرتے ہیں۔

برصغیر کی صورت حال یہ تھی کہ محمود غزنوی نے راجا جے پال کو عبرتناک شکست دی تھی۔ راجا نے بعد میں شرم سے خودکشی کر لی تھی۔

1004 عیسوی میں سلطان محمود غزنوی نے ایک بار پھر برصغیر کا رخ کیا۔ اب وہ جائیہ کے راجا بج رائے پر حملہ کرنے آیا تھا۔

راجا کو شکست ہوئی اس نے بھی خودکشی کر لی۔

1006 عیسوی میں محمود غزنوی ملتان پر حملہ آور ہوا۔ اس زمانے میں ملتان کا حکمران ابوالفتح داؤد تھا۔ یہ لوگ عقیدے کے لحاظ سے اسماعیلی تھے۔ 1008 عیسوی میں محمود غزنوی نے جے پال کے نواسے سکھ پال کو شکست دی۔ 1009ء میں محمود غزنوی نے نگر کوٹ پر حملہ کر کے بے شمار مالِ غنیمت حاصل کیا۔ 1010 سے 1011 عیسوی۔ ملتان پر دوسرا حملہ۔

1014 میں تھانیسر پر حملہ۔ 1621 میں کشمیر پر حملہ۔ 1020 میں اس نے لنجر پر حملہ کیا تھا۔ غرض یہ کہ وہ اس طرح ہندوستان میں فتوحات حاصل کرتا رہا۔ بالآخر 1030 میں وہ وفات پا گیا۔

محمود غزنوی کے حملوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کے دروازے کھول دیے۔

اس صدی میں صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا تھا اور جنگ کے میدانوں میں نئے نئے ہتھیار آزمائے گئے تھے۔ اس کے بعد کی رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ پوری دنیا تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ ایجادات ہو رہی ہیں۔ کردار سامنے آ رہے ہیں۔ انسان کی سائنسی ایجادات تو سترہویں صدی سے شروع ہوتی ہیں ایجادات سامنے آنے لگی ہیں۔ اسپین کے مسلمان سائنس دانوں کے احوال میں صلیبی جنگیں ہیں اور آج کے دور کا توڑ پھوڑ ہے۔

(جاری ہے)

سیلف میڈ

انور فرہاد

ایک سپر اسٹار کی زندگی کے اہم گوشے

ایک معروف عسکری گھرانے کی اس لڑکی نے اپنے اندر کے فن کو اس طرح پیش کیا کہ ایک زمانہ اس کا گرویدہ ہوگیا۔ اس کے چہرے کی معصومیت، مکالمے کی ادائیگی اور فن اداکاری کی خوبی نے اسے ممتاز بنایا۔ نہ صرف وہ بہ حیثیت اداکارہ مشہور ہوئی بلکہ آئی پی ایل کی ایک بڑی کرکٹ ٹیم کی مالک ہونے کی وجہ سے بھی شہرت حاصل کی۔ آج اس کے پرستار ہزارہا ہیں۔ یہ مقام اس نے کیسے حاصل کیا؟

گزشتہ دنوں شوبز اور اس سے وابستہ ایسے لوگوں کے بارے میں مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ جو نئے نئے اس لائن میں آئے ہیں تاکہ میں بھی اپنے طور پر ان کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ ان کے بارے میں پڑھوں، جانکاری حاصل کروں۔ اس سلسلے میں ایک نام ذہن میں آیا پریتی زنٹا کو کہ وہ لکی بھی جونیئر آرٹسٹ نہیں۔ 1998ء سے 2014ء تک کی فلموں میں اس نے کام کیا ہے۔ بڑے بڑے ہدایت کاروں نے اسے اپنی فلموں میں کاسٹ کیا

ہے۔ بڑے بڑے آرٹسٹوں کے ساتھ اس نے اداکاری کی ہے۔ ہدایت کاروں میں راکیش روشن، لیش چوپڑا، کرن جوہر، فرحان اختر، منی رتنم، عباس مستان، راج کنور، سدھارتھ آنند، بلرام شرما، پریمیش ملہوترا، آدیتہ چوپڑا، فرح خان جیسوں کی فلموں میں کام کیا ہے۔

شاہ رخ خان، عامر خان، سلمان خان، سنجے دت، اکشے کمار، سیف علی خان، انیل کپور، ریتھک روشن، گووندا، سنی دیول، ایتابھ بچن، ابھیشک بچن، ریکھا، مادھوری ڈکشٹ، رانی مکرجی، فریدہ جلال، اجے دیوگن، ارجن رام پال، ماہیما چوہدری، جیکی شیروف، زہرہ سہگل، ملائکہ اروڑا، جانی لیور، شکتی کپور، امریش پوری، ڈمپل کپاڈیہ، پریانکا چوپڑا، رندھیر کپور، جیا بچن، انوپم کھیر، ارشد وارثی، نصیرالدین شاہ، لارادتہ، متھن چکرورتی، کرینہ کپور، چنکی پانڈے، جان ابراہم، قادر خان، کبیر بیدی، سوتالی چندرے، رتی اگنی ہوتری، جاوید جعفری، ونش بھاردواج، دپیکا پوڈوکون، جاوید شیخ، عرفان خان اور دھرمیندر جیسے چھوٹے بڑے تقریباً تمام ہی فنکاروں کے ساتھ اپنی اداکارانہ خوبیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ پریٹی کی کون سی بات نے متاثر کیا کہ اس کے بارے میں معلومات کا خزانہ جمع کیا جائے تو سنیں۔ انسان کی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ہر حساس آدمی کو ضرور متاثر کرتی ہیں۔

میں نے کسی اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ اداکارہ پریٹی زنٹا نے 28 لڑکیاں ایڈاپٹ کی ہیں جن کی تعلیم کے اخراجات وہ اٹھا رہی ہیں۔ بظاہر یہ چھوٹی سی خبر تھی مگر اسے پڑھ کر میں اس اداکارہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج کے دور میں جب نفسانفسی کا عالم ہے۔ کچھ لوگ اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ آتے ہیں۔ اپنے بچوں سے بھی کہتے ہیں بس ہم تمہیں اور پڑھا نہیں سکتے۔ اب تم کما کر ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔ ہمارا بوجھ ہلکا کرو۔ اس دور میں ایک اداکارہ، ایک دو نہیں دو درجن سے بھی زیادہ لڑکیوں کی تعلیمی اخراجات اٹھا رہی ہے۔ ان لڑکیوں کو گود لینے کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ بے سہارا ہیں یا پھر ان کے ساتھ کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ وہ نارمل اور باعزت زندگی گزارنے کے قابل نہیں۔ پریٹی نے ان کی ذمہ داریاں سنبھال کر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ محض ایک اداکارہ نہیں ایک اچھی انسان بھی ہے۔ آج کے اس آپادھاپی کے دور میں اپنے آپ کو ایک اچھا انسان ثابت کرنا بڑا مشکل، بہت دشوار کام ہے۔ میں اس اداکارہ سے ملے بغیر، اس کی کوئی فلم دیکھے بغیر اس کا گرویدہ ہو گیا اور مجھے یہ بات شدت سے یاد آئی کہ فلمیں بھی اچھی ہوتی ہیں اور فلموں میں کام کرنے والے بھی۔ یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ پریٹی زنٹا کی انسانی خوبیوں نے مجھے متاثر کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ فلم والے محض فلم والے نہیں ہوتے، ان میں بھی بہت سے اچھے ہوتے ہیں۔ ایک اچھے انسان کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ نانا پاٹیکر جو فلموں میں زیادہ تر منفی کردار کرتا ہے۔ جس کا لہجہ بڑا روکھا اور رف ہوتا ہے اور فلم میکرز اسے کڑوا کریلا بنا کر فلموں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اندر سے کتنا اچھا انسان ہے اس کی اچھائی اور انسان دوستی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ہر فلم کا آدھا معاوضہ کسی فلاحی ادارہ کو ڈونیٹ کر دیتا ہے۔ فلموں میں ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرنے والا ولن، ایک درد مند دل رکھنے والا انسان بھی ہے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

ہمارے ہاں بھی ایسے فلمی لوگ تھے اور اب بھی ہوں گے۔ سلطان راہی اور محمد علی کے بارے میں آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ دونوں کس طرح مستحق اور ضرورت مندوں کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں عام لوگوں کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ وہ اس ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو کے فارمولے پر عمل کرتے ہیں۔ یہی بات پریٹی زنٹا پر بھی صادق آتی ہے۔

بچپن سے ہی اس کے عجیب و غریب شوق تھے۔ ایک بار بڑی شدت سے وہ ٹرک ڈرائیور بننے کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ شوق اسے اس وقت پیدا ہوا۔ جب وہ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ اپنی گاڑی میں اپنے دادا سے ملنے ہماچل پردیش جا رہی تھی جو ان دنوں کنسٹرکشن کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ہائی وے پر سفر کے دوران ایک ٹرک اچانک تیزی سے عقب سے نمودار ہوا اور پریٹی کی گاڑی کو سائیڈ مارتا ہوا آگے نکل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اگرچہ ٹرک ڈرائیور کا یہ عمل اخلاقی اور قانونی دونوں لحاظ سے غلط تھا مگر جانے کیوں اس طرح ٹرک کا آگے نکل جانا کمسن پریٹی کو بہت اچھا لگا اور اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ مجھے ٹرک ڈرائیور بننا چاہیے تاکہ میں بھی اسی طرح چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کو سائیڈ مارتے ہوئے اور پرے دھکیلتے ہوئے آگے نکل جاؤں۔ یہ خواہش بہت دنوں تک رہی۔ کچھ دنوں کے بعد نن بننے کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ اس کے لیے وہ اتنی کریزی ہو گئی کہ ایک روز جب

اس کے ڈیڈی اسے ایک چرچ میں لے گئے جہاں جا کر اس نے صلیب بنائی اور اسکول میں یاد کی ہوئی یسوع مسیح کی دعا پڑھی۔ تاہم یہ شوق بھی تھوڑے دنوں میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے بعد آرمی جوائن کرنے کے بارے میں سوچنے لگی مگر جب ایک بار اسے آرمی اسپتال جانے کا اتفاق ہوا، وہاں جا کر اس نے خون میں نہائے زخمی سپاہیوں کو دیکھا تو اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ آرمی جوائن کرنے کا خیال دل سے نکال پھینکا۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ کبھی کچھ، کبھی کچھ بننے کا خیال اسے آتا رہا۔ کبھی سوچتی پولیس والی بن جاؤں کبھی سوچتی مجھے پرائم منسٹر بننا چاہیے، یہ سب کچھ بتانے کا یہ مقصد ہے کہ اپنی کم سنی کے زمانے میں پریتی اوٹ پٹانگ آرزوؤں اور تمناؤں میں الجھی رہتی تھی۔ اسے فلم ایکٹریس بننے کا کبھی خیال نہیں آیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک دن وہ ایکٹریس بن گئی۔ قصہ یوں ہے کہ ایک دن پریتی کی ایک کلوز فرینڈ کے بھائی کا فون آیا جو اشتہاری فلمیں بناتا تھا۔ اس نے اسٹوڈیو سے کال کی تھی۔ فون پر اس نے کسی جھجک کے بغیر پوچھا۔

''کیا تمہاری ٹانگیں خوب صورت ہیں؟''

''یہ کیا بدتمیزی ہے، کیسی بات کر رہے ہو؟'' پریتی نے اس غیر متوقع سوال پر بھنا کر کہا۔

''وہ بات دراصل یہ ہے کہ......'' اس نے پریتی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک کمرشل میں خوب صورت ٹانگیں دکھانی ہیں مگر ایڈ میں کام کرنے والی ماڈل بھاگ گئی ہے لہٰذا مجھے ایسی لڑکی چاہیے جو دلکش ٹانگوں کی مالک ہو، اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔''

''میں خوب صورت ہوں اس لیے میری ٹانگیں بھی خوب صورت ہیں۔'' پریتی زنٹا بولی۔ ''مگر میں اس قسم کا کام نہیں کر سکتی۔ میری فیملی ہرگز اس کی اجازت نہیں دے گی۔''

ایڈ میکر نے اسے سمجھایا۔ ''اشتہار میں صرف ٹانگیں ہی دکھائی جائیں گی، چہرہ نہیں۔''

یہ سن کر پریتی نے کچھ سوچا پھر بولی۔ ''اگر ایسی بات ہے تو......''

''بالکل ایسی ہی بات ہے۔ تم فوراً اسٹوڈیو آجاؤ۔''

اور ایڈ شوٹ ہوا تو ایسا ہی ہوا۔ صرف اس کی خوب صورت ٹانگوں کی عکاسی کی گئی جس پر اسے خوشی ہوئی کہ کسی کو بھی یہ نہیں چلے گا کہ یہ اس کی ٹانگیں ہیں اور اس خوشی میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب اسے پانچ ہزار روپے بطور معاوضہ دیا گیا۔ ان دنوں وہ اسٹوڈنٹ تھی اس لیے یہ رقم اس کے لیے بہت بڑی تھی۔ اسے اس بات پر حیرت بھی ہوئی کہ اتنے ذرا سے کام کے اتنے زیادہ پیسے ادا کیے گئے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پیسا بڑے بڑوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ پریتی زنٹا تو بے چاری ایک کمزور سی لڑکی تھی۔ پیسوں کے جال میں ایسی پھنسی کہ تین دن بعد جب اس کی دوست کے بھائی نے اسے ایک اور ایڈ کی آفر کی تو اس نے بخوشی قبول کر لی۔

دوست کے بھائی نے بتایا۔ ''ایک چاکلیٹ کا کمرشل ہے اور تمہیں ذہن میں رکھ کر پلان کیا گیا ہے۔'' یہ بات پریتی کو بہت بھلی لگی اور خوشی اور فخر سے پھولی نہیں سمائی۔ یہ ایڈ کر کے اسے بہت مزہ آیا۔ مزہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی شوٹنگ ایک فوڈ اسٹریٹ پر ہوئی تھی۔ پریتی چونکہ کھانے کی بڑی شوقین ہے اس لیے شوٹ سے پہلے اس نے اتنا کھا لیا کہ جب شوٹ کا وقت آیا تو اس سے وہ چاکلیٹ نہیں کھائی گئی جو ایڈ میں اسے کھاتا ہوا دکھایا جانا تھا۔ اس لیے اس کی حالت دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ چاکلیٹ پکڑے کھڑی رہے۔ اس طرح ایڈ شوٹ ہوا اور یوں پریتی زنٹا کی شوبز کیریئر کا آغاز ہو گیا۔ پریتی نے بھی فلموں میں اس وقت انٹری دی جب کمرشلز کے ذریعے اچھی طرح اس کی شناخت بن گئی مگر اس بارے میں بتانے سے پہلے پریتی زنٹا کے فیملی بیک گراؤنڈ پر روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ بعد کے حالات کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری یا قباحت نہ ہو۔

پریتی نے شملہ میں جنم لیا۔ وہ راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے والد لیفٹیننٹ کرنل درگا نند زنٹا آرمی سے وابستہ تھے۔ اس کے دو بھائی ہیں۔ اس کے بڑے بھیا دیپانکر بھی اپنے پتا کی طرح آرمی میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چھوٹا بھائی منیش لاس اینجلس امریکا میں رہتا ہے۔ روایتی راجپوت گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس گھرانے میں پرانے رسم و رواج کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کے باوجود پریتی کے والدین کے خیالات مختلف تھے۔ وہ آگے کی سوچتے تھے۔ محض لڑکی ہونے کی وجہ سے انہوں نے کبھی بھی پریتی کے ساتھ مخصوص برتاؤ نہیں کیا بلکہ اپنے بیٹوں کی طرح اسے بھی آگے بڑھنے کی کھلی آزادی دی۔ اس نے اپنے پیر تھس سے

بہت کچھ سیکھا۔ اس کے پاپا نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے۔ وہ بہت زبردست انسان تھے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کی شخصیت اس کے ڈیڈی کی طرح ہے تاہم ذہنی پختگی میں اس کی ماں کا کردار بھی نمایاں رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بہت سے طور طریقوں میں وہ اپنی ماں جیسی ہے۔ بچپن میں ہی اس کے والدین نے اس کے اور اس کے بھائیوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ کتنی ہی بڑی مصیبت سر پر کیوں نہ آن پڑے لیکن جھوٹ نہیں بولنا۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ پریتی آج تک جھوٹ نہیں بولتی اور اس کے بھائی بھی جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر پریتی کے دوستوں میں بھی کوئی مذاق میں جھوٹ بولتا ہے تو اسے اچھا نہیں لگتا۔ سچ بولنے والے اس کے دل کو بھاتے ہیں، جب کہ وہ جھوٹ بولنے والوں سے نفرت کرتی ہے۔ اس کے ڈیڈی کی جاب ایسی تھی کہ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ تھوڑے دن اس شہر میں تو تھوڑے دن کسی اور شہر میں۔ انڈیا بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے مختلف تہذیبوں کا مجموعہ ہے، ہر صورت میں ایک الگ تہذیب ہے۔ اس طرح پریتی کو بھی اپنے ڈیڈ کے ساتھ نگر نگر گھومنے کا موقع ملا تو اسے مختلف جگہوں کے مختلف کلچر دیکھنے کو ملے۔ یوں اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اس کی شخصیت میں اعتماد آتا گیا۔ دوست بنانا سیکھا اور لوگوں میں گھلنا ملنا آیا وہ جو کہتے ہیں نا کہ سفر وسیلہ ظفر تو پریتی کے لیے بھی مسلسل سفر میں رہنے سے کامیابی کے بڑے بھید بھاؤ کھلے لیکن اس طرح ایک نقصان بھی ہوتا تھا، ایک شہر کے اسکول سے نکل کر اسے دوسرے شہر کے اسکول میں داخلہ لینا پڑتا تھا۔ لہٰذا اس کے والدین نے اسے شملہ کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرادیا۔

جب پریتی کی عمر 13 برس تھی اس کی زندگی میں جیسے طوفان آگیا۔ ایک خوف ناک ٹریفک حادثے میں اس کے ڈیڈی کا انتقال ہوگیا جب کہ اس کی ممی ارابھا شدید زخمی ہوگئیں۔ ان کے جسم کی 22 ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ان کی حالت انتہائی سیریس تھی۔ اگرچہ وہ بچ گئی تھیں لیکن ان کی حالت نیم مردے جیسی تھی۔ تقریباً چار برس تک ان کی حالت ایسی رہی کہ کبھی کومے میں ہوتیں تو کبھی ہوش میں۔ پریتی اور اس کے بہن بھائیوں کے لیے وہ دن بہت صبر آزما تھے چونکہ ان لوگوں کی معاشی حالت مضبوط تھی اس لیے انہیں بدترین حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے دادا دادی موجود تھے لہٰذا ان کی سرپرستی میں ان کی زندگی کا سفر جاری وساری رہا۔

اس دوران پریتی نے اسکول کی تعلیم مکمل کرلی تھی۔ اس کے بعد اس نے دہلی کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا مگر چند روز بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس جیسی لڑکی کا گزارا وہاں ممکن نہیں۔ پریتی چونکہ ٹام بوائے جیسی تھی اس لیے اسے مذاق کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ کچھ دن تو اس نے حالات سے نمٹنے کی کوشش کی مگر جب بات مذاق سے کچھ اور آگے بڑھ گئی اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ بگڑے ہوئے لڑکوں کے گروپ نے اس سے شرمناک فرمائشیں کرنا شروع کردیں تو اس نے کالج جانا چھوڑ دیا اور واپس شملہ چلی گئی اور وہاں کے ایک کالج سے انگریزی میں آنرز کیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کی طلب اس میں اب بھی باقی تھی۔ آنرز کے بعد اس نے نفسیاتی ڈاکٹر بننے کا سوچا اور سائیکالوجی کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔

اپنی طبیعت اور موڈ ومزاج کے لحاظ سے وہ منفرد تھی۔ ٹین ایجر کی حیثیت سے اس کی زندگی عام لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔ مثلاً اس عمر میں عموماً لڑکیوں پر لڑکے فریفتہ ہو جاتے ہیں مگر پریتی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں رہا۔ لڑکوں کے ساتھ اس کا تعلق دوستوں جیسا ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اسے بھی لڑکی نہیں سمجھا۔ کبھی کسی لڑکے نے اس سے اظہار محبت نہیں کیا۔ زیادہ تر لڑکے اس کے پاس اس مقصد کے تحت آتے تھے کہ وہ ان کی دوستی ان کی من پسند لڑکی سے کروادے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فطری طور پر عمر کے اس حصے میں اسے کئی لڑکے اچھے لگتے تھے مگر ان میں سے بھی کسی نے اس سے محبت والا تعلق نہیں رکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ لڑکے اس سے ڈرے ڈرے سے رہتے تھے۔ غالباً اسی لیے کوئی بھی لڑکا محبت کے ارادے سے اس کے قریب نہیں آیا۔ گویا وہ مردمار قسم کی لڑکی تھی۔ جس طرح کسی زمانے میں اداکارہ تبو کی بڑی بہن فرح ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی اپنے بچپن میں ٹام بوائے قسم کی ہوا کرتی تھی۔ اس کا قد، اس کے ہم عمر لڑکوں سے بھی لمبا تھا۔ وہ لڑکوں سے بے دھڑک لڑ پڑتی اور ان کی مرمت کردیتی تھی۔ بڑی ہونے کے بعد بھی لڑکوں کو دوست بنانا اسے اچھا لگتا تھا اور عورتوں سے زیادہ مردوں کی کمپنی میں وہ خود کو کمفرٹیبل محسوس کرتی تھی۔ اپنی انہی خوبیوں کے ساتھ وہ بڑی ہوتی گئی۔ پڑھتی اور آگے بڑھتی گئی۔ شملہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پریتی اپنی دوست انو بھا کے پاس

ممبئی آ گئی اور رنگوں اور روشنیوں کے اس شہر کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی کہ پھر واپس شملہ نہیں گئی۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ اسے نفسیاتی ڈاکٹر بننے کا خیال آیا اور وہ ڈاکٹر ایلکس کنڑال اور ڈاکٹر وزیر علی کے زیر سایہ سائیکالوجی کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ اب تمام وقت اس کے ہاتھ میں موٹی موٹی کتابیں ہوتیں اور وہ ان میں غرق رہتی۔ اسی دوران پریتی کو کمرشل آفر ہوا۔

پریتی کمرشلز کر چکی تھی کہ اس کی ملاقات شیکھر کپور سے اتفاقیہ ہو گئی۔ ایک روز وہ اپنی دوست کے بھائی جس نے اسے اپنے دو کمرشلز میں کام کروایا تھا کو پک کرنے تاج ہوٹل گئی تھی۔ ان دنوں چونکہ وہ نفسیات پڑھ رہی تھی اس لیے اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں جن میں سے ایک کتاب ''مرد اجنبی'' کے حوالے سے بھی تھی۔ اس روز بھی کسی فلم کے لیے آڈیشن چل رہا تھا۔ آڈیشن لینے والے شیکھر کپور تھے۔ بہت سے لوگ وہاں آڈیشن کے لیے جمع تھے۔ جب کہ پریتی وہاں اس مقصد کے لیے نہیں گئی تھی۔ وہ تو دوست کے بھائی کو لینے آئی تھی۔ وہ اسے تلاش کر رہی تھی کہ اچانک شیکھر کپور پریتی کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔ ایک مشہور سیلیبریٹی کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر پریتی نروس ہو گئی۔ شیکھر نے پریتی سے ہاتھ ملایا۔ اس دوران شیکھر کی نظر پریتی کے ہاتھ میں موجود کتابوں پر پڑی۔ اتفاق سے جنس پر مبنی وہ کتاب سب سے اوپر تھی۔ اس کے ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی شیکھر کپور کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھرے جنہیں دیکھ کر پریتی اور نروس ہو گئی۔ شیکھر نے پوچھا۔

''کیا تم بھی آڈیشن دینے آئی ہو؟''

''نہیں میں کسی اور کام سے یہاں آئی ہوں۔''

مگر شیکھر کپور نے اصرار کیا کہ پریتی ضرور آڈیشن دے۔ تھوڑے انکار کے بعد وہ راضی ہو گئی مگر بڑی بے دلی کے ساتھ آڈیشن دیا۔ اس دوران کسی کا فون بجا تو پریتی کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا اور دوست کے بھائی کو بھی ساتھ نہیں لیا جس کے لیے وہاں گئی تھی۔ اس موقع پر اس نے دل ہی دل میں خود سے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی کسی آڈیشن کے لیے نہیں جائے گی۔

پریتی زنٹا اس روز تو شیکھر کپور سے جان چھڑا کر آ گئی تھی مگر شیکھر نے کسی نہ کسی طرح اسے ڈھونڈ نکالا اور فلم ''تارا رم پم پم'' میں کام کرنے کی پیشکش کر دی۔

پریتی نے اس موقع پر بھی جان چھڑانے کی بہت کوشش کی۔

''دیکھیے میرے گھر والے کبھی نہیں چاہیں گے کہ میں فلم میں کام کروں۔ کیونکہ میں روایتی فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔''

لیکن شیکھر کپور شدید اصرار کرتے رہے۔ آخر تنگ آ کر پریتی بولی کہ ٹاس کر لیتی ہوں اگر ہیڈ آیا تو جواب ہاں میں ہوگا، ورنہ نہ سمجھیں۔ اس کے بعد سکہ اچھالا تو ہیڈ آ گیا۔ اس طرح فلم کی آفر قبول کرنی پڑی مگر یہ بات گھر والوں کو بتانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ چلو پہلے دوستوں کو بتا دوں لیکن جب اس نے دوستوں کو بتایا تو انہوں نے اسے مذاق سمجھا کیونکہ اس کی عادت ہنسی مذاق کرنے کی تھی اس لیے دوستوں نے اس بات کو بھی سیریس نہیں لیا۔

بہرحال یہ بات بتانی تو تھی اس لیے ایک دن پریتی نے تمام تر ہمت جمع کر کے اس بارے میں پہلے اپنی ممی کو بتایا۔ پھر دادا کے گوش گزار کیا۔ اس کی ممی کا ری ایکشن ایسا تھا جیسے انہیں کوئی اعتراض نہ ہو مگر دادا اس کی بات سن کر اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے پریتی سے بات چیت بند کر دی۔

ایک طرف تو یہ سب کچھ ہو گیا جب کہ دوسری طرف شیکھر کپور کی یہ فلم فلور پر نہیں جا سکی کیونکہ وہ نیکسٹ پروجیکٹ ایلزبتھ میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ شیکھر کپور نے جب بھی پریتی زنٹا کو اپنی کسی فلم میں کاسٹ کیا وہ شروع ہی نہ ہو سکی پھر ہوا یہ کہ شیکھر پریتی کو لے کر کوئی موی تو نہیں بنا سکے مگر اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے پریتی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈمپل کپاڈیہ کے بعد بولی ووڈ میں ایک ہیروئن ہلچل مچانے آ رہی ہے۔''

شیکھر کپور کے اس انٹرویو کے بعد پریتی زنٹا پر جیسے فلمی آفرز کی برسات ہو گئی۔ تاہم اس نے اس موقع پر بھی اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا اور بہت سوچ سمجھ کر ایک فلم ''دل سے'' سائن کی جو نامور ہدایت کار منی رتنم کی فلم تھی۔ اس فلم میں پریتی کا کردار محض تین سین پر محیط تھا مگر اس چھوٹے سے کیریکٹر میں اس کا نوٹس لیا گیا اور وہ ٹاک آف دا ٹاؤن بن گئی۔ آج بھی لوگ ''دل سے'' کے حوالے سے کہتے ہیں۔ اس رول میں پریتی خوب بھلی لگی تھی۔ اس کے بھرے بھرے گال زبردست لگے مگر عجیب بات ہے کہ خود

پریتی کو اپنے یہ گول مٹول رخسار قطعی پسند نہ تھے۔ اس مسئلے پر اس کا کہنا تھا۔ "میں تو ایسے رخسار چاہتی تھی کہ چہرے کی ہڈی بھی واضح نظر آئے جیسا کہ ملائکہ اروڑا خان کا چہرہ ہے۔ تاہم شیکھر کپور کی حتمی رائے یہ تھی کہ گول چہرہ پریتی کی شخصیت کے حساب سے پرفیکٹ ہے۔ وہ اس لک میں ہمیشہ جوان نظر آئے گی جب کہ ایسے چہرے والے افراد جن کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہوں بہت جلد بوڑھے لگنے لگتے ہیں۔" وہ کہتی ہے۔ "میرے خیال میں مسٹر شیکھر نے درست کہا تھا۔ کیونکہ آج اس عمر میں بھی میں بچی نظر آتی ہوں تو شاید اس کا راز میرا یہ گول مٹول چہرہ ہی ہے۔"

پریتی کا فلمی سفر زبردست طریقے پر جاری ہو گیا۔ کندن شاہ کی "کیا کہنا" میں اسے کنواری ماں کے روپ میں پیش کیا گیا جس میں اس نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ کیا۔ ناظرین کے علاوہ مبصرین اور ناقدین نے بھی اس ابھرتی ہوئی اداکارہ کی دل کھول کر تعریف کی۔ سونے پر سہاگا یہ کہ یہ فلم اپنی کہانی اور اس کے موضوع کی وجہ سے ہٹ ہو گئی۔ "کیا کہنا" سے پہلے اس کی فلم "سولجر" بھی ہٹ ہو چکی تھی جو ہدایت کار عباس مستان کی فلم تھی اور بوبی دیول جیسے ہیرو کے مقابل اس نے اس طرح جم کر اور اعتماد کے ساتھ کام کیا تھا کہ فلم انڈسٹری کے پنڈتوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے بارے میں شیکھر کپور نے جو پیش گوئی کی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ اس کے بعد ہر سال اس کی ایک دو فلمیں ریلیز ہوتی گئیں۔ جو ہٹ بھی ہوئیں اوسط درجے کی بھی ثابت ہوئیں اور فلاپ بھی ہوئیں۔ اس بارے میں وہ کہتی ہے۔

"میری ظاہری پرسنالٹی کی وجہ سے جلد ہی مجھ پر "ببلی ایکٹریس" کا لیبل لگا دیا گیا جب کہ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح مجھے ٹائپ کاسٹ بنانا درست نہیں تھا۔" وہ کہتی ہے۔ "اگر میرے کیریئر پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ میں نے ہر قسم کے کردار پلے کیے ہیں۔ تقریباً 30 فلموں میں سے محض 8،10 فلمیں ہی ایسی ہوں گی جن میں میں نے ببلی کیریکٹرز کیے ہیں پھر بھی مجھے یہ ٹیگ دے دیا گیا جو مناسب نہیں۔"

پریتی چونکہ خاصی پڑھی لکھی اور باشعور اداکارہ ہے۔ اس لیے اس کی باتیں، اس کی رائے اور وژن اہمیت کی حامل ہو سکتی ہیں۔ اس نے فلم انڈسٹری کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں ایک صحافی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ "فلم انڈسٹری کے بارے میں بہت سی غلط باتیں مشہور ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلم نگری اچھی جگہ نہیں جب کہ میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہر شعبہ میں ہوتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے فلم انڈسٹری اچھی جگہ لگی ہے۔ جہاں میری سبھی سے دوستی ہے۔ شاہ رخ خان، سلمان خان، ابھیشیک بچن، سیف علی خان سمیت تقریباً سب ہی سے اچھے تعلقات ہیں۔" اس ضمن میں بات کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ "میں کبھی بھی کسی خاص کیمپ کا حصہ نہیں بنی، شاید اس لیے کہ میں سب سے بہتر ریلیشن شپ قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے غیبت کرنا یا اس عمل کا حصہ بننا اچھا نہیں لگتا ہے۔ جہاں کچھ لوگ بیٹھے کسی کی برائیاں کر رہے ہوں وہاں سے فوراً اٹھ جاتی ہوں کیونکہ مجھے اس عمل سے شدید نفرت ہے اسی لیے میرے دوستوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس بات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی یہ اداکارہ بہت خوب صورت ہے بہت اچھی ہے۔ غیبت بہت بڑی برائی ہے۔ اتنی بڑی برائی کہ ہمارے مذہب میں تو غیبت کرنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھا رہا ہے..... یہ لڑکی ہمارے دین سے تعلق نہیں رکھتی مگر اس کی سوچ کتنی پاکیزہ ہے۔ یقیناً یہ اس کے بڑوں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں انہوں نے اسے جھوٹ سے نفرت پیدا کرائی وہیں اس برائی سے بھی بچنے کی ترغیب دی۔ پریتی نے اپنی دوستی کے بارے میں اپنے افیئر کے معاملے میں بھی لب کشائی کی ہے۔" اس کا کہنا ہے۔ "فلم انڈسٹری میں میری دوستی صرف دوستی کی حد تک ہی رہی ہے۔ کسی کے ساتھ معاملہ افیئر کی حد تک نہیں گیا۔ افیئر سے خود کو بچائے رکھنے کی سب سے بڑی وجہ میری فیملی تھی۔ جیسا کہ بتا چکی ہوں کہ دادا فلموں میں آنے کی وجہ سے سخت ناراض تھے۔ تاہم انہوں نے نیم رضامندی ظاہر کرتے ہوئے مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر خاندان کے نام کو بٹہ لگا تو گھر میں کبھی قدم نہیں رکھنا۔ میں نے دادا کی اس تنبیہ کو نہ صرف توجہ سے سنا بلکہ اسے ہمیشہ یاد رکھا کیوں کہ ڈیڈی کی موت کے بعد دادا ہی ہمارے لیے سب کچھ تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے کسی عمل سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ کسی میل کو ایکٹر سے لنک اپ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے ساتھ کام کرنے والے سارے کے سارے ہیرو شادی شدہ تھے اور

میری پروموشن کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ شادی شدہ مردوں سے اس قسم کے تعلق کو انتہائی برا جانتی ہوں۔ اسی لیے نہ کسی شادی شدہ مرد میں دلچسپی ظاہر کی نہ ہی کسی ایسے مرد کو اپنی جانب پیش قدمی کی اجازت دی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کوئی آپ کے ساتھ زبردستی کچھ نہیں کرسکتا جب تک کہ آپ کی طرف سے کوئی سگنل نہ ملے۔ اگر عورت ایک حد متعین کرلے تو کسی مرد کی جرأت نہیں کہ اس حد کو عبور کرنے کے بارے میں سوچے بھی۔ کسی بھی CO اسٹار سے لنک اپ نہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ صرف وہ میرے دوست تھے بلکہ ان کی بیویوں سے بھی میرے اچھے تعلقات تھے، خواہ کرینہ کپور ہو یا سوزانے خان یا پھر کوئی اور، سبھی میری اچھی دوست ہیں۔ لہٰذا کیسے ممکن تھا کہ اپنی ان ڈیئر فرینڈز کی ازدواجی زندگیوں میں زہر گھولنے کا سبب بنتی؟ میں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ کبھی کسی سے ایسا تعلق نہیں رکھا جس پر شرمندگی ہو اور نہ ہی اس قسم کی حرکتوں کے ذریعے کیریئر کو آگے بڑھانے کے بارے میں سوچا۔ میں آج جو کچھ ہوں اس کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ کسی میل کو ایکٹر سے محبت کی پینگیں بڑھا کر آگے بڑھوں گی۔ ہاں ڈیٹنگ ضرور کی ہے لیکن انڈسٹری میں سے کبھی کسی کے ساتھ نہیں بلکہ باہر کے مردوں کے ساتھ۔"

"لیکن سیف علی خان اور شیکھر کپور کے ساتھ پریتی کے افیئرز کی افواہیں تو بہت اڑی تھیں جو محض افواہیں ہی تھیں۔ پریتی ان کے بارے میں کہتی ہے کہ ان میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں۔ سیف میرا دوست ہے اور دوستوں میں جیسی محبت ہوتی ہے، ایسی ہی ہمارے درمیان تھی اور پھر کرینہ کپور نے مجھے اپنی شادی میں انوائٹ کیا تھا۔ کیا کوئی عورت شوہر کی محبوبہ کو اپنی شادی میں بلا سکتی ہے؟ اگر ہمارے درمیان ایسا کچھ ہوتا تو کرینہ کبھی بھی اپنی شادی میں مجھے دعوت نہیں دیتی مگر وہ جانتی تھی کہ سچ کیا ہے۔" پریتی نے تو مزید افواہوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ "بوبی دیول کے ساتھ بھی مجھے لنک کیا گیا جب کہ کوئی نہیں جانتا کہ بوبی اور تانیا کو ملانے میں، میں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح رتھک روشن کی سابق وائف سوزانے بھی میری بہترین دوست رہی ہے بلکہ رتھک سے ملنے سے پہلے ہی سوزانے کو میں جانتی تھی۔ ہماری دوستی 1997ء سے جاری ہے اور اب جب کہ دونوں میں علیحدگی ہوچکی ہے اب بھی اس سے دوستی کا رشتہ قائم ہے۔ میں اسے پیار سے "جاپ" کہتی تھی۔ یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی کے شوہر کے ساتھ میرے ایسے ویسے تعلقات ہوتے تو کیا یہ میرے ساتھ دوستی رکھتیں؟ افواہوں کا کیا ہے۔ انڈسٹری میں کون ہے جس کے بارے میں کچھ نہ کچھ غلط نہ پھیلایا گیا ہو۔ تاہم میں اپنے بارے میں دعوے سے کہتی ہوں کہ اگر کسی کے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے کہ کسی CO ایکٹر کے ساتھ میرا لنک اپ رہا ہے تو لاکر دکھائے۔ میں اسے ایک کروڑ روپے انعام دوں گی۔ میرا تعلق ایسی کٹر فیملی سے ہے کہ اگر اس قسم کی حرکت کرلی تو مجھے میرے گھر والے ہی قبول نہیں کریں گے۔ رہی شیکھر کپور کی بات جس کی سابق بیوی سچترا کرشنا مورتی نے ایک بار الزام لگایا تھا کہ شیکھر اور میرے درمیان لنک اپ ہے۔ اس کے جواب میں، میں نے کہا تھا کہ اس عورت کو اپنے دماغ کا علاج کسی مینٹل اسپتال سے کرانا چاہیے۔ میرے اس شدید ردعمل پر کئی لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم نے بہت سخت جواب دیا ہے۔ واضح رہے کہ شیکھر صاحب میرے استاد کی جگہ ہیں۔ ان کے ساتھ اس قسم کا تعلق رکھنے کے بارے میں سوچنا بھی پاپ سمجھتی ہوں۔" پریتی کہتی ہے۔ "شیکھر جی کے ساتھ ایک بار میں نے تاج ہوٹل میں لنچ کیا تھا جس پر ان کی ایکس وائف نے یہ گھٹیا الزام لگا دیا حالانکہ وہ ایک پروفیشنل لنچ تھا جس کے دوران ہمارے درمیان ایک پروجیکٹ ڈسکس ہوتا رہا۔ کوئی پرسنل بات نہیں ہوئی۔ پھر بیچ کے دس برس تک شیکھر صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔" پریتی کا کہنا ہے۔ "اس الزام سے نہ صرف مجھے تکلیف ہوئی بلکہ جس کے ساتھ ان دنوں ڈیٹنگ میں مصروف تھی اسے بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ تاہم اس نے مجھے کول رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے اس الزام کے جواب میں خاموش رہنے کو کہا تھا لیکن میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ سچترا اپنا میوزک ویڈیو البم لانچ کررہی تھی اور اسے پبلسٹی کی ضرورت تھی لہٰذا اس نے نیوز میں ان رہنے کے لیے یہ گھٹیا طریقہ سوچا اور اس پر عمل کیا تھا۔"

سلمان خان کے ساتھ بھی پریتی کے تعلقات کو سبوتاژ کرنے کے لیے کچھ لوگوں نے مذموم کوشش کی تھی۔ جس کے بارے میں وہ کہتی ہے۔ "اس ٹیپ میں سلمان اور مجھ سمیت دیگر ایکٹرز سے متعلق عجیب مواد شامل کیا گیا تھا۔ دراصل انتہائی مہارت سے ہمارے ویڈیو کلپس کو توڑ مروڑ کر ایسی شکل دے دی گئی تھی جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ہم

نے ایک دوسرے کے خلاف بے ہودہ باتیں کی ہیں۔ اس ٹیپ کو بنانے والوں کا مقصد میرے خیال میں یہ تھا کہ ہم ایکٹرز کے درمیان اختلافات ہو جائیں۔ اس ٹیپ پر میڈیا میں بہت شور مچا تھا۔ ایسی گھٹیا حرکت پر میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں؟ تاہم جب معائنے کے بعد یہ ٹیپ جعلی ثابت ہوا تو اطمینان ہوا اور میں اس معاملے کو کورٹ لے گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ فتح میری یعنی سچ کی ہوئی۔ اس بے ہودہ حرکت نے سلمان اور میرے تعلقات پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ ہم اب بھی دوست ہیں اور ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔''

اسی دوران نیس واڈیا کے ساتھ بھی کچھ باتیں میڈیا کی زینت بنیں۔ اس کے ساتھ بھی پریتی کو منسلک کرنے کی باتیں میڈیا پر آئی تھیں جن کے بارے میں پریتی نے بھی لب کشائی کی ہے۔ وہ چونکہ جھوٹ نہیں بولتی۔ اس لیے اس نے یہ بات بڑی جرأت کے ساتھ کہی ہے۔ ''اس بات سے انکار نہیں کروں گی کہ نیس واڈیا سے افیئر رہا ہے لیکن اب ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے بریک اپ کی وجہ نیس کی ماں مرین واڈیا کو قرار دیا جاتا ہے جب کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میڈیا نے انہیں ''پیار کی دشمن'' کے طور پر پیش کیا ہے لیکن وہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ میرے اور نیس کے تعلق پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ ان کا برتاؤ ہمیشہ میرے ساتھ اچھا رہا۔ آج نیس اور میں دوست ہیں اور اپنی کرکٹ ٹیم کنگز الیون پنجاب کے پارٹنر بھی ہیں۔ ایک بار آئی پی ایل کے دوران ہماری ٹیم میچ جیتی تو میں نے خوشی سے نیس کو گلے لگا لیا تھا جسے خوب ہائی لائٹ کیا گیا۔ حالانکہ جیت کی خوشی میں یہ بے اختیار سرزد ہونے والا عمل تھا جب کہ میڈیا نے اسے الگ ہی رنگ دے دیا تھا۔''

فلموں میں اداکاری کرتے کرتے وہ ایک دم کرکٹ کی ایسی شیدائی کیسے بن گئی کہ آئی پی ایل میں کھیلنے والی ایک ٹیم کی پارٹنر بن گئی۔ کیونکہ اسے شروع ہی سے اسپورٹس سے محبت تھی۔ گیارہ سال تک اس نے جمناسٹک کی، کراٹے سیکھے، باسکٹ بال، گھڑ سواری اور رائفل شوٹنگ جیسے کھیلوں میں حصہ لیا۔ ابتدا ہی سے اسے کرکٹ سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے ڈیڈ بھارت میں اسپورٹس اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اپنے بچوں کی اسپورٹس سے دلچسپی دیکھ کر یہ خیال آیا ہو کہ ان کے دیس میں ایسا اسکول ہونا چاہیے جس میں

کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والے تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔

''آئی پی ایل کی اونر شپ بھی اس کی کرکٹ سے گہرے لگاؤ کی وجہ سے تھی۔ بہت سے فلم والے اور فلم والیاں فلموں سے کمایا ہوا پیسہ کسی اور کاروبار میں لگاتے ہیں۔ پریتی نے بھی آئی پی ایل کی ایک ٹیم کنگز الیون پنجاب پر اس لیے سرمایہ کاری کی تھی کہ مالی فائدہ حاصل کرے۔ مگر کرکٹ سے محبت اور اپنی ٹیم کی آنر شپ سے فائدہ کی وجہ سے تو اس نے فلموں سے بریک لیا اور ایسی ایسی فلموں کو سائن کرنے سے بھی انکار کر دیا جو بعد میں سپرہٹ ثابت ہوئیں۔ یہ سب کچھ اس نے اس لیے کیا کہ اپنی تمام توجہ اپنی ٹیم کو دے سکے۔ اس ضمن میں اس کا کہنا ہے۔'' کیونکہ میں ٹیم کو بزنس کی طرح لیتی تھی اور بزنس کو اگر بھرپور وقت نہ دیا جائے تو نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔''

''پریتی کے پاس چونکہ بزنس کی ڈگری بھی ہے اس لیے وہ اپنے بزنس پر سنجیدگی سے توجہ دیتی ہے اس نے اس شعبے میں خود کو یکسر بدل ڈالا۔ نہ زیادہ میک اپ کرتی نہ ہی جینز وغیرہ پہنتی کہ مرد اسے سنجیدگی سے لیں اور اس کا احترام کریں۔'' پھر بھی اس پر انگلیاں اٹھیں۔ اس بارے میں وہ کہتی ہے۔'' کسی بھی بزنس میں ایک عورت کے ساتھ دنیا کیسا سلوک کرتی ہے اس کا اندازہ مجھے کنگز الیون پنجاب کی اونر شپ کے دوران ہوا۔ نیٹ پر میرے متعلق ایسی ایسی باتیں لکھی گئیں کہ میں نے سماجی ویب سائٹ کا استعمال ہی بند کر دیا۔ میرے اور نیس کے بارے میں وہ کچھ کہا گیا جس کے بارے میں سوچ کر غصہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ ایک بار میں نے ڈائمنڈ کی ایک انگوٹھی خریدی مگر بڑی انگلی میں فٹ نہ ہو سکی۔ اس لیے اسے واپس کر دیا۔ جس پر خبر بن گئی کہ نیس واڈیا نے میرے لیے رنگ خریدی تھی جو منگنی ٹوٹنے کے بعد واپس لے لی۔ اسی طرح اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کو گلے لگانے پر بھی میرے بارے میں چٹ پٹی خبریں سامنے آئیں حالانکہ شاہ رخ، وجے ملایا، نیتا امبانی بھی اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کو گلے لگاتے ہیں لیکن میں نے ایسا کیا تو ایشو بن گیا کہ یوراج یا بریٹ لی سے میرا چکر ہے۔ پہلے تو اس قسم کی بے ہودہ خبروں پر مجھے بہت غصہ آتا تھا مگر جب مجھے اس بات کا ادراک ہوا کہ میں آئی پی ایل کی سب سے زیادہ پُرکشش اونر ہوں اسی لیے مجھے ٹارگٹ کیا جاتا ہے۔ تو اب ایسی باتوں کو نظر انداز کرنے لگی ہوں مگر اس بات پر افسوس ضرور ہوتا ہے کہ لوگ حقائق جانے بغیر کیوں

کسی کے خلاف من گھڑت باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔"

اس کے علاوہ ایک اسکینڈل اور بھی تھا۔ شاندار امروہی والا۔

شاندار امروہی کا قصہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی وصیت میں پریتی کے نام کروڑوں کی جائیداد کی تھی جس پر کچھ افسانہ طرازوں نے یہ کنٹروورسی پیدا کردی کہ ان سے پریتی کا کوئی خفیہ رشتہ تھا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اگر کوئی رشتہ تھا تو باپ بیٹی جیسا رشتہ تھا۔ اس معاملے پر پریتی اس طرح وضاحت کرتی ہے۔

"امروہوی صاحب مجھ سے اپنی بیٹی کی طرح محبت کرتے تھے۔ میں بھی ان کا احترام کرتی تھی اور ہر مشکل وقت میں ان کے ساتھ کھڑی ہوجاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب ان کے رشتے دار بھی ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی ساری جایداد میرے نام کردی تھی مگر میں نے کورٹ میں اس وصیت نامے کو پھاڑ دیا اور ایک پیسا بھی نہیں لیا۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنے زور بازو سے کمائے ہوئے پیسے پر ہی بھروسا کیا اور کسی سے بھی کچھ نہیں لیا۔ اس واقعے کے بعد مجھے بولی وڈ کی امیر ترین اداکارہ قرار دیا جانے لگا۔"

اس کے خلاف ایک بار یہ افواہیں بھی پھیلائی گئیں کہ پریتی منشیات کی عادی ہوچکی ہے اور نشے کی عادت سے جان چھڑانے کے لیے فارن کنٹری سے علاج کروا رہی ہے۔ ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے پریتی نے کہا۔ "حالانکہ میں باقاعدگی سے خون کا عطیہ دیتی رہتی ہوں۔ اب کوئی بتائے کہ کسی نشئی کا کیا خون لیا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی یہ ثابت کردے کہ فلاں ملک کے فلاں اسپتال میں میرا علاج چل رہا تھا تو اسے ایک کروڑ روپے دوں گی۔" وہ تو یہاں تک کہتی ہے۔ "اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو اپنے بالوں کا نمونہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ ان کے ٹیسٹ سے پتا چل جائے گا کہ میں منشیات استعمال کرتی ہوں یا نہیں؟" وہ کہتی ہے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں، مجھے کیوں پریشان کرتے ہیں؟ میں جب تک ہیروئن تھی مجھے خوب پذیرائی ملتی تھی مگر جونہی آئی پی ایل میں داخل ہوئی میرے خلاف منفی پروپیگنڈہ شروع ہوگیا۔ ٹورنامنٹ کے دوران میری ٹیم کو کیس میں انوالو کیا گیا جس میں ہمیں کامیابی ملی۔ ان سب منفی باتوں سے قطع نظر میری توجہ اپنی ٹیم پر رہی۔ میری ٹیم کے لڑکے بہت اچھے ہیں اور اُمید ہے ہماری ٹیم ایک دن آئی پی ایل کی ٹرافی ضرور حاصل کرلے گی۔"

حسن و دولت اور عیش و آرام ہی بہترین زندگی کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ جتنی باتیں پریتی کے حوالے سے ہوئیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے باپ کی بیٹی اور بڑی اداکارہ ہونے کے باوجود پریتی کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے جن سے اس کے صبر و سکون میں بڑا خلل پیدا ہوا اس کی زندگی میں بڑی بدمزگی پیدا ہوئی۔ دو واقعات تو اس کی زندگی میں ایسے آئے کہ اس نے اپنی موت کو اپنے سے بہت قریب دیکھا ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتی ہے۔ "کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میری زندگی میں غیر معمولی واقعات کا ہونا معمول کا حصہ ہے۔ ان میں سے دو واقعات تو ایسے ہیں جب میں نے اپنی موت کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا، ان میں سے ایک سری لنکا میں پیش آیا۔ میں وہاں اپنے ذاتی کام کے سلسلے میں گئی تھی۔ وہاں اپنی آنکھوں سے بم بلاسٹ ہوتے دیکھا جس میں انسان چیتھڑوں کی طرح اڑ گئے تھے۔ ہر طرف خون ہی خون اور انسانی اعضا تڑپتے لاشے جن میں بچے بھی تھے اور بڑے بھی۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ ایسا خوف ناک منظر تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں بم کی رینج سے باہر تھی۔ دوسری بار موت کا رقص تھائی لینڈ میں دیکھا جہاں چھٹیاں منانے گئی تھی کہ سونامی آگیا جس نے لمحوں میں سب کچھ تہس نہس کرکے رکھ دیا۔ سمندر کی بپھری ہوئی لہروں نے وہ تباہی مچائی کہ اسے قیامت صغریٰ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس طوفان میں اپنے کئی دوستوں کو کھویا ہے۔ میں اس طوفان کی زد میں آنے سے بچ گئی تھی مگر مہینوں تک خوف سے سو نہیں سکی تھی۔ راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور رونے لگتی تھی۔ اس وقت ذہن میں یہی سوچ ہوتی کہ کاش میں بھی اس طوفان کی نذر ہو جاتی کیونکہ میرا صبر و سکون برباد ہوگیا تھا۔ چنانچہ زندگی میں پہلی بار سائیکولوجسٹ کے پاس گئی۔ ان دنوں ایک عجیب عادت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ جب بھی اس خوفناک طوفان کی یاد آتی تو فوراً ایکسر سائز کرنے لگتی جس سے ذہن کو خوف سے نجات مل جاتی۔ فلم "سلام نمستے" میں میرا اکسرتی جسم اسی وجہ سے ہے کہ ان دنوں خوب ورزش کرتی تھی کیونکہ اس سے سکون ملتا تھا۔ اس کے علاوہ خوف پر قابو پانے کے لیے اسکیوبا ڈائیونگ

بھی سیکھی۔ ان دو واقعات نے مجھے زندگی کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔''

کیسی عجیب بات ہے ہر شخص جانتا ہے کہ موت برحق ہے، جو دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن یہاں سے جانا ہے پھر بھی لوگ موت سے اس قدر ڈرتے ہیں۔ پریتی زنٹا تو ایک بہادر عورت ہے پھر بھی اپنے قریب موت کو دیکھا تو خوف سے نفسیاتی مریضہ بن گئی۔ پریتی حقیقتاً بہت بہادر خاتون ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ باشعور ہے اور اپنے نظریات پر سختی سے قائم۔ اپنے بارے میں اس کی اپنی اور لوگوں کی کیا سوچ ہے اس سلسلے میں وہ یوں کہتی ہے۔

''لوگ مجھے بہادر، نڈر اور جرأت مند کہتے ہیں۔ شاید ان کے ذہنوں میں میرا امیج اس لیے بنا ہے کہ میں کہیں بھی کچھ بھی کہنے سے کہیں چوکتی۔ بے جھجک اپنے احساسات کا اظہار کر دیتی ہوں۔ لوگوں کی رائے سے قطع نظر خود کو بہادر تو نہیں سمجھتی البتہ کوشش کرتی ہوں کہ غلط کو غلط کہوں، خواہ وہ غلط کام کوئی بھی کر رہا ہو۔ اپنی اس فطرت کے باعث انڈر ورلڈ کی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ حوصلہ دکھانے پر مجھے ایوارڈ بھی دیا گیا۔ حالانکہ میری نظر میں، میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا تھا بس برائی کے خلاف آواز اٹھا کر تھوڑی سی ہمت دکھائی تھی۔ ویسے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ انڈر ورلڈ سے ٹکر لینے پر ابھی تک زندہ کیسے ہوں؟ شاید اس لیے کہ اس قسم کے قدم اٹھانے پر میری ہمیشہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔'' اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ مزید بھی کہتی ہے۔ ''میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ انسان جیسا ہو اس کو ویسا ہی پیش کرنا چاہیے۔ کسی بھی قسم کا مصنوعی خول نہیں چڑھانا چاہیے۔ اگرچہ ہم ایکٹرز کو ایسا بننا پڑتا ہے جیسے ہم نہیں ہوتے اور اس کام کے ہمیں پیسے بھی ملتے ہیں لیکن ریئل لائف میں اپنا اصل امیج شو کرنے پر مجھے ایک طرح کا اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ شوبز میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنی اداکارانہ شخصیت سے زیادہ اپنے اصل امیج کو اس قدر اہمیت دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں دانستہ دوسروں سے الگ یا منفرد نظر آنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ پیرنٹس نے میری تربیت کچھ اس انداز سے کی ہے کہ ہر معاملے میں منفرد طریقے سے سوچتی ہوں۔ باتا پا دونوں نے یہی سکھایا کہ چیزوں کو مختلف ویوز سے دیکھو اور کسی دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے اپنی رائے کا اظہار کرو۔ کیونکہ تمہارے پاس بھی عقل ہے۔ وہ کہتی ہے مجھے یاد ہے بچپن میں جیسا دوسرے بچے کرتے تھے ویسا ہی میں بھی کرتی تھی۔ جب پوچھا جاتا۔ تم نے یہ کام کیوں کیا؟ تو جواب دیتی اس لیے کہ دوسرے بچے بھی ایسا کر رہے تھے تو والدین کہتے کیا تمہارے دوستوں نے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں یہ کام کرنے پر مجبور کیا تھا؟ ڈیڈی سمجھاتے ہوئے کہتے۔ بیٹا! تمہاری اپنی ایک شخصیت ہے، تم بھی دماغ رکھتی ہو جو عقل سے بھرا ہے۔ تمہارے پاس کسی بھی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے انتخاب کی پاور موجود ہے اس لیے زندگی میں ہمیشہ خود فیصلے کرو۔ خواہ وہ دوسروں کی نظر میں غلط ہوں یا صحیح۔ چنانچہ ڈیڈی کی ایسی باتوں سے میری شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے۔ آج میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں خواہ میری رائے کسی کو اچھی لگے یا بری۔ اپنی سوچ کے مطابق مجھے جو بہتر لگتا ہے وہی کرتی ہوں۔''

پریتی کی یہ باتیں سب کے لیے مشعل راہ ہیں۔ پریتی کے پڑھے لکھے اور روشن خیال ماں باپ نے اس کی رہنمائی کے لیے جو باتیں اسے بتائیں ان پر عمل کر کے جس طرح پریتی نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے ان پر عمل کر کے دوسرے بھی کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ آج کے بچوں کی مجبوری یہ ہے کہ ان کے والدین کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے تھوڑا وقت ان کے ساتھ گزاریں۔ لہٰذا ایسی باتیں انہیں جہاں سے بھی ملیں انہیں گرہ سے باندھ لینا چاہیے ان پر عمل کرنا چاہیے۔

ایکٹریس، بزنس وومن، کنگز الیون پنجاب کی کو اونر یہ تمام پریتی کے حوالے ہیں، اکثر لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ ذاتی طور پر تم کس حیثیت کو پسند کرتی ہو؟

پریتی کا جواب سنیے۔ وہ مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔ ''جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے تو میں سب سے بڑھ کر انسان ہونا پسند کرتی ہوں کیونکہ انسانیت کے درجے پر فائز ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے مگر افسوس کہ آج اس مادہ پرست ترقی یافتہ دنیا میں ہر چیز کی بہتات ہے جب کہ انسانیت قحط سے دوچار ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں افراد میں ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی کم ہے جو حقیقت میں انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔ چہرے مہرے اور حلیے سے بظاہر انسان نظر آنے والوں کے اندر اگر جھانک کر دیکھا جائے تو ان انسان نما افراد کی اکثریت میں انسانیت نام کو بھی

نہیں ملے گی۔ اگر یہ واقعی انسان ہوتے تو آج اس جہان کا یہ حال نہ ہوتا۔ اخبار اٹھا کر دیکھ لیں یا نیوز چینل ٹیون اپ کرلیں آپ کو ہر طرف بے چینی، نفسانفسی، قتل وغارت گری، بم بلاسٹ، ظلم وستم اور ناانصافی نظر آئے گی اسی لیے میں کہتی ہوں کہ ہم کچھ اور بھلے نہ بنیں کم ازکم انسان تو بن ہی جائیں تاکہ ہمارا یہ گلوبل ولیج امن وآشتی کا گہوارہ بن جائے۔"

یہ پاکیزہ خیالات ایک فلم ایکٹریس کے ہیں۔ فلم والے محض فلم والے نہیں ہوتے ان میں ایسے اعلیٰ وارفع جذبات کے حامل افراد بھی ہوتے ہیں۔

پریتی نے محض فلموں میں کام کیا فلم پروڈکشن کی طرف توجہ نہیں دی اگرچہ وہ بزنس وومن بھی ہے۔ اس نے ایک فلم پروڈیوس کی تھی "عشق ان پیرس" اس کا اسکرپٹ بھی اس نے خود لکھا تھا مگر یہ فلم چلی نہیں۔ باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی۔

کسی بھی فلم کی کامیابی یا ناکامی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ پریتی کی زبانی ہی سنیے۔

"میرے ڈائریکٹر پریم آر سونی کو کینسر ڈائیگنوز ہوا تھا۔ اس لیے اس کی پروگریس رک گئی تھی۔ میں کسی اور ڈائریکٹر سے فلم مکمل کرواسکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس طرح فلم مکمل ہونے اور ریلیز ہونے میں تاخیر ہوگئی۔ اگرچہ کچھ میڈیا پرسنز نے اس موقع پر بھی مس گائیڈ کیا اور کہا کہ اس فلم کی ریلیز اس لیے رکی ہوئی ہے کہ اسے کوئی خریدنے والا نہیں۔"

البتہ عشق ان پیرس کے بعد پریتی نے کسی اور فلم کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ کرکٹ کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کسی اور سے عشق کرنے کی اسے مہلت ہی نہیں ملی۔

مگر جب آئی پی ایل کا میلہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کا ذہن فلموں کی طرف بھی مائل ہونے لگتا ہے۔ 2015 کے IPL کا میلہ بھی اختتام پذیر ہوچکا ہے شاید اسی لیے فلموں کے حوالے سے اس کی کچھ خبریں میڈیا پر آنے لگی ہیں۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح تروتازہ ہے۔ اس لیے فلمساز اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

شادی کے بارے میں کہتی ہے کہ جیسے ہی من کا میت ملا شادی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گی اور بچے بھی پیدا کروں گی۔

حالانکہ اداکارائیں جلدی شادی کہاں کرتی ہیں کیونکہ عام طور پر ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ شادی کے بعد ان کی عوامی مقبولیت میں کمی آجائے گی۔ عالیہ بھٹ، انوشکا شرما، سوناکشی سنہا وغیرہ کیا شادی کی عمر کو نہیں پہنچی ہیں؟ مگر ابھی تک وہ انڈسٹری میں بے بی ڈول بھی جاتی ہیں۔ کاجل، ایشوریہ، کرینہ کپور اور رانی مکھرجی نے اس وقت شادی کی جب وہ 35 اور چالیس کی حدیں عبور کرگئیں۔ اس لیے پریتی کو بھی شاید ابھی جلدی نہیں ہے۔

پریتی نے بڑی جدوجہد کی ہے۔ آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے اپنی تعلیم اور تربیت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے دیکھیے وہ خود اس بارے میں کیا کہتی ہے۔

"اپنی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو یہ مجھے رولر کوسٹر کی طرح لگتی ہے جس میں نشیب بھی آئے اور فراز بھی، کامیابیاں بھی ملیں اور ناکامیوں کا بھی منہ دیکھنا پڑا۔ دکھ بھی اٹھائے اور خوشیوں کا جشن بھی منایا۔ بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ نت نئے تجربات ہوئے تاہم ایک بات کی خوشی ہے کہ زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے اپنے فیصلے خود کیے۔ جو درست بھی رہے اور غلط بھی ثابت ہوئے مگر میں ان پر قائم رہی۔ ان سے سیکھا کہ کس طرح زندگی کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ اگرچہ بہت سے تنازعات اور غیر معمولی واقعات کا سامنا رہا لیکن ان سب کے باوجود اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ آنے والے وقت میں میرے لیے بہت کچھ اچھا ہونے والا ہے۔ مستقبل میں بہت سے کام کرنے کی خواہش ہے۔ انسانیت کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ ہماری دنیا بہت خوب صورت ہے اور ہماری ویلیوز اچھی ہیں لیکن کچھ چیزیں اس ویلیس کی خوب صورتی کو ماند کردیتی ہیں۔ مثلاً ایک لڑکی کا گینگ ریپ ہوجاتا ہے اور لوگ کھڑے دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کرپاتا۔ ان چیزوں کا احساس کرنا چاہیے اور ان کے خاتمے کے لیے اچھے لوگوں کو سیاست میں آنا چاہیے۔ لہٰذا میرا مستقبل میں سیاست کے میدان میں آنے کا ارادہ بھی ہے۔ ویسے تو کئی سیاسی جماعتوں کی جانب سے الیکشن لڑنے کی آفر ہوچکی ہے مگر میں نے انکار کردیا کیونکہ ابھی سیاست کے لیے خود کو بہت کم عمر سمجھتی ہوں لیکن کسی روز ضرور سیاست داں بن کر اپنے دیس کی خدمت کرنا چاہوں گی۔ مجھے دوبارہ نئی زندگی ملی ہے شاید قدرت مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔"

نیلم احمد بشیر

اس وادئ شب میں قحط کا آسیب اترا تھا۔ سب اندوہ کا شکار تھے۔ زندگی رزقِ زمیں بنتی جارہی تھی اور رمقِ زندگی خواب ہو گئی تھی۔ ہر سو موت کی پرچھائیاں تھیں اور لوگ جینے کی آرزو میں بھاگ رہے تھے۔ بچھڑے خواب دامن پکڑ پکڑ کر آگے دھکیل رہے تھے۔ ایسے وقت میں باپ کی محبت اور ممتا کے جذبے برسرِپیکار ہوئے اور ایک نئی کہانی نے جنم لیا۔

ایک ماں کی ممتا کا عکاس قصہ ٔ ملال

اپنا گاؤں چھوڑنے کو اس کا کب جی چاہتا تھا مگر عبدالحئی اور عمارہ اب مجبور ہو گئے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ انہیں یہی جدی پشتی گاؤں اب بےگانہ لگنے لگا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی دشمن کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ سالہا سال سے صومالیہ کی دھرتی پر بارش کی ٹھنڈی میٹھی، حیات آفریں بوندوں نے برسنا چھوڑ رکھا تھا مگر اب کے برس تو ایسا ظالم اور بے رحم قحط پھیلنے لگا تھا کہ بڑے بوڑھے کہہ اٹھے تھے۔ کم از کم آدھی صدی تک ہم نے ایسی ویرانی اور وحشت نہ دیکھی

تھی۔
لوگ دانے دانے کو محتاج ہوئے جا رہے تھے۔ پیٹ خالی، زبانیں خشک، ہونٹ پیاسے اور آنکھیں ہر دم آسمانوں کی طرف لگی ہوں تو جینے میں کوئی مزہ نہیں رہتا۔ ''مٹی کا پیالہ'' کہلائے جانے والا یہ ملک بھوک کا پیالہ بن چکا تھا۔ اکثر گھرانوں میں آٹھ دس بچے اور چند بزرگ موجود تھے جو خوراک، صحت، سہولیات کے فقدان کی وجہ سے جان کنی کے عالم میں مبتلا تھے۔ عبدالحیٰ اور عمارہ کی چھوٹی سی جھونپڑی میں ان کے علاوہ ان کے چھ بچے اور عمارہ کا بوڑھا باپ بدرالدین رہتا تھا جس کا اب ان کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بیوی مر چکی تھی اور دونوں جوان بیٹے باپ کو چھوڑ کر اپنا اپنا مقدر کھوجنے مختلف راستوں پر چل نکلے تھے۔ بڑا بیٹا عباس بحری قذاقوں کے ایک ٹولے میں شامل ہو کر ان سے بہت دور سمندروں میں جا بسا تھا۔ کئی کئی سال وہ اپنی شکل تک نہ دکھاتا۔ آتا تو ان کے لیے بہت سا لوٹ کا سامان لاتا اور فخریہ انداز میں کہتا۔ ''بابا ہم بڑا شاندار راہ ہیں یعنی اپنے سمندر کے سپاہی۔ سمندر ہمارے ہیں اور بدیسی جہازوں کو ہمارے پانیوں میں تیرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسی لیے ہم انہیں لوٹتے اور اپنے ساتھیوں اور خاندانوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔''
یہ حقیقت ہے کہ صومالی قذاقوں کی طاقت ان کی کمزور حکومت سے کہیں زیادہ ہے اس لیے انہیں روکنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے وہ بڑی کامیابی سے جہازوں کو یرغمال بناتے، تاوان وصولتے، سمندروں میں دندناتے پھرتے ہیں۔
بدرالدین کا دوسرا بیٹا فلّو باغی اسلامی جہادی گروپ الشباب میں بھرتی ہو کر جا چکا تھا۔ صومالیہ کے باغی افراد کی اس مضبوط اور فعال جماعت کے طور پر یہ چند مخصوص علاقوں میں بڑی کامیابی سے اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔ وہ قحط کے لیے کام کرنے والی مددگار یواین او تنظیموں کو جاسوس قرار دے کر ان سے خوراک، ادویات اور دیگر امدادی سامان چھین لیتے ہیں اور افریقن یونین کے امن قائم رکھنے والے گروپس سے جن میں ریڈ کراس بھی شامل ہے، اکثر برسر پیکار رہتے ہیں۔
بدرالدین اکثر اپنے بیٹوں کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا جس پر عمارہ چڑ جاتی۔ دونوں بھائی بڈھے باپ کو اس کے اور اس کے شوہر کے حوالے کر کے خود بے نیازی سے زندگی گزار رہے تھے اور انہوں نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی تھی کہ ان کی بہن، اس کا خاندان اور ان کا باپ قحط کے عفریت سے کس طرح مقابلہ کر کے زندہ رہنے کی کوششیں کر رہے تھے۔
عمارہ اور عبدالحیٰ کو اپنے بچوں کے بھوکے پیاسے رہنے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ چھ کے چھ بچوں میں ان کی جان تھی اور وہ انہیں حد سے زیادہ پیارے تھے۔ سب سے چھوٹا علی موسیٰ تو ابھی محض چند ماہ کا ہی تھا۔ تیکھے نقوش بڑی بڑی ذہین آنکھوں والا تھا۔ ان سب کو بہت پیارا لگتا اور سب اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ نانا بدرالدین بھی اس کا دیوانہ تھا۔ کبھی کبھی لاڈ پیار میں پچکارتے ہوئے اسے اپنے بیٹے فلّو بابا کے نام سے پکارنے لگتا۔ تو عمارہ کے ماتھے پر تیوری پڑ جاتی۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی مگر پھر زبان سے کچھ نہ کہتی اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی۔ اسے دکھ ہوتا کہ علی موسیٰ ایسے دنوں میں پیدا ہوا ہے جب نہ ان کے گھر میں بندھی واحد گائے کے تھنوں میں کوئی دودھ بچا ہے اور نہ ہی اس کی چھاتیوں میں۔ کبھی کبھار تو وہ یہ بھی سوچنے لگ جاتی۔ ہمارے ہاں پانچ بچے تو پہلے ہی تھے۔ اگر یہ چھٹا علی موسیٰ، اس سوکھی، اجڑی، بنجر، پیاسی دنیا میں نہ آتا تو اللہ کا کیا بگڑ جاتا۔ اس گھر میں پہلے کیا کم نہ تھے کھلانے کو؟
عبدالحیٰ کئی سالوں سے بیکار تھا۔ ایک زمانے میں وہ ہیروں کی کانوں میں مزدوری کیا کرتا تھا تو وہ لوگ روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ ڈی بیئرز Debeers نامی یورپی کمپنی نے کئی زمانوں سے افریقا کی کانوں سے ہیرے نکالنے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ وہ مقامی افراد کو کانوں میں بھیجتے اور وہاں سے کچے، بے ساخت، ناتراشیدہ ہیرے نکلوا کر اپنے ترقی یافتہ ملکوں کے کارخانوں کو بھیجتے جہاں انہیں کیمیائی عمل سے مناسب ساخت کے ہیروں کی شکل دی جاتی اور پھر فروخت کے لیے دنیا بھر میں بھیجا جاتا ہے۔ خریدار ملکوں میں بسنے والی حسین انگلیوں اور کرسٹل وائن گلاسوں جیسی نازک گردنیں رکھنے والی نازنین جب دلکش آویزوں اور گلوبندوں سے اپنے آپ کو سجاتی، سنوارتی ہیں تو انہیں کہاں خبر ہوتی ہے کہ ان چمکتے، دمکتے پتھروں میں محنت کے پسینے اور خون کی ننھی بوندوں کی آمیزش رچی ہوئی ہوتی ہے۔
عبدالحیٰ کو دن بھر کی اجرت کے محض دس سینٹ ملتے تھے جس سے اس کے خاندان کا بمشکل ہی گزارا ہوتا تھا۔ ایک روز ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد گھر آتے ہوئے اسے

زمین میں گڑا ہوا ایک ننھا سا ہیرا نظر آ گیا تو اس نے اسے قدرت کی طرف سے اپنی خوش بختی کا انعام سمجھ کر اٹھا لیا اور گھر لا کر عمارہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ کیا عبدالحیٰ؟ ہم اس کا کیا کریں گے؟'' عمارہ نے حیران ہو کر اپنے شوہر سے سوال کیا جس کے خوشی کے مارے دانت نکلتے ہی جا رہے تھے۔

''میری جان! یہ تحفہ ہے میری طرف سے۔ تو اسے سنبھال کے رکھ لے۔ میں ایک روز اس کی انگوٹھی بنوا کر تیری انگلی میں پہناؤں گا تو بڑی پیاری لگے گی۔'' اس نے اپنے سات بچوں کی ماں، صابر بیوی کو سنایا تو اس کے خوب صورت سلونے نقوش گلاب کی طرح کھل اٹھے۔ جی میں جھوم اٹھی مگر جھوٹ موٹ اٹھلا کر بولی۔

''لے بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ میں اس کا کیا کروں گی؟ یہ تو گورے صاحبوں کی گوری میموں کے ہاتھوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں ہمارے تو پیٹ کو اناج چاہیے اور بس۔ میں تو دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ آسمان سے خوب پانی برسے۔ ہمارے کنویں، کھیت کھلیان سب کی ویرانی دور ہو اور ہمارے جانور اور بچے پھلیں پھولیں۔ بھرے پیٹ سے سوئیں۔'' عمارہ نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

عبدالحیٰ نے ٹھنڈی سانس بھری پھر ہیرے کو اپنی بیوی کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''چل پگلی ابھی تو سنبھال اسے برا وقت آیا تو اسے شہر جا کر بیچ بھی دیں گے۔ آخر کام ہی آئے گا نا۔''

عمارہ نے ہیرے کو ایک ننھی سی پوٹلی میں باندھ کر ایک محفوظ جگہ چھپا دیا اور سوچنے لگی۔ شاید یہ ہیرا ہمیں ہمارے دکھوں سے نجات دلوا دے۔ شاید واقعی ہمیں ایک نئی زندگی دے سکے۔ اسے لگا ایک قیمتی اثاثہ اس کے ہاتھ آ گیا ہے جس کی اسے ہر حالت میں اب رکھوالی کرنا ہے۔ افسوس کہ وہ دن آتا دکھائی نہ دیا جس میں عمارہ اپنے پیارے شوہر کی لائی ہوئی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن کر اتراتی ہوئی اپنے شوہر کو دکھا دکھا کر لجاتی۔ سوسو بل کھاتی دھرتی سے بھوک اگتی اور آسمان سے پیاس برستی تھی۔ ایسے میں ہیرے کا وہ کیا کر سکتے تھے گاؤں کے سبھی خاندانوں کا بھوک اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔ کنویں تالاب سب سوکھ چکے تھے۔ ڈھور ڈنگر دم توڑ رہے تھے سرسبز زمین خشک ہو کر مرجھا چکی تھی اور قحط کا بھوت چاروں طرف ننگا ناچ رہا تھا۔ چاروں طرف سے ایسی بری بری خبریں آ رہی تھیں کہ بھوک پیاس کے مارے سینکڑوں بچے مدفوق ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر رزق خاک بنتے جا رہے تھے۔ عبدالحیٰ اور عمارہ بھی اپنے خاندان کے بارے میں فکر مند تھے کہ اسے کیسے بچا پائیں گے۔

گاؤں میں اعلان ہو چکا تھا کہ سب لوگ اپنا بچا کھچا سامان اور اشیائے خورد و نوش سنبھالیں اور دوداب کی طرف چل دیں جو ایک بہت پرانا، قابل اعتماد، اقوام متحدہ کے زیر نگرانی چلنے والا ریفوجی کیمپ تھا۔ دوداب، کینیا؟ اتنی دور پہنچنے میں تو بہت دن لگیں گے۔ عبدالحیٰ نے اپنے بھائی مستقیم سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور کوئی چارہ بھی تو نہیں بھائی۔ بھوک کے مارے بچے بلک رہے ہیں اور ہم بھی نڈھال ہیں۔'' مستقیم نے ہولے سے کہا۔ نقاہت کے مارے اس کے منہ سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اسے اپنے بچوں اور بیوی کی فکر تھی۔ سبھی پریشان تھے۔ اس لیے صبح سویرے ہی ایک قافلہ تیار ہو گیا اور دوداب کی جانب چلنے لگا جو سننے میں آیا تھا کہ تقریباً چالیس دن کی پیدل مسافت پر تھا۔

ایک پریشان ہجوم ہولے ہولے قدموں سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ سورج سے ظلم برستا تھا اور گرم ہوائیں بار بار رستہ روکنے پر تلی نظر آتی تھیں۔ اڑتی ہوئی گرم ریت کے ذرے آنکھوں میں سوئیوں کی طرح چبھتے تو کچھ دیر کے لیے اندھا ہی کر کے رکھ دیتے۔ سب کا ایک ہی مشن تھا۔ دوداب پہنچنا، ہر قیمت اور ہر حالت میں۔ بڑھے ہوئے پیٹوں، بڑے بڑے سروں، غیر متوازن جسموں والے بچے، کمروں پر لادے گود میں اٹھائے ماں باپ سسکتے، تڑپتے، لڑھکتے، ڈھلکتے سب چلتے ہی جا رہے تھے کبھی گرتے کبھی اٹھتے اور اٹھ کر پھر ہمت سے چلنے لگتے تھے۔

''وہاں پالک اور گوبھی، بھی تو روز مل جایا کرے گی نا۔'' عمارہ کے باپ بابا بدرالدین نے چلتے چلتے بیٹی سے کہا۔ عمارہ نے سر ہلا کر اسے جواب دے دیا۔

''بیٹی تھوڑا سا پانی دے دے۔'' اس نے عمارہ اور اس کے شوہر عبدالحیٰ کی کمروں کے گرد بندھی چند پانی کی بوتلیں دیکھ کر کہا تو عبدالحیٰ نے رک کر بابا کو چند گھونٹ پانی پلا دیا۔ ''ارے دے دے بیٹا بڑی پیاس لگی ہے۔'' بابا نے التجا کی تو عمارہ نے تڑپ کے بوتل اپنے شوہر کے ہاتھ سے لے لی۔

''کیا کرتے ہو۔ بچوں کے لیے پانی کم پڑ جائے گا۔

ابھی ہمیں اسی پانی پر چالیس دن جینا ہے۔ بابا کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔" عمارہ نے بے چین ہوکر کہا۔ بدرالدین خاموش ہوگیا۔ اپنی قمیص سے اپنے ہاتھ پاؤں پونچھے اور خاموشی سے سب کے ساتھ چلنے لگا۔

عبدالحئی کے بھائی مستقیم کے دو چھوٹے بچے اب تقریباً حواس کھو بیٹھے تھے وہ اور اس کی بیوی آمنہ انہیں گود میں لیے گرم گرم ریت پر بیٹھ کر رونے پیٹنے لگے۔ لوگ بھی آس پاس کھڑے ہوکر افسوس کرنے لگے۔

"دیکھو بھائی مستقیم! اب یہ بچے تو بچیں گے نہیں۔ ان کی خاطر ہمارا قافلہ رک نہیں سکتا۔ بہتر یہی ہوگا کہ انہیں یہیں زمین پر لیٹا چھوڑ دو اور اللہ کے حوالے کردو سپرد خدا۔ دیکھو رسولن اور اس کا شوہر نبی بخش بھی اپنا بچہ خدا کے حوالے کر رہے ہیں۔ آمنہ اور مستقیم نے گردن گھما کر دیکھا۔ ان کے گاؤں کے لوہار نبی بخش اور رسولن اپنے ننھے منے بچے کو گڑھا کھود کر اس میں نیچے اتار رہے تھے۔ رسولن کی اپنی حالت بھی بگڑ رہی تھی۔

عبدالحئی اور عمارہ کے دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ انہوں نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ سارا صحرا ننھے ننھے تازہ کھدے ہوئے گڑھوں سے بھرا پڑا تھا۔ کتنے ہی لوگ اپنے جگر گوشوں کو زمین میں دفنا چکے تھے۔ غالباً بہت سے قافلے دوداب کی طرف چلے جارہے تھے۔"

"توبہ کتنا مشکل ہے۔ میں تو شاید ایسا نہ کرسکوں۔ بڑی ہمت ہے آمنہ اور مستقیم کی۔" عمارہ نے اپنے کمزور، نڈھال بچوں کو سمیٹتے ہوئے ہولے سے کہا اور علی موسیٰ کو اپنے سینے سے مزید چپکا لیا۔"

میرا مینا علی موسیٰ، ننھی حمدہ اور ابوبکر میں چلنے کی سکت نظر نہ آتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دونوں بچے نڈھال ہوکر زمین پر گر گئے۔ عمارہ کے رشتے دار ابوالحسن اور اس کی بیوی جلیلہ تڑپ کر ان کی طرف بڑھے مگر یہ دیکھ کر انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرلیں کہ ننھی حمدہ کا سانسوں سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح ایک طرف کو لڑھک گئی تھی۔ ابوبکر اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ جلیلہ نے اپنے شوہر کے ہاتھ سے پانی کی چھاگل کھینچ کر ابوبکر کے منہ میں چند قطرے ٹپکائے مگر وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس میں جاتی آتی سانس دکھائی نہ دیتی تھی۔ ابوالحسن کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تھوڑا پانی بچانا ہے۔ ان کے لیے اپنے لیے۔" اس نے اپنے بقیہ بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر سوکھی ٹہنیوں کی مدد سے ایک ننھا سا گڑھا کھود کر حمدہ کو اس میں ڈال دیا۔ ابوبکر نہ مرا تھا نہ جیتا تھا۔ قافلہ روانہ ہو رہا تھا۔ سورج سر پر آگیا تھا۔ ابوالحسن نے ابوبکر کو گود میں اٹھایا تو قافلے میں سے ایک بولا۔ "اسے اللہ کے سپرد کرو بھائی اور بس اب آگے چلو۔ اس کے حصے کا پانی..... کام آئے گا۔ ان جانوں پر ضائع نہ کرو جو عنقریب پھڑ پھڑا کر اپنے قفس سے آزاد ہوجائیں گی۔"

ابوالحسن اور اس کی بیوی جلیلہ اپنے چار سالہ نیم مردہ پیارے ابوبکر کو صحرا کی تپتی گود میں لٹا کر آنسو بہاتے آگے بڑھ گئے۔ اس نیم جاں کی سوالیہ آنکھیں دیر تک ان کے حواس پر چھائی رہیں۔

"توبہ میں تو ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ بھلا اپنے بچوں کو یوں تنہا نیم مردہ چھوڑ کر کیسے کوئی جاسکتا ہے؟" عمارہ بولی تو ابوالحسن خاموش رہا۔

قافلے کے لوگ وقفے وقفے سے ڈال پر پکے پھلوں کی طرح زمین پر گر کر جان کی بازی ہارتے چلے جارہے تھے۔ عمارہ اور ابوالحسن اپنے بچوں کو یوں بچا کر آگے آگے ہانک رہے تھے جیسے انہیں موت کے بے رحم پنجوں سے ہر قیمت پر بچا لینے کا عہد کر رکھا ہو۔

"عمارہ بیٹا! ایک بات بتاؤں یہ صحرا ہمیشہ سے ایسا تھوڑی تھا۔ بہت پرانے زمانے میں یہ سبزہ زار ہوا کرتا تھا۔ میرے دادا کے پردادا نے اپنے پردادا سے یہ بات سن رکھی تھی۔ یہاں پھول کھلتے اور سبز جنگلوں میں ہرن قلانچیں بھرتے تھے۔ تتلیاں، سرخ گلابوں پر ڈولتی اور گائے بھینسوں کے تھن سفید سفید جھاگیں اڑاتے دودھ سے بھرے رہتے تھے۔ سب لوگ مکھن اور بالائی کھاتے تھے۔ اناج سے پیٹ اور بھڑولے بھرنے رہتے تھے۔"

بابا بدرالدین بولے چلا جارہا تھا مگر عمارہ کو اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے باپ کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا تھا۔ انسان کو کھانا نہ ملے تو اس کا اپنا دماغ خود کو کترنا اور کھانا شروع کردیتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جھرجھری لی۔

"سچ نانا! تو پھر ہماری باری میں صحرا اتنا ظالم کیوں ہوگیا ہے؟" دس بارہ سالہ نواسا محمود نانا سے پوچھنے لگا۔

"بس بارش ہم سے روٹھی اور ہمارا رزق اٹھ گیا۔

بارش کو مناؤ تو سب ہرا بھرا ہو جائے گا۔" بابا بدرالدین زور زور سے قہقہے لگاتا۔ "اے میری محبوبہ بارش آ اور مجھے سیراب کر دے، نہال کر دے۔"

عمارہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر اس کے گال پر جا کر جم گیا۔ وہ حیران سی ہو گئی۔ تو کیا ابھی میرے جسم میں اتنا پانی ہے کہ اس سے آنسو کا ایک قطرہ ہی بن سکے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے رونا نہیں چاہیے۔ میں روئی تو پانی کا ایک قیمتی قطرہ ضائع ہو جائے گا۔ کیا خبر وہ قطرہ میرے ننھے علی موسیٰ کے لیے دودھ کا ایک قطرہ ہی بن جائے۔ مجھے علی رضا کے لیے اس حیات بخش بوند کو بچانا ہے۔ مجھے اپنا بچہ بچانا ہے۔

"دیکھو بھائیو اور بہنو! ہم سب اس وقت ایک مشکل وقت بلکہ قیامت سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے بچے بھوک سے مر رہے ہیں مگر ہمیں اپنے ہوش و حواس کھونا نہیں چاہیے۔ اپنا پانی راشن کر کے رکھیں۔ جو بچے اب اتنی سکت نہیں رکھتے کہ آگے جا سکیں انہیں اللہ کے سپرد کریں اور آگے کو چلیں۔ ان کے لیے پانی بچائیں جو ابھی جیتے ہیں اور شاید جیتے ہی رہیں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت کٹھن فیصلہ ہے مگر ہم سب کو کرنا ہی ہو گا۔" قافلے کے سربراہ مرد نے اپنی بچی کھچی طاقت مجتمع کر کے اعلان کیا تو بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے نیم مردہ بچے زمین پر لٹائے اور سینے کوٹ کوٹ کر بین کرنے لگے۔ پھر روتے پیٹتے ہوئے اٹھے اور بچوں کو چھوڑ کر آگے کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ آہیں، سسکیاں اور گرم ہوائیں مل جل کر ایک ماتم میں تبدیل ہو گئیں اور چاروں طرف ایک افسردگی چھا گئی۔

"ہم دوواب پہنچتے ہی اس ہیرے کو بیچ دیں گے۔ تم فکر نہ کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عبدالحئی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے کہہ تو دیا مگر خود زمین پر گر کر بے سدھ ہو گیا۔ عمارہ تڑپ کر اس پر جھکی، ہلایا مگر اس کا محبوب شوہر تو اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ عمارہ مچھلی کی طرح گرم ریت پر لوٹنیاں لینے لگی۔ عبدالحئی کا چوغہ پکڑ کر کھینچنا چاہا مگر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ عبدالحئی اب کسی اور ہی طرف جانے والے قافلے میں شامل ہو چکا تھا۔ اب ایک ایسی کٹی پتنگ تھا جو اس سے کٹ کر بہت دور جا چکی تھی اور وہ اسے دوبارہ کبھی آسمانوں میں اڑتے ہوئے دیکھ نہ سکے گی۔

اپنے پیارے شوہر اور زندگی کے ہم سفر عبدالحئی کا ساتھ چھوٹ جانے پر وہ سر میں خاک ڈال کر بین ڈالتا

برہان الدین جانم

(متوفی 1982ء)

اردو شاعر، میراں جی شاہ شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ، بیجاپور میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ علوم ظاہری و باطنی اپنے والد سے حاصل کیے۔ ان کی متعدد تصنیفات دکنی زبان میں ہیں، جن میں سے اکثر منظوم ہیں۔ موضوع تصوف و سلوک ہے۔ ان میں وصیت الہادی، سک سہیلا اور منفعت الایمان زیادہ مشہور ہیں۔ دوسری کتابیں نکتہ، واحد، بسم الکلام رموز الواصلین، بشارت الذکر، جنت البقا اور ارشاد نامہ ہیں۔ کلام کا ایک مجموعہ حقیقت کے نام سے بھی ہے۔

مرسلہ: عطیہ زہرا۔ جہلم

ابوالہول

دنیا بھر میں ابوالہول سے زیادہ عظیم الشان اسٹیچو اور کوئی نہیں ہے۔ ماسپرو نے سچ کہا ہے کہ جس آرٹ نے ایسی ٹھوس چٹان سے یہ مجسمہ کاٹا ہے۔ وہ آرٹ بلاشبہ کامل ہے۔ یقیناً ابوالہول عجائب روزگار میں سے ہے۔ ابوالہول کا چہرہ آدمی کا ہے اور باقی جسم شیر کا ہے۔ ناک ٹوٹ چکی ہے مگر ہونٹوں پر ایک عجیب اور مبہم مسکراہٹ اب تک باقی ہے۔ ابوالہول جیزہ شہر میں بڑے اہرام کے آگے ریگستان کی چوٹی پر کھڑا ہے اور اس کا رخ مشرق کی جانب ہے تاکہ سورج کی پہلی کرن وہی دیکھے۔ اس کی لمبائی ستاون میٹر ہے اونچائی بیس میٹر اور چہرے کی چوڑائی پانچ میٹر ہے۔ اس کے کان 1/37 میٹر، ناک 1/70 میٹر اور منہ 1/32 میٹر کا ہے۔ یہ پورا بت ایک ہی پتھر کا ہے۔ یونہی کہیں کہیں معمولی جوڑ پائے جاتے ہیں۔ نئی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ابوالہول اصل میں فرعون خفرع کا مجسمہ ہے۔ (تقریباً 869 ق م) خفرع اپنے سے پہلے فرعون خوفو کے جیسا ہرم تو نہ بنا سکا مگر ابوالہول بنا کر اس نے دنیا کے آرٹ میں بہت ہی اہم اضافہ کیا۔

مرسلہ: بخشی محمد عزیز۔ میلسی ضلع وہاڑی

چاہتی تھی مگر قافلے والوں کے پاس مرنے والوں کے سوگ کے لیے طاقت اور وقت نہیں تھا۔ وہ تو بس وہ داب پہنچنا چاہتے تھے صرف چلتے ہی جا رہے تھے۔ عمارہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے سوچتی رہی۔ اس کے بچوں کے باپ عبدالحئی نے گزشتہ دنوں میں سب سے کم کھایا اور پیا تھا۔ یہی کہتا تھا۔ ''بچوں کے لیے بچانا زیادہ ضروری ہے۔ میں ٹھیک رہوں گا۔ خشک روٹیوں کے چند ٹکڑے عمارہ نے اپنی کمر پر لادے ہوئے تھیلے میں بچا رکھے تھے۔ چند بوتلوں میں بچا پانی جیسا خزانہ بھی انہوں نے اپنے کلیجے سے لگا رکھا تھا مگر اس کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ بھوکے پیاسے بچے اور بابا بدرالدین لڑکھڑاتے، سسکتے اپنے آپ کو گھسیٹتے بس چلتے چلے جا رہے تھے۔ اسی لمحے ایک گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ بابا بدرالدین نے آسمان کی جانب دیکھا۔ یو این ایڈ کا ایک ہیلی کاپٹر ان کے سروں کے بالکل اوپر سے گزر رہا تھا۔ سبھی کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ایک سفید فام شخص نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ سب سمجھے کہ اب آسمان سے من و سلویٰ ٹپکے گا سو انہوں نے گرمجوشی سے جواب میں زور زور سے ہاتھ ہلائے۔ مگر ہیلی کاپٹر انہیں دیکھ کر بس چپکے سے گزر ہی گیا۔ کچھ ہوا نہیں۔
ننھا لوا سا رضا، نانا سے پوچھنے لگا۔
''نانا یہ اللہ میاں تھے؟ یہ نیچے کیوں نہیں آئے۔ ہمیں روٹی کیوں نہیں دیتے؟''
بابا بدرالدین خاموش رہا۔ اسے عبدالحئی کے گزر جانے سے یکدم بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ سوچیں اسے ڈسنے لگیں۔ ''کیا ہم سب یونہی بھوکے پیاسے اس صحرا میں مر کھپ جائیں گے۔ گڑھوں کی تہوں میں بیٹھی ہوئی صحرائی چھپکلیوں اور سانپوں کی غذا بن جائیں گے۔ جہاز میں بیٹھے گورے گورے لوگوں کو تو اوپر سے ہم محض کالے کالے سوکھے سوکھے چیونٹے ہی لگتے ہوں گے اور چند کالے چیونٹے دنیا سے ختم ہو بھی جائیں تو بھلا دنیا کو کیا فرق پڑتا ہے۔'' بابا اونچی آواز میں اپنی تباہی بکنے لگا۔
پھر ایسا ایک دن عمارہ کی زندگی میں بھی آ گیا جب اس کے لیے اپنے بچوں کو ساتھ گھسیٹنا ممکن نہ رہا۔ دو تو ایسے سوئے کہ پھر صبح اٹھے ہی نہیں۔ تین نیم مردہ ہو کر بے سکت ریت پر پڑے رہے۔ قافلے والے مجبور کرنے لگے کہ وہ انہیں یونہی سپرد خدا کر کے آگے چلی جائے ورنہ وہ اسے چھوڑ جائیں گے۔ عمارہ کو خود سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ بھی اتنی بے رحم، سنگ دل ہو جائے گی کہ اپنے جگر گوشوں کو اس طرح سے چھوڑ سکتی ہے مگر پھر علی رضا اور بابا کی خاطر وہ بھی پتھر کی بن گئی اور آگے بڑھ گئی۔ بابا بدرالدین کو کوئی خاص اعتراض نہ محسوس ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خوش تھا کہ کھانے والے منہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ روٹی کے چند ٹکڑے اور پانی کے چند گھونٹ بچ رہیں گے تو فائدہ ہی ہوگا نا۔
''ٹھیک کہہ رہے ہیں قافلے والے کہ اب ان زندہ لاشوں کو کیا تکلیف دینی۔ انہیں اللہ کے سپرد کر دو بیٹی اور آگے چلو۔'' اس نے عمارہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ عمارہ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بابا کو کچھ جواب دیتی۔ ایک بے جان بت کی طرح خاموشی سے اٹھی اور صحرا کی ریت میں اپنے قدموں کے نشان چھوڑتی آگے بڑھنے لگی۔ ان کا سفر ابھی جاری تھا مگر اس کے بچوں کی منزل شاید خود ہی قریب چلی آئی تھی۔ اسے شاید ان پر رحم آ گیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی۔ مگر اسے یہ یقین تھا وہ اپنے نیم مردہ بچوں کے پیاسے لب، ویران و حیران آنکھیں اپنے ذہن کے پردے سے کبھی کسی طرح نہ ہٹا پائے گی۔
کم از کم ابھی علی موسیٰ تو زندہ تھا۔ اس کے پاس تھا۔ وہ اسے ہر قیمت پر زندہ بچا لینے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہی اس کے جینے کا سہارا ہو سکتا تھا۔ اے اللہ میری مدد فرما۔ وہ علی موسیٰ کے چڑیا جیسے کھلے منہ میں اپنی سوکھی چھاتی دے کر دعائیں مانگنے لگی۔ اس نے علی موسیٰ کے بے شمار بوسے لے لیے۔ کتنا معصوم اور بے بس تھا اس کا ننھا۔ اس کا کل اثاثہ اب یہی تھا۔ عمارہ نے حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا۔
''ابا اللہ میاں اوپر رہتا ہے نا؟'' کوئی بچہ اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا۔
''ہاں بیٹا دعا کرو۔ اللہ مینہ برسائے اور ہمیں کھانا ملے۔'' اس کے باپ نے بیٹے کو پچکارتے ہوئے کہا۔
''بابا اللہ میاں ہمیں کھانا کیوں نہیں دیتا؟'' بیٹے نے پھر سوال کیا۔
''دے گا بیٹا ضرور دے گا۔ بس دعا کرتے رہو۔'' باپ نے ہولے سے کہا یوں جیسے اسے اپنی بات پر خود بھی اعتبار نہ ہو۔
رات سر پر آ گئی تھی۔ تھکن اور بھوک سے نڈھال لوگ پھر بھی بے سدھ ہو کر سو گئے۔ ٹھنڈی ہوا مہربان تھی انہیں دنیا و مافیہا کے احساس سے بے گانہ کر دیا مگر تڑکے ہی صحرا کا مزاج بدلنے لگا۔ گرد کا ایک طاقتور طوفان اٹھا اور

انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ گرم گرم ہواؤں کے بگولے بپھر کر ان پر حملہ آور ہو گئے اور انہیں ان کی بے بسی اور کم مائیگی کا احساس دلانے لگے۔ عمارہ، علی موسیٰ اور بابا تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ اسی افراتفری میں عمارہ نے دیکھا کہ ریت کے طوفان سے بھی ایک بڑا طوفان ان کے سر پر آپہنچا تھا اور ان کو حواس باختہ کر کے رکھ دیا۔

قافلے کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے گھیرے میں لے لیا اور ان سے بچا کھچا کھانے پینے کا سامان چھیننے لگے۔ عمارہ نے الٹے سیدھے ہاتھ مار کے روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے اور پانی کی ایک بوتل اپنے گھاگھرے میں چھپالی اور خود علی موسیٰ سمیت ایک خیمے میں چھپ گئی۔ ڈاکو اس سے روٹی اور پانی تو نہ لوٹ سکے مگر ایک دو نے آگے بڑھ کر عورتوں کو پامال کرتے ہوئے عمارہ کو بھی روند ڈالا۔

قافلے والوں کی عورتیں یوں سرعام لٹ جانے، رگیدے جانے پر احساس ذلت سے منہ پر کپڑا ڈالے روئے چلی جارہی تھیں مگر ان کے مردوں کے پاس اتنا جذبہ بھی نہ بچا تھا کہ وہ انہیں تسلی اور حوصلہ ہی دے سکتے۔ بے حس خاموش پتھر بنے کھڑے انہیں دیکھتے تھے اور زبان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ بھوک نے ان سے ہر قسم کا احساس اور جذبہ چھین لیا تھا۔

کوئی بات نہیں، شکر ہے میں روٹی اور پانی بچا لینے میں کامیاب رہی۔" عمارہ کے دل میں طمانیت بھری ایک لہر اٹھی اور اسے شانت کر گئی۔ اس نے پانی کی آدھی بوتل کو پیار سے یوں سہلایا جیسے وہ ننھے علی موسیٰ کا پیارا سا بدن ہو۔ وہ والہانہ انداز میں بوتل کو چومنے لگی اور پھر چند قطرے اپنے منے کے حلق میں ٹپکا دیے۔ اب تو ہر قطرہ آب حیات تھا۔ علی موسیٰ نے اپنی آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا تو عمارہ کی جان میں جان آگئی ورنہ وہ تو کچھ فکرمند سی ہو گئی تھی کہ علی موسیٰ بھی کہیں اسے اکیلا چھوڑ کر اپنے باپ اور بھن بھائی کے پاس نہ چلا گیا ہو۔

"میری بچی تو لٹ گئی۔ خدا غارت کرے ان ڈاکوؤں کو۔" بابا بدرالدین اپنی بیٹی کی پامالی پر آنسو بہاتے ہوئے بولا۔ "تیرا بھائی اسی لیے الشباب میں شامل ہوا ہے کہ ایسی بدی کا خاتمہ کر سکے۔" بدرالدین نے اپنے بیٹے کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"نام نہ لو میرے بھائیوں کا، ایسے ہوتے ہیں بھائی۔ ہم لٹ گئے برباد ہو گئے کوئی ہماری مدد کو نہ آیا۔"

عمارہ دانت پیس کے ایسے چیخی کہ بابا سہم گیا اور عجیب عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"چل کوئی بات نہیں میری بچی۔ تو خود کسی مرد سے کم ہے کیا؟ ہم لوگ زندہ ہیں شکر ہے خدا کا۔"

"وہ واب کب آئے گا بھائی۔" بابا قافلے والوں سے بار بار پوچھنے لگا جس کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا کہ کسی کے پاس اس کے اس سوال کا جواب تھا ہی کہاں۔

"چل تیرا بھائی عباس تو خوب پانی پیتا ہوگا۔ سمندر میں گھر اور رہتا ہے نا۔" بابا پھر اپنے بیٹے کو یاد کرنے لگا۔

"ہائے میرا بیٹا۔"

"تیرا بیٹا ایک بحری قذاق ہے بابا، لٹیرا ہے، اگر اتنا اچھا ہوتا تو تجھے اور مجھے یوں چھوڑ کر آرام سے نہ رہتا۔ دیکھ ہم کیسے صحرا میں دربدر ہو رہے ہیں۔ مت یاد کر ان جنموں کو۔" عمارہ نے پھر بابا کو ڈانٹ کر سرزنش کی۔

"اچھا یہ بتا...... وہ تو ٹھیک ہے نا؟" بدرالدین نے یکلخت موضوع بدل کر پوچھا۔

"کون علی موسیٰ؟" عمارہ نے بھولپن سے سوال کیا۔

"ارے نہیں پگلی...... وہ......؟"

"اچھا؟ بابا ہاں۔" عمارہ سمجھ گئی کہ بابا کا اشارہ اس ہیرے کی طرف ہے جسے اس نے گھر سے نکلتے وقت اپنے کپڑوں میں ہی سی لیا تھا اور کچھ کچھ دیر بعد دیکھ کر تسلی کرتی رہتی تھی کہ وہ ہے، کہیں گم نہیں ہوا۔

"بس فکر نہ کرو۔" وہ واپ پہنچتے ہی ہم اسے بیچ دیں گے تو بہت سے پیسے مل جائیں گے اور اب تو بس ہم تین ہی ہیں۔ آرام سے گزارہ ہو جائے گا۔ ہائے بیٹا عبدالحئی...... میرے بیٹوں سے بڑھ کر اس نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔" بابا یکدم دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ عمارہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی کچھ نہیں بولی۔

"وہ اور بچے بھی ہوتے تو ہم سب کتنا خوش ہوتے، خوب کھاتے پیتے۔" بابا بولتا گیا مگر نہ جانے عمارہ کو کیوں لگا جیسے بابا دل سے یہ بات نہیں کر رہا اور وہ دل ہی دل میں مطمئن ہے کہ افراد خانہ کم ہو گئے ہیں۔

"ویسے وہ...... ہے کہاں؟ حفاظت سے ہے نا؟"

"تم فکر نہ کرو۔ عمارہ نے مختصر جواب دیا اور سوچنے لگی۔ میرے اپنے ہیرے ریت میں دفن ہو گئے مگر علی موسیٰ کو میں مشت خاک میں تبدیل نہیں ہونے دوں گی۔ ہر قیمت پر بچاؤں گی۔ اس کے ننھے سوکھے ڈھانچے جیسے بدن

کو سینے سے مزید چپکاتے ہوئے اسے بہت طاقت محسوس ہوئی اور وہ نئے سرے سے مضبوط قدم جماتی قافلے والوں کے ساتھ چلنے لگی۔ سب کے چہرے لٹک چکے تھے اور کہنے سننے کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہ بچا تھا سب کسی ہارے ہوئے لشکر کے سپاہیوں کی طرح مردہ قدموں سے چل رہے تھے۔

"ایک گھونٹ پانی تو دے دے بٹیا، پیاس سے مرا جارہا ہوں۔" بابا بدرالدین نے عمارہ سے کہا تو وہ یوں چونک اٹھی جیسے بابا نے اس سے دوجہاں کی دولت مانگ لی ہو۔

"پانی! مگر بابا پانی تو بالکل چند گھونٹ بچا ہے اور وہ میں نے علی موسیٰ کے لیے بچایا ہوا ہے۔" عمارہ تڑپ کر بولی۔

"علی موسیٰ...... علی موسیٰ...... کیا تو نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ ارے اس نے کہاں بچنا ہے۔ اس چھچھڑے کی خاطر تو مجھے پانی نہیں دے گی۔" بابا غصے میں چیخا۔

"یااللہ! یہ صحرا آخر سمندر کیوں نہیں بن جاتا؟ اسے سمندر بنا دے تاکہ ہم سب پانی پی پی کر مر جائیں۔ ہم مر کیوں نہیں جاتے۔ اللہ مجھ میں اب پیاس برداشت کرنے کی اور سکت نہیں ہے۔ میں کیوں بچ گیا ہوں؟" وہ زمین پر لوٹنیاں لگانے لگا۔

عمارہ اسے خاموشی سے تکتی رہی۔ ایک لفظ بھی نہ بولی۔

"میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں عمارہ۔ پانی دے دے مجھے۔" بابا بدرالدین اپنی بیٹی کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر التجائیں کرنے لگا۔

"تو تو اتنی اچھی، رحم دل بیٹی ہوا کرتی تھی۔ کیا ہوگیا ہے تجھے؟"

"نہیں ہے پانی میرے پاس۔" عمارہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"تیرا دل اتنا سخت کیسے ہوگیا بیٹی۔"

"بابا رحم دل وہ ہوتا ہے جس کے پاس دینے کے لیے کچھ ہوتا ہے۔ علی موسیٰ کے علاوہ میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے۔" عمارہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی۔

"اس چار ماہ کے بچے کی خاطر اپنے ستر سالہ باپ کو مار دے گی ظالم عورت، وہ باپ جس نے تجھے پیدا کیا، کھلایا پلایا، پالا پوسا۔ دے دے پانی مجھے...... خدا کے واسطے...... رحم کر...... میں مرا جارہا ہوں۔"

بابا اپنی بیٹی کے ہاتھ سے بوتل لینے کو لپکا۔ قافلہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جارہا تھا اور باپ بیٹی اس واحد بوتل پر جھپٹ رہے تھے جس میں محض چند گھونٹ سامانِ حیات مقید تھا۔ اسی کشمکش میں علی موسیٰ کی کمزور گردن کبھی آگے کو لڑھکتی تھی اور کبھی پیچھے کو۔ مگر عمارہ نے اسے اپنی مضبوط گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیا۔

"اگر تو نے مجھے پانی نہ دیا تو میں تیرے اس منحوس بچے کا خود گلا دبا دوں گا۔" بابا دیوانوں کی طرح چلاتا ہوا عمارہ کے پیچھے دوڑا مگر نقاہت کے مارے زمین پر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی نیم جاں مینڈک کی طرح باہر کو نکلی پڑتی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولے بس یونہی تکے جارہا تھا کہ اسے اچانک لگا جیسے عمارہ، اس کی پیاری بیٹی اس کے بالکل قریب چلی آئی ہے۔ اس کا میلا بدرنگ گھاگرا اسے بے حد حسین لگ رہا تھا۔ آخر میری بٹیا کو مجھ پر ترس آ ہی گیا۔ آخر اپنے بوڑھے لاچار باپ کو مرنے کیسے دے سکتی تھی۔ بابا مسکرا کر بولا۔

"یہ لے بابا...... سپردِ خدا کیا تجھے میں نے۔" عمارہ نے باپ کی طرف سفید میلی سی پلاسٹک کی بوتل پھینکی اور ننھے علی موسیٰ کو چھاتی سے چپکائے خود دوڑتی ہوئی اس سے دور جاتی دکھائی دی۔

"چلو دفع ہوتی ہے تو ہو جائے، پانی تو دے گئی مجھے۔" بدرالدین نے بوتل کو ہاتھوں میں یوں تھام لیا جیسے وہ کائنات کا سب سے بڑا خزانہ اب اس کی تحویل میں ہو۔ ہانپتے کانپتے لرزتے ہاتھوں اور منہ سے کتے کی طرح باہر نکلی زبان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بدرالدین نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور اس کے اندر جھانکا۔ بے تابی سے اس کے حواس قابو میں نہ آرہے تھے۔

"کتیا نے محض ایک ہی بوند چھوڑی ہے۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ کس قدر چمکدار تابناک خوب صورت قطرہ تھا وہ۔ دوسرے ہی لمحے بدرالدین اپنا سر پیٹنے لگا بال نوچ نوچ کر زمین پر لوٹنے لگا۔ ساری کی ساری بوتل اس نے بار بار صحرا کی ریت پر انڈیل کر تسلی کرنا چاہی مگر قطرہ سالم رہا۔ اسے بار بار بوتل میں ڈالا تو قطرہ ٹھنکنانے لگتا۔ چمکتے لشکتے ہوئے اس کی آنکھیں خیرہ کرتا۔ صحرا کی گرم ریت کے بگولے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے اور اس کے دیوانے قہقہے سنتے رہے۔

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے تیسرے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے. ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

محمد علی

انھیں شہنشاہ جذبات کا خطاب دیا گیا، پاکستانی فلم انڈسٹری کا بے تاج بادشاہ ٹھہرایا گیا، انہوں نے عرصے تک اس نگری پر راج کیا۔ وہ ایک وجیہہ شخص، ایک باوقار انسان تھے، جنھوں نے نسلوں پر اپنا اثر چھوڑا۔ نہ تو ماضی میں ان کی مثال ملتی ہے، نہ ہی مستقبل میں کوئی امکان۔ اور یہ ممکن بھی کیوں کر ہو، وہ زرخیز مٹی ہی نہیں رہی، جہاں ایسے پیڑ اگا کرتے تھے۔

محمد علی ایک اداکار نہیں، ایک ادارہ تھے۔ پرواز کی خواہش تھی، پائلٹ بننے کی آرزو۔ مگر معاشی مسائل نے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ اتنے وسائل نہیں تھے کہ اکیڈمی کا حصہ بنتے۔ مگر قدرت نے بھی کہاں مایوس کیا۔ فن نے انھیں پر عطا کیے اور انہوں نے شہرت کی بلند ترین چوٹیوں پر بسیرا کیا۔ 277 سے زائد فلموں میں اداکاری کی۔ بیش تر نے شائقین پر اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ وہ بین الاقوامی شخصیت تھے۔ ذوالفقار بھٹو سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ کہا جاتا ہے، 1974 میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے چند اہم ترین شرکا نے محمد علی کے گھر قیام کیا۔ یاسر عرفات بھی ان کے مداح تھے۔ ایران نے بھی نشان سپاس سے نوازا۔ بھٹو سے دوستی کی وجہ سے ضیا دور ان پر کٹھن گزرا۔ تاہم بعد میں ان کے اور ضیاالحق کے تعلقات بہت خوشگوار ہوگئے۔ وہ ان کے ساتھ 1983 میں بھارت بھی گئے۔ نواز شریف کے وہ ایڈوائزر تھے۔

وہ 19 اپریل 1931 کو بھارت کے شہر رام پور میں پیدا ہوئے۔ چار بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے ہیں۔ ابھی تین سال کے تھے کہ والدہ جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس وقت ان کے والد سید مرشد علی کی عمر 35 برس تھی، مگر انہوں نے یہ سوچ کر شادی نہیں کی کہ نہ جانے سوتیلی ماں بچوں سے کیا سلوک کرے۔ سید مرشد دینی عالم تھے۔ خاندان خاصا مذہبی تھا۔ انگریزی تعلیم کا رجحان نہیں تھا۔ 14 سال کی عمر تک محمد علی نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی۔ مدرسے میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ہجرت کے بعد خاندان نے ملتان میں ڈیرا ڈالا۔ والد گڑ منڈی کی ایک مسجد کے خطیب رہے۔ یہاں ان کے والد کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ جدید تعلیم کی اہمیت آشکار ہوئی۔ انہوں نے 1949 میں محمد علی کو اسلامیہ اسکول، ملتان میں داخل کرا دیا۔ قابل تھے۔ ایک برس بعد ملت ہائی اسکول، ملتان میں نویں میں داخلہ مل گیا۔ برادری کے بیشتر

افراد سندھ میں آباد تھے، سو 1955 کے آس پاس وہ حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ سٹی کالج، حیدرآباد سے انٹر کیا۔ معاشی مسائل نے پاؤں پکڑ لیے۔ یافت کے ذرائع تلاش کیے۔ بڑے بھائی ارشاد علی ریڈیو پاکستان، حیدرآباد میں ڈراما آرٹسٹ تھے۔ ان کے وسیلے ادھر قدم رکھا۔ اس وقت ایک ڈرامے کے دس روپے ملا کرتے تھے۔ آواز میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ املا اور تلفظ پر گرفت تھی۔ جلد ہی خود کو بہ طور صداکار منوالیا۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور سے بھی پروگرام کیے۔ فلمی دنیا بھی یہی آواز لے کر پہنچی۔ ان کی آواز سن کر ریڈیو پاکستان کے جنرل ڈائریکٹر زیڈ اے بخاری نے انہیں کراچی بلا لیا۔ باقی مراحل بخاری صاحب کی صحبت میں طے ہوئے۔ مکالموں کی ادائیگی، جذبات کا برتاؤ انہوں نے سکھایا۔ تمام اسرار و رموز گھول کر پلا دیے۔

1962 میں فلم "چراغ جلتا رہا" سے کیریر کا آغاز کیا۔ فلم زیادہ کامیاب تو نہیں ہوئی، مگر محمد علی کی اداکاری نے لوگوں کو متوجہ کیا۔ کئی فلموں میں کاسٹ کیا گیا۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ انہیں ہیرو کے بجائے ولن کے کرداروں کی پیشکش ہوئی۔ اگلی چند فلموں میں وہ منفی کردار میں نظر آئے۔ 1963 میں ریلیز ہونے والی فلم "شرارت" صحیح معنوں میں ان کی شناخت بنی۔ قسمت کا ستارہ چمکا۔ ان کی کئی فلمیں ہٹ ہوئیں۔ ان کی اور زیبا کی جوڑی ناظرین کے دلوں میں گھر کر گئی۔ "چراغ جلتا رہا" میں وہ پہلی بار ساتھ نظر آئے تھے۔ انہوں نے ستر سے زائد فلمیں ساتھ کیں۔ فلم "تم ملے پیار ملا" کی شوٹنگ کے دوران 29 ستمبر 1966 کو اداکار آزاد کے گھر محمد علی۔ زیبا کا نکاح ہوا۔ انہوں نے "علی زیب" کے نام سے پروڈکشن ہاؤس بنایا تھا، جس نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔

محمد علی اور زیبا نے انتہائی خوش گوار زندگی گزاری۔ اللہ نے ہر نعمت عطا کی، مگر اولاد کی نعمت سے وہ محروم رہے۔ واضح رہے کہ زیبا کی پہلی شادی اداکار لالہ سدھیر سے ہوئی تھی، جس سے ان کی ایک بیٹی تھی۔ اس لڑکی کو محمد علی نے سگی بیٹی کی طرح پالا تھا۔ وہ ایک خیراتی ادارہ بھی چلایا کرتے تھے۔ ان کی فاؤنڈیشن کے تحت مختلف شہروں میں اسپتال قائم ہوئے۔ تمام اخراجات وہ اپنے وسائل سے پورے کرتے تھے۔ ان کی سخاوت کے اور بھی قصے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے، انہوں نے کئی بیواؤں اور یتیموں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ بہت سے غریبوں کے چولھے محمد علی کی وجہ سے جلتے تھے۔ وہ مستحق ساتھیوں کی بھی مدد کرتے۔

انہوں نے اندرا گاندھی کی خواہش پر ایک ہندوستانی فلم "کلرک" میں بھی کام کیا، جو 89 میں ریلیز ہوئی۔ فلم میں زیبا بھی تھیں۔ یہ منوج کمار کی فلم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایڈیٹنگ کے وقت جب منوج کمار نے فلم دیکھی، تو انہیں احساس ہوا کہ محمد علی کی جان دار اداکاری کے سامنے وہ بالکل دب گئے ہیں، انہوں نے ان کا کردار کاٹ دیا اور فلم بکس آفس پر ناکام رہی۔ وہ آخری عمر تک متحرک رہے۔ وہ کئی فلاحی اور سماجی اداروں کے رکن تھے۔ ان تمام امور میں ان کی پیاری بیوی بھی ان کے ہم رکاب رہیں۔ 19 مارچ 2006 کو لاہور میں حرکت قلب بند کر جانے سے لیجنڈ کا انتقال ہوا۔

مستنصر حسین تارڑ

ایک جانب یہ گریہ کہ ادب پڑھنے کا رجحان ختم ہوا، اب کتابیں کوئی نہیں خریدتا، دوسری طرف یہ عالم کہ ان صاحب کی کتب دھڑا دھڑ بکے جا رہی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج دنیا فلم اسٹارز اور کرکٹرز کے پیچھے دیوانی، کوئی قلم کار سڑک پر کھڑا ہو، تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ مگر ہمارے ممدوح نے اس نظریے کو بھی غلط ثابت کیا۔ ادبی میلوں میں ان کا سیشن کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ سیشن کے اختتام پر مداح انہیں یوں گھیر لیتے ہیں کہ شہد کی مکھیوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ آٹوگراف کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے من پسند ادیب کے ساتھ سیلفیاں بنائی جاتی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کو اردو کا مقبول ترین ادیب کہا جاسکتا ہے۔ فکشن ہو، سفرنامے یا کالم، انہوں نے لکھنے والوں کی پوری نسل کو متاثر کیا۔ بالخصوص ناولوں کی دنیا میں ان کا مقام جداگانہ ہے۔ "بہاؤ" جیسا لازوال ناول لکھا، جس نے ایک ناممکن دنیا کو ممکن کر دکھایا۔

مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ 1939 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، رحمت خان تارڑ گجرات کے ایک کاشت کار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد نے شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انہیں اپنے فکشن کا بھی موضوع

بتایا۔ بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں ان کا بچپن گزرا۔ سعادت حسن منٹو پڑوس میں رہتے تھے۔ وہ مشن ہائی اسکول، رنگ محل اور مسلم ماڈل ہائی اسکول کے طالب علم رہے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایف اے کے بعد برطانیہ کا رخ کیا، جہاں فلم، تھیٹر اور ادب کو نئے زاویے سے سمجھنے کا موقع ملا۔ پانچ چھ برس وہاں گزرے۔ 1957 میں شوق آوارگی انہیں ماسکو، روس میں ہونے والے یوتھ فیسٹیول لے گیا۔ اس سفر کی روداد 1959 میں ہفت روزہ قندیل میں شائع ہوئی۔ یہ قلمی سفر کا باقاعدہ آغاز تھا۔

پاکستان لوٹنے کے بعد جب اندر کا اداکار جاگا، تو انہوں نے پی ٹی وی کا رخ کیا۔ پہلی بار بہ طور اداکار "پرانی باتیں" نامی ڈرامے میں نظر آئے۔ "آدھی رات کا سورج" بہ طور مصنف پہلا ڈراما تھا، جو 74ء میں نشر ہوا۔ آنے والے برسوں میں مختلف حیثیتوں سے ٹی وی سے منسلک رہے۔ جہاں کئی یادگار ڈرامے لکھے، وہیں سیکڑوں بار بہ طور اداکار کیمرے کا سامنا کیا۔ پاکستان میں صبح کی نشریات کو اوج بخشنے والے میزبانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بچوں کے چاچا جی کے طور پر معروف ہوئے۔

1969 میں وہ یورپی ممالک کی سیاحت پر روانہ ہوئے، واپسی پر "نکلے تری تلاش میں" کے نام سے سفرنامہ لکھا۔ یہ 71ء میں شائع ہوا۔ قارئین اور ناقدین دونوں ہی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسے پڑھنے کے بعد محمد خالد اختر نے لکھا تھا۔ "اس نے مروجہ ترکیب کے تاروپود بکھیر ڈالے ہیں!" اس کتاب کو ملنے والی پذیرائی کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلا سفرنامہ "اندلس میں اجنبی" تھا، جسے پڑھ کر شفیق الرحمان نے کہا۔ "تارڑ کے سفرنامے قدیم اور جدید سفرناموں کا سنگم ہیں!"

بیالیس برسوں میں تیس سفرنامے شائع ہوئے۔ بارہ صرف پاکستان کے شمالی علاقوں کے بارے میں ہیں۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی "کے ٹو" پر ان کا سفرنامہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہفتے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس علاقے سے ان کے گہرے تعلق کی بنا پر وہاں کی ایک جھیل کو "تارڑ جھیل" کا نام دیا گیا۔ چند نمایاں سفرناموں کے نام یہ ہیں۔ "خانہ بدوش، نانگا پربت، نیپال نگری، سفر شمال کے، اسنو لیک، کالاش، پتلی پیکنگ کی، ماسکو کی سفید راتیں، یاک سرائے، ہیلو ہالینڈ اور الاسکا ہائی وے۔"

سفرنامے کے میدان میں اپنا سکہ جما کر ناول نگاری کی جانب آگئے۔ اوّلین ناول "پیار کا پہلا شہر" ہی بیسٹ سیلر ثابت ہوا۔ اب تک اس کے پچاس سے زاید ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یوں تو ہر ناول مقبول ٹھہرا، البتہ "راکھ" اور "بہاؤ" کا معاملہ مختلف ہے۔ خصوصاً "بہاؤ" میں ان کا فن اپنے اوج پر نظر آتا ہے، پڑھنے والوں نے خود کو حیرت کے دریا میں بہتا محسوس کرتے ہیں۔ اس ناول میں انہوں نے تخیل کے زور پر ایک قدیم تہذیب میں نئی روح پھونک دی۔ "بہاؤ" میں ایک قدیم دریا سرسوتی کے معدوم اور خشک ہو جانے کا بیان ہے، جس سے پوری تہذیب فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

"راکھ" کو 1999 میں بہترین ناول کے زمرے میں وزیراعظم ادبی ایوارڈ کا مستحق گردانا گیا، جس کا بنیادی موضوع سقوط ڈھاکا اور بعد کے برسوں میں کراچی میں جنم لینے والے حالات ہیں۔ "قلعہ جنگی" نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اردو کے ساتھ پنجابی میں بھی ناول نگاری کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس سفر میں افسانے بھی لکھے۔ ان کی شناخت کا ایک حوالہ کالم نگاری بھی ہے، جس میں ان کا اسلوب سب سے جداگانہ ہے۔

مستنصر حسین تارڑ ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کے مداح ہیں۔ "برادرز کرامازوف" کو دنیا کا سب سے بڑا ناول خیال کرتے ہیں۔ اردو میں قرۃ العین حیدر ان کی پسندیدہ لکھاری ہیں۔ شفیق الرحمان کی کتاب "برساتی کوّے" کو اپنے سفرنامے "نکلے تری تلاش میں" کی ماں قرار دیتے ہیں۔ کرنل محمد خان کی "بجنگ آمد" کو اردو کا بہترین نثری سرمایہ سمجھتے ہیں۔

شاہد آفریدی

دنیائے کرکٹ میں جو شہرت عمران خان کے حصے میں آئی، اس کا دیگر کرکٹرز فقط خواب دیکھ سکتے تھے۔ جب بین الاقوامی کھلاڑی ان کی گرد کو نہ پا سکے، تو پاکستانی کھلاڑیوں کی کیا مجال۔ ایک عرصے تک اس محاذ پر خاموشی رہی، مگر پھر

1996 میں پاکستان اور سری لنکا کے درمیان ہونے والے میچ میں عجیب واقعہ ہوا۔ کئی راکٹ فائر ہوئے۔ ون ڈے کرکٹ کی تیز ترین سنچری وانحی گئی اور یوں کرکٹ کے اس ستارے کا جنم ہوا، جس کے جارحانہ انداز نے لاکھوں شائقین کو گرویدہ بنا لیا۔ جب وہ پہلی بار بنگلا دیش گیا، تو درجنوں لڑکیاں ہاتھ میں بینر لیے اس سے شادی کی درخواست کر رہی تھیں۔ آج وہ پاکستان کا مہنگا ترین کھلاڑی ہے۔ ہر کمپنی کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی پراڈکٹ وہ انڈورس کرے۔ یار لوگ انہیں لالا کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاہد خان آفریدی المعروف "بوم بوم" اس بات کا ثبوت ہیں کہ پاکستانی شائقین کس چیز کے مداح ہیں۔ ہاں، انہیں ماہرانہ اور تکنیکی بنیادوں پر کھیلی جانے والی طویل اننگز بھی اچھی لگتی ہیں، وہ سنجیدہ بلے بازوں کو بھی سراہتے ہیں، لیکن ان کی دھڑکن تو تب ہی تیز ہوتی ہے، جب آفریدی کا بلا حرکت میں آتا ہے، جب گیند ہوا میں بلند ہوتی ہے، جب وہ اسٹینڈز میں جا گرتی ہے۔ اپنے تو اپنے، غیر بھی ان کے گرویدہ۔ انہیں بوم بوم کا نام بھارت کے معروف کرکٹر اور کمنٹیٹر روی شاستری نے دیا۔ وہ جے سوریا کے بعد دنیا کے دوسرے آل راؤنڈر ہیں جنہوں نے ون ڈے کرکٹ میں 6000 ہزار سے زائد رنز بنائے اور تین سو سے زائد وکٹیں حاصل کیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی کارکردگی میں تسلسل کی کچھ کمی رہی۔

شاہد آفریدی کا پورا نام صاحب زادہ محمد شاہد خان آفریدی ہے۔ وہ یکم مارچ 1980 کو خیبر ایجنسی میں پیدا ہوئے۔ بچپن کراچی میں گزرا۔ یہیں اوائل عمری میں انہوں نے کرکٹ کی دنیا میں قدم رکھا۔ اکتوبر 1996 میں کینیا میں ہونے والے ایک ٹورنامنٹ سے انٹرنیشنل کرکٹ میں قدم رکھا۔ بس، پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس دورے پر لیگ اسپنر کے طور پر منتخب کیا گیا تھا، مگر یہ ان کی جارحانہ بلے بازی تھی، جس نے پلینگ الیون تک پہنچایا۔ نیٹ پر انہیں وقار یونس اور سعید انور نے بلے بازی کرتے دیکھا تو انہیں لگا، نیروبی کے میدان میں وہ کچھ انوکھا کر گزرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ پھر وہاں جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ انہوں نے سری لنکا کے خلاف صرف 37 گیندوں پر 102 رنز بنائے، جس میں بارہ چھکے شامل تھے۔ یہ اس وقت ایک عالمی ریکارڈ تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ انہوں نے ون ڈے میں تین سو وکٹوں کا ہدف بھی 2011 ورلڈ کپ میں سری لنکا کے خلاف ہی عبور کیا۔

شروع میں وہ ٹیم میں ان اور آؤٹ ہوتے رہے۔ ایک عرصے تک انہیں اوپنر کی حیثیت سے آزمایا گیا۔ انہیں ٹیسٹ میچز میں بھی موقع دیا گیا، انہوں نے پانچ سنچریاں بھی بنائیں، جن میں چنائی میں کھیلی جانے والی 141 رنز کی یادگار اننگز بھی شامل ہے، مگر ان کا

مزاج ٹیسٹ کرکٹ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، کبھی انہیں ڈراپ کر دیا جاتا تو وہ ناراض ہو کر ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیتے۔ ایسا ہی واقعہ 2006 میں ہوا، مگر پھر بورڈ کے کہنے پر وہ فیصلہ واپس لے لیا۔ ایک زمانے میں انہیں ٹیسٹ ٹیم کی کپتانی سونپ دی گئی تھی، مگر انہوں نے 2010 کے دورہ انگلینڈ کے میچ میں کپتانی چھوڑ کر سب کو حیران کر دیا۔ یہ ایک غیر ذمے دارانہ فیصلہ تھا۔ یہ آفریدی کی مقبولیت تھی، جس نے انہیں اس نوع کے غیر ذمے دارانہ فیصلے کے باوجود ٹیم میں شامل رکھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ 2014 کے ورلڈ کپ سے قبل بھی ہوا، جب انہوں نے یہ کہہ کر کھلبلی مچا دی کہ بورڈ انہیں کپتانی دینا چاہتا ہے تو واضح اعلان کرے۔ اس طرح کی غیر ذمے داری کا مظاہرہ وہ کرکٹ کے میدانوں میں بھی بارہا کر چکے ہیں، کئی اہم موقع پر جب ٹیم کو ان کی ضرورت تھی وہ بچگانہ شاٹ کھیل کر وکٹ گنوا بیٹھے۔ بال ٹیمپرنگ کرتے پائے گئے، گیند چبائی، پچ خراب کی۔ مداح کی پٹائی کی، جنوبی افریقا میں ایک شخص کے سر پر بلا دے مارا۔ لگتا۔۔۔ 2011 ورلڈ کپ میں وہ ٹیم کے کپتان تھے۔ انہوں نے ٹیم کو سیمی فائنل تک پہنچایا۔ مگر کارکردگی میں تسلسل نہیں رہا۔ کپتانی مصباح الحق کے پاس چلی گئی۔ ایک روزہ کرکٹ میں سب سے زیادہ چھکے مارنے کا ریکارڈ ان کے پاس ہے۔ جنوری 2006 میں انہوں نے بھارت کے خلاف ٹیسٹ میچ میں ہربھجن سنگھ کی لگاتار چار گیندوں پر چھکے رسید کیے۔ یہ کارنامہ ان سے پہلے صرف کپل دیو نے انجام دیا تھا۔ 2007 میں سری لنکا کے گیند باز ملنگا بندارہ کو ایک اوور میں 32 رنز دے مارے۔ یہ کرکٹ کا دوسرا مہنگا ترین اوور تھا۔ انہیں کئی ملکی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ وہ حکومت پاکستان اور یونیسیف کے قبائلی علاقوں میں پولیو

کے خلاف مہم کے سفیر ہیں۔ پاکستان سپر لیگ میں انہیں پشاور کی کپتانی سونپی گئی۔ وہ اس لیگ کے اہم ترین کھلاڑی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ ٹی 20 ٹیم کے کپتان ہیں۔

398 ون ڈے میچز میں انہوں نے 395 وکٹیں لیں اور 8,064 رنز بنائے۔ 82 ٹی 20 میچز میں وکٹوں کی تعداد 83 اور رنز 1,218 ہیں۔ وہ بلاشبہ عہد حاضر کے بہترین آل راؤنڈرز میں سے ایک ہیں۔

عاطف اسلم

شہرت کی دیوی کا معاملہ عجیب ہے۔ آدمی اپنے کام میں قابل، سنجیدہ اور مخلص ہے اس کے باوجود شہرت سے میلوں دور رہے۔ کتنے ہی کارنامے انجام کیوں نہ دے لے مگر کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ادھر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں ایک ہی گیت شہرت کی بلند ترین چوٹی پر لے جاتا ہے۔ وہ ہمالیہ پر کھڑے ہوتے ہیں، پوری دنیا ان کی سمت دیکھ رہی ہوتی ہے۔ ان کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ عاطف اسلم بھی ایسا ہی ایک نام ہے۔ اگر کسی پاکستان فن کار کو حقیقی معنوں میں انٹرنیشنل فن کار کہا جاسکتا ہے تو وہ عاطف ہی ہیں۔ بالی ووڈ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے بڑے بڑوں کی چھٹی کروی۔ ان کی آواز ہالی ووڈ میں بھی سنی گئی۔ جب اسٹرنگز جیسے مستند پاکستانی بینڈ نے اپنے ایک گانے کو بین الاقوامی سطح پر لے جانے کا فیصلہ کیا، تو کسی گورے کو اس میں شامل کرنے کی بجائے عاطف اسلم کو اس کا حصہ بنایا۔

عاطف اسلم 12 مارچ 1983 کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ وزیر آباد سے لاہور منتقل ہوئے۔ ڈویژنل پبلک اسکول میں داخلہ لیا۔ کرکٹ کے شائق تھے۔ اسکول کی کرکٹ ٹیم کا حصہ رہے۔ بڑی خواہش تھی کہ پاکستان کرکٹ ٹیم کا حصہ بنیں۔ محنت بھی خوب کی۔ کلب کرکٹ کھیلی، عمران خان نے بھی انہیں مشوروں سے نوازا مگر رکاوٹیں ایسی آئیں کہ عبور ہی نہیں ہوئیں۔ شاید اس وقت مایوسی نے گھیر لیا ہو مگر بعد میں جو شہرت انہیں ملی، اس نے اس کی بڑی حد تلافی کردی۔

پی اے ایف کالج، لاہور کے زمانے میں موسیقی نے اپنی سمت بلایا۔ خود میں موجود گلوکار کو دریافت کیا۔ اس عشق کو مہمیز کیا ان کے بڑے بھائی نے، جن کے پاس موسیقی کا اچھا خاصا کلیکشن تھا۔ نجی محافل اور مختلف تقریبات سے گانے کا سفر شروع کیا۔ عاطف اسلم نے گلوکاری کا آغاز جل بینڈ سے کیا۔

ان کے ساتھ گوہر ممتاز بھی بینڈ میں شامل تھے۔ پہلے گیت "عادت" نے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ میوزک چارٹس پر نمبر ون رہا۔ اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔

عاطف کی بینڈ سے علیحدگی کی خبر آئی۔ اور کچھ ہی روز بعد ان کا البم مارکیٹ میں آ گیا۔ اس البم کے گیتوں نے سننے والوں کو گرویدہ بنا لیا، یہ ریکارڈ تعداد میں فروخت ہوا۔ یہیں سے تنازعات کا آغاز ہوتا ہے۔ بینڈ کے رکن گوہر نے ان پر سرقے کا الزام لگا دیا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے بھی جل بینڈ کے تحت اپنا البم ریلیز کیا۔ عاطف کے اور اس البم کے چند گانے یکساں تھے۔ جل کے لیے اب فرحان گائیکی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ یہ معاملہ کورٹ تک گیا۔ عاطف کو تسلیم کرنا پڑا کہ ان کے مقبول گیتوں کی تیاری میں گوہر بھی شامل تھے۔ "عادت" اور "تنہائی" کی شہرت ہندوستان پہنچ گئی۔ مہیش بھٹ نے انہیں اپنی فلموں میں شامل کیا۔ 2005 میں وہ کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ اس واقعے نے تنازعے کو مزید ہوا دی۔ گوہر نے ہندوستان جا کر بھی اپنا مقدمہ لڑا۔ اسکی بازگشت بھی سنائی دی کہ ایک مخصوص عرصے تک عاطف پر پاکستان میں البم ریلیز کرنے پر پابندی عائد کی جاسکتی تھی، مگر جیسے ہم نے ابتدا میں ذکر کیا، قسمت کی دیوی جس پر مہربان ہو اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کرسکتا۔

عاطف اسلم انڈین فلموں کے لیے اولین انتخاب بن گئے۔ کتنی ہی فلموں کے لیے انھوں نے گیت گائے۔ ہندوستان کے دیگر گلوکار کے برعکس، جو پس پردہ رہتے ہیں، جب عاطف کی آواز شامل کی جاتی، تو اس کی پروموشن ویڈیو میں بھی عاطف نظر آتے۔ ہندوستان میں ان کی مقبولیت پر وہاں کے گلوکار بہت چراغ پا ہوئے۔ انہوں نے ان پر شدید تنقید کی، بے سرا ٹھہرایا، مگر جب قسمت کی دیوی کا سایہ ہو تو کون راہ میں رکاوٹ کھڑی کرسکتا ہے۔ 2013 میں ایک میوزک ڈسٹری بیوشن کمپنی نے انہیں برصغیر کا مقبول ترین گلوکار ٹھہرایا۔ اے آر رحمان، شریا گھوشال اور موہت چوہان ان

سے پیچھے تھے۔ بس ایک پل، پرنس، رئیس، بدلا پور، بجرنگی بھائی جان جیسی ہندوستانی فلموں کے لیے انہوں نے یادگار گانے گائے۔ البم جل پری، دوری اور میری کہانی ریکارڈ تعداد میں فروخت ہوئے۔ کوک اسٹوڈیو میں وہ طرح طرح کے تجربات کرتے نظر آئے، جنھیں بہت سراہا گیا۔ انہوں نے فلم "بول" میں اداکاری بھی کی۔ وہ تمغۂ امتیاز حاصل کرنے والے کم عمر ترین شخص تصور کیے جاتے ہیں۔

حبیب جالب

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

کسے خبر تھی کہ ہوشیار پور کا یہ نوجوان جو جگر مرادآبادی سے متاثر ہے، جو کراچی میں راغب مرادآبادی کا شاگرد رہا، جس کا رجحان فی الوقت روایتی غزل کی سمت ہے، مستقبل میں انقلاب کا استعارہ بنے گا، عوامی شاعر کہلائے گا، لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائے گا۔ یہ اس شخص کا تذکرہ ہے، جو کسی حکومت کے سامنے نہیں جھکا، جس نے تکالیف برداشت کیں، قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ اسے انتقام کا نشانہ بنایا گیا، ایک پل سکون کا نصیب نہیں ہوا، فقیری اور اسیری ساتھ ساتھ چلتے رہے، مگر اس کی آواز دھیمی نہیں پڑی۔ اس کا لہجہ آخری لمحے تک توانا رہا۔ اس کے الفاظ میں وہ چنگاری تھی، جنھوں نے آمریت کے کوداموں کو خاکستر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی موت کے بعد بھی وہ زندہ ہے۔

حبیب جالب 1928 میں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ ہجرت کے بعد پاکستان کو مسکن بنایا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول جیکب لائن، کراچی میں زیرِ تعلیم رہے۔ اوائل میں صحافت کا پیشہ اپنایا۔ پھر ایک ٹیکسٹائل مل سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ معروف کسان رہنما حیدر بخش جتوئی کی سندھ ہاری تحریک میں کام کیا۔ یہیں ان میں طبقاتی شعور پیدا ہوا اور انہوں نے معاشرتی ناانصافیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ 1956 میں انہوں نے لاہور کا رخ کیا۔ بعد کی زندگی ادھر ہی گزری۔ پہلا مجموعہ "برگِ آوارہ" 1957 میں شائع ہوا۔

آمریت کے شدید مخالف تھے۔ مخالفین تو خیر اور بھی تھے مگر ان میں سے کوئی آمروں کو اتنا نہیں کھلتا تھا جتنے حبیب جالب۔ سبب واضح تھا، ان کے مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے تھے۔ مطالبہ بن جاتے۔ انقلاب پسند انہیں گنگناتے۔ 60 کے عشرے میں وہ اوج پر تھے۔ ہر مشاعرہ ان کے نام رہتا۔ 1958 میں جب پہلا مارشل لا لگا۔ 1962 میں اسی آمریت کے تحت دستور پیش کیا گیا، تو جالب نے وہ نظم کہی، جو امر ہو گئی، جس نے دلوں کو گرمایا، انسان کو جوش سے بھر دیا۔ "میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا" ایک نعرہ بن گیا۔ ہر گلی میں جالب کے الفاظ گونجا کرتے۔ ایوب اور یحییٰ خان کے ادوار میں انہیں متعدد بار گرفتار کیا گیا۔ انہیں شدید اذیتیں دی گئیں۔ جیل کے زمانے میں بھی انہوں نے شاعری کی۔ کہا جاتا ہے، وہ مسودہ ضبط کر لیا گیا، تاہم تخلیقیت کی راہ کون روک سکتا ہے، سچ پر پابندی لگانا مشکل۔ وہ خوشبو کی طرح پھیلتے چلے گئے۔

جب 70 کے انتخابات کے بعد جنرل یحییٰ خان نے اقتدار اکثریتی پارٹی کو منتقل نہیں کیا، مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع کیا، تو جالب نے اپنے قلم کو تلوار بنا لیا۔ کہا:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

ان کے اندیشے سچ ثابت ہوئے۔ 1974 میں ذوالفقار علی بھٹو کے حیدرآباد سازش کیس میں زیرِ عتاب آئے، تو جالب نے کہا:

قصرِ شاہی سے یہ حکم صادر ہوا
لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو

ضیاالحق کے مارشل لا کے بعد حیدرآباد سازش کیس ختم ہوا، اسیر رہا ہوئے۔ لوگ سمجھے، بھٹو مخالفت کی وجہ سے جالب ضیا پر تنقید نہیں کریں گے مگر وہ تو حبیب جالب تھے۔ صعوبتیں سہہ لیں گے مگر اظہارِ رائے پر قدغن برداشت نہیں۔ اسی دور میں تو انہوں نے کہا تھا:

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

ضیاالحق کے انتقال کے بعد پی پی کی حکومت آئی۔ لوگوں کو بڑی امیدیں تھیں مگر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب جالب

نے حالات پر یوں تبصرہ کیا:

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھریں ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

انہوں نے فلموں کے لیے بھی لکھا۔ بالخصوص زرقا کے لیے لکھا گیت رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے' بہت مقبول ہوا۔ دیگر فلمیں جن میں ان کے گیت سنائی دیے، ان میں "ہم ایک ہیں، موت کا نشہ، ناگ منی، دو راستے، زخمی نمایاں ہیں۔ نگار فلمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

ان کا انتقال 13 مارچ 1993 کو ہوا۔ بیماری کے ایام میں انہوں نے کسی قسم کی امداد قبول نہیں کی۔ سچائی کی قوت نے انہیں موت کے بعد بھی زندہ رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب پرویز مشرف کا مارشل لا لگا، جب وکلا تحریک شروع ہوئی، تو جالب کے اشعار پھر ہر زبان پر تھے۔ یہ عوامی شاعر، انقلابی شخص اب بھی دلوں میں دھڑک رہا تھا۔ 2006 میں ان کے نام سے حبیب جالب امن ایوارڈ کا اجراء ہوا۔ کلیات حبیب جالب کا شمار سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں ہوتا ہے۔

افتخار عارف

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

پی ٹی وی کے مقبول ترین پروگراموں کی فہرست مرتب کی جائے، تو اس میں کسوٹی کی شمولیت یقینی ہے۔ اور یہ ذرا حیران کن ہے۔ ایک کوئز شو... پی ٹی وی کی تاریخ کے کامیاب ترین پروگراموں میں بھلا کیسے شمار ہوسکتا ہے؟ اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کا فارمیٹ بہت زبردست تھا۔ آپ جواب جانتے تھے، ایکسپرٹس کو بوجھنا ہوتا تھا، بیس سوال ہوتے، سب ایک ایک کر کے آگے بڑھتے۔ گرہیں کھلتی جاتیں، دلچسپی بڑھتی جاتی۔

بے شک فارمیٹ لاجواب تھا، مگر اصل کمال اس کے میزبان قریش پور اور ایکسپرٹ عبداللہ بیگ اور افتخار عارف کا تھا۔ (بعد میں افتخار عارف کی جگہ غازی صلاح الدین نے لے لی تھی) کیا شخصیات تھیں۔ غضب کا حافظہ۔ پھر نفیس انداز بیان۔ تینوں ہی صاحبان لوگوں کے دل میں گھر کر گئے۔ اس پروگرام نے دو نسلوں کے معلومات عامہ کے ذوق کو مہمیز کیا۔

افتخار عارف ایک باکمال شاعر، زندہ دل شخصیت اور جس سے ملیں، اسے گرویدہ بنالیں والی شخصیت ہیں۔ عہد حاضر کے ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے زبان و ادب کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ کئی اہم اداروں میں اعلیٰ ترین ذمے داریاں سنبھالیں۔ قومی زبان کے صدر رہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین کا منصب سنبھالا۔ عام رائے ہے کہ ان ہی کے دور میں اس ادارے نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ اردو مرکز، لندن سے وابستگی رہی۔ اس وقت تہران میں ایکو (ECO) کے ثقافتی ادارے کے سربراہ ہیں۔ یہ ان کی کامیابیوں کا مختصر احوال ہے۔ وہ 21 مارچ 1944 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ گو سرکاری کاغذات میں 1943 کا سن درج ہے۔ وہاں کے علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے، جس نے تربیت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مطالعے کا ذوق پیدا ہوا۔ شعر کہنے کی جوت جگائی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ ہجرت کی، تو کراچی کو مسکن بنایا۔ بعد میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔ وہاں اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ پھر پی ٹی وی کا رخ کیا۔ کسوٹی کا حصہ بنے، جس کی شہرت لازوال۔ اس سے جڑا ہر شخص جیسے امر ہوگیا۔ پھر "اردو مرکز" سے وابستہ ہو کر لندن کا رخ کیا۔ لوٹ کر مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین بنے۔ اکادمی ادبیات کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ اب ایران میں ہیں اور وہاں کی ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ تقریبات کے سلسلے میں پاکستان آنے کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔

افتخار عارف کی شاعری پر ثقہ اہل قلم کی رائے میسر ہے۔ ناقدین فن کے مطابق اپنے مواد پر ان کی گرفت حیرت انگیز ہے۔

میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھرا کیا
مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا

ان کے ہاں غور و فکر ہے، فلسفہ ہے، تہذیبوں کا رنگ ہے، مستقبل کا آہنگ ہے۔ پھر کمال یہ کہ جو سوچتے ہیں، اسے گرفت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ جدید اردو شاعری کی توانا آواز ہیں۔ ایک ایسی آواز جو ہمارے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور آسودگی بخشتی ہے۔

تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا، کب تماشا ختم ہوگا

شہرت مسائل بھی پیدا کرتی ہے، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے والا اعتراضات کی زد میں بھی آتا ہے۔ کچھ یہی

معاملہ افتخار عارف کا بھی ہے۔ ان پر لابنگ کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مصلحت پسند بھی کہتے ہیں۔ البتہ ان الزامات کا تعلق انتظامی امور سے، ان کی شاعری کی قدرومنزلت پر سب متفق۔

شیخ مجیب الرحمان

سقوط ڈھاکے کے وقت مجیب الرحمان کو غدار ٹھہرایا گیا۔ دشمنوں سے ساز باز کرنے والا شخص۔ چالاک اور مکار، جمہوریت پسند کے روپ میں آمر۔ یہ عوام کا ردعمل تھا، جس کے پیچھے ریاستی فکر تھی، مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، علمی وفکری حلقوں کا معتدل موقف معنویت اختیار کرتا گیا، جس میں اغیار کی سازشوں کے ساتھ اپنوں کی غفلت کا بھی تذکرہ تھا۔

شیخ مجیب الرحمان نے 17 مارچ 1920 کو ضلع فرید پور میں آنکھیں کھولیں۔ 1947 میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے تاریخ اور علم سیاسیات میں گریجویشن کیا۔ زمانہ طالب علم میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ 1945 تا 1946 وہ اسلامیہ کالج کے طلبا کی یونین کا جنرل سیکرٹری رہا۔ 1946 میں وہ بنگال اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی کونسل کا رکن بھی رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اس نے نئی راہوں کی سمت قدم بڑھائے اور مسلم لیگ سے الگ ہوکر پاکستان مسلم اسٹوڈنٹس لیگ قائم کی۔ اس کی سوچ پر قوم پرستی نے غلبہ پالیا تھا۔ بنگالی قومیت کا علم اٹھایا۔ اردو کی مخالفت کی۔ کچھ مؤرخین کے مطابق وہ اوائل سے مسلم لیگ کے نظریے سے متفق نہیں تھا مگر بنگال میں اس کی مقبولیت کی وجہ سے اس کا ساتھ دیا۔ 1949 میں اس کی سرگرمیوں کو بنیاد کر ڈھاکا یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ اس عرصے میں اس نے جیل بھی کاٹی۔

1952 میں جب حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ قائم کی تو مجیب الرحمٰن نے اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ 1953 میں وہ عوامی لیگ کا جنرل سیکریٹری بنا۔ مارچ 1954 کے انتخابات میں مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ 1956 کا آئین صوبائی خودمختاری کی جو حدود مقرر کرتا تھا، اس سے اسے اختلاف تھا۔

فروری 1966 میں اس نے پہلی مرتبہ نیشنل کانفرنس لاہور کے اجلاس میں چھ نکات پیش کیے۔ مارشل لا کی مخالفت کی اور اسے اپنی قوم پرستانہ سوچ کی ترویج کے لیے برتا۔ 1958 اور 1959 کے کچھ ایام جیل میں گزرے۔ مئی 1966 میں اسے گرفتار کرلیا گیا، لیکن فروری 1969 میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے بعض سیاسی رہنماؤں کے دباؤ پر رہا کردیا گیا۔

دسمبر 1970 کے عام انتخابات میں شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے بے مثال کامیابی حاصل کی۔ سول اور عسکری اسٹیبلشمنٹ کے لیے وہ ایک مشکل گھڑی تھی۔ پہلی بار طاقت کا مرکز مشرقی پاکستان منتقل ہونے والا تھا۔ اس نے چھ نکات کی بنیاد پر نیا آئین بنانے کا اعلان کردیا۔ آنے والے دنوں میں یحییٰ خان کے غلط فیصلوں کی وجہ سے حالات بگڑتے چلے گئے۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کیا، ادھر مجیب کا حکومت میں آنا ذوالفقار علی بھٹو کے حق میں بھی نہیں تھا۔ ایک ڈیڈ لاک پیدا ہوگیا۔ مشرقی پاکستان میں بغاوت کے شعلے اٹھنے لگے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس بگاڑ کو بھارت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ مارچ 1971 میں مجیب الرحمان نے عدم تعاون کی تحریک شروع کردی، اسے گرفتار کرلیا گیا اور فوجی آپریشن شروع ہوگیا۔ دسمبر 1971 میں حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ مشرقی پاکستان اب بنگلا دیش تھا۔ اندرا گاندھی کا زہریلا بیان ثبوت تھا کہ یہ سازش کس نے رچی۔ 8 جنوری 1972 کو مجیب الرحمان کو رہا کردیا گیا۔ وہ لندن اور دہلی کے راستے 10 جنوری کو ڈھاکا پہنچا۔ اسے بنگلا دیش کا وزیراعظم نامزد کردیا گیا مگر اس کا انجام بے حد عجیب ہوا۔ عوامی لیگ نے سوشلزم اور سیکولر ازم کی بنیاد پر اصلاحات شروع کیں۔ پٹ سن، کپڑا سازی اور جہاز سازی کی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ نیا آئین تیار ہوا۔ ان تمام جماعتوں (بالخصوص جماعت اسلامی) کو جو پاکستان سے علیحدگی کے خلاف تھیں، خلاف قانون قرار دے دیا اور ان کے قائدین کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس کی ہندوستان سے قربت بڑھنے لگی۔ ایسے کاروباری معاہدے ہوئے، جس سے بنگلا دیشی معیشت ہندوستان کی محتاج ہوگئی۔ 1974 میں ملک میں زبردست قحط پڑا۔ انتشار بڑھنے لگا۔

بنگلا دیش میں ایک بار پھر بے چینی کی لہر اٹھنے لگی۔ عوامی لیگ نے طاقت کے زور پر اسے دبانے کی کوشش کی تو حالات مزید بگڑ گئے۔ دسمبر 1974 میں آئین معطل کر کے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔ صدارتی نظام نافذ ہو گیا۔ جنوری 1975 میں مجیب الرحمان صدر بن گیا۔ بنگال اس آمرانہ رویہ کو برداشت نہیں کر سکا۔ بغاوت شدید ہو گئی۔ 15 اگست 1975 کو مجیب الرحمان اور اس کے اہل خانہ کو قتل کر دیا گیا۔ صرف دو بیٹیاں شیخ حسینہ اور شیخ ریحانہ زندہ بچیں، جو اس وقت ملک سے باہر تھیں۔ شیخ حسینہ واجد بعدازاں ملک کی وزیراعظم بھی بنی۔

انضمام الحق

اس کرکٹر کو یاد کرنے کے کئی حوالے ہیں، اس کی سادگی اور بھولپن، کبھی کبھار اس کا یک دم غصے میں آجانا، اس کا جثہ، اس کی دل چسپ انگریزی، بعد کے برسوں میں مذہب کی جانب رجحان، مگر اصل حوالہ تو اس کی حیران کن بلے بازی ہی ہے۔ اس دراز قد کرکٹر کی نظر عقاب سی تھی۔ گیند بالر کے ہاتھ سے نکلی نہیں اور اس نے جان لیا کہ اسے میدان میں کس سمت اچھالنا ہے۔ کرکٹ کی حیران کن سمجھ۔ کب وکٹ پر ٹھہرنا ہے، کتنا انتظار کرنا ہے، کب قدموں کا استعمال کرنا ہے، کس بالر سے محتاط رہنا ہے، کسے کھل کر کھیلنا ہے، اسے انضمام الحق سے بہتر بھلا کون سمجھتا تھا۔ اگر پاکستان کے دس عظیم ترین کھلاڑیوں کی فہرست بنے گی تو یہ سابق ٹیسٹ کپتان اس میں شامل ہوگا۔ انضمام الحق، جنھیں لوگ انضی کہہ کر پکارتے، اپنے عہد کے کامیاب ترین بلے بازوں میں سے ایک تھے۔ کتنے ہی ریکارڈ اس کے جلال کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ اس کی پُرسکون نظر نے کتنے ہی بپھرے ہوئے سمندروں کو شانت کیا۔ کتنے ہی دشوار مقابلوں میں اس کی صلاحیت کا ہتھیار آخری فرق ثابت ہوا۔ انضمام الحق 3 مارچ 1970 ملتان میں پیدا ہوئے۔ کرکٹ کا شوق بچپن سے ساتھ۔ کسی اور شے میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ کیسے کیسے ریکارڈ اپنے نام کیے۔ انضمام ٹیسٹ کرکٹ میں یونس خان اور جاوید میانداد کے بعد پاکستان کے دوسرے سب سے زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑی ہیں۔ ایک روزہ کرکٹ میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ رنز انہوں نے اسکور کیے۔ وہ انڈین کرکٹ لیگ کے لیے بھی کھیلتے رہے اور اسی لیگ کی ٹیم لاہور بادشاہ کے کپتان رہے۔ اسے فتح دلائی۔ وہ تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن ہیں۔ انہوں نے 1991 کی ہوم سیریز میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ون ڈے کیریر کا آغاز کیا تھا۔ اس سیریز میں ایک نصف سنچری بنائی۔ اگلی سیریز سری لنکا کے خلاف تھی، جس میں ان کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔ انہوں نے دو سنچریاں بنائیں۔ اسی متاثر کن کارکردگی کے بعد اس 22 سالہ نوجوان کو ورلڈ کپ کی ٹیم میں شامل کیا۔ بعد کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔ پاکستان کو 1992 ورلڈ کپ جتانے والی ٹیم کے اہم رکن تھے۔ انھوں نے سیمی فائنل اور فائنل میں یادگار اننگز کھیلیں۔

بالخصوص نیوزی لینڈ کے خلاف 37 گیندوں پر 60 رنز کی اننگز تو ایک شاہکار تھی۔ یوں تو انہوں نے کتنی ہی یادگار اننگز کھیلیں، پاکستان کو مشکل حالات سے نکالا، ٹرپل سنچری بھی بنائی، مگر وہ 1993 میں ویسٹ انڈیز کے خلاف 90 رنز ناٹ آؤٹ کو اپنی بہترین کاوش ٹھہراتے ہیں۔

انہوں نے ون ڈے میں 83 نصف سنچریاں بنائیں۔ ایک زمانے میں یہ ایک ریکارڈ تھا۔ وہ ان گنے چنے کھلاڑیوں میں سے ہیں، جنھوں نے اپنے ون ڈے کیریر میں دس ہزار رنز کا ہندسہ عبور کیا۔ جب آئی سی سی نے 2005 میں ورلڈ الیون بنائی، تو انضی ٹیسٹ اور ون ڈے دونوں میں شامل تھے۔ ٹیسٹ انہوں نے 120 کھیلے، آغاز 1992 میں انگلینڈ کے خلاف کیا تھا۔ 49.60 کی شاندار اوسط سے 8,830 رنز بنائے۔ 25 سنچریاں جڑیں۔

2003 سے 2007 تک وہ پاکستان کی ون ڈے اور ٹیسٹ ٹیم کے کپتان رہے۔ ان کا ریکارڈ متاثر کن رہا۔ اکتوبر 2007 میں انہوں نے کرکٹ کو خیرباد کہا۔ جن تمیں ٹیسٹ میچز میں کپتانی کی، ان میں سے گیارہ جیتے۔ ون ڈے میں بھی ان کی بہ طور کپتان کارکردگی بہت اچھی رہی۔ کامیابی کی شرح کا موازنہ دھونی اور رکی پونٹنگ سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ 2007 ورلڈ کپ کی ناکامی اور باب وولمر کی موت کے بعد ان کے کیریر پر فل اسٹاپ لگ گیا۔ سادہ مزاج آدمی تھے،

غصہ کم ہی آتا مگر جب آتا تو اس سے تنازعات جنم لیتے۔

1997 میں ٹورنٹو میں صحارا کپ کھیلا جا رہا تھا، جہاں میچ کے دوران وہ ایک تماشائی پر چڑھ دوڑے، جو ان پر جملے کس رہا تھا۔ انہوں نے اس بدمعاش کی درگت بنانے کے لیے ڈریسنگ روم سے بلا منگوا لیا تھا۔ شاید اس کا سر پھوڑ دیتے سیکیورٹی اہل کاروں نے بہ مشکل روکا۔ انضمام کا موقف تھا کہ اس شخص نے ان کے ملک اور مذہب سے متعلق رکیک جملے کہے تھے۔

2006 کا اوول ٹیسٹ ایک اور واقعہ۔ وہ ٹیم کے کپتان تھے، جب ڈیرل ہیئر نے پاکستانی ٹیم پر بال ٹمپرنگ کا الزام عائد کیا۔ انضمام اشتعال میں آ گئے۔ چائے کے بعد وہ ٹیم کو لے کر میدان ہی میں نہیں آئے۔ خاصا ہنگامہ ہوا۔ جب وہ خدا خدا کر کے میدان میں پہنچے، امپائر طریقہ کار کے مطابق میچ ختم کرنے اور انگلینڈ کو فاتح قرار دینے کا اعلان کر چکے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا اولین واقعہ تھا۔ پہلی بار کسی کپتان نے یوں میچ ہارا۔ اس واقعے پر بہت لے دے ہوئی۔ ڈیرل ہیئر تو زیر عتاب آئے ہی، انضمام پر بھی چار میچوں کی پابندی لگی۔ ان کی دینی سوچ کا اثر ٹیم پر بھی پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ انضمام فقط اسے ہی ٹیم میں شامل کرتے، جو ان کے نقطہ نظر سے قریب ہوتا۔

محمد خان جونیجو

آج کے پاکستان میں جنرل ضیا الحق کے حامی بھی بہت، مخالفین بھی کئی۔ کوئی انہیں مرد مومن کہتا ہے، تو کوئی الزام عائد کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے مفادات کے لیے مذہب کو استعمال کیا، ریاست کو افغان جنگ میں جھونکا، جمہوریت اور آزادیٔ اظہار پر قدغن لگائی۔ پہلے دو الزامات پر تو بحث ہو سکتی ہے، مگر آخری الزام درست ہے۔ انہوں نے الیکشن کروانے کا وعدہ کیا، قسمیں کھائیں اور ان سے مکر گئے۔ اقتدار کو طول دینے کے لیے مہمل پیغام پر مبنی متنازع ریفرنڈم کروایا۔ خدا خدا کر کے انتخابات کروائے، تو کوشش کی کہ ایسا وزیر اعظم ہو، جو ان کے سامنے اف بھی نہ کرے۔ کسی نے محمد خان جونیجو کا نام لے دیا کہ شریف آدمی ہیں۔ انتخاب غلط ثابت ہوا۔ کہتے ہیں، ضیا الحق سے ہونے والی اولین ملاقات ہی میں جونیجو پوچھ بیٹھے، سر ملک سے آمریت آپ کب ختم کر رہے ہیں؟ ایک تجزیہ کار نے لکھا، ضیا الحق کو مردے کی تلاش تھی، مگر جسے منتخب کیا، وہ مردہ کفن پھاڑ کر بولنے لگا۔

آج ماہرین متفق ہیں کہ جونیجو دور، پاکستان کا بہترین دور تھا۔ امن و امان اور اقتصادی ترقی کے لحاظ سے اس دور کی مثال نہیں ملتی۔ محمد خان جونیجو پاکستان کے دسویں وزیراعظم تھے۔ وہ 18 اگست 1932 کو سندھ کے علاقے سندھڑی میں پیدا ہوئے۔ ذہانت بلا کی تھی۔ وضع دار آدمی تھے۔

برطانیہ سے زراعت میں ڈپلوما کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز 21 برس کی عمر میں کیا۔ 1962 میں سانگھڑ سے مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کا۔۔۔ رکن منتخب کیا گیا۔ جولائی 1963 میں وزیر ہو گئے۔ 1985 کے غیر جماعتی الیکشن میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ انہیں صدر نے وزیراعظم نامزد کیا۔ اسمبلی نے انہیں اعتماد کا ووٹ دیا۔ انہیں ایک ایمان دار سیاست دان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ مخالفین بھی ذکر احترام سے کرتے ہیں۔ بطور وزیراعظم کئی مراحل پر انہوں نے جنرل ضیا الحق سے اختلاف کیا۔ دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اوجڑی کیمپ دھماکے کے بعد حالات بگڑنے لگے۔ جنرل ضیا الحق نے 8 ویں ترمیم استعمال کرتے ہوئے جونیجو حکومت کو ختم کر دیا۔

کئی سالوں کی علالت کے بعد 16 مارچ 1993 کو ان کا انتقال ہوا۔ یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ جونیجو سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم تھے اور ان کے بعد بھٹو کی بیٹی، یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم بنیں۔

نثار بزمی

پاکستان کی تاریخ کا بہترین اداکار کون ہے؟ ممکن ہے، کوئی سنتوش کا نام لے، کوئی محمد علی کا تذکرہ کرے، کسی کا انتخاب وحید مراد ہو، تو کسی کا ندیم۔ البتہ جب بہترین موسیقار کی بات ہو، تو زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ فوراً نثار بزمی کا نام ذہن میں آئے گا۔ اساتذہ تو اور بھی کئی تھے، مگر جو رجحانات انہوں نے متعارف کروائے، وہ ایک عرصے تک انڈسٹری پر چھائے رہے۔

مہدی حسن اور ان کے اکٹھ سے "رنجش ہی سہی" اور

"اک ستم اور میری جاں ابھی جاں باقی ہے" جیسے لازوال گیت انڈسٹری کو ملے۔ "دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں" جیسے یادگار گیت ان ہی کی دھن تھی۔ رونا لیلیٰ کی آواز میں ریکارڈ ہونے والا یہ گیت آج بھی تازہ ہے۔ میڈم نور جہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت نخرے کرتی ہیں، ریکارڈنگ سے فقط دس منٹ پہلے پہنچتی ہیں۔ خود میڈم نے بھی اس بات کا اعتراف کیا مگر نثار بزمی صاحب کی ریہرسل پر ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچتی تھیں۔ بڑی توجہ سے کام کرتیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ فن کی باریکیوں سے آگاہ تھے۔ اتنی گرفت تھی کہ اوروں کو بھی ان سے سیکھنے کا موقع ملا۔ انہیں کتنے ہی نشان سپاس عطا ہوئے۔ تمغہ برائے حسن کارکردگی سے انہیں نوازا گیا۔ ان کا تعلق موسیقار گھرانے سے نہیں تھا۔ وہ یکم دسمبر 1924 کو نصیر آباد، ممبئی میں سید قدرت علی کے گھر پیدا ہوئے، جو خاصے مذہبی آدمی تھے۔ اصل نام سید نثار احمد تھا۔ بچپن میں وہ معروف موسیقار امان علی خان سے متاثر تھے۔ شوق اس فن کی طرف لے گیا۔ استاد کا دامن تھاما۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں موسیقی کے اسرار و رموز سمجھنے میں آنے لگے۔

1944 میں انہوں نے ممبئی ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈرامے "نادر شاہ درانی" کی موسیقی ترتیب دی، جو بہت پسند کی گئی۔ دیگر پروڈیوسر ان کی جانب متوجہ ہوئے۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی ان کی دھنوں کا بڑا چرچا ہوا۔ فقط دو برس میں آل انڈیا ریڈیو سے فلمی نگری تک پہنچ گئے۔ انہیں فلم "جمنا پار" کے گانے کمپوز کرنے کی پیشکش کی گئی۔ یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی۔ گیت بہت مقبول ہوئے۔ اگلے ایک عشرے میں انہوں نے 40 کے قریب فلموں کی موسیقی دی۔ لتا، آشا بھوسلے، منا ڈے اور محمد رفیع سے گانے گوائے۔ رفیع کی آواز میں فلم "کھوج" کا گانا "چاند کا دل ٹوٹ گیا، رونے لگے ہیں ستارے" بے حد مقبول ہوا۔

ان کا شمار ممبئی کے مصروف ترین موسیقاروں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے کئی تجربات کیے۔ آنند بخشی کو نغمہ نگار کی حیثیت سے فلم "بھولا آدمی" میں متعارف کروایا۔ یہ ایک کامیاب کاوش تھی۔ نثار بزمی ہی نے کلیان جی آنند جی کی جوڑی کو سازندوں سے موسیقار بنایا۔

1962 میں وہ پاکستان آئے۔ ممبئی میں جما جمایا کام تھا، یہاں از سر نو محنت کرنی پڑی۔ اس انڈسٹری میں بھی کئی نابغۂ روزگار موسیقار موجود تھے۔ خورشید انور اور رشید عطرے کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ روبن گھوش، ماسٹر عنایت اور سہیل رعنا بھی کام کر رہے تھے۔ الغرض خاصا مقابلہ تھا۔

طویل انتظار کے بعد انہیں ایک فلم "ہیڈ کانسٹیبل" کی موسیقی دینے کا موقع ملا، مگر یہ عمل نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ ایک برس بعد فضل احمد کریم فضلی نے اپنی معروف فلم "ایسا بھی ہوتا ہے" کی موسیقی ترتیب دینے کی پیشکش کی۔

انہیں اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس فلم نے راستہ ہموار کر دیا۔ 1966 میں انہوں نے "لاکھوں میں ایک" کی موسیقی دی۔ اس کے گیتوں نے ثابت کر دیا کہ ممبئی سے آنے والے یہ صاحب کس معیار کے کلاکار ہیں۔ پروڈیوسر اور ہدایت کار بھی خوش تھے کہ چلو ایک اور اچھا موسیقار ملا۔ آنے والے دنوں میں انہوں نے کئی یادگار فلمیں کیں۔ 1968 میں فلم "صاعقہ" اور 1970 میں فلم "انجمن" کے لیے نگار ایوارڈ حاصل کیے۔ 1972 میں "میری زندگی ہے نغمہ" 1979 میں "خاک اور خون" اور 1986 میں فلم "ہم ایک ہیں" کی موسیقی پر بھی نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔

جہاں مہدی حسن اور نور جہاں جیسے منجھے ہوئے گلوکاروں کے ساتھ کام کیا۔ وہیں رونا لیلیٰ اور اخلاق احمد جیسے نئے فن کاروں کو بھی موقع دیا۔ کتنے ہی موسیقاروں نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ کئی گلوکاروں نے ان کی رہنمائی میں اپنا فنی سفر شروع کیا۔ ان کی گنتی انڈسٹری کے ان گنے چنے لوگوں میں ہوتی تھی، جن کے سامنے ہر سر احتراماً جھک جاتا۔ 22 مارچ 2007 کو اس عظیم فن کار کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر 83 سال تھی۔

سید قاسم محمود

ادیب، مترجم، محقق اور ناشر... اُن کو اِس طرح متعارف کروانا کافی نہیں۔ جس شے کا تذکرہ ضروری، وہ ہے ان کی لگن اور خلوص۔ بلا کے محنتی انسان تھے۔ دھن کے پکے۔ جو سودا ذہن میں سما گیا، اس کے لیے تن من دھن سب لگا دیا۔ معلومات عامہ کے میدان میں حیران کن کارنامے انجام دیے۔ کیسے کیسے انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیے۔

انسائیکلو پیڈیا پاکستان کا اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا سب سے معتبر کارنامہ، جن کے مجموعی صفحات کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان کے کتنے ہی ایڈیشنز شائع ہوئے۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ انسائیکلو پیڈیا کے دیگر منصوبوں پر بھی کام کر رہے تھے۔ پاکستان میں سستی کتب چھاپنے کا انوکھا سلسلہ شروع کیا، جو بہت مقبول ہوا۔ وہ ہماری درخشاں تہذیب کے نمایندے تھے۔ مینار پاکستان پر نصب تختیوں کے مدیر تھے۔ تمام تختیاں ان کی زیرِ نگرانی نصب ہوئیں۔ کتنے ہی اخبارات سے منسلک رہے۔ سائنسی صحافت میں انہوں نے نئے رجحانات متعارف کروائے۔

وہ 17 نومبر 1928 ضلع روہتک میں سید ہاشم علی کے گھر پیدا ہوئے۔ 1947 میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ ہجرت سے قبل ہمدرد دواخانہ دہلی سے وابستہ رہے۔ ہجرت کے زمانے میں مہاجرین کے کیمپوں میں فلاحی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ یہاں آنے کے بعد چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں کلرکی بھی کی۔ ”اردو دائرہ معارف اسلامیہ“ کے اوّلین مدیرِ اعلیٰ پروفیسر علامہ محمد شفیع کے ماتحت رہے۔ حکومت پنجاب کی ”مجلس زبان دفتری“ میں بطور مترجم کام کیا۔ اسی زمانے میں افسانہ نگاری اور تصنیف و تالیف کام شروع ہوا۔ ادب کے ساتھ جدوجہد بھی جاری رہی۔ ادیب فاضل کے مرحلے سے گزر کر بی اے کیا۔ صادق، لیل و نہار، ادب لطیف سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے۔ یونیسکو کے زیرِ اہتمام ٹوکیو میں فن ادارت کا کورس کیا۔ مشہورِ زمانہ کتاب ”قائد اعظم کا پیغام“ مرتب کی جو اب تک ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ مارشل لا کے خلاف تھے، بہ طور صحافی عملی جدوجہد کی۔ کراچی آنے کے بعد عالمی ڈائجسٹ سے وابستہ ہوئے۔ مارشل لا کے باعث تباہ ہونے والے شاہکار بک فاؤنڈیشن کو ازسرِنو قائم کیا۔ سائنس میگزین کا اجرا کیا۔ عالمی ادب کے شاہکار اردو میں پیش کیے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ زندگی کے آخری برسوں تک جاری رہا۔ ان کا علمی و ادبی سرمایہ اتنا ہے کہ اس کے تذکرے کے لیے الگ دفتر درکار۔ دیکھنے والا انگشت بدنداں رہ جائے۔ جو اداروں کے کرنے کا کام، وہ اکیلا شخص کر گیا۔ وہ پاکستان کے حقیقی محسن تھے۔ 31 مارچ 2010 کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی عمر 82 برس تھی۔ حکومتِ پاکستان نے کئی مرتبہ صدارتی ایوارڈ کی پیش کش کی، مگر انہوں نے وہ قبول نہیں تھا۔

کرشن چندر

ایک سروے کے مطابق ان کا شمار اردو کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ پڑھے جانے والے فکشن نگاروں میں منٹو کے بعد وہ دوسرے نمبر پر ہیں۔ البتہ نظریاتی سطح پر ان کے اثرات منٹو سے زیادہ ہیں۔ یہ کرشن چندر کا تذکرہ ہے، جس کے بارے میں یہ رائے مستند ہے کہ انہوں نے آخری برسوں میں اسلام قبول کرلیا تھا۔

انہوں نے اپنے افسانوں میں اس دور کے معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کا احاطہ کیا۔ مذہبی تعصبات، آمرانہ اور سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کی۔ اپنے افسانوں میں زندگی کے اعلیٰ معیارات اور مقاصد پر بحث کی۔ ان کی تخلیقات ”کالو

بھنگی“، ”مہالکشمی“ اور ”ایک گدھے کی سرگزشت“ کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ ”زندگی کے موڑ پر“ اور ”بالکونی“ بھی ماسٹر پیس ہیں۔ ان کے ہاں رومانویت بھی بامعنی تھی۔ انہیں آج بھی بڑی توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اپنے ہمعصر افسانہ نگاروں سے کافی مختلف تھے۔ زبان پر خوب عبور حاصل تھا۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور اسی لئے عام انسان کی بات کرتے تھے۔ ان کے دل میں امیروں کے تئیں بغاوت اور بدلے کا جذبہ تھا۔

کرشن چندر 23 نومبر 1914 کو وزیر آباد، ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گوری شنکر چوپڑا میڈیکل افسر تھے۔ تعلیم کا آغاز اردو اور فارسی سے کیا۔ 1935 میں انگریزی میں ماسٹرز کیا۔ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پنجاب اور کشمیر میں پرورش ہوئی، مگر ان کی علاقوں کی حقیقی جھلک ان کی ابتدائی کہانیوں میں نہیں ملتی۔ ان کہانیوں پر رومانویت غالب تھی۔ دھیرے دھیرے جب ذہن پختہ ہوتا گیا۔ سماجی معاملات سے سابقہ پڑا تو لہجے میں بھی تبدیلی آئی۔ کرشن چندر نے ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو بنیاد بنا کر کئی افسانے لکھے، جن میں ''اندھے''، ''جیکسن'' اور ''امرتسر'' قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ڈیڑھ درجن سے زائد ناول لکھے۔ ''ایک گدھے کی سرگزشت'' نمایاں تر ہے۔ یہ مزاح اور طنز کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہ ناول شمع میں قسط وار شائع ہوا۔ قارئین کے اصرار پر انہوں نے 'گدھے کی واپسی' کے عنوان سے ایک اور ناول لکھا۔ اس کا تیسرا حصہ بھی آیا۔

ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ بھی بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کی بہن سرلا دیوی بھی فکشن لکھتی ہیں۔ سرلا دیوی کے شوہر ریوتی شرن شرما ایک معروف آدمی تھے۔ انہوں نے اردو ڈرامے اور اسٹیج کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ الغرض وہ پورا گھرانا نابغۂ روزگار شخصیات پر مشتمل تھا۔

بالی ووڈ میں بھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ کئی فلموں کی کہانیاں، منظر نامے اور مکالمے تحریر کیے۔ ''دھرتی کے لال''، ''دل کی آواز''، ''دو چور'' اور ''شرافت'' میں ان کے قلم کا جادو چلا۔ 8 مارچ 1977 میں جب ان کا انتقال ہوا۔ یہ اردو کے لیے ناقابل تلافی نقصان تھا۔ وہ آخری عمر تک لکھتے رہے۔ انتقال سے قبل وہ ایک مضمون ''ادب برائے بطخ'' لکھ رہے تھے۔ یہی مضمون لکھتے ہوئے انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ ان کی دوسری بیگم مسلمان تھیں۔ ناقدین کے مطابق 1955 سے 1960 کے درمیان انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین ادب تخلیق کیا۔ جہاں انہیں سراہنے والے کئی ہیں تو کچھ تنقید بھی کرتے ہیں۔

عابد علی

عابد علی 17 مارچ 1952 کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ بہن بھائیوں میں نمبر پانچواں۔ والد، اصلاح الدین پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ والدین کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنیں مگر یہ ہو نہ سکا۔ بچپن میں شرمیلے اور کم گو ہوا کرتے تھے۔ کھیلوں سے زیادہ کہانیوں سے رغبت تھی۔ ''آگ کا دریا'' اوائل عمری میں پڑھ ڈالا۔ ساحر اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری بھاتی تھی۔ مصوری بھی کی۔ میٹرک کے بعد کراچی آگئے مگر یہاں کے حالات کی وجہ سے واپس لوٹنا پڑا۔ ادھر گریجویشن کیا۔ پھر ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ اس کا سبب معروف شاعر عطا شاد بنے جنہوں نے انہیں آڈیشن دینے کی تحریک دی تھی۔ منتخب ہونے کے بعد صداکاری کی، اسکرپٹ لکھا، بہ طور ٹیکنیشن بھی کام کیا۔ 73ء میں لاہور پہنچے۔ اگلے برس پی ٹی وی تک رسائی حاصل کی۔ پہلے ایک پروگرام کی میزبانی کی۔ پھر یاور حیات کے ڈرامے ''فرار'' میں نظر آئے۔ اس عرصے میں تھیٹر بھی کیا۔ ''جھوک سیال'' کیریر میں نیا موڑ ثابت ہوا۔ اب ''ایک حقیقت ایک فسانہ'' اور ''ایک محبت سو افسانے'' جیسی کامیاب سیریز کیں۔ ''وارث'' نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے، جس میں پہلی بار جاگیرداروں کے مظالم کی منظر کشی کی گئی تھی۔ پھر ''سمندر'' اور ''دہلیز'' جیسے معیاری ڈراموں میں نظر آئے۔ ''سمندر'' پر انڈیا میں چار فلمیں بنیں، جن میں سے ایک میں دلیپ کمار نے عابد علی کا

کردار نبھایا۔ دلیپ کمار نے اپنے ایک انٹرویو میں ان کی تعریف بھی کی۔ 88ء میں تھیٹر کو خیرباد کہہ دیا۔ دو برس بعد ریڈیو سے بھی ناتا ٹوٹ گیا۔ فلموں میں بھی کام کیا۔ وہاں بیشتر تر کردار پختہ عمر لوگوں کے کیے۔ گو اس وقت زیادہ عمر نہیں تھی۔ اداکاری میں خود کو منوانے کے بعد ہدایت کاری میں قدم رکھا۔ ''دوریاں'' پھر ''دشت'' کیا، جسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ اسے شوٹ کرنا اور ایسی کہانی کو فلمانا آسان نہیں تھا۔ ''دوسرا آسمان'' کو بھی بہت سراہا گیا۔ اس زمانے میں پرائیویٹ پروڈکشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی ایک پروڈکشن ہاؤس قائم کیا اور اس کے پلیٹ فورم سے کئی مقبول ڈرامے بنائے۔ وہ ٹی وی کو آرٹ فارم نہیں سمجھتے۔ نہ

ہی ناول کہتے ہیں اور نہ ہی غزل۔ ان کے نزدیک یہ ڈائجسٹ فارم ہے۔ اس میں تمام رنگ ہونے چاہئیں۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ ان کی دوسری بیگم رابعہ نورین بھی سینئر اداکارہ ہیں۔ ان کی بیٹی امان علی کا شمار پاکستان کی اہم ماڈلز اور اداکاروں میں ہوتا ہے۔

شوکت عزیز

پاکستان ایک عجیب و غریب ملک ہے۔ یہاں حکمران درآمد کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو مدتوں سے بیرونِ ملک مقیم رہا وہاں کے منظم اداروں میں اہم عہدوں پر فائز رہا، اسے پاکستان لا کر ایسے اداروں کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں، جن کا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو۔ یوں تو ہمارے سامنے کئی مثالیں ہیں مگر سب سے اہم نام جناب شوکت عزیز کا ہے، جو مشرف دور میں ملک کے وزیر اعظم رہے۔ بے شک وہ بے حد ذہین آدمی تھے۔ اقتصادیات کے میدان میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں، مگر وزیر اعظم کا عہدہ انہیں سونپنے کا فیصلہ کچھ عجیب تھا۔

1999 میں شوکت عزیز وزیر خزانہ تھے۔ 6 جون 2004 کو جب میر ظفر اللہ خان جمالی نے استعفیٰ دیا، تو تھر سے منتخب ہونے والے یہ صاحب 28 اگست 2004 کو ملک کے وزیر اعظم بنے۔ انتخابی مہم کے دوران ان پر خود کش حملہ بھی ہوا۔ سیکیورٹی انتہائی ناقص تھی، مگر خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہے۔

وہ 9 مارچ 1949 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عزیز احمد پاکستان کے سابق وزیر اور اپنے وقت کے معروف بیورو کریٹ تھے۔ ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرکس ہائی اسکول، کراچی اور ایبٹ آباد پبلک اسکول سے حاصل کی۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج قصور میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ 1967 میں گریجویشن کیا۔ 1969 میں ایم بی اے کی ڈگری انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن، کراچی سے حاصل کی۔ 1969 میں سٹی بینک کا حصہ بن گئے۔ ترقی کے مراحل تیزی سے طے کیے۔ کئی ملکوں میں تعینات رہے، جن میں امریکا، یونان، برطانیہ، ملائیشیا اور سنگاپور نمایاں۔ اس عمل سے ان کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ 1992 میں اس بینک کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوئے۔ بین الاقوامی تنظیموں نے اُن کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ انہیں ماہر اقتصادیات کے طور پر شناخت کیا جانے لگا۔ ایک مرحلے پر انہوں نے میاں صاحب کی حکومت کو بھی مشوروں سے نوازا۔ جب پرویز مشرف آئے

تو وہ شوکت عزیز کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ 1999 میں پرویز مشرف کی پیشکش پر انہوں نے وزارتِ خزانہ کا قلمدان سنبھالا۔ عام رائے ہے کہ ان کی پالیسیوں سے معیشت کسی حد تک سنبھل گئی تھی۔ 2001 میں شوکت عزیز وہ بین الاقوامی رسائل کی جانب سے دنیا کے بہترین وزیر خزانہ قرار پائے۔

میر ظفر اللہ خان جمالی کی طرف سے استعفے نے ایک بحران پیدا کر دیا۔ سوال یہ تھا کہ اگلا وزیر اعظم کون ہوگا۔ مسلم لیگ ق نے شوکت عزیز کا نام پیش کیا۔ کچھ عرصے چوہدری شجاعت وزیر اعظم رہے۔ اسی عرصے میں شوکت عزیز نے انتخابی مہم چلائی۔ اسی مہم کے دوران 29 جولائی 2004 کو فتح جنگ میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔

ان کی شہریت کا معاملہ خاصا متنازع رہا۔ اپوزیشن نے الزام لگایا کہ وہ پاکستانی شہری ہی نہیں ہیں۔ یہ لطیفہ بھی چلا کہ انہیں انتخابات سے ایک روز قبل نادرا کا شناختی کارڈ بنا کر دیا گیا تھا۔ ان کے پاس امریکی پاسپورٹ تھا۔ امریکی قانون کے مطابق اگر کوئی امریکی قومیت رکھے، تو اسے اپنی پرانی قومیت چھوڑنی پڑے گی۔ یعنی امریکی پاسپورٹ کا حامل وزیر اعظم پاکستان نہیں بن سکتا۔ اسی امر پر چیف جسٹس افتخار چوہدری نے کیس شروع کیا تھا مگر انہیں ایک ریفرنس کے ذریعے غیر فعال کر دیا گیا۔ 2007 میں جب مسلم لیگ ق کی حکومت ختم ہوئی، تو باقی لیڈر تو یہیں رہے، البتہ توقع کے عین مطابق وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلتے بنے۔ عالمی اداروں کے پاس ان کے لیے کئی آفرز تھیں۔ پھر ادھر رہنا خطرناک تھا۔ جب پی پی پی نے حکومت میں آنے کے بعد اعلان کیا کہ مشرف دور میں اقتصادی ترقی کا دعویٰ کھوکھلا ہے، خزانہ تو خالی پڑا ہے، تو سب کی توپوں کا رخ شوکت عزیز کی جانب ہو گیا۔ پرویز مشرف کو بھی، جو اس وقت صدر تھے، کہنا پڑا کہ انہیں واپس آ کر الزامات کا جواب دینا چاہیے۔

پراسرار ہائی جیکر

آصف ملک

اس نے ایسی پلاننگ کی کہ تمام خفیہ ایجنسیاں اسے تلاش کرتی رہ گئیں۔ اس نے اکیلے ہی ہوائی جہاز کو اغوا کیا اور تاوان کی رقم حاصل کر کے ہوا کی بلندیوں پر پرواز کرتے طیارے سے فرار ہو گیا۔ وہ گیا کہاں اس راز سے آج تک پردہ نہ اٹھ سکا۔

تاریخ کی سب سے انوکھی ڈکیتی جس کے مجرم کا سراغ کوئی نہ لگا سکا

ہائی جیکنگ ہمیشہ سے ایک مشکل اور مخصوص جرم رہا ہے جسے مخصوص ذہن رکھنے والے لوگ خاص مقاصد کے تحت کرتے ہیں۔ ذرا تصور کریں سینکڑوں مسافروں سے بھرے جہاز کو یوں اغوا کرنا کہ اس سے پہلے اسلحے سمیت کسی ائرپورٹ سے جہاز میں سوار ہونا اور اس کے بعد عملے اور خاص طور سے پائلٹس کو قابو کرنا یقیناً آسان اور عام کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضائی قزاقی کا جرم فضائی پروازوں کے آغاز سے اب تک بہ مشکل ڈیڑھ سو بار انجام

دیا گیا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ فضائی قزاق کا مقصد کامیابی سے زیادہ اپنے مقصد کی تشہیر ہوتی ہے چاہے اس کے لیے اسے اپنی اور اپنے ساتھ کئی سو افراد کی جان کیوں نہ لینی پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جرم کے مرتکب اکثر افراد کا مطمع نظر اس سے مالی فائدے کے بجائے سیاسی یا اپنے مقصد کی تشہیر کا فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بہت کم فضائی قزاق ایسے ہیں جنہوں نے یہ جرم رقم کے حصول کے لیے کیا اور مزے کی بات ہے کہ ان میں سے اکثر فوری یا بعد میں پکڑے گئے اور اپنے کیے کے صلے میں سزائے موت سے عمر قید تک کی سزائیں بھگتیں۔

لیکن ایک فضائی قزاق ایسا بھی گزرا ہے جس نے نہ صرف کامیابی سے ایک طیارہ ہائی جیک کیا بلکہ اس نے دو لاکھ ڈالرز بھی وصول کیے اور اس کے بعد اڑتے طیارے سے کامیابی سے فرار بھی ہو گیا۔ نہایت وسیع پیمانے پر تلاش کے بعد اس کا کوئی سراغ نہیں ملا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ مزے کی بات ہے کہ اس شخص کا نہ تو کوئی پس منظر ہے اور نہ ہی امریکا بھر کی پولیس اور ایف بی آئی یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکی کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ وہ واردات سے پہلے اور اس کے بعد بھی ایک پراسرارترین اور نامعلوم فرد رہا۔ جرم کی تاریخ میں ڈی بی کوپر کہلانے والا شخص ایک مثال بن گیا ہے۔ اگر کسی لاینحل معمے یا کسی نامعلوم شخص کی طرف اشارہ کیا جائے تو اسے ڈی بی کوپر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ امریکی تاریخ کا واحد غیر حل شدہ فضائی قزاقی کا کیس ہے۔

الاکس ڈان کوپر نامی ایک شخص نے چوبیس نومبر 1971ء پورٹ لینڈ ریاست اوریگن سے سیئٹل ریاست واشنگٹن جانے کے لیے ایک ٹکٹ خریدا۔ بعد میں میڈیا کی غلطی سے وہ ڈی بی کوپر کے نام سے معروف ہو گیا اور تصحیح کے باوجود اسے آج تک اسی غلط نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ سانولے رنگ کھڑے نقوش اور بھنچے ہوئے پتلے ہونٹوں والا شخص تھا جس کی قومیت کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے کیونکہ وہ نہ تو میکسیکن نقوش کا حامل تھا اور نہ ہی امریکا کے مقامی ریڈ انڈین نقوش رکھتا تھا۔ وہ سیاہ فام نسل سے بھی نہیں تھا۔ لیکن ماہرین کو شبہ تھا کہ اس کی رگوں میں سیاہ فام خون ضرور تھا۔ ممکنہ طور پر وہ ریڈ انڈین اور سیاہ فام نسل کے اختلاط سے وجود میں آیا تھا۔ اس کا قد تقریباً پانچ فٹ دس انچ اور جسم درمیانہ اور چست تھا۔ آنکھوں تلے اور ناک کے اطراف گہری لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ اکثر اعصاب زدہ رہتا تھا اور شاذ ہی مسکراتا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے پچاس کے درمیان کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

قصے کا آغاز چوبیس نومبر کی سردترین شام کو ہوا۔ اس روز تھینکس گیونگ ڈے تھا اور بیشتر لوگ اپنے گھروں پر ڈنر کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک شخص سیاہ اٹیچی کیس لیے اوریگن کے شہر پورٹ لینڈ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر نارتھ ویسٹ اور ینٹ ائر لائن کے ایک کاؤنٹر پر پہنچا۔ اس نے اپنا تعارف ڈان کوپر کے طور پر کرایا۔ اس نے سیئٹل واشنگٹن جانے والی پرواز نمبر تین سو پانچ کا ایک ون وے ٹکٹ طلب کیا۔ دونوں شہروں کے درمیان مشکل سے آدھے گھنٹے کا فضائی سفر تھا۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی سوزن گراہم کا بیان ہے کہ وہ چالیس سے پچاس کے درمیان کا پانچ فٹ دس انچ سے چھ فٹ تک طویل اور ایک اکہرے رنگ کے رین کوٹ اور مفلر میں تھا اس کے نیچے اس نے گہرے رنگ کا مکمل سوٹ پہن رکھا تھا۔ سوٹ تلے سفید کالر والی شرٹ اور تنگ ٹائی تھی جس پر اس نے مدر پرل ٹائی پن لگا رکھی تھی۔ وہ بات کرتے ہوئے تاثر نہیں دے رہا تھا اور اس کی سیاہ آنکھیں قطعی سپاٹ تھیں۔ اس نے بہت مختصر بات کی۔ جو ان الفاظ پر مبنی تھی۔

"میرا نام الاکس ڈان کوپر ہے مجھے کچھ دیر بعد سیئٹل جانے والی پرواز کا ایک ٹکٹ چاہیے۔"

سوزن نے اسے ٹکٹ بنا کر دیا تو اس نے رقم پوچھی اور نقد ادائیگی کر کے اس کا شکریہ ادا کر کے ٹکٹ لے لیا۔ کچھ دیر بعد وہ پرواز تین سو پانچ کے طیارے بوئنگ 727 میں سیٹ نمبر اٹھارہ سی، ایک اور روایت کے مطابق پندرہ ڈی اور مزید ایک دعوے کے مطابق اٹھارہ ای سیٹ پر بیٹھا تھا۔ یہ شیڈولڈ پرواز کئی شہروں کو جاتی تھی اور جب اس نے پورٹ لینڈ سے مقامی وقت کے مطابق دو بج کر پچاس منٹ پر پرواز کی تو طیارہ نشستوں کے لحاظ سے ایک تہائی بھرا ہوا تھا۔ کوپر جس جگہ بیٹھا ہوا تھا یہ جگہ فلائیٹ اٹینڈینٹ کی جمپ سیٹ کے پاس تھی۔ اس نے سگریٹ نوشی کی ممانعت کی لائٹ بند ہوتے ہی ایک سگریٹ سلگایا اور بوربن وسوڈے کا آرڈر دیا تھا۔ کچھ دیر وہ دونوں چیزوں سے بیک وقت شغل کرتا رہا اور پھر اس نے اپنے کوٹ سے ایک کاغذ نکالا اور اسے آگے جھک کر جمپ سیٹ پر موجود فلائٹ اٹینڈینٹ فلورنس شیفنر کے حوالے کر دیا۔ وہ سمجھی کہ اس کاغذ پر اس بزنس

مین نظر آنے والے شخص نے اپنا فون نمبر لکھا ہے اور اس نے اسے دیکھے بغیر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ اس پر کوپر دوبارہ آگے آیا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مس بہتر ہوگا تم کاغذ کو ایک نظر دیکھ لو کیونکہ میرے پاس ایک عدد بم ہے۔"

فلورنس نے گھبرا کر کاغذ بیگ سے نکالا تو اس پر تقریباً ٹائپ کے انداز میں اور تمام کیپٹل الفابیٹ میں ایک تحریر تھی۔ اسے کسی نفیس اور باریک پین سے لکھا گیا تھا۔ "میرے پاس اس بریف کیس میں ایک بم ہے جو میں ضرورت پڑنے پر استعمال بھی کرسکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے برابر والی سیٹ پر آجاؤ۔ خیال رہے کہ یہ طیارہ ہائی جیک کیا جا چکا ہے۔ اس لیے کسی غلط حرکت کا خیال دل میں مت لانا۔"

فلورنس ایک تربیت یافتہ ائر ہوسٹس تھی اور اسے ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ اپنی جمپ سیٹ سے اٹھ کر اس کے برابر میں آبیٹھی جیسا کہ اس نے کہا تھا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "کیا میں بم دیکھ سکتی ہوں؟"

کوپر کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیلے تھے مگر اس کی آنکھیں ویسی ہی سرد تھیں۔ اس نے کہا۔ "تم سمجھ رہی ہو شاید میں بلف کر رہا ہوں لیکن تم دیکھ سکتی ہو۔"

کوپر نے اپنا بریف کیس اس حد تک کھولا کہ فلورنس بم کا نظارہ کرسکے۔ یہ آٹھ عدد ڈائنا مائٹ اسٹکوں پر مشتمل بم تھا جو چار چار کرکے اوپر تلے ایک بنڈل کی صورت میں سرخ رنگ کے ٹیپ سے بندھی ہوئی تھیں۔ ان سے سرخ انسولیشن والی تاریں نکل کر ایک سرخ ہی رنگ کی سلینڈر نما بیٹری تک جا رہی تھیں۔ دیکھنے میں یہ ایک مکمل اور مہلک بم لگ رہا تھا مگر جب بعد میں فلورنس نے ایف بی آئی کے ماہرین کو بم کا حلیہ بتایا تو انہوں نے اسے نامکمل بلف قرار دیا کیونکہ اس میں ٹریگر نہیں تھا۔ ٹریگر کے بغیر بم اڑانا آسان کام نہیں تھا۔ فلورنس اگر خوفزدہ ہوئی تھی تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا اور اسی انداز میں بولی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"دو لاکھ امریکی ڈالرز، چار عدد پیراشوٹ دو پرائمری اور دو اضافی ہوں۔ سیٹل میں ایک عدد فیول ٹینکر تاکہ جیسے ہی طیارہ وہاں لینڈ کرے اسے ری فیول کیا جائے۔ جب تک یہ سارے کام نہیں ہو جاتے طیارہ فضا میں رہے گا۔ کیا تم میرے مطالبات سمجھ گئی ہو؟"

فلورنس نے سر ہلایا۔ "مجھے کاک پٹ جانا ہوگا۔"

"بالکل مگر کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ میں اسے استعمال کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔" کوپر نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ فلورنس نے سر ہلایا اور اٹھ کر کاک پٹ تک گئی اس نے طیارے کے کیپٹن ولیم اسکاٹ کو ہائی جیکنگ اور ہائی جیکر کے مطالبات کے بارے میں بتایا۔ کیپٹن فوری ائر ٹریفک کنٹرولر اور دوسرے حکام سے رابطے میں مصروف ہو گیا۔ جب فلورنس واپس آئی تو کوپر نے تاریک شیشوں والی عینک پہنی ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ جہاں کوپر بیٹھا تھا وہاں آس پاس کئی قطاروں تک کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ فلورنس نے کوپر کو بتایا کہ اس کے مطالبات کیپٹن کے گوش گزار کر دیے ہیں اور وہ حکام سے رابطہ کر رہا ہے۔ کیپٹن ولیم اسکاٹ نے سیٹل ائر پورٹ کے ائر ٹریفک کنٹرول سے رابطہ کیا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد اس نے مقامی حکام اور وفاقی حکام کو اس بارے میں بتایا اور آخر میں اس نے طیارے کے چھتیس مسافروں کو آگاہ کیا کہ ایک معمولی سی تیکنیکی مسئلے کی وجہ سے سیٹل تک ان کی پرواز ذرا تاخیر کا شکار ہوگی۔ اس دوران میں یہ خبر نارتھ ویسٹ اورینٹ کے صدر ڈونالڈ نائروپ تک پہنچ گئی تھی اس نے فوری حکم جاری کیا کہ ہائی جیکر کے مطالبہ کردہ دو لاکھ ڈالرز ادا کیے جائیں اور ائر لائن کے تمام ملازمین ہائی جیکر سے مکمل تعاون کریں۔

سیٹل کے ائر ٹریفک کنٹرول نے پولیس کی رضامندی سے طیارے کو دو گھنٹے تک فضا میں چکر لگانے کی اجازت دی تاکہ اس دوران میں ہائی جیکر کے لیے رقم اور پیراشوٹ لائے جاسکیں۔ یہ دونوں کام ایف بی آئی کر رہی تھی۔ ایف بی آئی کے ماہرین پیراشوٹس کو کوپر کی مرضی کے مطابق سیٹ کر رہے تھے۔ پیراشوٹس کے بارے میں کوپر نے بعد میں مزید ہدایات دی تھیں کہ اسے کس قسم کے پیراشوٹس درکار ہیں۔ اگر پرائمری پیراشوٹ کسی وجہ سے نہ کھلے تو اضافی پیراشوٹ خود بہ خود کھل جاتا۔ اس سے ظاہر تھا کہ کوپر نہ صرف پیراشوٹس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا بلکہ وہ ممکنہ طور پر پیرا جمپنگ کا تجربہ بھی رکھتا تھا ورنہ وہ طیارے سے نکلنے کے لیے اتنا خطرناک راستہ منتخب نہ کرتا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانا آسان کام نہیں ہے اور ذرا سی بے احتیاطی یا غلطی سے چھلانگ موت کی چھلانگ بھی ثابت ہوتی ہے۔ بہت سے ماہر اور سینکڑوں

چھلانگوں کا تجربہ رکھنے والے اسی وجہ سے موت سے ہمکنار ہوئے تھے۔

فلورنس نے بعد میں بتایا کہ کوپر سیئٹل اور اس کے آس پاس کے علاقے سے مکمل طور پر باخبر لگ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ ٹاکوما ائرپورٹ کے پاس ہی مک شورڈ ائربیس ہے جو ٹاکوما سے بیس منٹ کی فضائی مسافت پر واقع ہے۔ اس نے فلورنس کو اشارے سے اس کا جائے وقوع واضح بھی کیا تھا۔ اس نے جو بات کی وہ مکمل طور پر سکون اور سوچ سمجھ کر کی تھی۔ اس کے انداز میں ذرا بھی گھبراہٹ یا "مجھے کیوبا لے چلو" قسم کے ہائی جیکرز کا اضطراب نہیں تھا۔ جو ان دنوں آئے دن امریکی ہوائی جہاز اغوا کررہے تھے۔ خاص طور سے میامی جانے والی پروازوں کا نام ہی مذاق میں میامی براستہ ہوانا رکھ دیا گیا تھا۔ یہ سیاسی ہائی جیکر ہوتے تھے جن کی اکثریت امریکا میں ہی گرفتار ہوجاتی تھی اور ان میں سے کم کو کیوبا جانا نصیب ہوتا تھا۔ ایک اور ائرہوسٹس ٹینا میکلو نے تفتیش کرنے والوں کو بتایا۔

"وہ ذرا بھی نروس نہیں تھا۔ وہ پُرسکون اور خاموش تھا۔ ہمارے ساتھ اس کا رویہ بہت نفیس اور شائستہ تھا اور ذرا بھی درشتی یا بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس تمام وقت میں پُرخیال اور پُرسکون رہا تھا۔ اس نے ایک بوربن ختم کرکے دوسری بوربن کی فرمائش کی تھی۔ اس نے پینے میں بھی کوئی عجلت نہیں دکھائی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کے ایک ایک گھونٹ سے لطف اٹھا رہا ہو۔"

اس وقت پروازوں پر شراب ادائیگی کی بنیاد پر فراہم کی جاتی تھی اس نے دونوں بار فلورنس کو ادائیگی کی اور ٹپ پاس رکھنے پر اصرار کیا۔ اس نے کہا کہ اسے سیئٹل میں رکنے کے دوران اس کا بتایا ہوا کھانا مہیا کیا جائے۔ مگر اس نے کھانے کے تین سیٹ تیار کرنے کو کہا تھا۔ فلورنس اور ٹینا اس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوتیں۔ اس دوران میں ایف بی آئی ایجنٹس سیئٹل کے مختلف بینکوں سے رقم کے لیے بیس ڈالرز کے پرانے بنا کسی نشان کے استعمال شدہ نوٹ جمع کر رہے تھے۔ مگر ان میں سے اکثر کا شروع کا الفابیٹ ایل تھا جس کا مطلب تھا کہ انہیں فیڈرل ریزرو بینک آف سان فرانسسکو نے جاری کیا ہے اور ان میں سے اکثر 1969ء میں سی سیریز میں جاری ہوئے تھے۔ ایف بی آئی والے ان میں سے ہر نوٹ کی تصویر لے رہے تھے۔ کیونکہ وقت کم تھا اس لیے متعدد افراد اس کام پر لگے ہوئے تھے۔ حیران کن طور پر کوپر نے سو ڈالرز کے بجائے بیس ڈالرز کے نوٹ طلب کیے تھے اور شاید اس وجہ سے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی اور انہیں یاد رکھنا یا ان کا ریکارڈ رکھنا آسان نہ ہوتا اسی وجہ سے ایف بی آئی والے ان کی تصاویر اتارنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

کوپر نے ائرفورس کے جنگی پیراشوٹ لینے سے انکار کردیا تھا جو صرف ایک رسی کھینچنے سے کھل جاتے تھے اور انہیں کنٹرول کرنا بھی آسان تھا اس کے بجائے اس نے سویلین پیراشوٹ طلب کیا تھا جسے رسیوں کی مدد سے قابو کیا جاتا ہے اور اسے کھولنا بھی کسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطالبہ تھا اس لیے ایف بی آئی حکام نے سیئٹل کے ایک اسکائی ڈائیونگ اسکول سے مذکورہ پیراشوٹ حاصل کیے تھے۔ یہ سب چیزیں طیارے کی سیئٹل آمد سے پہلے وہاں پہنچادی گئی تھیں۔ رقم سب سے آخر میں آئی تھی اور اس وقت طیارہ دو گھنٹے تک ٹاکوما ائرپورٹ پر چکر لگانے کے بعد لینڈ کررہا تھا۔ حکام نے تمام رن وے مکمل طور پر خالی کرالیے تھے۔ سیئٹل آنے والی دیگر پروازوں کا رخ آس پاس کے ہوائی اڈوں کی طرف موڑ دیا گیا تھا جسے سیئٹل سے پرواز کرنی تھی اسے روک لیا گیا تھا اور تمام ٹرمینلز مسافروں سے خالی کرالیے گئے تھے۔ اس وقت ائرپورٹ پر ضروری اسٹاف کے علاوہ صرف پولیس اور ایف بی آئی والے موجود تھے۔

پانچ بج کر اڑتیس منٹ پر کوپر کو بتایا گیا کہ اس کی مطلوب اشیا ایئرپورٹ پر آچکی ہیں اور پانچ بج کر اکتالیس منٹ پر طیارہ سیئٹل کے ٹوباکو ائرپورٹ پر لینڈ کررہا تھا۔ جیسے ہی طیارہ نیچے اترا کوپر نے کیپٹن ولیم اسکاٹ کو ہدایت کی کہ طیارے کو رن وے کے ایک الگ تھلگ مگر روشن حصے میں لے جائے اور طیارے کے کیبن کی روشنیاں بند کردے۔ یقیناً وہ پولیس کے نشانچیوں سے بچنے کے لیے ایسا کررہا تھا۔ کیپٹن ولیم اسکاٹ نے ایسا ہی کیا۔ طیارے کے رکتے ہی نارتھ ویسٹ اورینٹ کا آپریشن مینیجر عام سے لباس میں طیارے تک آیا۔ اس نے اپنا یونیفارم اتار دیا تھا کہ کہیں کوپر غلطی سے اسے پولیس آفیسر نہ سمجھ لے کیونکہ اس کا یونیفارم خاصی حد تک اسی رنگ اور ڈیزائن کا تھا۔ بس نشانات اور بیجز کی کمی ہوتی۔

بوئنگ سات سو ستائیس زیادہ اونچا نہیں ہے مگر اس کے آگے والے اور درمیانی دروازے اتنے بلند ضرور تھے کہ بغیر سیڑھی کی مدد کے ان پر چڑھنا اترنا آسان نہیں

تھا۔ کیونکہ یہاں سیڑھی نہیں تھی اس لیے طیارے کا عقبی دروازہ کھولا گیا۔ اس کے ساتھ آٹومیٹک کھلنے اور بند ہونے والی سیڑھی تھی اور آپریشن مینیجر اس سے اندر آیا۔ اس نے رقم کا بنا ہوا پیک اور پیراشوٹ کوپر کے حوالے کیے اور فوری واپس لوٹ گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوپر نے اطمینان سے تمام چیزوں کا معائنہ کیا اور جب اسے اطمینان ہوگیا کہ رقم اس کی مرضی کے مطابق اور پیراشوٹ درست حالت میں ہیں تو اس نے سوائے ٹینا میکلو اور پائلٹس کے تمام افراد کو طیارے سے اترنے کی اجازت دے دی۔ ایک حیرت آمیز خوشی کے ساتھ تمام مسافر اور عملہ عقبی دروازے سے طیارے سے نکل گیا اور چند منٹ بعد وہ سب باحفاظت ایئر پورٹ ٹرمنل تک پہنچ گئے تھے۔ حکام بھی کوپر کی اس حکمتِ عملی پر حیران تھے اور انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ بغیر مطالبے کے ہی مسافروں اور غیر ضروری عملے کو طیارے سے جانے کی اجازت دے دے گا۔ صرف ٹینا رک گئی تھی جو حسرت سے جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی نے تمام افراد کے جانے کے بعد طیارے کا دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔

اس کے بعد کوپر نے ری فیولنگ ٹرک کو طیارے کے پاس آنے کی اجازت دی۔ جس وقت طیارے میں ایندھن بھرا جا رہا تھا۔ کوپر کاک پٹ میں کیپٹن اسکاٹ اور اس کے عملے کو بتا رہا تھا کہ انہیں طیارہ کہاں لے جانا ہے۔ اس نے کیپٹن اسکاٹ سے کہا کہ وہ میکسیکو سٹی کے جنوب مشرق میں ساحل کے پاس لے جائے۔ سیٹل سے پرواز کے بعد وہ طیارے کو کم سے کم رفتار سے اڑائے زیادہ سے زیادہ سو ناٹ فی گھنٹا جو ایک سو بیس میل یا ایک سو نوے کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار بنتی ہے۔ بلندی زیادہ سے زیادہ دس ہزار فٹ ہونی چاہیے۔ اس نے مزید وضاحت کی کہ طیارے کے لینڈنگ گیئر باہر نکلے ہوئے ہوں جیسا کہ ٹیک آف یا لینڈنگ کے وقت ہوتے ہیں۔ پروں کے حرکت کرنے والے فلیپس بالکل نیچے پندرہ ڈگری کے زاویے پر ہوں (اس سے طیارہ کم رفتار پر فضا میں آرام سے اڑتا ہے اور بے قابو نہیں ہوتا)۔ کیبن پریشر ختم کر دیا جائے۔

کیپٹن اسکاٹ کو کوپر کی کسی بات پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں تھی مگر اس کے کوپائلٹ ولیم رٹا کزک نے بتایا کہ یہ طیارہ ایک بار میں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار میل پرواز کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے لازمی ری فیولنگ کی ضرورت ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں انہیں میکسیکو تک جانے کے لیے ایندھن لینے ایک بار امریکا میں کہیں اترنا لازمی تھا۔ کسی قدر بحث کے بعد کوپر اور کاک پٹ کا عملہ ریاست نیواڈا کے شہر رینو کے ایئرپورٹ سے ری فیولنگ پر متفق ہوگئے۔ کیپٹن اسکاٹ نے ریڈیو پر حکام کو کوپر کی احکامات سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے تعاون کی درخواست کی تاکہ وہ غیر معمولی حالات میں محفوظ پرواز کر سکے۔ اس علاقے میں ایئر ٹریفک کو طیارے کے راستے سے ہٹانا تھا۔

تمام امور طے ہونے کے بعد کوپر نے حکم دیا کہ ٹیک آف کے دوران طیارے کا عقبی کارگو والا دروازہ کھلا رکھا جائے اور اس کی سیڑھیاں باہر کی جائیں۔ اس پر نارتھ ویسٹ اورینٹ کے حکام نے اسے خبردار کیا کہ یہ محفوظ ٹیک آف کے لیے رسک ہوگا۔ کوپر نے جواب دیا کہ بالکل بھی رسک نہیں ہوگا مگر اس نے سیڑھیاں باہر نکالنے پر اصرار نہیں کیا یہ کام وہ بعد میں خود کر سکتا تھا جب طیارہ ہوا میں ہو۔ ایک ایف اے کے افسر نے کوپر سے درخواست کی کہ وہ اس سے آمنے سامنے ایک ملاقات چاہتا ہے۔ کوپر نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ اس دوران میں ری فیولنگ ٹرک کا ایک فیول پمپ میکنزم جام ہوگیا اور اس کی وجہ سے فیولنگ میں سستی آئی۔ کوپر مشکوک ہوا تھا مگر اس نے ایک اور ری فیولنگ ٹرک کو وہاں آنے کی اجازت دے دی۔ جب دوسرا ٹرک خالی ہوگیا اور طیارے کے ٹینک ابھی فل نہیں ہوئے تو اس نے تیسرے ری فیولنگ ٹرک کو آنے کی اجازت دی۔ اس دوران میں کوپر مسلسل کاک پٹ میں رہا اور اس کے ہاتھ میں بم والا بریف کیس موجود رہا تھا۔ کیپٹن اسکاٹ نے اس سے درخواست کی۔

"بعض اوقات ٹیک آف کے دوران طیارے اور اس کی باڈی میں الیکٹریکل چارج پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت میں خطرہ ہوگا کہ بم ڈیٹونیٹ ہو جائے اس لیے تم مہربانی کر کے اس کی تاریں عارضی طور پر نکال دو۔"

کوپر نے انکار کر دیا۔ "میں یہ خطرہ مول لے سکتا ہوں لیکن بم کو ڈی فیوز نہیں کر سکتا۔"

سات بج کر چالیس منٹ پر طیارے نے سیٹل سے پرواز کی۔ اس وقت طیارے میں کوپر کے ساتھ ٹینا میکلو، کیپٹن اسکاٹ، کوپائلٹ رٹا کزک اور فلائیٹ انجینئر ایچ ای اینڈرسن موجود تھے۔ جس وقت طیارہ اپنے طے شدہ فلائٹ لیول یعنی دس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا تو نزدیکی ایئر بیس سے اڑنے والے دو عدد ایف ایک سو چھ لڑاکا طیارے

بوئنگ سات سو ستائیس کے آگے اور پیچھے یوں پرواز کرنے لگے کہ وہ کوپر کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اسی طرح ایک ٹریزر جیٹ طیارہ ٹی تھرٹی تھری بھی نیشنل گارڈز کی ڈیوٹی سے ہٹ کر طیارے کے ساتھ آگیا اور اس کے بالکل پیچھے پرواز کرنے لگا تھا مگر کیلیفورنیا کے پاس پہنچ کر یہ کم فیول کی وجہ سے واپس اپنے ایئر بیس چلا گیا۔ البتہ لڑاکا طیارے بدستور موجود تھے اور وہ میزائل فائر کرنے کے لیے اسٹینڈ بائی تھے بس انہیں حکم کا انتظار تھا۔

طیارے کی پرواز کے ساتھ ہی کوپر نے ٹینا میکلو کو حکم دیا کہ وہ بھی کاک پٹ میں چلی جائے اور دروازہ اندر سے بند کر کے وہیں رہے۔ جب وہ کاک پٹ کی طرف جا رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ کوپر اپنی کمر کے ساتھ کچھ باندھ رہا تھا۔ آٹھ بجے کاک پٹ میں ایک وارننگ لائٹ جلنے بجھنے لگی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ کارگو والے دروازے کی سیڑھی باہر نکالنے والا نظام آن کر دیا گیا تھا۔ اس پر کیپٹن اسکاٹ نے انٹر کام سسٹم پر کوپر کو مدد کی پیشکش کی جو اس نے مسترد کر دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ طیارے کا کیبن پریشر گر رہا ہے۔ یعنی کوپر نے کارگو والا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کیبن پریشر کرنے والی لائٹس آن ہو گئیں۔ اس وقت طیارے کا کیبن پریشر کم نہیں کیا گیا تھا۔ کوپر نے اپنے واضح حکم کی خلاف ورزی کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح کیبن پریشر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اندر کا درجہ حرارت بھی تیزی سے گرنے لگا۔ کیپٹن اسکاٹ اور اس کے ساتھیوں نے آکسیجن ماسک لگا لیے تھے اور صرف کاک پٹ گرم رکھنے والا سسٹم آن کر لیا تھا۔ اس سے باہر درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے خاصا نیچے جا چکا تھا۔

کیونکہ کوپر نے سخت وارننگ دی تھی کہ کوئی کاک پٹ سے باہر نہ آئے اس لیے کسی نے ایسی جرأت نہیں کی اور وہ اسی حالت میں طیارے کو اڑاتے ہوئے دس بج کر پندرہ منٹ پر رینو ائر پورٹ پہنچے جہاں طیارے نے اس حالت میں لینڈنگ کی کہ اس کی عقبی دروازے کی سیڑھی بدستور باہر نکلی ہوئی تھی اور طیارہ با حفاظت نیچے اتر گیا۔ ائر پورٹ پر اترتے ہی طیارے کو ایف بی آئی کے ایجنٹوں، ریاستی دستوں، پولیس اور ایئر پورٹ سیکیورٹی اسٹاف نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ عملے کو کاک پٹ میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ مسلح ایجنٹس عقبی حصے سے طیارے میں داخل ہوئے۔ وہاں کوئی سرگرمی نہیں تھی اور ایسا

لگ رہا تھا کہ کوپر راستے میں کہیں طیارے سے نکل گیا تھا اور جب وہ اندر داخل ہوئے تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ طیارہ اندر سے خالی تھا اور کوپر جا چکا تھا۔

کوپر کے فرار کی تصدیق ہوتے ہی ایف بی آئی نے فوری طور پر طیارے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور تفتیش کا آغاز کر دیا۔ ایف بی آئی کو طیارے سے اجنبی فنگر پرنٹس کے چھیاسٹھ نشانات ملے۔ ان میں سے کچھ مدر پرل ٹائی پن، کوپر کے سیاہ کلپ اور چادر میں سے دو پیراشوٹ جو وہ طیارے میں چھوڑ گیا تھا۔ ان میں سے ایک کھلا ہوا تھا اور اس کی شیٹ پر دو عدد لمبے کٹ لگے ہوئے تھے۔ غالباً کوپر ان کی مضبوطی جانچنا چاہ رہا تھا کہ وہ کام بھی کرتے یا نہیں، وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ پیرا شوٹ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے۔ دوسرا رہ جانے والا پیرا شوٹ اسی طرح پیک تھا۔ ایف بی آئی نے سیئٹل، پورٹ لینڈ اور رینو میں ان تمام افراد سے تفصیلی سوال جواب کیے جنہوں نے کوپر کا سامنا کیا تھا یا وہ طیارے میں تھے جب اسے ہائی جیک کیا گیا۔ ان انٹرویوز سے بہت سے مختلف پہلو سامنے آئے جو آپس میں بھی متضاد تھے۔

دوسری طرف ایف بی آئی اور اوریگن کی مقامی پولیس نے فوری طور پر مشکوک افراد کی چھان بین شروع کر دی۔ ان میں ایک مقامی جرائم پیشہ ڈی بی کوپر بھی شامل تھا۔ پولیس نے اس تک رسائی حاصل کی مگر وہ بالکل مختلف آدمی نکلا تھا پھر وہ ہائی جیکنگ کے وقت ایک بار میں موجود تھا۔ اس کے بعد بھی پولیس اور ایف بی آئی کئی مشکوک افراد تک پہنچی مگر ان میں سے کوئی بھی مبینہ الاکس بی کوپر نہیں نکلا تھا۔ اسی دوران میڈیا میں ایک غلط فہمی پروان چڑھ رہی تھی۔ کوپر نے جس طرح اپنا نام بتایا تھا اس سے لگا جیسے وہ خود کو ڈی بی کوپر کہہ رہا ہے اور جب تک حکام کی طرف سے اس کی تصحیح کی جاتی عوام کی زبان پر ڈی بی کوپر کا نام چڑھ چکا تھا۔ اس غلط نام کو آگے بڑھانے میں ایک ناتجربے کار رپورٹر کلائیڈ جابین اور ایک میڈیا مین جوئی فریز کا ہاتھ تھا۔ ان کی غلطی آج بھی ڈی بی کوپر کے نام کی صورت میں زندہ ہے۔

ایک طرف حکام کوپر کے پس منظر تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف اس کی عملی تلاش بھی جاری تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ طیارے کی پرواز کے بعد آٹھ بج کر پندرہ منٹ سے لے کر دس بج کر پندرہ منٹ تک کہیں بھی

طیارے سے چھلانگ لگا سکتا تھا۔ اس نے پچھلا حصہ کھول کر کیپٹن اسکاٹ کو طیارے کی بلندی کم کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور آٹھ بج کر پچیس منٹ پر طیارہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا جو اگرچہ فری فال کے لحاظ سے زیادہ بلندی ہے۔ عام طور سے چھلانگ لگانے والے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتے ہیں مگر دس ہزار فٹ کی بلندی بھی زیادہ نہیں ہے اور اگر اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے والا دو ہزار فٹ کی بلندی پر پیراشوٹ کھول لے تو زمین تک آتے آتے اس کی رفتار پچیس کلو میٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ کوئی بھی ماہر آسانی سے زمین پر باحفاظت اتر سکتا ہے۔ کوپر کے بارے میں ایف بی آئی اور پولیس کے ماہرین کو یقین تھا کہ وہ اسکائی ڈائیونگ کا ماہر ہو یا نہ ہو لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ اس لیے اس کے باحفاظت زمین پر اترنے کا امکان تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ تقریباً ہزار میل طویل اس علاقے میں وہ کہیں بھی اتر سکتا تھا۔ اگر ایک لائن کھینچ لی جاتی تب بھی بلندی، ہوا کا زور اور خود اس کی کوشش اسے دائیں بائیں تیس سے چالیس میل دور لے جا سکتی تھی، گویا اسے تلاش کا علاقہ کوئی ستر سے اسی ہزار مربع میل بن سکتا تھا۔ اس سارے علاقے میں بے شمار چھوٹے بڑے شہر، دور دراز آبادیاں تھیں۔ جنگل اور ویرانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ متعدد دریا بہتے تھے۔ بے شمار جھیلیں تھیں اور دلدلی علاقے کی وجہ سے رات آٹھ بجے کے بعد نوّے فیصد لوگ اپنے گھروں میں پائے جاتے تھے اور جو باہر ہوتے وہ بھی کھلی جگہوں پر نہیں ہوتے۔ اس لیے اس کا امکان بہت کم تھا کہ اگر کوپر کسی آبادی کے پاس اترا ہو تو بھی اسے کسی نے دیکھا ہو۔

بوئنگ سات سو ستائیس کے پیچھے اڑتے دونوں لڑاکا طیاروں کے پائلٹس نے اسے طیارے سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ رات کا وقت تھا اور حد نگاہ محدود تھی۔ کوپر نے تقریباً سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اسی طرح اس کا اٹیچی کیس اور رقم والا بیگ بھی گہرے رنگ کا تھا۔ نیچے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور اگر کوپر نے چھلانگ لگانے کے بعد اس وقت پیراشوٹ کھولا ہوگا جب وہ بادلوں کی گھنی تہہ میں داخل ہو چکا تھا تو پائلٹس کے لیے اسے دیکھنا ناممکن تھا۔ تین ہزار فٹ سے کم بلندی پر کوئی ریڈار بھی کسی پیراشوٹ کی نشان وہی نہیں کر سکتا ہے۔ صرف بادل ہی نہیں تھے بلکہ زمین پر کئی جگہوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف فائیٹر پائلٹس بلکہ زمین پر بھی کوئی کوپر کو نیچے آتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ لڑاکا طیارے ذرا فاصلے پر تھے مگر نیشنل گارڈز کی تھرٹی تھری طیارے کے بالکل نیچے تھا اور اس کے پائلٹ بوئنگ سات سو ستائیس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ بھی کوپر کو باہر نکلتے نہیں دیکھ سکے۔

کیپٹن اسکاٹ اور اس کے عملے نے آٹھ بج کر تیرہ منٹ پر جب کہ عقبی دروازہ کھل چکا تھا طیارے میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ محسوس کی تھی۔ اس پر ایف بی آئی کے ایجنٹوں نے ایک تجربہ کیا۔ انہوں نے اسی طیارے کو اسی عملے کے ساتھ اسی بلندی پر لے جا کر اس کے عقبی دروازے سے ایک نوّے کلوگرام وزنی تھیلا نیچے گرایا تو طیارے میں بالکل ویسی ہی تھرتھراہٹ ہوئی تھی۔ اس تجربے سے انہوں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کوپر کہاں طیارے سے نکلا تھا۔ فلائیٹ ریکارڈ کے مطابق اس وقت طیارہ واشنگٹن کے جنوب مغرب میں دریائے لوئیس پر پرواز کر رہا تھا اور نیچے طوفانی بارش جاری تھی۔ ماہرین نے اندازہ لگایا کہ کوپر ممکنہ طور پر نزدیکی پہاڑی چوٹی سینٹ ہیلنز کے نزدیک ایک مصنوعی جھیل مروون میں اترا ہوگا۔ یہ جھیل دریائے لوئیس پر ایک ڈیم بنانے سے وجود میں آئی تھی۔

دیکھا جائے تو کسی بھی پیراشوٹ جمپ کے لیے یہ نہایت ناموزوں وقت اور ناموزوں ترین موسم تھا۔ بارش کے ساتھ ہلکا سا طوفان بھی آیا ہوا تھا جو پیراشوٹ کو غیر متوازن کر سکتا تھا اور اس کا خطرہ بہت زیادہ تھا کہ کھلتے وقت پیراشوٹ درست طریقے سے نہ کھل سکے اور کوپر کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے زمین سے جا ٹکرائے۔ اس کا بھی امکان تھا کہ پیراشوٹ تو کھل جائے مگر ہوائیں اور طوفانی بارش اسے بے قابو کر کے کوپر کو کسی چٹان یا اونچے درخت پر جا کر دے ماریں۔ دونوں صورتوں میں اس کی بچت کا امکان کم تھا۔ کودتے وقت اس کے پاس رقم اور بم والے اٹیچی کیس کی صورت میں کم سے کم پچاس سے ساٹھ کلوگرام اضافی وزن تھا اور یہ اضافی وزن بھی اسے مشکل سے دوچار کر سکتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق کوپر کا اپنا وزن کم سے کم ستّر کلوگرام تھا۔ اس طرح کل وزن ایک سو بیس سے ایک سو تیس کلوگرام بن رہا تھا۔ سب سے خطرناک چیز اس وقت دس ہزار فٹ کی بلندی پر باہر کا درجۂ حرارت تھا جو منفی ستاون درجے سینٹی گریڈ تھا۔

ان سب امکانات کو مدِنظر رکھ کر بھی ماہرین کا خیال

تھا کہ کوپر زمین پر باحفاظت پہنچ گیا تھا کیونکہ اس نے یہ منصوبہ ایک ایک چیز کو مدِنظر رکھ کر بنایا تھا۔ اسے یہ تک معلوم تھا کہ اس علاقے میں موسم کیسا ہوگا اور اس نے اگر یہاں چھلانگ لگائی تھی تو بہت سوچ سمجھ کر لگائی تھی۔ اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اس نے وزن کم کرنے کے لیے اٹیچی کیس پہلے ہی پھینک دیا ہو اور صرف رقم کے ساتھ چھلانگ لگائی ہو۔ جو اس کے جسم کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اس صورت میں اس کے دونوں ہاتھ فری فال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح آزاد تھے۔ موسم سے قطع نظر اگر اس نے اپنا پیرا شوٹ دو ہزار فٹ کی بلندی پر کھولا ہوگا تو اسے تیز ہواؤں اور بارش سے بھی واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس سے زیادہ بلندی پر تھیں۔ ایک بار پیرا شوٹ درست طریقے سے کھل جاتا تو اس کے بعد تیز ہوا اور بارش کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ بالفرض کہ ایک پیراشوٹ ٹھیک سے نہیں کھلا ہوگا تو اس کے پاس ریزرو پیراشوٹ تھا گویا اس کے پاس دو چانس تھے۔

تلاش کا مرکز اس علاقے کی دو کاؤنٹیاں کلارک اور کاؤلٹز تھیں۔ مگر ان سے ملحق علاقوں میں بھی تلاش جاری تھی۔ ایف بی آئی کے لاتعداد ایجنٹوں اور ان کاؤنٹیز کے ڈپٹی شیرف اپنے آدمیوں کے ہمراہ اس پورے علاقے کو نہایت سرد موسم میں پیدل اور ہیلی کاپٹر کی مدد سے چھانتے رہے۔ یہاں ناہموار پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ دور دراز جگہوں پر موجود فارم ہاؤسز تک گئے اور ایک ایک فرد سے سوالات کیے کہ انہوں نے اس رات کچھ دیکھا یا سنا تو نہیں تھا۔ مگر انہیں کوئی کلیو نہیں ملا۔ اس کے ساتھ سرکاری حکام کشتیوں میں دریائے لوئیس اور اس کی جھیلوں مرون اور یالے کو کھنگال رہے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ کوپر پانی میں اترا ہو اور ڈوب گیا ہو مگر انہیں نہ تو کوپر ملا اور نہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز ملی جن کے ساتھ اس نے طیارہ چھوڑا تھا۔ معمولی سا سراغ بھی سامنے نہیں آیا۔

زمینی تلاش کے ساتھ ایف بی آئی نے کوپر کی تلاش میں آرمی کے ائرنیشنل گارڈز ونگ کے ہمراہ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں سے اس سارے راستے پر تلاش کا کام شروع کیا جو سیٹل سے رینو تک تھا۔ اس راستے کو ایوی ایشن نے وکٹر 23 کا نام دیا۔ تلاش کے دوران بے شمار درختوں کے ٹوٹے سرے، پلاسٹک کے ٹکڑے، پیراشوٹس کے ٹکڑے اور دھاتیں ملیں مگر ان میں سے کسی کا تعلق کوپر سے نہیں نکلا تھا۔ یہ سب دوسروں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت ماہرین کا خیال تھا کہ موسم کی خرابی اس تلاش میں آڑے آرہی ہے۔ جابجا برف تھی اور کسی شہادت کے برف تلے ہونے کا امکان بھی تھا۔ اس لیے طے ہوا کہ برف پگھلتے ہی تلاش کا کام پھر شروع کیا جائے گا۔ مارچ کے وسط میں برف پگھلنے کے آغاز کے ساتھ ہی ایف بی آئی نے فورٹ لوئیس سے دو سو فوجی، ائر نیشنل گارڈز اور مقامی پولیس کی مدد سے ایک وسیع آپریشن ان ہی علاقوں میں کلارک اور کاؤلٹز کاؤنٹیوں میں شروع کیا جہاں وہ سرما میں تلاش کرچکے تھے۔

اٹھارہ روز مسلسل جاری رہنے والی اس تلاش کا نتیجہ حسب سابق نکلا یعنی کوئی چیز سامنے نہیں آئی۔ اس لیے اپریل میں ایک اور آٹھ روزہ تلاش کی مہم شروع کی گئی۔ ایک بری تلاش کرنے والی بحری کمپنی نے اپنی چھوٹی آبدوز سے جھیل مرون کی دو سو فٹ کی گہرائی میں تلاش کا کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جھیل یالے اور دریائے لوئیس میں بھی غوطہ خور تلاش کرتے رہے۔ موسم بہتر ہونے کے بعد مقامی رضا کار بھی اس تلاش میں شامل ہو گئے تھے۔ ایسی ہی دو رضا کار عورتوں نے ایک انسانی ڈھانچا تلاش کیا۔ یہ ڈھانچا کلارک کاؤنٹی کے ایک غیر آباد علاقے میں ملا تھا مگر جب اس کا طبی معائنہ ہوا تو ڈھانچا کسی عورت کا ثابت ہوا تھا۔ یہ ایک مقامی لڑکی تھی جو چند ہفتے پہلے غائب ہو گئی تھی۔ اسے کسی نے بے دردی سے قتل کرکے اس کی لاش یہاں ویرانے میں پھینک دی تھی جہاں جانوروں اور مردار خور پرندوں نے اسے ڈھانچا کردیا تھا۔ بہرحال تلاش کا یہ وسیع ترین سلسلہ ہائی جیکنگ سے متعلق کوئی بھی ثبوت حاصل کیے بغیر اختتام کو پہنچ گیا اسے امریکی تاریخ کی سب سے بڑی تلاش مہم کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے جمع شدہ معلومات کا تجزیہ جاری تھا اس سے لگ رہا تھا کہ ممکنہ طور پر کوپر وہاں نہیں اترا تھا جہاں اسے تلاش کیا جارہا تھا۔ فلائٹ تین سو پانچ کے کیپٹن اسکاٹ کا کہنا تھا کہ وہ کیونکہ کوپر کی فرمائش اور ہدایت کے مطابق رفتار اور بلندی پر طیارہ اڑا رہا تھا اس لیے وہ اسے مینول کنٹرول کررہا تھا اور اس میں امکان تھا کہ طیارہ اپنے اصل رخ سے ذرا سا ہٹا ہو جب وہ اس علاقے میں پرواز کررہا ہو۔ اسی طرح کاؤنٹی نینٹل ائر لائن کی ایک پرواز فلائٹ تین سو پانچ سے صرف چار منٹ کے فاصلے پر تھی اور اس کے کیپٹن ٹام بوہان نے بتایا کہ اس علاقے میں موسم توقع کے

مطابق نہیں تھا ہوا کا رخ پہلے سے بتائی سمت سے ہٹ کر تھا۔ ایک اور نتیجہ یہ نکل رہا تھا کہ کوپر کے اترنے کی جگہ پہلے سے تعین کی ہوئی جگہ سے مزید جنوب مشرق میں تھی اور یہ جگہ دریائے واشوگال تھی۔ ایف بی آئی انویسٹی گیشن ٹیم کے سربراہ رالف ہیملس بچ نے ریٹائر ہونے کے بعد 1986ء میں اپنی کتاب میں اس بارے میں لکھا۔

''مجھے اعتراف ہے، اگر میں دوبارہ اس کیس کی انویسٹی گیشن کرتا تو میں سب سے پہلے اسے دریائے واشوگال کی وادی اور اس سے ملحق علاقوں میں تلاش کرتا، کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں اس کے اترنے کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ آنے والے برسوں میں اس کیس کو حل کرنے کی متعدد سرکاری اور نجی کوششیں کی گئیں لیکن کچھ نہیں ہوا ہمیں ہائی جیکر کا ذرا بھی سراغ نہیں ملا۔''

1971ء کے آخر میں ایف بی آئی نے ایک اور طریقے سے ہائی جیکر تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ایجنسی نے اپنے پاس موجود کرنسی نوٹوں کے سیریل نمبرز ملک بھر میں پھیلے تجارتی مراکز، ریس کورسز، جوئے خانوں اور ان جگہ پر بھیج دیئے جہاں روز کیش کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ دنیا بھر کے کرنسی ایکسچینج مراکز کو بھی یہ سیریل نمبرز بھیج دیئے گئے۔ نارتھ ویسٹ اور ینٹ ائرلائن نے رقم کے پندرہ فیصد انعام کا اعلان کیا جو شخص ہائی جیکر کو پکڑواتا یا اس کے پاس موجود رقم بازیاب کراتا۔ پندرہ فیصد کل رقم کا تیس ہزار ڈالرز بنتا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت کے دو لاکھ ڈالرز آج کے گیارہ لاکھ ستر ہزار ڈالرز کے مساوی مالیت رکھتے تھے۔ 1972ء کے آغاز میں اٹارنی جنرل جان مچل نے نوٹوں کے سیریل نمبرز عام کر دیئے اور عوام سے اپیل کی کہ ان میں سے کوئی نمبر ان کی نظر سے گزرے تو فوراً حکام کو مطلع کریں۔

فوراً ہی دو افراد نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے مذکورہ سیریل میں سے کچھ بیس ڈالرز کے نوٹ استعمال کیے تھے۔ ان کے بارے میں ایک رپورٹر کارل فلیمنگ نے رپورٹ جاری کی تھی اس نے ایک شخص کا انٹرویو بھی کیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہائی جیکر سے ملا تھا مگر بعد میں یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ 1973ء کے آغاز میں اخبار وی اوریگن جرنل نے ایک اعلان شائع کیا اس نے ایک ہزار ڈالرز کا اعلان کیا اس پہلے شخص کے لیے جو اس سیریل کے نوٹوں میں سے کوئی ایک نوٹ اخبار تک یا ایف بی آئی کے کسی بھی فیلڈ آفس تک پہنچائے گا۔ سیٹل کے ایک رسالے وی پوسٹ انٹیلی جنیس نے بھی پیشکش پانچ ہزار ڈالرز کے انعام کے ساتھ کی۔ یہ پیشکشیں 1974ء کے تھینکس گیونگ ڈے تک جاری رہیں اور اس دوران میں کوئی ایک نوٹ بھی سامنے نہیں آیا۔

اس دوران میں نارتھ ویسٹ اور ینٹ ائرلائن نے ہائی جیکر کو ادا شدہ رقم کی واپسی کے لیے اپنی انشورنس کمپنی گلوبل ایڈمیٹی کارپوریشن پر مقدمہ کر رکھا تھا اور سپریم کورٹ نے انشورنس کمپنی کو حکم دیا کہ وہ ائرلائن کو تاوان کی رقم کے بدلے ایک لاکھ اسّی ہزار ڈالرز ادا کرے۔ یہ کل رقم کا نوّے فیصد بنتا تھا لیکن ائرلائن حکام کا دعویٰ تھا کہ ان کا نقصان اس سے کہیں زیادہ تھا۔ انہیں نہ صرف اپنا طیارہ بہت عرصے تک واپس نہیں ملا اور اس سے فلائٹ آپریشن متاثر ہوا۔ پھر یہ کنیکٹنگ فلائٹ تھی انہیں بہت سے مسافروں کو رقم واپس کرنا پڑی یا انہیں دوسرے طیاروں یا ائرلائن میں سیٹ کرانا پڑا پھر تفتیش کے دوران طیارے کے استعمال کا خرچ بھی ائرلائن کو برداشت کرنا پڑا اس کے مقابلے میں ایک لاکھ اسّی ہزار ڈالرز کی ادائیگی بہت کم تھی مگر عدالت نے ائرلائن کا دعویٰ مسترد کر دیا اور اسے ایک لاکھ اسّی ہزار ڈالرز پر اکتفا کرنا پڑا۔

ایک طرف کوپر کی تلاش جاری تھی دوسری طرف اس بارے میں میڈیا اور عوام کی قیاس آرائیاں اور اسے تلاش کرنے کی نجی سرگرمیاں جاری تھیں ان کے ساتھ ساتھ اس کیس کے قانونی پہلوؤں پر بھی عمل درآمد جاری تھا اور پورٹ لینڈ جہاں یہ طیارہ اغوا ہوا تھا وہاں عدالت نے ایک گرینڈ جیوری تشکیل دی اور اس جیوری نے کوپر کو طیارے کے اغوا اور متعدد افراد کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے کا مرتکب قرار دیا۔ اسی جیوری نے فیصلہ دیا کہ مستقبل میں جب بھی کوپر گرفتار ہو اس پر ان الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔ قانونی کارروائی کا مقصد کوپر کے بیرونِ ملک پکڑے جانے کی صورت میں اسے امریکا لانے کے لیے زمین تیار رکھنا بھی تھا۔ کیونکہ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ درحقیقت امریکا سے باہر جا چکا ہو اور وہ امریکی ڈالرز ایسی جگہ خرچ کر رہا ہو جہاں اس کے پکڑے جانے کا امکان بہت کم ہو۔

کسی بھی ترقی پذیر ملک میں یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں جانے والے ڈالرز کو نہ تو چیک کیا جاتا تھا اور نہ ہی وہ اس ملک سے باہر نکلتے تھے بلکہ اندرونِ ملک ہی

گردش کرتے تھے یا طویل عرصے کے لیے لاکرز اور تجوریوں میں چلے جاتے تھے۔اس لیے ان کا سامنے آنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔کوپر کم سے کم اتنا ہوشیار ضرور ہوگا کہ اس نے پہلے ہی سوچ لیا ہوگا کہ اسے رقم کو امریکا میں نہیں چلانا ہے ورنہ بالآخر وہ پکڑا جائے گا۔عین ممکن ہے اس نے کسی ترقی پذیر ملک کے منی چینجر سے پہلے ہی معاملہ کرلیا ہو اور دو لاکھ ڈالرز اسے دے کر بدلے میں صاف ستھرے نوٹ لے لیے ہوں اس مقصد کے لیے اگر وہ دس فیصد ریبیٹ بھی دیتا تو سودا مہنگا نہیں تھا۔وہ سکون سے ایک لاکھ اسّی ہزار ڈالرز بلا خوف وخطر امریکا میں خرچ کرتا اور کوئی اسے نہ پکڑتا۔بہت زیادہ امکان تھا کہ اس نے ایسا ہی کیا ہوگا۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ کیوبا چلا گیا تھا جہاں اس نے دو لاکھ ڈالرز سے خاصی پُرتعیش زندگی گزاری ہوگی۔ کیوبا اس وقت امریکی مفروروں کی جنت تھا کیونکہ کسی بھی قسم کے جرائم میں ملوث شخص با آسانی وہاں پناہ حاصل کرسکتا تھا اگرچہ وہ امریکا کو مطلوب ہو۔کیوبن حکام اسے خوشی سے پناہ دیتے تھے اور امریکا کے حوالے کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔اس کے ساتھ ہی کیوبا میں امریکی کرنسی چلانا بھی مشکل نہیں تھا۔وہاں بے شمار ایسے لوگ تھے جو امریکی ڈالرز خرید لیتے تھے اور اسے اپنے پاس بہ طور خزانہ محفوظ رکھتے تھے۔ان میں راشی حکام، اسمگلرز اور جرائم پیشہ افراد شامل تھے۔پھر کیوبن کرنسی میں دو لاکھ ڈالرز قوت خرید کے لحاظ سے بہت زیادہ بنتے تھے۔کوپر کیوبا میں برسوں آرام سے رہ سکتا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور تلاش کا سلسلہ جاری رہا۔جب کوپر نے بوئنگ سات سو ستائیس کے عقبی دروازے کی سیڑھی باہر نکالی تھی تو اس کا نچلا حصہ تیز ہوا یا کسی اور وجہ سے ٹوٹ کر گر گیا تھا اور یہ گم شدہ ٹکڑا پوری تلاش کے باوجود نہیں ملا تھا۔ 1978ء میں ہرن کے ایک شکاری نے یہ حصہ ایک سڑک سے تیرہ میل دور اور واشنگٹن کے شمال مغربی ساحل سے کوئی اٹھارہ میل دور پایا لیکن یہ جگہ طیارے کے فلائی پاتھ میں آتی تھی۔یہ جگہ جھیل مروِن سے خاصے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔تقریباً سات کلوگرام وزنی دھات کا یہ ٹکڑا دس ہزار فٹ کی بلندی سے گرنے کی صورت میں دو میل سے زیادہ دائیں بائیں یا آگے پیچھے نہیں جاسکتا تھا۔تو کیا کوپر اسی علاقے میں کودا تھا مگر ماہرین اس سے متفق نہیں تھے۔

فروری 1980ء میں برائن انگرا ہم نامی آٹھ سالہ بچہ اپنے خاندان کے ہمراہ دریائے کولمبیا کے کنارے چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔یہ جگہ دریا کے نچلے حصے میں دینکور واشنگٹن سے کوئی تیرہ میل نیچے اور ایریل سے کوئی بیس میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔بچے نے دریا کے کنارے کوپر کو دی جانے والی تاوان کی رقم کے تین پیک ریت میں دبے پائے۔اگرچہ ان کی حالت بری تھی لیکن یہ بدستور بنڈل کی صورت میں ربر بینڈ سے گڈی کی طرح بندھے ہوئے تھے۔حیرت انگیز طور پر نو سال گزر جانے کے بعد بھی نوٹوں کی ساخت، پرنٹ اور رنگت برقرار تھی۔جب کہ انہیں اس دوران میں شدید موسمی تغیر اور پانی کا سامنا رہا تھا۔ان کے سیریل نمبر کسی قدر دقت سے پڑھے جاسکتے تھے۔برائن کے ماں باپ نے اس کی اطلاع پولیس کو دی اور معاملہ فوری ایف بی آئی تک پہنچ گیا۔تینوں بنڈلوں کو ایف بی آئی کی لیب میں پہنچایا گیا جہاں ان کے تکنیکی ماہرین نے تصدیق کی کہ یہ وہی رقم ہے جو کوپر کے مطالبے پر اسے دی گئی تھی۔

بنڈلوں میں سے دو بنڈل بیس نوٹوں پر مشتمل سو نوٹوں والے تھے۔جب کہ تیسرے بنڈل میں نوّے نوٹ تھے۔یوں کل رقم پانچ ہزار آٹھ سو ڈالرز بنتی تھی۔اب سوال یہ تھا کہ یہ بنڈل یہاں کیسے پہنچے؟ کیونکہ یہ جگہ طیارے کے روٹ اور کوپر کے کودنے کی ممکنہ جگہوں سے خاصے فاصلے پر تھی۔نوٹوں پر تحقیق کرنے والے آرمی ہائیڈرولوجک انجینئرز نے نوٹ کیا کہ تمام ہی نوٹ کناروں سے دائرے کی شکل میں تباہ ہوئے تھے اور ان کی گول سی صورت نکل آئی تھی۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے یہ بنڈل خاصے عرصے دریا کی لہروں میں ڈولتے رہے تھے اور مسلسل چکر کھانے سے ان کے کنارے جھڑ گئے تھے۔ اسی طرح بہت عرصے تک پانی میں بھیگنے سے نوٹ آپس میں یک جان سے ہوگئے تھے، بعد میں انہیں خاصی کوشش سے الگ کیا گیا۔پھر یہ اس جگہ آکر ریت میں پھنس گئے اور ان پر مزید ریت آگئی جو دریا کے سائیکل سے کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔یہ سب قدرتی طور پر ہوا تھا اور ماہرین نے بنڈلوں کو جان بوجھ کر اس جگہ دفنانے کا نظریہ مسترد کردیا تھا۔

بہرحال اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوپر نہ تو دریائے لوئیس میں اترا تھا، نہ جھیل مروِن میں اور نہ ہی اس کے کسی اور حصے میں، کیونکہ اس کے پانی کے سسٹم کا دریائے کولمبیا سے کوئی تعلق نہیں تھا یعنی دونوں دریاؤں کا آپس میں

کوئی ایسا رابطہ نہیں تھا جس کے ذریعے گرنے والے نوٹ وہاں سے بہہ کر دریائے کولمبیا تک آتے۔ مسئلہ یہ تھا کہ دریائے کولمبیا اور اس کی اپ اسٹریم فلائٹ تین سو پانچ کے پاتھ وے میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے یہ امکان نہیں تھا کہ کوپر کسی طرح بھی دریائے کولمبیا یا اس کے آس پاس اترا ہو۔ البتہ ایک صورت ممکن تھی کہ کوپر دریائے واشوگال یا اس کے آس پاس اترا ہو اور وہاں سے یہ بنڈل بہہ کر نیچے دریائے کولمبیا تک پہنچے ہوں کیونکہ دونوں دریاؤں کا آپس میں رابطہ تھا اور دریائے واشوگال کا سارا پانی بالآخر دریائے کولمبیا میں جا کر گرتا تھا۔

مگر ماہرین کی اس تھیوری میں کئی سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ اول ایک بنڈل سے دس نوٹ کس طرح غائب ہوئے جب کہ اس کا ربر بینڈ اسی طرح بندھا ہوا تھا۔ یہ بات تصدیق شدہ تھی کہ تمام بنڈل سو سو نوٹوں پر مشتمل تھے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر تینوں بنڈل بہت عرصے دریا میں تیرتے رہے تو وہ آخر ایک ساتھ کیسے رہے اور ایک ہی جگہ آ کر ریت میں کیسے رکے جب کہ انہوں نے یہاں تک آنے کے لیے میلوں کا فاصلہ اور شاید مہینوں میں یہ سفر طے کیا تھا۔ امکانات کی ریاضی کہتی ہے کہ ایسا ایک ارب میں سے صرف ایک بار ممکن ہے یعنی ننانوے کروڑ ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے بار یہ ممکن نہیں تھا کہ تمام تین بنڈل ایک ہی جگہ رہتے۔ ربر بینڈ پر تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ ریت میں دفن ہونے سے پہلے یہ دو سال تک پانی میں تیرتے رہے تھے۔ دوسری صورت میں ان سے زیادہ وقت گزرنے پر ربر بینڈ اپنی کیمیائی ساخت کھو دیتے اور ٹوٹ جاتے۔ دوسرے لفظوں میں بنڈل گزشتہ سات سال سے زیادہ عرصے سے دریائے کولمبیا کے اس کنارے ریت میں دفن رہے تھے۔

نوٹوں کے ساتھ چپکے مائیکرو آرگنگ عناصر کی مدد سے ماہرین نے اندازہ لگایا کہ یہ دریا کی ایک شمالی شاخ سے ہوتے ہوئے اس جگہ پہنچے جسے ٹینا بار کہتے ہیں۔ جس جگہ یہ بنڈل پائے گئے وہاں دریا میں ریت کی دو تہیں تھیں۔ ایک تہ جو 1974ء تک اوپر سے آنے والی ریت نے بنائی تھی اور دوسری تہ جو اس کے بعد بنی تھی۔ اسی تہ میں بنڈل پائے گئے تھے۔ مگر یہ بنڈل اس تہ کے سب سے اوپری حصے میں ملا تھا جو زیادہ سے زیادہ دو سال پہلے تشکیل پائی تھی۔ اس پر دریا میں تیر کر آنے کا نظریہ پیش کرنے

جرجی زیدان

(1861ء۔1914ء)

مصری ادیب، مورخ اور افسانہ نویس۔ عرب پادری کا بیٹا تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت پہلے بیروت کے ایک کلیسا اور پھر مدرسے میں حاصل کی۔ 1891ء میں شادی ہوئی۔ 1892ء میں قاہرہ سے ''الہلال'' کا اجراء کیا اور اپنی وفات تک اس کا مدیر رہا۔ تاریخ ال تمدن الاسلامی اور تاریخ آداب اللغتہ العربیہ کے علاوہ بہت سے تاریخی ناولوں کا بھی مصنف ہے۔

مرسلہ: نادر مرزا، اسلام آباد

والے ماہرین اور ریت پر تحقیق کرنے والے ماہرین کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ مگر کوئی بھی حتمی نتیجہ نہیں نکلا کہ بنڈل اصل میں کہاں سے آئے تھے اور کس وقت یہاں ریت میں رکے۔ دوسرے مفروضی سوالوں کے جوابات بھی نہیں ملے اور معاملہ مزید پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔

رقم کی اس دریافت کے بعد نت نئے مفروضات سامنے آنے لگے۔ اس میں ایک خیال یہ تھا کہ رقم کے یہ بنڈل کسی جانور نے یہاں تک پہنچائے اور اسی جانور نے ایک بنڈل سے کسی طرح دس نوٹ نکال لیے تھے۔ شاید وہ اسے کھانے کی کوئی چیز سمجھا ہوگا اور جب اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا تو اس نے اسے دریا کی ریت میں دفن کر دیا ہوگا جیسا کہ جانوروں کی عادت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بنڈل زیادہ گہرائی میں نہیں پائے گئے اور برائن انگراہم کو آسانی سے مل گئے۔ مگر اس مفروضے میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ آخر نوٹ کناروں سے گولائی میں کیوں کتر گئے۔ جو صرف بہت عرصے تک پانی میں رہنے سے ممکن ہے۔ کاؤلٹز کاؤنٹی کے شیرف نے خیال پیش کیا کہ یہ رقم اصل میں کوپر سے اس وقت گر گئی جب اس نے طیارے سے چھلانگ لگائی تھی اور ہوائیں اسے اڑا کر دریائے کولمبیا تک لے آئیں۔ مگر اس تھیوری میں بھی دیگر سوالوں کے جوابات موجود نہیں تھے۔ ایک مقامی اخبار کے مدیر نے یہ خیال بھی پیش کیا کہ رقم اصل میں کوپر نے خود دفنائی تھی کیونکہ ایک کامیاب ہائی جیکنگ کے بعد بھی وہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی

صورت اس رقم کو خرچ نہیں کر سکے گا اور اس نے رقم کے بنڈلوں کو مختلف مقامات پر دفنا دیا جن میں سے ایک یہ جگہ بھی تھی جہاں سے تین بنڈل نکل آئے۔

اگلے سال اسی مقام سے مزید شہادتوں کی تلاش کے دوران میں ایک انسانی کھوپڑی ملی اور اس کی تفصیلی جانچ کے بعد پتا چلا کہ یہ کسی عورت کی ہے اور ممکنہ طور پر اس کا تعلق قدیم امریکی باشندوں سے تھا۔ 1986ء میں خاصی بحث کے بعد ملنے والے نوٹ مساوی طور پر برائن انگراہم اور ائرلائن انشورنس کمپنی میں تقسیم کر دیے گئے اور اس میں سے چودہ نوٹ ایف بی آئی نے بہ طور شہادت اپنے پاس رکھ لیے۔ برائن انگراہم نے ان نوٹوں کے بدلے حکومت کی تازہ نوٹ لینے کی پیشکش مسترد کر دی اور 2008ء میں اس نے ان میں سے چودہ نوٹ ایک نیلامی کے ذریعے سینتیس ہزار ڈالرز میں فروخت کیے۔ اس وقت تک باقی نو ہزار سات سو دس نوٹوں میں سے ایک بھی پوری دنیا میں کہیں منظر عام پر نہیں آیا تھا جب کہ ان کے سیریل نمبر بدستور ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوپر کو باقی نوٹوں سمیت سمندر نے نگل لیا تھا اور اب ان کا منظر عام پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

1988ء میں کولمبیا دریا کے اسی علاقے میں پیراشوٹ کا ایک ٹکڑا برآمد ہوا۔ مگر تفصیلی معائنے کے بعد ایف بی آئی کے ماہرین نے فیصلہ دیا کہ اس کا کوپر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد 2008ء میں بچوں نے واشنگٹن کے قریب ایمبوائے نامی علاقے میں پیراشوٹ کا ایک ٹکڑا پایا۔ اب تک صرف طیارے کی سیڑھی کا ٹوٹ جانے والا حصہ اور کولمبیا دریا سے ملنے والی رقم کی طیارے سے باہر ملنے والے شواہد میں شامل تھی مگر اس سے کوپر اور باقی رقم تک کوئی رہنمائی نہیں ملی تھی۔

ایف بی آئی نے عینی شاہدین کی مدد سے ڈی بی کوپر کا ایک فیس اسکیچ تیار کرایا جو پچانوے فیصد اس سے مماثلت رکھتا تھا۔ کئی ہفتے کی محنت کے بعد یہ اسکیچز جو سیاہ عینک کے ساتھ اور اس کے بغیر تھے ملک بھر کے اخباروں اور رسائل میں شائع ہوئے۔ ٹی وی پر ان کی اتنے بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی کہ تقریباً نوے فیصد امریکیوں نے یہ اسکیچز دیکھ لیے۔ امریکا کی پوری تاریخ میں کسی تصویر یا اسکیچ کی اتنے بڑے پیمانے پر تشہیر نہیں ہوئی تھی۔ کوپر جیسے نقوش کے حامل افراد کی امریکا میں کوئی کمی نہیں تھی اور ان میں بڑی تعداد جرائم پیشہ افراد کی تھی۔ اس لیے پولیس اور ایف بی آئی کے پاس کالز اور خود آ کر دعویٰ کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا جن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ لیکن ہر ایک کا دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ جن کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ ممکنہ ہائی جیکر ہیں وہ تمام اس معاملے سے بری الذمہ ثابت ہوئے۔

کئی ایک افراد تو ایسے نکلے کہ جب ان کا پولیس یا ایف بی آئی سے سامنا ہوا تو انہیں بھی یقین ہو گیا کہ یہی ڈی بی کوپر ہو سکتے ہیں۔ وہ ہو بہو اس سے مشابہ تھے۔ مگر ان افراد نے ناقابلِ تردید ثبوتوں اور گواہوں کی مدد سے ثابت کیا کہ وہ کوپر نہیں ہیں ان کی اپنی شناخت تھی اور وہ ہائی جیکنگ کے واقعے کے وقت اپنے گھروں یا کام کے مقامات پر یا پھر واقف کاروں کے ساتھ تھے۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جو تنہائی پسند تھا اور اپنے گھر سے بہت کم باہر جاتا تھا۔ پولیس نے اسے اپنی تحویل میں لیا لیکن جب اس کی شناخت کے لیے فلائٹ تین سو پانچ کے عملے کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے متفقہ طور پر اسے ڈی بی کوپر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے فنگر پرنٹ بھی مختلف ثابت ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز امر ہے کہ کوپر نے بلا تکلف طیارے میں جا بہ جا اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑے تھے جیسے اسے یقین ہو کہ ان نشانات کی مدد سے اس تک رسائی یا اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔

ایف بی آئی ہائی جیکر کی چھوڑی اشیا کا سائنٹیفک ٹیسٹ بھی کر رہی تھی۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا اس وقت ڈی این اے ٹیسٹ کی ٹیکنالوجی اپنے آغاز میں تھی۔ 2001ء میں ایف بی آئی نے اعلان کیا کہ انہیں کوپر کی ٹائی پن پر تین طرح کے ڈی این اے کے آرگینک نمونے ملے ہیں۔ مگر خاصی گہرائی سے جانچ کے بعد بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکا کہ ان میں سے کوئی کوپر سے تعلق رکھتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ موازنے کے لیے ایف بی آئی کے پاس نہ تو کوئی فرد تھا اور نہ ہی کوئی اور نمونہ۔ اسپیشل ایجنٹ فریڈ گٹ نے اس بارے میں کہا۔ "ہمارے پاس موجود ٹائی پن پر ڈی این اے کے دو چھوٹے نمونے اور ایک بڑا نمونہ پایا گیا ہے۔ لیکن ان سے کوئی نتیجہ نکالنا ممکن نہیں تھا۔ ایف بی آئی نے اپنے پاس موجود نمونوں کے ساتھ ساتھ اس ائرلائن ٹکٹ (اس کی قیمت اٹھارہ ڈالرز جمع ٹیکس تھی۔ کل قیمت بیس ڈالرز تھی جو کوپر نے نقد ادا کی) کا بھی معائنہ کیا جو کوپر نے پورٹ لینڈ سے لیا تھا مگر اس پر کسی قسم کا کوئی ڈی این

اسے نمونہ نہیں پایا گیا۔ بدقسمتی سے ٹائی پن کو بہت سے لوگوں نے چھوا تھا اور یہ نمونے ان کے بھی ہو سکتے تھے۔"

کوپر نے دو استعمال شدہ پرائمری پیراشوٹ اور دو ریزرو پیراشوٹ طلب کیے تھے۔ پرائمری پیراشوٹ سادہ تھے اور اس نے جدید قسم کے ملٹری اور اسپورٹس پیراشوٹ لینے سے انکار کیا تھا۔ اس نے ایک پرائمری پیراشوٹ کھول لیا تھا اور اسے طیارے میں ہی چھوڑ گیا۔ اسی طرح دوسرا ریزرو پیراشوٹ پیک حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ کھولے جانے والے پرائمری پیراشوٹ کا بیگ غائب تھا اس کے بارے میں امکان تھا کہ کوپر نے رقم اس میں ڈال کر اسے اپنے جسم سے باندھ لیا تھا تاکہ رقم محفوظ اور یقینی طور پر اس کے ساتھ رہے۔ ٹینا میکلو نے کاک پٹ میں جاتے ہوئے اسے شاید یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ ایف بی آئی نے ملک بھر میں پھیلے اسکائی ڈائیونگ کے اسکولز اور ان سرکاری اداروں سے بھی چھان بین کی جو سویلین افراد کو بھی اسکائی ڈائیونگ کی تربیت دیتے تھے مگر انہیں کوپر کے بارے میں کوئی نشان نہیں ملا۔ ایف بی آئی کے خیال میں اس نے اسکائی ڈائیونگ کی تربیت امریکا سے باہر حاصل کی تھی۔

نئی صدی کے آغاز پر جب کہ کوپر کیس کو تیس سال سے زیادہ ہو گیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اب اس کیس سے ایف بی آئی اور پولیس کی دل چسپی بالآخر ختم ہو جائے گی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر کوپر کیس متحرک رہا اور ایف بی آئی مسلسل نت نئے زاویوں سے تفتیش جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ نجی شعبے سے افراد بھی تفتیش کے لیے سامنے آنے لگے۔ ان میں ایک نمایاں نام ٹام کائل کا تھا۔ اس کا تعلق سیٹل نیچرل ہسٹری اینڈ کلچرل میوزیم سے تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ماہرین اور سائنس دانوں کی ایک ٹیم جمع کی۔ اس کا مقصد کوپر کیس کے مختلف پہلوؤں کو ان جدید سائنسی طریقوں اور ٹیکنالوجیکل آلات کی مدد سے چیک کرنا تھا جو 1971ء میں دستیاب نہیں تھے۔ یہ گروپ جو کوپر ریسرچ ٹیم کے نام سے معروف ہوا۔ اس نے سب سے پہلے جی پی ایس اور سیٹلائیٹ سے لی گئی تصاویر سے اس سارے علاقے کا معائنہ کیا جہاں ممکنہ طور پر کوپر اترا تھا جہاں طیارے کی سیڑھی کا ایک حصہ اور جہاں رقم کے بنڈل پائے گئے تھے۔

انہوں نے طیارے کے راستے اور کوپر کے اترنے کی ممکنہ جگہ کا پھر سے تجزیہ کیا۔ جدید ترین برقی خردبین کی مدد سے جو کسی بھی چیز کو ایک کروڑ گنا بڑا کر کے دکھا سکتی تھی۔ کوپر کی ٹائی پن کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اس پر مخصوص خوشبو کے کیمیائی حصے پائے جن میں المونیم اور سوڈیم کی آمیزش تھی۔ دو سالہ کی تفتیش کے بعد کائل نے اعلان کیا کہ کوپر کی ٹائی پن پر ٹائٹینیم کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج کے مقابلے میں ستر کے عشرے میں اس دھات کا استعمال نہایت محدود تھا اور صرف انجینئرز اور ٹائٹینیم کے ساتھ کام کرنے والے افراد کا اس سے واسطہ پڑتا تھا۔ کائل نے کہا کہ کوپر ممکنہ طور پر انجینئر یا دھات کا ماہر یا کیمسٹ تھا اور کسی ٹائٹینیم استعمال ہونے والی جگہ کام کرتا تھا اور وہاں وہ یہ ٹائی پن لگا کر جاتا رہا تھا اسی وجہ سے اس پر دھات کے باریک ذرات آئے۔ بہر حال اس ٹیم کی ریسرچ کا بھی وہی نتیجہ نکلا جو اس سے پہلے کی جانے والی تحقیقات کا نکلا تھا۔

کوپر نے بہت سا وقت ائر ہوسٹس فلورنس اور ٹینا کے ساتھ گزارا تھا اور اس کے چہرے کے نقوش اور دوسری جسمانی تفصیلات بھی انہوں نے بتائی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سیٹل اور اس کے آس پاس خاص طور سے مک شورڈ ائر بیس سے اچھی طرح واقف تھا اس سے ایف بی آئی کو شبہ ہوا کہ وہ ائر فورس کا سابق ملازم یا تربیت یافتہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ اسکائی ڈائیونگ سے واقف تھا اور اس کی ٹائی پن پر ٹائٹینیم کے ذرات پائے گئے۔ واضح رہے کہ اس سخت ترین دھات کا زیادہ تر استعمال لڑاکا طیاروں اور تیز رفتار میزائلوں کی تیاری میں ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بہت زیادہ دباؤ، حرارت اور رگڑ برداشت کر سکتی ہے۔ یہ سخت ترین فولاد سے بھی دوگنا مضبوط دھات ہوتی ہے۔

ایف بی آئی کے نفسیات کے ماہرین نے کوپر کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا۔ ماہرین کے ایک بڑے گروہ کا خیال تھا کہ اسے رقم کی اشد ضرورت تھی اور اسی وجہ سے اتنا بڑا رسک لینے کو تیار ہوا۔ شاید اس کے پاس رقم نہیں تھی اور وہ مقروض بھی ہو گیا تھا۔ مگر اس واقعے کے دوران میں اس نے جس طرح کی منصوبہ بندی کی اور اس پر عمل کے دوران میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور کئی مواقع ایسے تھے جب مضبوط ترین اعصاب والے افراد بھی مشتعل ہو سکتے ہیں اس موقع پر بھی وہ پُرسکون اور متحمل رہا جیسے ری فیولنگ میں تاخیر کا واقعہ۔ اس کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد واضح کرتا ہے کہ وہ اگر مجرم بھی تھا تو کوئی عام مجرم نہیں تھا۔ اس لحاظ سے یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ اگر وہ اعلیٰ پائے کا مجرم تھا تو اسے

اتنا گمنام نہیں ہونا چاہیے تھا۔کم سے کم جرائم پیشہ حلقے میں اسے معروف ہونا چاہیے تھا۔مگر یہاں بھی سب سے پہلے تفتیش کے باوجود اس کے بارے میں کوئی ایک اطلاع بھی سامنے نہیں آئی۔

ماہرین کے نزدیک تعجب انگیز اس کی طلب کردہ رقم کی مقدار اور نوٹوں کا کم مالیت کا ہونا تھا۔آج تک فضائی قزاقی کی تاریخ میں کسی نے اتنی کم رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔وہ آسانی سے ایک یا دو ملین ڈالرز طلب کرسکتا تھا۔اس وقت بھی سو ڈالرز کا نوٹ موجود تھا۔وہ پاؤنڈ میں رقم طلب کرسکتا تھا جس میں بڑی مالیت کے نوٹ بھی ہوتے ہیں اور بین الاقوامی طور پر اسے چلانا ڈالرز کے مقابلے میں کہیں کم رسکی ہوتا۔مگر اس نے دو لاکھ ڈالرز مانگے اور وہ بھی بیس ڈالرز کے پرانے نوٹوں کی صورت میں۔ان دس ہزار نوٹوں کا وزن پچاس کلوگرام بن رہا تھا۔اتنے اضافی وزن کے ساتھ اسکائی ڈائیونگ خطرناک ہوسکتی تھی۔اس کے مقابلے میں اگر وہ ایک ملین ڈالرز سو پاؤنڈز کے نوٹوں کی صورت میں طلب کرتا تب بھی ان کا وزن اتنا ہی ہوتا۔اس صورت میں ایف بی آئی کے کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ وہ اصل میں صرف ایک سنسنی پسند شخص تھا۔جو ایک کامیاب اور ناقابلِ حل جرم کرکے دکھانا چاہتا تھا۔اسے رقم یا اس کی مالیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ ثبوت کے طور پر دریائے کولمبیا سے ملنے والی رقم کا حوالہ دیتے ہیں۔ان کے مطابق باقی رقم بھی اسی طرح زمین پر دفن کردی ہوگی اور کوپر اپنا کام کرکے ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا۔

ان ماہرین کو یقین تھا کہ اس کا نام بھی فرضی تھا۔اس وقت کسی ائرلائن کا ٹکٹ لینے کے لیے کوئی شناختی دستاویز دکھانا ضروری تھا اور مسافر اپنا جو نام بتاتا اسی پر ٹکٹ بن جاتا تھا۔سوال یہ تھا کہ اس نے ڈان کوپر کا نام ہی کیوں اختیار کیا۔اس کی وجہ ایک کامک ہیرو کو قرار دیا۔ڈان کوپر نامی بیلجین کامک ہیرو کو کینیڈا کی ائرفورس کا ٹیسٹ پائلٹ ہے اور بے شمار مہماتی کارنامے انجام دے چکا ہے۔وہ نہ صرف طیارے اڑانے بلکہ اسکائی ڈائیونگ کا بھی ماہر ہے۔مزے کی بات ہے کہ یہ کامک سیریز بلجیم میں اور وہیں کی زبان میں شائع ہوتی رہی اس کا کبھی انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا۔اس سے یہ خیال سامنے آیا کہ ڈان کوپر ممکنہ طور پر کینیڈین شہری تھا اور اس نے وہیں یہ کامک بک دیکھی ہو گی۔اس نے تاوان کی رقم بھی وہیں چلائی ہوگی۔کینیڈا میں امریکی ڈالرز تقریباً مقامی کرنسی کی طرح چلتے ہیں اور انہیں غیرملکی کرنسی کی طرح نہیں لیا جاتا ہے۔

ماہرین کے یقین کی وجہ کوپر کا اپنا نام اس طرح لینا تھا کہ الائس ڈان کوپر ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہا تھا اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے ڈی بی کوپر مشہور ہوگیا۔اسے ٹکٹ فروخت کرنے والی لڑکی نے بھی تصدیق کی کہ اس نے اپنا نام روانی سے نہیں لیا تھا۔ایف بی آئی کے نفسیاتی ماہرین کو یہ بھی یقین تھا کہ وہ بہت ذہین اور اچھا منصوبہ ساز تھا اس نے چار پیراشوٹ طلب کیے جس سے قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کسی یرغمالی کو لے جانا چاہتا ہے پھر اس نے ٹینا میکلو کو روک کر اس تاثر کو مزید گہرا کیا حالانکہ وہ صرف اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ اسے خراب پیراشوٹ نہ دیا جائے اور وہ کامیاب رہا تھا۔اس نے سیٹل سے ٹیک آف کرتے ہی ٹینا کو بھی کاک پٹ میں بھیج دیا تھا۔وہ آخر تک کاک پٹ میں دیگر عملے کے ساتھ رہی تھی۔اس نے کامیابی سے وہ جگہ چھپالی جہاں اس نے طیارے سے چھلانگ لگائی تھی۔اسی طرح اس نے بوئنگ سات سو ستائیس کا انتخاب کیا صرف اس لیے نہیں کہ اس سے چھلانگ لگانا بہت آسان تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے تین طاقتور انجن اسے کم بلندی پر سست رفتاری سے ہموار پرواز کے قابل بناتے تھے۔اس کا عقبی دروازہ کھولنے کا میکنزم بہت آسان اور مینول تھا۔ایک فرد آسانی سے اسے کھول کر سیڑھی باہر نکال سکتا تھا۔اس وقت یہ واحد طیارہ تھا جس کے تمام ایندھن کے ٹینک ایک ہی ری فیولنگ پوائنٹ سے بھرے جاسکتے تھے اور اس میں بار بار پوائنٹ بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔اسی وجہ سے بہت جلد طیارے میں دوبارہ ایندھن بھر دیا گیا تھا۔کسی دوسرے طیارے میں یہ سہولت نہیں تھی۔سب سے بڑھ کر کوپر جانتا تھا کہ کاک پٹ میں داخل ہوئے بغیر وہ طیارے کی رفتار اور بلندی کو کس طرح کنٹرول کرسکتا تھا۔اگر کیپٹن اسکاٹ اس کے حکم کے برخلاف طیارے کو بلندی پر لے جاتا تو عقبی دروازہ کھولنے کی صورت میں پائلٹ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ طیارے کو دس ہزار فٹ کی بلندی پر لے آئے اور اس کی رفتار ایک سو بیس ناٹ سے کم کردے۔اسکائی ڈائیونگ کے لیے یہ سب سے بہترین پوزیشن ہوتی۔

کوپر طیارے کے بارے میں انتہائی تکنیکی تفصیلات سے واقف تھا جیسے پروں کے فلیپس کو پندرہ ڈگری پر رکھنا۔

اسی طرح وہ جانتا تھا کہ طیارے کے خالی ٹینکس کتنی دیر میں پورے بھر جاتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر عقبی دروازے کی سیڑھی باہر نکلی ہو تو طیارہ بنا کسی خطرے کے ٹیک آف کر جاتا ہے۔ حد یہ کہ وہ جانتا تھا کہ سی آئی اے ویت نام جنگ کے دوران دشمن مورچوں کے پیچھے موجود اپنے حامی دستوں کے سپلائی گرانے کے لیے بوئنگ سات سو ستائیس استعمال کرتی رہی تھی۔ سب سے خفیہ بات جس سے کوپر واقف تھا وہ یہ تھی کہ عقبی دروازہ کھولنے اور سیڑھی باہر نکالنے کے لیے ایک واحد سوئچ کاک پٹ کے باہر بھی موجود ہے اور اسے کاک پٹ سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کوپر نے ہائی جیکنگ کے لیے وہ وقت منتخب کیا جو پورے امریکا میں چھٹی کا وقت تھا اور اس میں کسی فرد کے بارے میں یہ جاننا بہت مشکل تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔ اس نے اپنے کام کو کسی قدر طویل کیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ جب امریکا میں ورکنگ ڈے شروع ہو تو وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا ہو۔ کسی ویرانے میں پیراشوٹ سے اترنا اور پھر کسی سڑک تک پہنچنا اور اس کے بعد ٹرانسپورٹ تلاش کرنا اور واپس اپنے گھر تک جانا آسان نہیں ہے۔ مگر کوپر نے اس کے لیے ایسا وقت چنا جب اسے واپسی کے لیے پورے چار دن ملے ہوئے تھے اور وہ بہت آرام سے اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ اس کا بھی پورا امکان تھا کہ اس علاقے میں اس کی ایک عدد گاڑی پہلے سے موجود ہو اور وہ اترنے کے بعد اس تک پہنچے اپنا حلیہ بدلے اور آرام سے وہاں سے نکل جائے۔ ایف بی آئی ماہرین کے مطابق اس کا امکان نوے فیصد تھا کہ اس نے ایسا ہی کیا ہوگا۔

مگر کوپر کی بہترین پلاننگ کے باوجود ایف بی آئی ماہرین اس کی پیرا جمپنگ کی صلاحیت کے بارے میں مشکوک تھے۔ 2006ء میں ایف بی آئی اسپیشل ایجنٹ لیری کار جو انویسٹی گیشن کا سربراہ تھا اس کا کہنا ہے۔ ”کوئی بھی تجربے کار پیرا ٹروپر بھی ایسے وقت جمپ لگانے کو ترجیح نہیں دے گا۔ جب بالکل تاریک رات جو بارش اور طوفان زدہ تھی اور دو سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے منفی ستاون درجے سینٹی گریڈ درجہ حرارت رکھنے والی ہوا اس کے چہرے پر لگ رہی ہو۔ اس نے گلے میں ایک مفلر اور ٹرنچ کوٹ پہنا ہو جو اسکائی ڈائیونگ کے لیے نامناسب تھے۔ یہ سیدھی سی جان خطرے میں ڈالنے والی بات ہے۔ ایسے حالات میں صرف فوجی ہی کسی بہت اہم مشن کو پورا کرنے کے لیے چھلانگ لگاتے ہیں مگر وہ اس کے لیے پوری طرح تیار بھی ہوتے ہیں۔ کوپر نے ایک اہم ترین چیز یعنی ہیلمٹ طلب نہیں کیا۔ اس نے سردی سے بچاؤ کے لیے خاص لباس بھی نہیں مانگا۔ اس درجہ حرارت میں انسان عام لباس میں اپنے حواس دو منٹ سے زیادہ برقرار نہیں رکھ سکتا ہے اور پانچ منٹ بعد جسم کا درجہ حرارت ستاسی درجے فارن ہائیٹ تک گرنے کے بعد اس کے دل کی دھڑکن رک جاتی ہے۔“

لیری کو یقین تھا کہ کوپر اصل میں پیرا ٹروپر نہیں بلکہ ایک سابق ائر فورس ائر مین تھا جو اصل میں طیاروں سے سپلائی ائر ڈراپ کے شعبے میں کام کرتا تھا۔ یوں اسے معلومات حاصل ہوئیں کہ طیارے کا ائر ڈراپ کا میکنزم کیسے کام کرتا ہے اور پیراشوٹ استعمال کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ لیکن یہ ساری معلومات اس عملی جمپ کے لیے قطعی ناکافی تھیں جو کوپر نے طیارے سے لگائی تھی۔ جیسے جیسے جمپ کے حالات اور ماہرین کے تجزیے سامنے آتے رہے ایف بی آئی کو یقین ہوتا چلا گیا کہ کوپر کی جمپ ناکام رہی تھی وہ اپنا پیراشوٹ کھولنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا اور زمین یا پانی میں جا گرا تھا۔ بالفرض محال اگر وہ نیچے پہنچ بھی گیا تھا تو نہایت خراب موسم، تاریکی اور ٹھیک اس جگہ اترنا ناممکن تھا جہاں وہ اترنا چاہتا تھا۔ ایف بی آئی کی تھیوری صرف ایک نقطے پر آکر رک جاتی ہے کہ اگر کوپر ناکام رہا تھا تو اس کی لاش کہاں گئی۔ زمین یا پانی میں اس کا کوئی نشان تو ملنا چاہیے تھا خاص طور سے جب پولیس، آرمی، ایف بی آئی اور رضا کاروں نے بہت وسیع پیمانے پر اس سارے علاقے کو چھان مارا تھا۔

کوپر کیس آج بھی بند نہیں ہوا ہے اور ایف بی آئی کی ایک ٹیم اس پر کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق امریکی ٹیکس گزاروں کے تقریباً دو ملین ڈالرز اس کام پر خرچ ہو چکے ہیں اور حاصل وصول کچھ نہیں ہوا۔ ایک اور نقطہ ہے کہ ہائی جیکنگ کے وقت کوپر کم سے کم چالیس سال کا تھا اور آج اس واقعے کو چالیس برس ہو چکے ہیں۔ یعنی کوپر کم سے کم چوراسی برس کا ہوگا اگر وہ زندہ ہوا تو۔ اگر وہ کسی طرح پکڑ میں آجاتا ہے تو اس کی عمر اور شاید جسمانی اور ذہنی کیفیت کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلانا ممکن نہیں ہوگا اور اگر ایسا کیا بھی گیا تو شاید ہی اسے سزا ہو۔ گویا ناکامی یہاں بھی ایف بی آئی کا مقدر ہوگی۔

سراب

راوی : شہناز ملک

تحریر : کاشف زبیر

قسط نمبر 107

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" ساوی کو لے کر چھپ...... مگر حملہ ادھورا رہ گیا اور ساوی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور ساوی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتا کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے۔ لیکن اس نے ڈیوڈ شا کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے ادشا کو بھی وہیں قید کررکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم ... چلتے جارہے تھے کہ پاسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں اسی کی سمت گرا تھا کہ تنبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے پاسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان

سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیر لب کہا "اعلانِ جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنے کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ گی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے مجرم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا جانتی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشالی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا بھی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بجا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا [illegible] دیا تھا۔ ابھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ کر سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلا گیا ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

حالات یک دم ہی سنگین ہو گئے تھے۔ روبیر معبد سے باہر نہیں آئی تھی۔ اس کی جگہ ہاتھ گاڑی پر ایک نسوانی لاش باہر آئی تھی۔ پھر ایرٹ حواس کھو کر باہر نکل گیا تھا۔ اب کرنل اور باسو کی صورت میں نئی آفت یہاں آ رہی تھی۔ مگر ہمارے پاس پریشان ہونے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کرنل اور باسو یہاں آتے ہمیں حرکت میں آ جانا تھا۔ وہ روش سے ہوتے ہوئے عمارت کی طرف ہی آ رہے تھے۔ ہم نے نگران افسر نارس کو اپنے موقع پر آگے کرنے کے لیے تیار رکھا ہوا تھا۔ میں نے مارٹ سے کہا۔ "اسے لاؤ اور سب تیار ہو جائیں۔ یہ طویل قامت آدمی کرنل جیمو اور اس کے ساتھ بڑی جسامت والا شخص باسو ہے۔ دونوں نہایت ہی خطرناک ہیں۔"

"میں لاتا ہوں جناب۔" مارٹ روانہ ہو گیا۔

"وہ رک گیا ہے۔" ربیک نے ایرٹ کے بارے میں اطلاع دی۔ "ایک پودے کے پیچھے چھپ گیا ہے۔"

"میرے خدا۔" میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "یہ لڑکا اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔"

ربیک اور مارٹ نے نگرانوں والی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ فوری طور پر نارس کو قید خانے سے نکال کر دفتر میں لایا گیا۔ اس دوران میں میں دیکھ رہا تھا کہ کرنل اور باسو کے ساتھ وہی چھوٹے قد کا گول مٹول پجاری تھا اور ایک نوجوان اور چھریرے جسم کا پجاری ان کے ساتھ تھا۔ ان کی آمد سے پہلے ہمیں یہاں سیٹ اپ کر لینا تھا۔ نارس کو لایا گیا اور ربیک اسے سمجھانے لگا کہ اسے اصل میں اپنی زندگی بچانی ہے اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ آنے والوں کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ نارس اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔ اس پر ربیک نے اس سے کہا۔ "غلط حرکت سے گریز ضروری ہے ساتھ ہی تمہیں کوشش کرنا ہوگی کہ وہ یہاں سے مطمئن ہو کر واپس چلے جائیں۔"

میں حسب روایت واش روم میں چلا آیا۔ میرے

ساتھ ایمار تھا اور ہم پوری طرح مسلح تھے۔ میں نے مارٹ اور ریک کو مختصراً حکمتِ عملی بتائی کہ اگر بات کھل جائے تو کوشش کرنی ہے کہ ان میں سے کوئی زندہ واپس نہ جائے۔ اگر ہم انہیں ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمیں کچھ آتشیں ہتھیار مل جاتے اور اس کے بعد ہم معبد میں جانے اور ڈیوڈشا کو ختم کرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ مگر یہ ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ صرف مجبوری کے عالم میں ہی ہم ایسا کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس میں رسک بہت زیادہ تھا۔ کرنل اور باسو دونوں بے حد خطرناک تھے اور اس کا امکان بہت کم تھا کہ ہم ان پر کامیابی سے قابو پا سکیں۔ ریک ٹائرس کے کمرے میں اس کے سر پر سوار تھا اور مارٹ راہداری میں پہرہ دے رہا تھا۔

کیونکہ کول متول پجاری نے پہلے بھی انہیں شناخت نہیں کیا تھا اس لیے اب بھی امکان یہی تھا کہ وہ انہیں نگرانوں میں سے سمجھے گا۔ جب کہ اصل نگران اعلیٰ یعنی ٹائرس اس کے سامنے ہوگا۔ اس صورت میں شک کرنے کا جواز بہت کم رہ جاتا تھا۔ جب تک وہ لوگ آتے یہاں سیٹ اپ تیار ہو چکا تھا۔ عمارت کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر سے اسے بجایا گیا تو مارٹ نے دروازہ کھولا اور مؤدب ہو کر آنے والوں کو راستہ دیا۔ کول متول پجاری نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ”نگران اعلیٰ کہاں ہے؟“

”دفتر میں۔“ مارٹ نے کم سے کم الفاظ میں جواب دیا۔ اس کا تلفظ اور لہجہ آرگون والوں سے کسی قدر مختلف تھا اس لیے اس کا کم بولنا ضروری تھا۔ ایمار اندر ایک لیٹرین میں تھا اور میں دوسرے لیٹرین کے دروازے کے پاس تھا۔ ایک لمحے کے نوٹس پر میں اندر جانے کے لیے تیار تھا۔ میں جہاں تھا وہاں سے راہداری کا تھوڑا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ سب سے آگے کول متول پجاری تھا اس کے بعد کرنل جیمز، پھر باسو اور آخر میں نوجوان پجاری تھا۔ باسو ذرا آگے گیا اور اچانک رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو میں یوں پلٹ کر اپنا پاجامہ درست کرنے لگا تھا جیسے ابھی لیٹرین سے نکلا ہوں۔ ہتھیار میں نے پہلے ہی اندر رکھ دیے تھے اس لیے اب خالی ہاتھ تھا۔ واحد خطرہ یہ تھا کہ باسو ریناٹ کی مخصوص سیاہ کی وردی دیکھ کر چونک نہ جائے۔ میں اور ایمار بدستور اسی وردی میں تھے اور یہ ہمیں پکڑوا سکتی تھی۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہمیں خادموں والے لباس میں آ جانا چاہیے تھا تاکہ کوئی ہماری طرف توجہ نہ دے۔ مجھے باسو کی نظریں اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں پاجامہ درست کرتے ہوئے اس سمت بڑھ گیا جہاں منہ ہاتھ دھونے کا انتظام تھا۔ وہ جگہ باہر سے نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ یہاں سے راہداری نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے کان باہر آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ کچھ دیر رکے رہنے کے بعد باسو کے بھاری قدموں کی چاپ آگے بڑھتی سنائی دی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر میں اور ایمار یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے جب تک یہ لوگ واپس نہیں چلے جاتے۔ ایمار نے جھانک کر کہا۔ ”اگر کوئی یہاں آ گیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔“

میں نے اسے اشارے سے تسلی دی کہ ہم خود آنے والے کو پکڑ لیں گے۔ اس جگہ سے دفتر میں ہونے والی گفتگو سننا ممکن نہیں تھا اور راہداری میں جانے میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے باسو باہر ہی ہو۔ ہم سیڑھیوں سے اوپری منزل تک بھی نہیں جا سکتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی راہداری سے گزرنا پڑتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ایمار کی طرح لیٹرین میں روپوش ہو جانا چاہیے تھا۔ باسو میری جھلک دیکھ چکا تھا۔ اب اگر میں لیٹرین سے نہ نکلا تو وہ سوچ سکتا تھا کہ میں اب تک یہاں کیا کر رہا ہوں۔ باسو میں شاید عام انسانی عقل کم تھی مگر اس میں جانوروں جیسی چھٹی حس ضرور تھی جو خطرہ بھانپ لیتی ہے۔ میں نے لیٹرین میں آنے کے بعد اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ اب جو ہونا تھا ہمیں اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنا بیکار تھا۔

کرنل اور دوسروں کو آئے ہوئے دس منٹ ہو چکے تھے اور اب تک ان کی واپسی کا ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ ان لوگوں کی آمد پریشان کن تھی مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ کسی خاص وجہ سے نہیں آئے تھے شاید یہاں کا معائنہ کرنے آئے تھے کہ سب معمول کے مطابق ہی ہے۔ اچانک ہی واش روم کے پاس قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ انداز ایسا تھا جیسے کوئی قدم دبا کر چل رہا تھا۔ مگر بھاری جسامت کی بنا پر اپنی آہٹ دبانے میں ناکام رہا ہو۔ پھر بھاری سانسوں کی آواز آئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ باسو یہاں آیا ہے۔ سانسوں کی آواز ذرا دور سے آ رہی تھی۔ پھر وہ بتدریج نزدیک آنے لگی۔ یہاں لائن سے پانچ لیٹرین تھے میں دوسرے لیٹرین میں تھا اور ایمار آخری لیٹرین میں۔ پہلا خالی تھا مگر باسو آ کر دوسرے لیٹرین کے سامنے رکا۔

میں نے تیر کمان اٹھا رکھا تھا مگر پھر اسے رکھ کر

میں نے بغلی چاقو نکال لیے۔ ان کے استعمال کے لیے مجھے
باسو کے نزدیک جانا پڑتا مگر یہ تیر کے مقابلے میں زیادہ
مہلک تھے بہ شرط کہ صحیح جگہ اور پوری قوت سے وار کیا
جاتا۔ میں نے دایاں ہاتھ پشت پر کر لیا اور بایاں ہاتھ
سامنے رکھا۔ میں گھٹنے موڑ کر جھکا جیسے ریس لگانے والے
دوڑنے سے پہلے جھکتے ہیں۔ باسو جیسے ہی دروازہ کھولنے کا
آغاز کرتا میں حملے کے لیے تیار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر
اسے مہلت مل گئی تو خود میری زندگی خطرے میں پڑ جائے
گی۔ اس لیے یہ ابھی یا کبھی نہیں والا معاملہ تھا۔ میں نے
سانس بھی روک لی تھی۔ میری نظر دروازے پر مرکوز تھی۔ یہ
زمین سے اوپر کوئی سات فٹ تک کا پٹ تھا جو ڈھائی فٹ
چوڑا تھا۔ یعنی اس کے اوپر اور نیچے سے اندر دیکھنا ممکن نہیں
تھا۔ باسو دروازے کے سامنے آکر رک گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ اندر کیوں نہیں آرہا ہے۔

اچانک ہی قدموں کی چاپ دروازے سے ہٹی اور باسو
برابر والے لیٹرین میں داخل ہوا۔ وہاں سے آنے والی
آوازیں بتا رہی تھیں کہ اندر کوئی موجود ہے۔ میرا تنا ہوا جسم
ڈھیلا پڑ گیا مگر میں ہوشیار ہی رہا تھا۔ یہ کسی قسم کا دھوکا بھی ہو
سکتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ باسو جانوروں جیسی حس رکھتا تھا
اور اس نے بھانپ لیا کہ اس وقت اندر آنا اس کے لیے ٹھیک
نہیں تھا اس لیے وہ برابر والے لیٹرین میں داخل ہو گیا اور
اب اس وقت مجھے دبوچتا جب میں اس کی طرف سے مطمئن
ہو جاتا۔ مگر ایسا ہوا نہیں، کچھ دیر بعد برابر سے آوازیں
آنا بند ہو گئیں۔ پھر وہ باہر نکلا اور واش بیسن والے حصے میں
ہاتھ دھونے لگا۔ میں ایک بار پھر چوکنا ہوا تھا۔

اس بار بھی کچھ نہیں ہوا اور وہ ہاتھ دھو کر لیٹرین سے
رخصت ہو گیا اور اس کے بھاری قدموں کی چاپ اب
نمایاں تھی یعنی وہ قدم دبا کر نہیں چل رہا تھا۔ اس کا یہ طرزِ عمل
میرے لیے غیر متوقع تھا۔ پہلے وہ یوں آیا جیسے اسے شک ہو
اور بنا کسی وجہ کے اچانک اس کا شک رفع ہو گیا اور وہ خود
یہاں سے دفع ہو گیا تھا۔ سچی بات ہے اس نے مجھے الجھن
میں ڈال دیا تھا۔ باسو پلانر نہیں تھا اسے شک تھا تو وہ اسی
وقت اسے دور کرتا۔ اسی لیے کرنل اور دوسرے لوگ بھی
اندر سے برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ شاید نارس بھی تھا
کیونکہ بچاری اسے کہہ رہا تھا کہ اسے دی گئی ہدایات پر
پوری طرح عمل کرنا تھا۔ کسی قسم کی خلاف ورزی کی صورت
میں سزا اسے ملے گی۔ پھر یہ ٹولہ عمارت سے باہر نکل گیا اور
اس کے ساتھ ہی ہم راہداری میں نکل آئے۔ مارٹ دروازہ
بند کر رہا تھا اور نارس سفید چادرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ ریبک
بھی آگیا۔ اس نے کہا۔ "ایرٹ اسی جگہ چھپا ہوا ہے۔"

"میں اسے لینے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ
لوگ کیوں آئے تھے؟"

"یہ بتانے کہ اب کوئی عمارت سے باہر نہ نکلے جو
نکلے گا وہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔" ریبک نے
کہا۔ "کرنل بچاری کی مدد سے یہاں کے بارے میں
سوالات کر رہا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ یہاں سے کوئی فرار تو
نہیں ہوا ہے۔ نارس نے اسے یقین دلایا کہ تمام قیدی
موجود ہیں۔ آخر لمحے تک اس کے چہرے پر شک رہا تھا۔"

روبیر کا خیال مجھے رہ رہ کر آرہا تھا۔ مگر ریبک نے
میرے اندر موجود خدشات کو مزید بڑھا دیا تھا اور مجھے لگا کہ
ان لوگوں کی آمد یقیناً روبیر کی وجہ سے تھی۔ وہ پکڑی گئی اور
اس پر تشدد کیا گیا تو وہ مر گئی مگر شاید اس نے اپنی زبان بند
رکھی تھی۔ وہ یہیں قید تھی اس لیے کرنل خود یہاں تفتیش کے
لیے آیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے قیدیوں کو دیکھنے پر
اصرار نہیں کیا۔ وہ آسانی سے مطمئن ہونے والا آدمی نہیں
ہے۔ میں نے ریبک سے کہا۔ "وہ ایسا ہی شخص ہے۔ اس
سے زیادہ خطرناک بڑی جسامت والا ہے۔ وہ لیٹرین میں
اندر بھی آیا تھا۔ میں سمجھا کہ ہمارے چکر میں آیا۔ کیونکہ اس
نے راہداری سے گزرتے ہوئے میری جھلک دیکھ لی تھی۔
مگر وہ صرف پانی بہا کر چلا گیا۔ ہم سے غلطی ہوئی ہمیں
ریناٹ کی خاص سپاہ کی وردی اتار دینی چاہیے تھی کیونکہ
یہاں ایسی وردی کوئی نہیں پہنتا ہے۔"

انکار اور میں نے اس کمرے کا رخ کرتے ہوئے کہا
جہاں لباس رکھے تھے اور وہاں سے خادموں والا ایک لباس
نکال کر وردی کے اوپر ہی پہن لیے۔ میں باہر آیا تو ریبک
مضطرب تھا۔ "آپ کا اس وقت باہر جانا مناسب نہیں ہے
جب کہ وہ حکم دے کر گیا ہے۔"

"فکر مت کرو تم جانتے ہو میں اندھا قدم اٹھانے کا
قائل نہیں ہوں۔ مجھ پر صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک بہت
بڑے کام کی ذمے داری ہے۔ اس وقت بھی میں صرف
ایرٹ کے لیے اسی ذمے داری کی وجہ سے باہر جا رہا
ہوں۔"

مارٹ نے دفتر میں کھڑکی پر پوزیشن سنبھال لی تھی
اور جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ کرنل اینڈ
پارٹی واپس معبد میں جا چکی تھی اور ایرٹ جہاں تھا وہیں دبکا
ہوا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر آیا اور عمارت کے سامنے کے

باغ والے پہلو میں آیا۔ یہاں سے مجھے ایرٹ نظر آرہا تھا۔ وہ جھکا ہوا ایک پودے کے عقب میں تھا اور اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہاں سے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید جذبات کی جس رو میں آکر وہ باہر نکل گیا تھا وہ یہاں تک آتے آتے ختم ہو گئی تھی اور اب وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے عمارت کی آڑ سے بازو لہرانے شروع کیے۔ ایرٹ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مگر میں رکا نہیں اور اس وقت تک لہراتا رہا جب تک اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھ نہیں لیا۔ اس نے جوابی ہاتھ لہرا کر مجھے اشارہ کیا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔

میں نے اپنا اوپری لباس اتار کر اسے سمجھایا کہ وہ بھی سفید کرتا اتار دے۔ چند اشاروں کے بعد وہ سمجھ گیا اور اس نے لباس اتارنا شروع کر دیا۔ سفید کرتے تلے اس نے سرمئی پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کرتے کا اس نے گولا بنا کر اپنے پاجامہ میں اڑس لیا۔ اب میں نے اسے سمجھایا کہ وہ گھاس پر رینگتا ہوا پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے قید خانے کی عمارت کی طرف جائے۔ وہ باغ میں خاصا آگے جا چکا تھا اور اس کا مقصد شاید قید خانے کی عمارت کی طرف جانا تھا جہاں ہاتھ گاڑی پر لاش لے جائی گئی تھی۔ میں نے بتایا کہ میں معبد کے پیچھے سے گھوم کر اس کی طرف آرہا ہوں۔ ایرٹ نے میری بات سمجھ لی اور آگے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ جب وہ کسی قدر آگے نکل گیا تو میں نے عمارت کے دوسرے پہلو کا رخ کیا اور کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے ریبک سے کہا۔

”میں اور ایرٹ قید خانے کی عمارت کی طرف جا رہے ہیں۔“

ریبک نے سوال نہیں کیا مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس طرف کیوں جا رہا ہوں۔ رسی بندھے درخت کے پاس آکر میں نے تیزی سے روش عبور کی اور اہرام نما معبد کے عقب میں آگیا۔ یہاں اندھیرا تھا اور میں اہرام کی کوئی سات فٹ اونچی دیوار کے ساتھ میں تیزی سے دوڑتا ہوا دوسرے کنارے پہنچا اور جھانک کر دیکھا۔ اس طرف روشنی تھی مگر ایرٹ نظر نہیں آیا تھا۔ میں پھر آگے بڑھا اور اس بار رفتار ذرا سست رکھی۔ ایک منٹ بعد میں نے احتیاط سے جھانک کر معبد کے اگلے حصے میں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ باغ میں ایرٹ نظر نہیں آرہا تھا اور اس کا نہ نظر آنا ہی بہتر تھا۔ قید خانے کی عمارت باغ سے ذرا فاصلے پر معبد کے اس کونے سے کوئی سو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ یہ ایک منزلہ عمارت اصل میں تین منزلہ تھی اور اس کی دو منزلیں زمین کے نیچے تھیں۔ جس کے بعد بڑا کنواں تھا اور اس میں ہارن تھا۔ مجھے وہ پجاری نظر نہیں آیا تھا جو ہاتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ کیا وہ قید خانے کی عمارت کے اندر ہی تھا۔

مجھے یاد آیا کہ اس جگہ صرف ہارن ہی نہیں بلکہ اسمار بھی موجود تھے جن کے آگے معبد کے مجرموں کو ڈالا جاتا تھا۔ پتا نہیں وہ اسمار تھے یا نہیں؟ لیکن وہ تھے تو امکان تھا کہ لاش کو ان کے آگے ڈال دیا جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں مضطرب ہو گیا۔ پہلے میں سوچ رہا تھا کہ وہ باہر آئے تو میں اندر جاؤں مگر اس خیال نے مجھے حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر معبد کے سامنے والے حصے کی طرف دیکھا اور جھک کر تیزی سے روش کراس کی۔ دوسری طرف آتے ہی میں نے اب باغ کے ساتھ چلتی روش کے کنارے اگی باڑھ کے پیچھے پناہ لی۔ قید خانے کی عمارت کے سامنے بڑے درخت اور باڑ اس طرح لگائی گئی تھی کہ باغ میں چہلیں کرنے والے پجاریوں کو یہ بدصورت عمارت نظر نہ آئے۔ اس وجہ سے امکان تھا کہ یہ معبد سے بھی نظر نہیں آتی ہو گی۔ کم سے کم اس کا داخلی دروازہ یقیناً نظروں سے اوجھل تھا۔

باڑ میں کہیں کہیں خلا تھا۔ میں باڑ کی آڑ میں جھک کر قید خانے کی عمارت کے دروازے تک پہنچا۔ اس کا بڑا سا دو پٹ والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کہ یہ جگہ معبد سے نظر نہیں آرہی تھی اور کوئی فرد اسی وقت قید خانے کا دروازہ دیکھ سکتا تھا جب وہ معبد کی چوٹی پر چڑھ جائے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو باڑ کے خلا سے ایرٹ مجھے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے ساتھ رینگتا ہوا نظر آیا۔ اب وہ پوری احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے شاباشی دی اور اندر گھس گیا۔ عمارت میں اندر تاریکی تھی اور میری آنکھوں کو مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا تھا۔ پھر میں آگے بڑھا۔ یہ گزرگاہ تھی جس کے دونوں طرف بڑے بڑے کمرے تھے اور ان میں مختلف قسم کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ذرا آگے گیا تو ایک سلوپ مجھے نیچے جاتا نظر آیا۔ نیچے مشعلوں کی روشنی تھی اور بدبو بتا رہی تھی کہ یہاں سے قید خانے کا آغاز ہو رہا تھا۔

میں دبے قدموں نیچے کی طرف بڑھا۔ پجاری اور ہاتھ گاڑی اوپر نظر نہیں آئی تھی۔ نیچے آتے ہی مجھے پجاری نظر آگیا۔ وہ ہاتھ گاڑی کے دوسری طرف زمین پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ میں اس سے فائدہ اٹھا

کر برق رفتاری سے اس کے سر پر پہنچا اور جب میں ہاتھ گاڑی کے دوسری طرف پہنچا تو یہ دیکھ کر میرا خون کھول گیا تھا کہ وہ لاش کو بے لباس کرکے شاید اسے بے آبرو کرنے کی فکر میں تھا۔ میرے ہاتھ نے اس کا گلا بند کر دیا۔ وہ کمزور آدمی نہیں تھا مگر تن آسانی اور عیاشی نے اسے ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ مزاحمت نہ کرسکا۔ بس پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

میں نے گلا تو مارنے کی نیت سے دبوچا تھا مگر پھر ایک خیال نے مجھے روک لیا اور میں نے صرف بے ہوش کرنے پر اکتفا کیا۔ جب وہ ڈھیلا ہوا تو اسے نیچے ڈال کر میں نے لاش کا جائزہ لیا۔ اس پر پڑنے والی پہلی نظر میں مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ روبیر نہیں ہے۔ یہ شاید سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی اور حسب روایت نہایت حسین تھی۔ اگرچہ اس کے رخسار پر نیل اور جسم پر زخموں کے نشانات تھے اس کے باوجود اس کی خوب صورتی عیاں تھی۔ اس کے پیٹ پر گھاؤ کا نشان تھا جس سے ابھی بھی ہلکا سا خون رس رہا تھا اور شاید یہی اس کی موت کی وجہ بنا تھا۔ میں نے اس کا اترا ہوا لبادہ اس کے جسم پر ڈالتے ہوئے سوچا کہ اسے نہ جانے کس بات کی سزا ملی تھی۔ اسی لمحے اوپر سے آہٹ سنائی دی اور پھر ایرٹ کی آواز آئی۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

”نیچے چلے آؤ۔“ میں نے کہا۔ ”ایک اچھی خبر ہے۔“

اچھی خبر کا سن کر ایرٹ جیسے اڑتا ہوا آیا تھا۔ اس نے آتے ہی بے ہوش پجاری اور خالی ہاتھ گاڑی کو دیکھا اور بولا۔ ”روبیر کہاں ہے؟“

”لاش روبیر کی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بے چاری خادماؤں میں سے ایک ہے۔“

اسی لمحے نسوانی کراہ نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ میں مڑا تو خلافِ توقع لڑکی کو ہلتے پایا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کیے بغیر اسے مردہ سمجھ لیا تھا۔ وہ زندہ تھی مگر بہ ظاہر مردہ نظر آرہی تھی۔ میں اس کی طرف جھکا اور پلٹ کر ایرٹ سے کہا۔ ”یہ زندہ ہے...... یہاں پانی تلاش کرو۔“

قید خانے میں کوئی قیدی نہیں تھا مگر ان کے لیے یہاں پانی کا ایک بڑا سا ٹب رکھا ہوا تھا جس میں نہ جانے کب سے پانی پڑا ہوا تھا مگر دیکھنے میں صاف ہی لگ رہا تھا۔ ایرٹ ایک مٹی کے کٹورے میں پانی لے آیا اور میں نے اس سے لے کر لڑکی کے ہونٹوں پر ذرا ذرا ٹپکانا شروع کیا۔ اس کا فوری ردعمل ہوا اور اس نے بے تابی سے منہ کھول دیا۔ پانی منہ میں اور حلق میں گیا تو اسے جلد ہوش آگیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ ایرٹ نے اسے تسلی دی۔ ”ڈرو نہیں ہم سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے ہم پجاری یا معبد سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔“

جلد لڑکی کے خوف پر اس کی تکلیف غالب آگئی اور وہ کراہنے لگی تھی۔ میں نے ایرٹ کی مدد سے کہا۔ ”ہم تمہیں لباس پہنا رہے ہیں۔ تمہیں کچھ تکلیف برداشت کرنی ہوگی۔“

لباس اور بے لباسی اس کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ معبد کی داسی تھی اور نہ جانے کتنی بے لباس راتیں گزار چکی تھی مگر تکلیف کا سن کر اس کا سفید چہرہ مزید سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا تو میں نے اسے ایرٹ کی مدد سے اس کا کرتہ لڑکی کو پہنایا۔ یہ مجبوری تھی کیونکہ یہاں اور کوئی لباس نہیں تھا۔ اسے تکلیف ہوئی تھی کیونکہ وہ رونے کے انداز میں کراہنے لگی تھی۔ میں نے لڑکی کے خون آلود لبادے کی پٹیاں پھاڑ کر پہلے اس کے پیٹ کے زخم پر گدی رکھ کر اوپر سے پٹی کی۔ دوسرا بڑا زخم اس کی ران پر تھا اور اس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ مرہم پٹی سے فارغ ہو کر اسے مزید پانی دیا تو وہ اس قابل ہوئی کہ سہارا لے کر چل سکتی تھی۔ ایرٹ نے پوچھا تو میں نے کہا۔ ”یہ ہمارے ساتھ جائے گی اور اس سے ہمیں معبد کے اندر کی معلومات حاصل ہوں گی۔“

”لیکن روبیر......“

”اس کے بارے میں بھی اسی سے معلوم ہو گا۔“ میں نے کہتے ہوئے پجاری کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کچھ کرنا ہوگا۔“

ایرٹ نے کہا۔ ”اگر یہ واپس نہ گیا تو جلد کوئی نہ کوئی اس کی تلاش میں آئے گا اور یہ زندہ ملا تو ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔“

”اس لیے ضروری ہے کہ یہ زندہ نہ رہے۔ یہ اس قابل بھی نہیں ہے جب میں یہاں آیا تو یہ اس لڑکی کو بے آبرو کرنے جارہا تھا۔“

”لیکن اس کی موت ایسی ہو کہ ہماری طرف نشان دہی نہ ہو اور لڑکی کی گم شدگی کی طرف دھیان بھی نہ جائے۔“

”اس کے لیے پہلے اس سے پوچھ گچھ کرنا ہوگی۔“ میں نے کہا اور پیالے میں پانی بھر کر بے ہوش

پجاری کے منہ پر ڈال دیا۔ ٹھنڈے پانی نے اسے جھنجوڑ دیا اور وہ کسمسانے لگا۔ میں نے اس کے گھٹنے پر چند ٹھوکریں ماریں تو وہ تکلیف سے بلبلا کر ہوش میں آ گیا۔ اس نے اس بار واضح الفاظ میں فریاد کی۔

"مجھے نہ مارو۔"

"زندہ رہنا چاہتے ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔" ایرٹ نے غرا کر کہا۔ "دوسری صورت میں تمہیں ہارن والے کنویں میں پھینک دیا جائے گا جہاں معبد کے مجرموں کو پھینکا جاتا ہے۔"

یہ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے اور اس نے گڑگڑا کر یقین دلایا کہ وہ سب بتائے گا۔ ایرٹ نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے یہاں کیوں لائے تھے؟"

"اسے قید خانے میں ڈالنا تھا۔" پجاری نے کہا تو لڑکی بے ساختہ بولی۔

"جھوٹ کہتا ہے اسے حکم تھا کہ مجھے اسمار کے سامنے ڈال دیا جائے۔"

"کیوں؟" اس بار ایرٹ نے لڑکی سے ہی پوچھا۔

"میں نے ایک لڑکی کی مدد کی تھی۔ اس نے خادماؤں والا لباس پہنا تھا مگر وہ معبد کی خادماؤں میں سے نہیں تھی۔ کسی کو اس پر شک ہوا تھا اور وہ چھپتی پھر رہی تھی۔ اس سے پہلے اسے پکڑا جاتا وہ غائب ہو گئی۔ وہ میرے پاس آئی تھی اور میں نے اسے فرار ہونے میں مدد دی۔ پتا نہیں کیسے پجاریوں کو مجھ پر شک ہو گیا اور انہوں نے مجھے مارا۔ ایک نے میرے پیٹ میں نیزہ مارا تھا۔ جب میں درد سے تڑپ رہی تھی تو آئی کون ہے ..... مجھے اسمار کے آگے ڈالنے کا حکم دیا پھر میں بے ہوش ہو گئی۔" لڑکی نے تفصیل سے بتایا تھا۔ ایرٹ نے تڑپ کر پوچھا۔

"اس کا نام روبیر ہے؟"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

"تم نے اسے کہاں نکالا؟"

"میں نہیں جانتی میں اسے معبد کی نچلی منزل تک لائی تھی اس کے بعد وہ خود کہیں گئی تھی۔"

گویا کرنل کی آمد اس وجہ سے تھی اور کیونکہ اسے علم نہیں تھا کہ کوئی لڑکی یا عورت یہاں سے فرار ہوئی ہے اس لیے اس نے قیدیوں کو دیکھنے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ ناترس کی وضاحت سے مطمئن ہو کر چلا گیا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ پجاری آسانی سے منہ کھولنے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ میں نے اس کی گدی پکڑی اور اسے کھینچتا ہوا تہ خانے کے دوسرے لیول تک لایا جہاں ہارن کا کنواں تھا اور اس میں ہارن موجود تھا۔ انسانوں کی موجودگی محسوس کرتے ہی اس نے بھیانک سی آواز نکالی تھی میں نے پجاری کو کنویں میں لٹکایا تو اس نے چیخ ماری تھی یہ سمجھ کر کہ میں اسے نیچے پھینک رہا ہوں۔ مگر میں نے اسے الٹا لٹکا دیا تھا اور اس کی ٹانگ پکڑ لی تھیں۔ ایرٹ میرے ساتھ آیا کیونکہ وہی پجاری سے سوال جواب کر سکتا تھا۔ اس نے پہلا سوال روبیر کے بارے میں کیا۔ "وہ کون ہے جسے بھگانے کی پاداش میں اس خادمہ کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔"

"میں نہیں ..... جانتا۔" اس نے ناک کے بل روتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کی ایک جھلک شاہین نے دیکھی تھی۔"

"شاہین کون ہے؟" ایرٹ نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ سپاہی ہے لیکن اس وقت مہا پجاری کے سب سے نزدیک وہی ہے۔ اسی نے زدنیرا کو نیزہ مار کر زخمی کیا تھا۔"

خادمہ کا نام زدنیرا تھا۔ میں نے کہا۔ "اس سے پوچھو۔ اندر کتنے لوگ ہیں اور ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی کہاں مقیم ہیں؟"

ایرٹ نے میرا سوال آگے کیا تو اس نے جلدی سے کہا۔ "اندر اب دو درجن خادمائیں اور ایک درجن پجاریوں کے علاوہ وہی چار مقدس ہیں۔"

"وہ کیسے مقدس ہو گئے؟"

"پتا نہیں مہا پجاری نے انہیں مقدس قرار دیا ہے۔" پجاری نے کہا۔ اب وہ فر فر بول رہا تھا۔ "وہ معبد کی آخری منزل پر ہیں جہاں سیتورکا معبد بھی ہے۔"

"معبد کی کتنی منزلیں ہیں؟"

"معبد کی تین بڑی منزلیں ہیں اور نیچے کی طرف بھی دو منزلیں ہیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"معبد کا خفیہ راستہ جو وادی کے اوپر جانے والے راستے کے پاس کھلتا ہے وہ معبد میں کہاں ہے؟"

"میں چھوٹے درجے کا پجاری ہوں۔ اس کے بارے میں صرف مہا پجاری اور اس کے چند ساتھی جانتے ہیں۔"

"سامنے والے دروازے کے علاوہ معبد کے اندر جانے کا کوئی راستہ ہے؟"

اس بار وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ "ایک راستہ اور ہے جو معبد کے اوپری حصے میں باہر نکلتا ہے لیکن یقین کرو میں نہیں جانتا کہ وہ راستہ کہاں ہے؟"

یہ انکشاف تھا کہ معبد کا ایک خفیہ راستہ اور بھی ہے جو اس کے اوپری حصے میں باہر کی طرف نکلتا ہے۔ ڈیوڈ شا کے بارے میں اس نے مزید بتایا کہ وہ سینتور والے حصے میں ہے اور وہاں سوائے آئی کون، شاہین اور چند مقرب پجاریوں کے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ معبد کی معمول کی سرگرمیاں بھی بند تھیں اور تمام فیصلے ڈیوڈ شا کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی اور آئی کون سمیت تمام ہی لوگ جو معبد میں تھے۔ اس وقت اس کے غلام تھے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب اس سے کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکتی ہے تو میں نے ایرٹ سے کہا۔ "اس کا انجام سوچ لیا ہے۔ ہم کسی طرح یہاں موجود اسماروں کو آزاد کرا کے باہر نکل جائیں گے۔ اسمار اس کا کام تمام کر دیں گے اور اگر کوئی دیکھنے آیا تو یہی معلوم ہو گا کہ کسی وجہ سے اسمار آزاد ہو گئے اور پجاری کو مار کر کھا گئے۔"

"زونیرا؟"

میں نے غور کیا اور کہا۔ "اس کا خون آلود لبادہ پھاڑ کر کہیں پھینک جائیں گے اور ایسا لگے گا کہ اسماروں نے اسے بھی کھا لیا ہے۔" میں نے جواب دیا تو ایرٹ مطمئن نظر آنے لگا۔ ہم پجاری کو لے کر واپس آئے۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ مگر شاید اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ اس کی موت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ وہ رونے گڑگڑانے لگا کہ اسے بخش دیا جائے۔ اوپر آتے ہی میں نے اس کی کنپٹی پر گھونسا مارا اور یہ ایک ضرب ہی اس کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گرا اور ہاتھ گاڑی پر بیٹھی ہوئی زونیرا سہم گئی تھی۔ میں نے ایرٹ کو اس کے پاس چھوڑا اور خود اسماروں کی تلاش کی۔ جلد میں نے ایک تاریک کوٹھری میں انہیں پا لیا۔ اس کے اوپری حصے میں گول کنویں نما سوراخ تھا جس سے معتوب کو اندر پھینکا جاتا تھا۔

اسماروں کو اندر پہنچانے کے لیے اس کی جڑ کے ساتھ ایک چھوٹا سا لیکن نہایت مضبوط لکڑی کا دروازہ تھا۔ میری موجودگی محسوس کر کے وہ غرانے لگے تھے۔ میں نے مشعل کی روشنی میں دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ دو یا ڈھائی فٹ کا تھا۔ اسے دو عدد مضبوط ترین بلیوں کی مدد سے بند کیا گیا۔ اسماروں کی کوٹھری تہ خانے میں تھی اور یہاں سے باہر کے دروازے تک طویل فاصلہ تھا۔ اگر دروازہ کھول دیا جاتا اور اسمار فوراً باہر آ جاتے تو کھولنے والے کے لیے عمارت سے نکلنا آسان نہ ہوتا۔ امکان یہی تھا کہ اسمار راستے میں آ لیتے۔ میں نے کوٹھری اور آس پاس کا جائزہ لیا اور ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔ کوٹھری کے اوپری حصے میں لکڑی کی کھونٹی لگی تھی۔ میں واپس آیا اور گودام سے رسی تلاش کی جو آسانی سے مل گئی۔ پھر میں نے ایرٹ سے کہا۔ "زونیرا کو لے کر باہر نکل جاؤ اور میرے آنے کا انتظار کرو جیسے ہی میں نکلوں دروازہ بند کر دینا کیونکہ اندر اسمار آزاد ہو چکے ہوں گے۔"

ایرٹ فکر مند ہو گیا۔ "اس میں خطرہ ہے، ہم پجاری کو ایسے ہی چھوڑ دیتے۔"

"نہیں منصوبے پر عمل کرنا لازمی ہے ورنہ ڈیوڈ شا ہوشیار ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے ہی روبیر کے بارے میں جان کر چوکنا ہیں۔"

میں اندر آیا اسماروں کی کوٹھری کے دروازے کی ایک بلی نکال دی۔ پھر بہت احتیاط سے دوسری بلی بھی نکالی۔ اب دروازہ کھل گیا تھا اور صرف دھکا دینے کی دیر تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کوئی اسمار دھکا نہ دے ورنہ وہ فوری آزاد ہو جائیں گے۔ رسی کو دروازے کے ہینڈل کے گرد گھمایا مگر گرہ لگانے سے گریز کی۔ پجاری کو پہلے ہی گھسیٹ کر نیچے لے آیا تھا۔ اسے کوٹھری سے ذرا فاصلے پر ڈال دیا۔ باہر نکلتے ہی اسماروں کو وہ مل جاتا تو امکان تھا کہ وہ باہر کی طرف ذرا دیر سے متوجہ ہوں گے اور مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ زونیرا کا لبادہ پھاڑ کر دہیں پھینک دیا۔ میں سیڑھیوں سے اوپر والی منزل تک آیا اور یہاں آ کر رسی کو پوری قوت سے کھینچا۔ دروازہ کھلنے اور دیوار سے ٹکرانے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ بھاگنے کے ساتھ میں رسی بھی کھینچے لیے جا رہا تھا۔

نچلی منزل پر آتے ہی میں نے چلا کر ایرٹ کو خبردار کیا۔ مجھے نچلی منزل سے بھیانک غراہٹ سنائی دی تھی۔ اسمار نکل آئے تھے اور شاید اوپر بھی آ رہے تھے۔ ایرٹ تیار تھا میرے باہر آتے ہی اس نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور باہر سے اس کی کنڈیاں لگانے لگا۔ اس کی کئی کنڈیاں تھیں جو لگ جانے کے بعد اندر سے اسے کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہی آخری کنڈی لگی اندر سے کوئی

دروازے سے ٹکرایا اور غراہٹ کی آواز آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ کوٹھری میں کم سے کم تین سے چار اسمار تھے اور اب وہ آزاد ہو چکے تھے۔ ان کی موجودگی میں اندر جانا بھی آسان نہیں تھا اور کوئی بے خیالی میں آکر دروازہ کھول دیتا تو یہ باہر بھی آسکتے تھے۔ پجاری کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اب تک لقمۂ اجل بن گیا ہوگا۔ رسی میں نے ایک جگہ چھوڑ دی تھی اور اب اس کی طرف کسی کا دھیان مشکل سے جاتا کہ رسی وہاں کیوں پڑی تھی۔ ہاں میں اسے نیچے چھوڑ دیتا تو شک کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ایرث سے کہا۔ ”تم اسے سہارا دو میں آس پاس نظر رکھوں گا۔“

ایرث نے زونیرا کو سہارا دیا۔ اس کے پیٹ کے زخم کی وجہ سے اسے اٹھانا مشکل تھا گود میں لیا جاسکتا تھا مگر اس سے ایرث کو مشکل ہوسکتی تھی۔ بہرحال چند قدم چل کر اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور سارا بوجھ ایرث پر آیا تو اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ میں آگے تھا۔ پہلے میں نے جھانک کر معبد کے سامنے والے حصے کا معائنہ کیا اور پھر ایرث کو اشارہ کیا۔ اس نے تیز قدموں سے روش پار کی اور معبد کی آڑ میں آ گیا۔ اس کے بعد میں آیا اور ہم روانہ ہو گئے۔ میرے خیال کے برعکس زونیرا کو اٹھانا ایرث کے لیے مسئلہ ثابت نہیں ہوا۔ ایک تو وہ چھریرے جسم کی مالک تھی اور دوسرے سنا ہے کہ حسین خواتین کا وزن نہیں ہوتا ہے یا ہوتا ہے تو محسوس نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے ایرث اسے اٹھائے بے تکان عمارت تک پہنچ گیا۔ ریبک وہیں موجود تھا اور ایک عدد لڑکی کو پا کر اس نے جلدی سے کہا۔ ”روبیرا؟“

”نہیں یہ معبد کی خادمہ ہے۔“ میں نے کہا اور اندر کود کر ایرث سے زونیرا کو احتیاط سے وصول کیا۔ ”یہ زخمی ہے اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”اسے لٹائیں میں آتا ہوں۔“ ریبک نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ایرث نے اندر آکر کھڑکی بند کر دی تھی۔ میں نے زونیرا کو وہیں پڑے کھال کے نمدے پر لٹا دیا۔ ریبک چند منٹ بعد اپنا دواؤں والا تھیلا لے آیا جو اسے سامیرا نے دیا تھا اور اس نے یہاں بھی ساتھ رکھا تھا۔ زونیرا کا زخم دیکھنے کے لیے کرتہ اوپر کرنا ضروری تھا اور نیچے اس نے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ ایک زخم اس کی ران پر بھی تھا۔ وہ بہتر تھا کہ خون بہنا رک گیا تھا۔ ریبک نے اس کا پیٹ کا زخم دیکھا جس سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور میں نے جو گدی بنائی تھی وہ خون سے بھیگ گئی تھی۔ ریبک نے ایک کالا سا محلول پانی میں ڈال کر پہلے اس سے اس کے زخم صاف کیے۔ یہ شاید کچھ جیسی کوئی چیز تھی کیونکہ زونیرا کے زخم پر لگا تو اسے تکلیف ہوئی تھی۔ ریبک کو اپنا کام کرتا چھوڑ کر میں اور ایرث باہر آ گئے۔ ایرث نے آتے ہی معذرت کرنا چاہی مگر میں نے اسے روک دیا۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں تم نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔“

ایمار اور مارٹ آگے موجود تھے اور مارٹ پہرہ دے رہا تھا۔ میں دفتر میں داخل ہوا تو اس نے مڑ کر مجھے بے تابی سے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑکی تک آیا اور باہر دیکھا تو مجھے ڈیوڈ شا چند دوسرے افراد کے ہمراہ دکھائی دیا۔ ان میں ایک وہی کمزور پجاری تھا۔ ان کے علاوہ تین افراد اور تھے اور یہ سب بھی پجاریوں کے لباس میں تھے۔ پجاریوں کا انداز نہایت مؤدبانہ تھا اور ڈیوڈ شا ان کے درمیان یوں تنا کھڑا تھا جیسے وہی یہاں کا حکمران ہو۔ حکمرانی کی سند اس نے خودکار رائفل کی صورت میں شانے سے لٹکا رکھی تھی۔ ایمار اور ایرث بھی آ گئے تھے۔ میں نے انہیں اشارے سے دکھایا اور کہا۔ ”یہ ڈیوڈ شا ہے میرا اصل دشمن۔“

ایمار نے تیر کمان سنبھال لیا۔ ”ہم اسے یہاں سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔“

”اگر آپ اجازت دیں۔“ مارٹ بھی پرجوش ہو گیا۔

مجھے خیال آیا کہ موقع اچھا ہے۔ مگر ڈیوڈ شا معبد کے دروازے پر تھا اور یہ جگہ یہاں سے کوئی تین سو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اتنے فاصلے سے نشانہ لینا آسان نہیں تھا۔ اگرچہ وہ سب ہی اچھے تیرانداز تھے لیکن اس کے باوجود اس کا امکان کم تھا کہ ڈیوڈ شا نشانہ بن سکے۔ ایک تو فاصلہ تھا اور دوسرے وہ پجاریوں کے درمیان میں تھا۔ پھر وہ ایسی جگہ تھا کہ بچ جاتا تو فوراً ہوشیار ہو جاتا اور اس کے بعد اسے نشانہ بنانا ممکن نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ معبد میں گھس جاتا۔ اس لیے میں نے انہیں روک دیا۔ ”ابھی نہیں کیونکہ وہ دور ہے اور تمہیں نشانہ بنانے کا دوسرا موقع نہیں ملے گا۔ اگر وہ ایسی جگہ ہو جو یہاں سے قریب ہو اور تمہیں دوسرا موقع ملے تب اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔“

ایرث، مارٹ اور ایمار نے تیر کمان سنبھال لیے تھے۔ میری نظر ڈیوڈ شا پر مرکوز تھی۔ وہ اس وقت باہر کیوں آیا تھا۔ کیا وہ پجاری کے واپس نہ آنے پر اسے دیکھنے کے لیے نکلے تھے۔ مگر اس صورت میں ڈیوڈ شا کو خود باہر آنے کی

کیا ضرورت تھی۔ وہ کسی کو بھیج کر معلوم کر سکتا تھا۔ وہ پجاریوں سے بات کر رہا تھا۔ پھر وہ لوگ ملنے اور مخالف سمت میں جانے لگے۔ مجھے اپنا خدشہ درست لگنے لگا۔ وہ قید خانے کی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ ڈیوڈ شا کو پجاریوں سے بات کرتے دیکھ کر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا کیونکہ برف والے کی طرح اس کے پاس بھی یہ صلاحیت تھی کہ وہ کسی کو اپنی زبان سمجھنے کے قابل بنا سکتا تھا۔ وہ خود بھی قابل تھا۔ اگرچہ شراب پیتا تھا مگر شاید اس کے باوجود وہ اس صلاحیت کا حامل تھا کہ خود بھی اجنبی زبان سمجھ سکے اور دوسرے کو اپنی بات سمجھا سکے۔ ایرٹ نے کہا۔

"یہ کہاں جا رہے ہیں؟"

"قید خانے کی طرف، شاید پجاری کے واپس نہ آنے سے یہ لوگ اسے دیکھنے جا رہے ہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ڈیوڈ شا جیسے مکار کا اس طرف جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ رائفل کی موجودگی میں امکان تھا کہ ایمار اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ وہ اندر جاتا تو تاڑ سکتا تھا کہ زونیرا بچ گئی ہے۔ ڈیوڈ شا اور پجاری جو مشعلیں تھامے ہوئے تھے معبد کے کنارے پہنچے اور خلافِ توقع قید خانے کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں مڑ گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "یہ قید خانے نہیں بلکہ رن وے کی طرف جا رہے ہیں جہاں طیارے اتریں گے۔"

"ہم کیا کریں؟" مارٹ نے پوچھا۔ "کیا ہم اسے وہاں نشانہ نہیں بنا سکتے ہیں؟"

یہ خیال میرے ذہن میں بھی تھا۔ اس سارے فساد کی جڑ ڈیوڈ شا تھا اور اگر وہ مارا جاتا تو یہ سب سے بڑی کامیابی ہوتی۔ میں نے مارٹ، ایمار اور ایرٹ سے کہا۔ "میرے ساتھ چلو ہمیں بھی عقبی حصے میں جانا ہوگا۔"

ریک نے زونیرا کے زخم کی صفائی کر کے اس پر مرہم لگا کر اس پر پٹی باندھ دی تھی۔ اسی نے اسے پاجامہ بھی لا کر پہنا دیا تھا اور اسے بالوں سے بنا ہوا کمبل اوڑھا رہا تھا۔ اب اسے لڑکی کو خوراک دینے کی فکر تھی۔ ریک کو وہیں چھوڑ کر ہم باہر آئے۔ عقبی باغ سے ہوتے ہم میدان کے کنارے تک آئے۔ یہاں روشنی نہیں تھی کیونکہ یہاں مشعلیں روشن نہیں تھیں۔ ڈیوڈ شا کے ساتھ موجود پجاریوں کے پاس تیز روشنی والی مشعلیں تھیں اور اتنی دیر میں وہ دوسری طرف سے گھوم کر نمودار ہو چکے تھے۔ وہ معبد کے وسطی حصے کی طرف آ رہے تھے۔ میں اور ایرٹ اسی درخت کی آڑ میں لیٹے ہوئے تھے جس کے اوپر رسی باندھی تھی۔

درخت سے آگے روش کے ساتھ چھوٹے پودے تھے مگر ان تک جانا مناسب نہیں تھا اگر کوئی اس طرف آ جاتا تو ہمیں چھپنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ ایمار اور مارٹ ہمارے عقبی طرف پودوں کے عقب میں دبکے ہوئے تھے۔ ایرٹ نے سرگوشی کی۔ "اوپر نہ چلیں؟"

"پہلے تم۔" میں نے کہا تو ایرٹ پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے بعد میں گیا اور مجھے احتیاط کرنا پڑی تھی۔ میرے وزن سے درخت کسی قدر ہل رہا تھا اور اس کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ یہاں ہوا نہیں چلتی ہے جو درخت حرکت کریں۔ یہ صرف اسی صورت میں حرکت کرتے جب کوئی انہیں حرکت دیتا۔ ڈیوڈ شا اور پجاری متوجہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے میں بہت آہستہ سے اوپر پہنچا۔ اس وقت تک ڈیوڈ شا پجاریوں کے ہمراہ رن وے کے وسط میں پہنچ چلا تھا۔ غالباً وہ رن وے کا معائنہ کرنے آیا تھا۔ اس وقت بھی ہم سے کوئی پونے تین سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں ایک مناسب جگہ تک گیا۔ ایرٹ بھی پاس ہی ذرا اوپر تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"روبیر نہیں ملی لیکن مجھے لگ رہا ہے وہ خیریت سے ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ آزاد ہے ورنہ اس کے پکڑے جانے کی صورت اب تک ہم کسی مصیبت میں پڑ چکے ہوتے۔ معبد کی طرف سے آنے والے یہی پوچھنے آئے تھے کہ یہاں سے کوئی فرار تو نہیں ہوا ہے۔ شامین میری توقع سے زیادہ خبیث آدمی ثابت ہو رہا ہے۔ روبیر نے عقلمندی کی جو اس کی نظر پڑتے ہی غائب ہو گئی۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟" ایرٹ نے پوچھا۔ "اگر وہ معبد سے نکل گئی ہوتی تو لازمی ہمارے پاس آتی۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ وہ معبد میں ہی کہیں چھپی ہے۔ معبد کی عمارت بہت بڑی ہے اس میں یقیناً چھپنے کی بہت سی جگہیں ہوں گی۔"

ڈیوڈ شا پجاریوں سے بات کر رہا تھا پھر اس نے ہاتھ بلند کیا مگر اس کا ہاتھ خالی تھا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "آن۔"

اس کے ساتھ ہی رن وے کی لائٹس آن ہو گئیں۔ پجاریوں میں کھلبلی سی مچی تھی۔ وہ یوں ڈر کر پیچھے ہوئے جیسے یہ کوئی جادو ہو۔ شاید ڈیوڈ شا نے ایسا ہی کوئی تاثر دیا تھا۔ وہ شاطر آدمی تھا۔ ان لوگوں کو اپنی روحانی قوت کا قائل کر کے مزید مرعوب کر رہا تھا۔ ریموٹ شاید اس کی

جیب میں تھا اور اس نے ہاتھ ڈال کر اس کا بٹن دبایا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں اور دایاں ہاتھ جو ہوا میں تھا وہ خالی تھا۔ اس نے لفظ آن کہا تھا۔ یہ انگریزی کا لفظ ہے اس لیے پجاریوں کے پلے نہیں پڑا۔ پجاری تجسس بھی تھے مگر روشن ہونے والی ڈسکوں کے پاس جانے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ غالباً ڈیوڈ شا نے اس حوالے سے انہیں روکا تھا۔ ورنہ پاس جانے پر وہ ڈسک دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ ان کی اصلیت نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ایک منٹ بعد ڈیوڈ شا نے اسی طرح ہاتھ بلند کیا اور بولا۔ ''آف۔''

ڈسک آف ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ شا اور پجاری واپس جانے لگے تھے۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ طیاروں کے آج ہی رات کسی وقت آنے کا امکان تھا۔ ڈیوڈ شا رن وے کا معائنہ کرنے آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے پجاریوں کو مرعوب بھی کر لیا یعنی ایک تیر سے دو شکار کیے۔ وہ اسی سمت سے جا رہا تھا جہاں سے آیا تھا یعنی مخالف سمت۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ڈیوڈ شا بہت محتاط تھا۔ وہ اس عمارت کے پاس آنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ یہاں تیز کمان سے مسلح افراد بہر حال موجود تھے اور وہ ان پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ عمارت سے دور رہا اور عقبی میدان میں جانے کے لیے بھی مخالف سمت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے آتے وقت بھی اور جاتے وقت بھی عمارت سے اپنا فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ ایک منٹ میں وہ معبد کے کونے تک پہنچے اور دوسری طرف مڑ گئے۔

ان کے غائب ہوتے ہی ہم نیچے اترے اور واپس عمارت کی طرف روانہ ہوئے۔ کھڑکی سے اندر آنے پر میں نے دیکھا کہ ریک زونیرا کو چمچ سے سوپ پلا رہا تھا۔ میرے پاس اس کی خیریت دریافت کرنے کا وقت نہیں تھا اور جب تک ہم بھاگتے ہوئے آبزرویشن پوسٹ تک پہنچے تو ڈیوڈ شا اور پجاری معبد کے داخلی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ ہم کھڑکی کے عقب سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ڈیوڈ شا معبد کے سامنے کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اطمینان کر رہا ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ اس کی نظریں چند لمحے کے لیے عمارت اور دفتر کی کھڑکی پر آ ٹکی تھیں۔ پھر وہ اور پجاری واپس اندر چلے گئے تو میں نے اپنے خیال کا اعلان کیا۔ ''طیارے آج رات آنے کا امکان ہے۔''

''یعنی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔'' ایرٹ نے کہا۔

''یقیناً۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''ڈیوڈ شا روشنیوں کو جلا کر اور بجھا کر گیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے پجاریوں کو بھی دکھا کر مرعوب کیا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد ان کی کارکردگی دیکھنا تھا۔''

''تب ہمیں تیار ہو جانا چاہیے۔'' ایمار نے کہا۔

''بالکل۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''ہم پانچوں اور چار فوجی افسران اس مہم میں شامل ہوں گے۔''

ریک نے فوجی افسران کے بارے میں سوال کیا۔ ''کیا ہم ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔''

''مجبوری ہے۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''اس مہم میں ہمیں زیادہ افراد کی ضرورت ہے۔''

ریک بھی آ گیا تھا اس نے تجویز دی۔ ''ہم ان کے ذمے اس طرح کے کام لگا سکتے ہیں کہ یہ ہمارے خلاف کچھ نہ کر سکیں۔''

''وہ کیسے؟'' مارٹ نے پوچھا۔

''انہیں خود سے دور نگرانی جیسے کاموں پر لگایا جا سکتا ہے۔''

میں نے ریک کا شانہ تھپکا۔ ''یہ اچھی تجویز دی ہے تم نے۔ ڈیوڈ شا نے پجاریوں کو مرعوب کر کے اپنے ساتھ ملا لیا ہے مگر وہ لڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔ لڑنے کا سارا بوجھ ڈیوڈ شا اور اس کے تین ساتھیوں کو اٹھانا پڑے گا۔ ہماری توجہ بھی ان پر ہی ہونی چاہیے۔ ان سے ہم پانچ ہی نمٹیں گے۔ میرا خیال ہے طیاروں کے استقبال کے لیے وہی چاروں آئیں گے۔ اب ہمیں ایسا منصوبہ بنانا ہے کہ ہم ان پر حملہ کریں اور ان کے جوابی حملے سے محفوظ بھی رہیں۔''

ایرٹ غور سے سن رہا تھا اس نے کہا۔ ''وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جس سے ہم ان پر حملہ کر سکیں۔ میدان میں چھپنے کی جگہ نہیں ہے۔ باغ سے یہ جگہ دور ہوگی۔''

''ایک جگہ ہے۔ مگر وہاں ہم بس حملہ کرنے تک ہی محفوظ رہ سکیں گے۔ کامیاب ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ناکامی کی صورت میں ہمارے لیے بچنا مشکل ہوگا۔''

''کون سی جگہ؟''

''معبد کی عمارت۔'' میں نے کہا۔ ''ہم اس پر چڑھ سکتے ہیں اور اس کی بلندی سے حملہ کر سکتے ہیں مگر وہاں ایسی کوئی آڑ نہیں ہے جو ہم جوابی حملے سے زیادہ تحفظ دے سکے۔ سیڑھی نما دیواریں جو زیادہ تحفظ نہیں دے سکتی ہیں۔''

ریک نے سوچا۔ ''ہاں وہاں سے ہم حملہ کر سکتے ہیں۔ اس پر سیڑھی نما جگہ ہے۔ ہم لیٹ سکتے ہیں اور چھپ سکتے ہیں مگر کھل کر حملہ نہیں کر سکتے ہیں۔''

''یہ خطرہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اس کے سوا اور

کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ ہم اس وقت حملہ کریں گے جب طیارہ اتر رہا ہوگا اور جب یہ تباہ ہوگا تو وہ لوگ لازمی بدحواس ہوں گے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔''

ربیک نے کہا۔ ''اس صورت میں ان کے جتنے قریب ہوں اتنا اچھا ہے تاکہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فیصلہ کن وار کرسکیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم ایک حد سے زیادہ نزدیک نہیں جاسکتے ورنہ ہم خود خطرے میں پڑ جائیں گے۔''

میرے ساتھیوں میں ایمار سب سے کم بولتا تھا اور وہ لیس باس قسم کا لڑکا تھا۔ وہ غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پہلی بار کہا۔ ''ایسا نہ کریں کہ فاصلے کا فیصلہ ہم عین موقع پر کریں۔''

میں نے سوچا اور مجھے اس کی بات پسند آئی۔ ''ٹھیک ہے ایسا بھی کرسکتے ہیں۔ کچھ فیصلے ہمیں عین موقع پر کرنے ہوں گے۔''

''یہ بتائیں کہ ان چاروں کو کیا ذمے داری دینی ہے؟'' ربیک نے فوجی افسران کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ اچھے لڑاکے ہیں اور تیر اندازی میں ان کا نشانہ بھی اچھا ہے۔''

''کیوں نہ ان کو معبد کے پہلوؤں پر لگا دیا جائے۔ وہاں سے یہ حملہ کرسکتے ہیں۔'' یہ تجویز مارٹ کی تھی۔ ''ان کو خود سے کم بلندی پر لگائیں گے تاکہ ان کے دل میں کوئی شرارت آئے بھی تو ہمیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔''

مجھے یہ تجویز بھی اچھی لگی تھی۔ اگر ان چاروں کو دو دو کرکے معبد کے پہلوؤں پر اس طرح لگا دیتے کہ وہ سگنل ملنے پر ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کرتے تو ہماری حملہ کرنے کی طاقت بڑھ جاتی۔ کئی سمتوں سے بیک وقت آنے والے تیروں سے بچنا آسان نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے ہم منصوبے پر بات کررہے تھے۔ نئے پہلو اور نئی تجویزیں سامنے آرہی تھیں۔ کسی قدر بحث کے بعد ہم تقریباً متفق ہو گئے۔ شروع میں ربیک اور اس کے ساتھی مجھ سے مرعوب اور دب کر رہتے تھے۔ مگر اب وہ اپنی آرا کا کھل کر اظہار کرتے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ میں معقول بات ماننے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد ہم حرکت میں آجائیں اور ان لوگوں کے باہر آنے سے پہلے پوزیشن سنبھال لیں۔ مجھے درست وقت کا اندازہ نہیں تھا کہ طیارہ کب یہاں آتے لیکن ہمیں یہ سوچ کر حرکت میں آجانا تھا کہ وہ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ یعنی ہمیں جلد از جلد معبد کے اوپر پہنچ کر مورچے بنا لینے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کے پاس رابطے کے لیے کوئی سیٹلائیٹ فون تھا۔ صرف سیٹلائیٹ فون ہی اس جگہ رابطے میں کام آسکتا تھا ورنہ کسی قسم کا ریڈیو کمیونیکیشن یہاں سے باہر کی دنیا سے رابطے میں کام نہیں آسکتا تھا۔ دوسرا طریقہ سیٹلائیٹ انٹرنیٹ تھا مگر اس میں نہ صرف انٹرنیٹ ڈیوائس بلکہ کوئی لیپ ٹاپ یا اسمارٹ فون بھی درکار ہوتا۔ ان آلات کے مقابلے میں سیٹلائیٹ موبائل زیادہ کارآمد تھا۔ اس سے وہ کسی بھی موبائل یا فون پر آسانی سے رابطہ کرسکتا تھا۔ اس کی بیٹری بھی بہت دنوں تک چل سکتی تھی۔ اضافی بیٹریاں رکھنا بھی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ تو سو فیصدی طے ہے کہ ڈیوڈ شا تمام انتظامات کرکے یہاں آیا تھا اور اس کا منصوبہ طے شدہ تھا۔ اب اس پر عمل درآمد کا وقت آگیا تھا۔

ربیک نے پوچھا۔ ''یہاں موجود لوگوں کا کیا کرنا ہے؟''

''پجاریوں سمیت سب کو بند کردینا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم کسی کو آزاد چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ان میں سے کوئی جاکر ہمارا راز فاش کرسکتا ہے۔''

دوپہر میں جو پکایا گیا تھا وہ رات کے لیے بھی کافی تھا۔ اگرچہ ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی سب کو کھانا دے دیا گیا۔ اس کام سے نمٹ کر ان کو خبردار کیا گیا کہ ابھی جس نے واش روم جانا ہے وہ چلا جائے ورنہ صبح سے پہلے پھر موقع نہیں ملے گا۔ یہ ساری تدابیر ان سب کو رات بھر اندر رکھنے کے لیے کی جارہی تھیں۔ تاکہ کوئی شور شرابا بھی نہ کرے۔ آنے والے دو گھنٹے میں اس مشکل مرحلے سے گزر کر ہم باہر جانے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ طے ہوا تھا کہ ہم اتنی خاموشی سے نکلیں گے کہ قیدی افراد کو اس کا علم نہ ہو۔ روانہ ہونے سے پہلے سب نے کچھ نہ کچھ کھا پی لیا تھا۔ میں آبزرویشن پوسٹ کے سامنے موجود تھا۔ معبد کا داخلی دروازہ اور اس کے سامنے باغ ویران تھا اور یقیناً اس وقت خودکار گن متحرک تھی۔

ڈیوڈ شا نے یہ اچھا حربہ رکھا تھا۔ اب اس کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی معبد سے باہر جاسکتا تھا اور نہ ہی معبد کے اندر آسکتا تھا۔ اب وہ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ بھی باہر آسکتا تھا اور اسے عقب میں پجاریوں کی بغاوت کا خطرہ نہیں رہتا۔ اگر وہ بغاوت بھی کرتے تو باہر نہیں آسکتے تھے۔ جو باہر آتا اسے موت ملتی۔ مجھے ردبیر کا خیال آیا کہ وہ آزاد تھی۔ کہیں وہ باہر نہ نکل آئے۔ لیکن وہ یہاں سے فرار ہونے

والی قیدی عورت کا انجام دیکھ چکی تھی اور اسے اس خطرے کا بہ خوبی علم تھا اس لیے وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ زود اثر دوا اور خوراک کے مرحلے سے گزرنے کے بعد سکون کی نیند سو رہی تھی اور اسے علم نہیں تھا کہ اس کی بے خبری میں یہاں کیا ہنگامہ ہونے والا ہے۔ اسی کمرے کی کھڑکی سے ہم سب باری باری عقبی باغ میں نکلے۔ چاروں فوجی افسران پوری طرح مسلح تھے اور میں انہیں بتا چکا تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ مگر فی الحال انہیں اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ ہم خاموشی سے عقبی حصے میں آئے۔

روش کے پار معبد کی اہرام نما بلند ہوتی عمارت تھی۔ اسے بالکل اہرام کے انداز میں تعمیر کیا تھا۔ پتھر کی بہت بڑی سلیں ایک دوسرے پر جما کر اس طرح رکھی گئی تھیں کہ وہ خاص ترتیب سے بلند ہوتی ہوئی اہرام جیسی ساخت اختیار کر گئی تھیں۔ یہ سیڑھی دار اہرام تھا۔ یعنی پتھروں کی ایک قطار تھی اس کے اوپر کچھ فاصلہ چھوڑ کر دوسری قطار تھی اور پھر قطاریں مسلسل اوپر جاتی رہی تھیں۔ یوں سیڑھی سی بن گئی تھی لیکن یہ چھوٹی سیڑھی نہیں تھی کیونکہ ہر قطار کوئی سات یا آٹھ فٹ اونچی اور اس کے قد ہیچے کی چوڑائی بھی اتنی ضرور تھی۔ ان پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تم لوگ دیکھ رہے ہو کہ اس پر چڑھنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں ترتیب سے چڑھنا ہوگا۔ دو افراد پہلے اوپر جائیں گے ان میں سے ایک سامان اوپر کرے گا اور دوسرا چڑھنے میں مدد دے گا۔ نیچے سے دو افراد کو چڑھنے میں مدد دیں گے اور یہی ترتیب آخر تک برقرار رکھی جائے گی۔ یعنی دو دو کی جوڑی میں ہم اوپر جائیں گے اور آخری فرد آخر میں آئے گا، سمجھ گئے؟“

کچھ سمجھ گئے تھے اور کچھ نہیں سمجھے تھے اس لیے میں نے دوبارہ سمجھایا۔ تیسری بار سمجھانے پر سب سمجھ گئے تھے۔ سامان بھی اسی ترتیب سے اوپر پہنچایا جاتا۔ اس کے بعد میں نے حفاظتی اصول بیان کیے۔ ”ہر ممکن خاموشی برقرار رکھنی ہے۔ ذاتی طور پر بھی اور سامان سے بھی شور نہ ہو۔ کسی کو چوٹ لگے تو وہ اسے خاموشی سے برداشت کرے۔ اگر اچانک کوئی اس طرف آنکلے تو جو جہاں ہو وہیں دبک جائے اور خود کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اگر ایک دشمن کی نظر میں آجائے تو وہ یوں ظاہر کرے کہ بس وہی ہے اور دشمن کو دوسروں سے بے خبر رکھے۔ ہو سکے تو دشمن کو بھٹکا کر دور لے جائے۔ اگر دشمن ایک ہو تو اسے ہوسکے تو کھ کر مار دے مگر اس طرح کہ آواز نہ ہو۔“

وہ سب غور سے سن رہے تھے۔ میں نے بات مکمل کر کے سوالات کر کے دیکھا کہ انہوں نے کس حد یاد کیا ہے۔ مگر یہ موقع ایسا تھا کہ وہ کوئی بات بھول نہیں سکتے تھے۔ دوہرانے سے یہ فائدہ ہوا کہ سب کے ذہن نشین ہو گیا تھا۔ سب نے سرمئی جنگی وردیاں پہن لی تھیں جو تاریکی میں چھپنے میں مدد دیتیں۔ ہتھیاروں کا جائزہ روانگی سے پہلے لے لیا تھا۔ ہمارے پاس تیر کمان، نیزے اور آتشیں روغن تھا۔ مشعلیں تھیں اور انہیں جلانے کے لیے دیا سلائیاں بھی تھیں۔ پانی کی چھاگلیں تھیں اور میرے پاس کچھ ڈرائی فروٹ بھی تھے۔ ہاقوں کے پاس کیا تھا میں اس سے لاعلم تھا۔ یہ سارے انتظامات واقع الوقتی کے لیے تھے۔ کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہمارا انتظار کتنا طویل ہوتا۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ آسمان صاف نہیں تھا کیونکہ ستارے نظر نہیں آرہے تھے۔ اگر موسم خراب ہوتا تو طیاروں کی آمد کا امکان کم تھا۔ مگر ڈیوڈ شا کی آمد ظاہر کر رہی تھی کہ امکان ہے۔ شاید اوپر موسم اتنا خراب نہ ہوا اور صرف بادل ہوں۔ جب وہ باہر سے مدد منگوا سکتا تھا تو اسے علم ہوگا کہ موسم کیسا ہے؟

”اوپر کیسے جائیں گے؟“ ایرٹ نے پوچھا۔

”پیچھے سے، پہلو سے خطرہ ہے کوئی اچانک آجائے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے۔“

”یہ خطرہ تو پیچھے بھی ہوگا۔“ ریک نے کہا۔ ”بلکہ دو طرف سے ہوگا۔“

”تب ایک ایک آدمی دونوں سمتوں میں لگا دیا جائے گا۔“ میں نے حل پیش کیا۔ ”اس دوران میں باقی اوپر چڑھیں گے۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دیکھ لیے جانے کا خطرہ اتنا نہیں رہے گا۔“

میرا اندازہ تھا کہ رات کے ساڑھے نو یا دس بج رہے تھے اور موسم خاصا سرد ہو چلا تھا۔ جسم کے کھلے حصوں پر یہ خنکی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ مگر موسم ناقابلِ برداشت بھی نہیں تھا۔ شاید آنے والے وقت میں ہوتا مگر فی الحال رات کے وقت باہر گزارا ہو سکتا تھا۔ میں نے سب کو ایک ایک کر کے معبد کے عقبی حصے میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ہمیں وسط سے چڑھنا تھا۔ پہلا جانے والا ہارٹ تھا۔ اس نے اپنا سامان وسط میں چھوڑا اور بھاگتا ہوا معبد کے دوسرے کونے تک چلا گیا اس کے بعد ایک فوجی افسر گیا اور اپنا سامان وسط میں رکھ کر بھاگتا ہوا واپس ہماری طرف والے کنارے پر آیا۔ اب دونوں طرف سے نگرانی ہو رہی تھی کسی کے اچانک

آجانے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد باقی بھی ایک ایک کر کے جانے لگے۔ سب سے پہلے میں گیا اور جا کر سامان والی جگہ اپنے بھی ہتھیار اور چیزیں رکھیں جن کے ساتھ اوپر جانے میں رکاوٹ نہ بنے۔ میں نے ایمار کی طرف دیکھا۔

''مجھے سہارا دو۔''

ایمار نے عقب سے سہارا دیا اور میں تقریباً سات فٹ اونچی دیوار پر آسانی سے چڑھ گیا۔ ایرٹ نے ریبک کو چڑھایا۔ اوپر آ کر میں نے ایمار کو اوپر کھینچا اور ایک فوجی افسر نے اسے عقب سے سہارا دیا۔ ریبک سامان اوپر لے رہا تھا اور ایرٹ اسے سامان پکڑا رہا تھا۔ ایمار نے ایک بار پھر مجھے سہارا دیا اور میں اگلے اسٹیپ پر پہنچ گیا۔ پھر ایمار نے نیچے سے فوجی افسر کو اوپر کیا۔ یوں ایک چین سسٹم بن گیا۔ میں ایمار اور ایک فوجی افسر اوپر چڑھ رہے تھے۔ ریبک اور ایرٹ باقی دو فوجی افسروں کے ساتھ سامان اوپر منتقل کر رہے تھے۔ پہلے سے ہدایات کے مطابق سارا کام خاموشی سے ہو رہا تھا۔ جب ہم تیسرے اسٹیپ تک پہنچ گئے تو مارٹ اور فوجی افسر جو کناروں سے نگرانی کر رہے تھے وہ دوڑتے آئے۔ پہلے وہ ایک دوسرے کی مدد سے اوپر آئے اور پھر سب کے ساتھ مل کر چڑھنے لگے۔ سامان کیونکہ سست روی سے اوپر جا رہا تھا۔ اس لیے میں، ایمار اور ہمارے ساتھ کا فوجی افسر پہلے اوپر پہنچ گئے۔

جیسے جیسے ہم اوپر جا رہے تھے دیواروں کی اونچائی اور قد بچے کم ہو رہے تھے۔ میرا خیال ہے کوئی دو سوفٹ کی بلندی پر آنے کے بعد ان کی اونچائی ساڑھے چار فٹ کے لگ بھگ رہ گئی تھی اور چوڑائی بھی اتنی ہی تھی۔ مجھے یہ جگہ مناسب لگی تھی اس لیے مزید اوپر جانے کے بجائے اسی جگہ رک کر دوسروں کا انتظار کرنے لگے۔ اہرام کی ساخت کی وجہ سے عقبی میدان اس جگہ سے کوئی ساڑھے تین سوفٹ دور ہو گیا تھا اور یہ فاصلہ تیروں سے حملہ کرنے کے لیے خاصا تھا۔ اگرچہ آتشیں ہتھیاروں کے لحاظ سے یہ کم تھا۔ اس کوہ پیمائی نے سب کی سانس پھلا دی تھی۔ ہم رکے تو موقع غنیمت جان کر سب ہی سانس درست کرنے لگے۔ کچھ دیر میں باقی سب بھی آ گئے۔ ہمیں یہاں تک آنے میں کوئی بیس منٹ لگے تھے۔ آنے والے ستانے لگے اور ہم اپنے ہتھیار لینے لگے۔ کچھ دیر بعد ریبک اور ایرٹ میرے پاس چلے آئے۔ جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے ہم پھیل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ریبک نے کہا۔

''ہم یہاں سورج ڈھلنے تک رکیں گے؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے خیال میں یہاں سے فاصلہ زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمیں نیچے جانا ہوگا۔ دوسرے سب ایک ہی قد بچے پر نہیں ہوں گے۔ کچھ اوپر ہوں گے اور کچھ نیچے۔ فوجی افسران کو اور نیچے رہنا پڑے گا کیونکہ یہ کناروں پر ہوں گے اور وہاں سے فاصلہ زیادہ ہو گا۔ مناسب فاصلے سے حملہ کرنے کے لیے نیچے رہنا ضروری ہوگا۔''

''کتنا نیچے جانا ہوگا؟'' ایرٹ نے پوچھا۔

میں غور کر رہا تھا۔ ہمیں ڈیڑھ سوفٹ کی بلندی پر رہنا تھا یعنی چھ سات اسٹیپ نیچے جانا تھا۔ فوجی افسران کو اس سے بھی نیچے جانا تھا انہیں سوفٹ کی بلندی پر رہنا تھا۔ میں نے پہلے انہیں روانہ کیا اور اس ہدایت کے ساتھ کہ چھپ کر اور خاموش رہیں اور جب تک ہماری طرف سے اشارہ نہ ملے کوئی کارروائی نہ کریں۔ وہ دونوں سمتوں میں دو دو کر کے روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''تم سب فی الحال یہیں ٹھہرو میں اوپر سے ہو کر آتا ہوں۔''

ریبک نے۔ ''میں چلوں آپ کے ساتھ؟''

''نہیں تم چاروں یہیں رہو اور چوکس رہو۔'' میں نے انکار کیا تو ریبک بجھ گیا تھا۔ یہاں تقریباً تاریکی تھی اور ہمیں آنکھوں پر زور دینا پڑ رہا تھا اس لیے میں تاثرات تو نہیں دیکھ سکا مگر ریبک کے انداز نے بتایا تھا کہ اسے میرے انکار سے مایوسی ہوئی ہے۔ میں اوپر جانے لگا تھا کہ اچانک آسمان کی طرف سے روشنی کی ایک لکیر سی نیچے آئی اور وادی کی ایک طرف کی دیوار اس سے روشن ہونے لگی تھی۔ اوپر بادل ہٹ گئے تھے اور چاند کی روشنی نیچے آ رہی تھی۔ ماحول کسی قدر روشن ہو گیا اور میں فکرمند ہو گیا۔ کیونکہ روشنی ہونا ہمارے لیے بہتر نہیں تھا۔ ماحول جتنا تاریک ہوتا ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ بہر حال اس وقت تو مجھے فائدہ ہوا اور مجھے آس پاس صاف نظر آنے لگا ورنہ اس سے پہلے میں اور میرے ساتھی اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چڑھ رہے تھے۔ چند اسٹیپ مزید اوپر جانے کے بعد قد بچے چار فٹ کے رہ گئے اور جیسے جیسے مزید اوپر جا رہا تھا یہ اور چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔

تین سوفٹ پر آنے کے بعد قد بچے ساڑھے تین فٹ کے رہ گئے تھے۔ ان کی اونچائی اور چوڑائی برابر تھی۔ یہ اتنی اونچائی تھی کہ اگر میں معبد کے دوسری سمت میں ہوتا تو شاید

مجھے آرگون کی بلند عمارات بھی نظر آتیں۔ مگر یہاں سے فصیل کے پار جنگل اور وادی کی دیوار نظر آرہی تھی۔ چاندنی بڑھ رہی تھی اور اس حساب سے روشنی بھی بڑھ رہی تھی۔ نیچے کا میدان بھی صاف نظر آنے لگا تھا اور اگر کوئی میدان میں ہوتا اور اوپر دیکھتا تو اسے میں اور میرے ساتھی بھی نظر آسکتے تھے۔ اب میں معبد کی چوٹی سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ نیچے تھا۔ معبد کا اہرام پانچ سو فٹ بلند اور زمین پر اس کی لمبائی چوڑائی بھی اتنی ہی تھی۔ یعنی اس کا ہر پہلو پانچ سو فٹ کا تھا۔ سب سے اوپر ایک کلس نما چیز نصب تھی جو سونے جیسے رنگ کی تھی اور جب اس پر روشنی پڑتی تو یہ جگمگا اٹھتی تھی۔ میں نے نہیں دیکھا تھا مگر راجا عمر دراز نے دیکھا تھا۔ کبھی کبھی یہاں دن میں دھند ہٹ جاتی تھی اور سورج کی روشنی نیچے تک آتی تھی۔ ایسا سرما میں ہوتا تھا۔

اب میں چاہتا تو بغیر ہاتھوں کا سہارا لیے اوپر چڑھ سکتا تھا۔ مگر احتیاطاً میں سہارا لے کر چڑھ رہا تھا۔ ایک غلط قدم مجھے واپس نیچے پہنچا دیتا اور یہ واپسی صحیح سلامت نہ ہوتی۔ چار سو فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد قدمچے ڈھائی فٹ سے چھوٹے ہو گئے تھے۔ میں اب بھی چاروں ہاتھوں پیروں کا استعمال کر رہا تھا۔ میں نے یہاں سے اوپر جانے کے لیے ایک پتھر پر ہاتھ رکھا تو وہ مجھے ہلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ باقی پتھروں سے جڑا ہوا نہ ہو۔ پہلے میں اسے اپنا وہم سمجھا تھا مگر جب میں نے اسے دوبارہ چھیڑا تو وہ باقاعدہ ہلا تھا۔ میں بغیر زور لگائے اسے ٹٹولنے لگا۔ اس کا امکان کہ وقت نے اہرام کو نقصان پہنچایا ہو۔ یہ ہزاروں سال پرانا تھا اور پتھروں کو جوڑنے والا مسالہ کمزور پڑ سکتا تھا۔ ایسے میں پتھر آپس میں جڑے نہیں رہتے اور یہ پتھر بھی شاید اسی وجہ سے الگ ہو گیا تھا۔ اہرام مصر بھی اس طرح شکست و ریخ کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں یہ الگ ہو کر نیچے جا پڑے اور یقیناً اس دوران میں خاصا شور اور ہنگامہ ہوتا۔ پتھر میرے کسی ساتھی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس لیے اس سے ہٹ کر میں اوپر کی طرف بڑھا۔

جب کلس پچاس فٹ کی بلندی پر رہ گیا تو قدمچے ایک یا سوا فٹ کے رہ گئے تھے۔ آخری سیڑھیاں میں نے پیروں سے ہی طے کیں اور کلس کے پاس پہنچ گیا۔ یہ کوئی چار فٹ اونچا اور چار ہی فٹ لمبا چوڑا ٹکڑا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگایا تو سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ چھونے سے ہی یہ سونے کا لگ رہا تھا۔ اس کے آخری حصے پر کوئی شفاف چیز جڑی ہوئی تھی اور اس کا سائز انسانی مٹھی سے زیادہ تھا۔ اس تک رسائی ممکن نہیں تھی کیونکہ اگر میں سونے کے اہرام پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو امکان تھا کہ میں پھسل کر واپس آؤں گا۔ دور سے دیکھنے پر یہ بہت بڑے سائز کا ہیرا لگ رہا تھا۔ چار فٹ لمبے چوڑے اور اتنے ہی اونچے اس سونے کے اہرام کا وزن یقیناً ٹن سے اوپر تھا۔ اس وقت سونا شاید پچیس ہزار روپے تولہ تھا۔ اس لحاظ سے یہ سونا تقریباً ڈھائی ارب روپے کا تھا۔ ایسا ہی سونے کا ایک اہرام برف والے کے پُراسرار ٹھکانے پر بھی موجود تھا۔ اگر اس کے اوپر جڑا ہیرا اگر اصلی تھا تو اس کی مالیت ٹنوں سونے سے بھی زیادہ تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ معبد کی چوٹی پر سونے کے اہرام اور اس پر ہیرے کی موجودگی نے مجھے مبہوت کر دیا تھا اور میں کچھ دیر کے لیے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے ہوش آیا اور میں نے ارد گرد دیکھا کہ میں کہاں کھڑا تھا اور کس صورت حال سے دوچار تھا۔ چونکنے کی ایک وجہ چاند کی کم ہوتی روشنی بھی تھی۔ جس طرح چاند کی روشنی نمودار ہوئی تھی اسی طرح اب وہ سمٹ رہی تھی اور وادی کی ایک دیوار پر تیزی سے اوپر جا رہی تھی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں بدستور تاریکی تھی اور میرے ساتھی اہرام کی سیڑھیوں پر کہیں تھے۔ میں نے ذرا ایک طرف سرک کر آرگون کی طرف دیکھا۔ مگر اتنے فاصلے سے شہر کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ فی الحال وہاں جنگ و جدل کا سماں تھا اس لیے باقاعدگی سے روشنی کرنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ ورنہ عام حالات میں وہاں رات کے وقت اتنی روشنی ہوتی تھی جو خاصی دور سے بھی صاف نظر آتی۔

مجھے پجاریوں کا خیال آیا اگر وہ زندہ سلامت تھے تو انہیں اب تک آرگون پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر ایزارٹ نے اس دوران میں شہر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی تو وہ ہماری مدد کے لیے آدمی بھیج سکتا تھا۔ سامیرا کے قلعوں اور اس کے آس پاس کیا صورت حال تھی اس سے میں قطعی بے خبر تھا۔ میں صرف اُمید کر سکتا تھا کہ جنگ کی نوبت نہیں آئی ہو گی۔ ویسے اب تک قلعوں کا محاصرہ کرنے والی فوج کو علم ہو چکا ہو گا کہ قلعے پر ریناٹ کی حکومت باقی نہیں رہی ہے اور وہاں حریت پسندوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اس اطلاع نے لازمی بددلی پھیلائی ہو گی اور بہت امکان ہے کہ فوج کے کچھ آدمی فرار یا بغاوت پر آمادہ ہو کر سامیرا سے جا ملے ہوں۔ ریناٹ اگر زندہ تھا تب بھی وہ محل کے تہ خانے میں

محصور تھا۔ اس کی فوج قلعے سے باہر تھی۔ دیکھا جائے تو صورتِ حال ہمارے حق میں تھی۔ لیکن مکمل فتح حاصل کیے بغیر ہم سکون سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ریناٹ کی فوج کو چھیڑنے سے قبل لازمی تھا کہ ڈیوڈ شا اور اس کے ٹولے کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ ٹولہ فوج سے زیادہ خطرناک تھا۔

مجھے خیال آیا کہ معبد کے اگلے حصے میں دیکھوں۔ اگرچہ اس میں گن اور اس سے زیادہ نگرانی کرنے والے آلات کا خطرہ تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ گن کی مار محدود ہے۔ یعنی اسے اس طرح سیٹ کیا گیا تھا کہ جب کوئی بیس گز کی دوری تک آئے تو اس پر فائر کرے۔ مگر یہ زیادہ دور تک بھی مار کر سکتی تھی۔ ڈیوڈ شا نے اپنے ٹھکانے پر مجھے قید رکھنے کے لیے جب یہ گن لگوائی تھی تو اس کی حد اس سے زیادہ تھی۔ اصل خطرہ گن کے ساتھ نگرانی کرنے والے انتظام کا تھا۔ اس میں ویڈیو کے علاوہ مختلف سینسرز بھی لگے تھے۔ ان میں خاص طور سے انفرا ریڈ سینسر زیادہ خطرناک تھا۔ یہ گھپ اندھیرے میں بھی کسی گرم جسم کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کی رینج نامعلوم تھی۔ ممکن ہے میں چوٹی سے جھانکتا اور دیکھ لیا جاتا۔ کچھ سوچنے کے بعد میں چوٹی سے ایک اسٹیپ نیچے آیا اور کھسکتا ہوا معبد کے سامنے والی ڈھلان کے سرے تک پہنچا اور بہت احتیاط سے نیچے جھانکا۔ میں نے فوراً ہی سر پیچھے کر لیا تھا۔ اگر گن اوپر کی طرف فائر کر سکتی تھی تو دو سیکنڈ کے لیے سر نکالنا بھی بہت رسکی تھا۔

چند لمحے بعد میں نے پھر اسی طرح جھانکا اور تین چار بار یہ حرکت دہرانے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ کم سے کم گن اوپر فائر نہیں کر رہی تھی یا وہی رینج والی بات تھی۔ سینسرز کا خیال کرتے ہوئے میں نے نیچے دیکھا یہاں سے باغ کی مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن معبد کے سامنے والی مشعل کی روشنی یہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ گن داخلی دروازے کے شیڈ کے عین اوپر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بھی یہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے عمارت والی سمت معبد کی ڈھلان پر دیکھا تو وہاں موجود ایک فوجی افسر دکھائی دیا۔ وہ مستعد کھڑا تھا۔ حالانکہ اسے بیٹھنا اور چھپنا چاہیے تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کھڑا ہوا تھا کہ ابھی اس طرف کسی کے آنے کے آثار نظر نہیں آئے تھے اور اگر کوئی آتا تو خاصی بلندی پر موجود فوجی افسر کو اتنی آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اسے محتاط اور غیر نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ جیسا

کہ اس کا دوسرا ساتھی تھا وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی طرح اہرام کے مغربی سمت تعینات دو فوجی افسر نظر نہیں آ رہے تھے۔

ریبک اور باقی سب ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر تھے اور یہاں سے نیچے موجود کسی شخص کا نشانہ لینا آسان تھا۔ مگر ہمارے لیے اپنا دفاع کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے ریبک اور مارٹ کو ایک اسٹیپ نیچے بھیج دیا۔ خود میں اور ایریٹ اسی اسٹیپ پر رہے۔ جب کہ ایمار کو ایک اسٹیپ اوپر بھیج دیا۔ ریبک سے فوجی افسروں کو پیغام بھجوایا کہ وہ نمایاں نہ ہوں۔ ہم خود بھی اس طرح بیٹھے تھے کہ نمایاں نہیں ہو رہے تھے۔ اب ہمارے پاس انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ رات بڑھنے کے ساتھ ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے سکڑ سمٹ کر بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ مگر اس حالت میں بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس لیے پہلو بدلتے اور کبھی اٹھ کر چہل قدمی کرتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی ہم دائیں بائیں موجود فوجی افسران پر نظر رکھے ہوئے تھے کیونکہ کسی کی آمد کی صورت میں وہی پہلے آگاہ ہوتے اور ہمیں اشارہ کرتے۔ ایریٹ میرے ساتھ تھا اور جب سے روبیرٹی ہوئی وہ مجھ سے بہت کم بات کر رہا تھا۔ اس نے خاصی دیر بعد زبان کھولی۔ ”اگر آج رات طیارے نہ آئے تو......؟“

”تب ہم صبح ہونے سے پہلے واپس جائیں گے اور سب سے اہم کام رسی کھولنا ہوگا۔“

”یہ کام میں اور مارٹ کریں گے۔“ نیچے سے ریبک نے کہا۔ ”مگر جناب آج سردی کچھ زیادہ نہیں ہے۔“

”ہاں ایسا لگ رہا ہے جیسے اوپر برفانی طوفان آیا ہوا اس کا اثر یہاں نیچے بھی آ رہا ہے۔“ میں نے تائید کی۔ اوپر ستارے بدستور غائب تھے اور اس سے لگ رہا تھا کہ وہاں بادل ہیں اور اس موسم میں ہمالیہ میں بادل صرف اپنی جھلک دکھانے نہیں آتے ہیں بلکہ یہ برستے ہیں اور طوفان لاتے ہیں۔ بارش کے ساتھ ساتھ برف باری... بھی ہوتی ہے۔ اس بلندی پر برف باری ہی ہو رہی ہوگی۔ لیکن یہاں نیچے برف کے آثار نہیں تھے اور نہ ہی بارش ہو رہی تھی۔ لیکن کچھ وقت گزرا تو میں نے محسوس کیا کہ اوس بڑھ رہی ہے اور جسم کے کھلے حصوں پر یہ واضح لگ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہمارے لباس بھیگنے لگے اور معبد کی سیڑھیاں نم ہونے لگیں۔ یہ بارش نہیں تھی۔ شاید اوپر جاری طوفان کی جو برف وادی میں آ رہی تھی وہ ایک خاص بلندی پر آنے کے بعد اوس میں بدل رہی تھی اسی وجہ سے اوس گرنے کی رفتار

میں تیزی آئی تھی۔

اسے آپ ہلکی بوندا باندی سمجھ لیں مگر اس میں قطرے بہت چھوٹے تھے۔ سردی کے ساتھ یہ دوسری آفت تھی اس نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ مگر ہمیں برداشت کرنا ہی تھا۔ ہم اسٹیپس کی دیوار سے لگ کر اوس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہرحال اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ہمارے ذہن چوکنا ہو گئے اور بیٹھے رہنے سے ذہن پر جو ایک کہالت سی آ رہی تھی وہ غائب ہو گئی۔ وقفے وقفے سے ہم میں سے کوئی ایک اٹھ کر اسٹیپ پر ہی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کا چکر لگاتا تھا۔ اس سے جسم ذرا گرم ہو جاتا تھا اور کناروں پر نگرانی کرنے والے بھی مستعد ہو جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ فوجی افسران سپاہی تو اچھے تھے مگر یہ مستعد نہیں تھے۔ برسوں سے انہیں آرام سے رہنے کی عادت پڑی ہوئی تھی جس نے ان کی مستعدی اور چستی چھین لی تھی۔ اسی وجہ سے ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی با آسانی معبد کے ہوکے قریب سپاہیوں پر آسانی سے غالب آ گئی۔ جدید اسلحہ بھی وجہ تھی لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کی سستی بھی ایک اہم وجہ تھی ورنہ یہ مزاحمت کرتے تو ڈیوڈ شا کو ٹف ٹائم دے سکتے تھے۔ جنگ میں انسان لڑتا ہے ہتھیار نہیں۔

وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ میں اور میرے ساتھی صبر سے آشنا تھے اس کے باوجود اس حالت میں انتظار آسان نہیں تھا۔ کپڑے زیادہ نم ہوئے تو سب ہی نے اٹھ کر چہل قدمی شروع کر دی کہ جسم گرم ہو۔ ایک بار میں ٹہلتا ہوا مغرب کی طرف جا رہا تھا کہ اس طرف موجود فوجی افسر نے سفید کپڑا لہرانا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میں نے سب کو ہوشیار رہنے کو کہا اور جھک کر اس سمت میں بڑھا۔ فوجی افسر بدستور کپڑا لہرا رہا تھا۔ میں نے نزدیک جاتے ہی اس سے کپڑا چھین لیا اور نیچے جھکنے کا اشارہ کیا۔ میں خود بھی جھک گیا تھا اور پھر کنارے سے جھانک کر دیکھا تو نیچے معبد کے ساتھ ساتھ چند مشعل بردار آتے دکھائی دیئے۔ میں نے غور کیا تو مشعلوں کی تعداد چار تھی مگر لوگ زیادہ تھے۔ میری نظریں ڈیوڈ شا کو تلاش کر رہی تھیں۔

مگر جلد مجھے احساس ہو گیا کہ وہ ان میں نہیں تھا۔ نزدیک آنے پر اضافی لوگ کرنل اور زیبی ثابت ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ چار عدد لڑکیاں جو یقیناً خادمائیں تھیں، مشعل تھامے چل رہی تھیں۔ پجاری بھی نہیں تھے۔ معبد کے نزدیک آتے آتے وہ نمایاں ہو گئے تھے۔ کرنل اور زیبی مسلح تھے مگر ان کی رائفلیں ان کے شانوں سے لگی ہوئی تھیں۔ کرنل جونز نے ہاتھ میں موجود تیز روشنی والی برقی لالٹین آن کر لی اور ان کے آس پاس تیز روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ اب گھوم کر معبد کے عقبی حصے میں آ گئے تھے اور میدان کے وسط کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میرے ساتھی جہاں تھے وہیں دبک گئے تھے میں نے فوجی افسروں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود جھک کر کرنل اینڈ پارٹی کے ہمراہ آگے بڑھنے لگا۔ کرنل کے ایک ہاتھ میں برقی لالٹین تھی اور دوسرے میں اس نے ایک خاصا بڑا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ لیکن یہ بیگ نہیں چوکور سا بکس تھا جس پر ہینڈل لگا ہوا تھا۔ یہ دھات کا بنا ہوا تھا کم سے کم فنشنگ سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

کرنل نے میدان کے درمیان میں آنے کے بعد وہ بکس زمین پر رکھا اور لالٹین نزدیک رکھ کر اسے کھولنے لگا۔ کھلنے پر یہ مشین جیسی نکلی تھی۔ کرنل نے اس کے ساتھ چھیڑ کی تو اس پر ایل ای ڈی لائٹس جل اٹھی تھیں۔ اس نے ایک طویل انٹینا نما چیز کھینچی اور پھر تار سے منسلک مائک اٹھا کر اس پر بولنے لگا۔ اس کی آواز بہت ہلکی تھی اس لیے الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن یہ تو واضح تھا کہ مشین اصل میں طاقتور ریڈیو تھا اور کرنل اس پر کسی سے رابطہ کر رہا تھا۔ میں نچلے اسٹیپ پر ایرٹ کے پاس آ گیا تھا اور ہم دونوں کنارے سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ ایرٹ نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے وادی سے باہر کسی سے رابطہ کر رہا ہے۔ یہ جو ڈبا ہے اس کی مدد سے دور دور موجود شخص سے بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے اگر اس کے پاس بھی ایسی ہی مشین ہو۔“

ایرٹ کے لیے یہ تعجب انگیز بات تھی کہ اس چیز کی مدد سے دور بیٹھے آدمی سے بات کی جا سکتی تھی۔ کرنل یقیناً اوپر آنے والے طیاروں یا طیارے سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوری کی وجہ سے یہ بھی واضح نہیں تھا کہ اس کا رابطہ ہو گیا ہے یا نہیں۔ لیکن تقریباً دس منٹ بعد کرنل کھڑا ہو گیا۔ البتہ اس نے ریڈیو بند نہیں کیا تھا یہ کھلا ہوا اور آن تھا کیونکہ اس کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ کرنل اب آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور شاید آنے والے طیارے یا طیاروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ ہم بھی اوپر کی طرف تھے اس لیے اس کی نظر ہماری طرف آ سکتی تھی اس لیے ہم مزید محتاط ہو گئے۔ بالآخر وہ وقت آ گیا تھا جس کا انتظار تھا لیکن ڈیوڈ شا کا یہاں نہ آنا مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ یہ اہم ترین موقع

تھا اور اس کی موجودگی یہاں ضروری تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو میں اپنے نقطۂ نظر سے سوچ رہا تھا ڈیوڈ شا کے خیال میں حالات معمول کے مطابق تھے اور اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ آنے والوں کے استقبال کے لیے بہ نفس نفیس خود موجود ہو۔ یہ کام اس نے کرنل اور زینی پر چھوڑ دیا تھا۔

اب میں اور میرے ساتھی بھی اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایرٹ کی مدد سے سب کو پیغام بھیج دیا کہ کرنل جونز ہی اصل نشانہ تھا اور اس کے بعد زینی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ مشعل بردار لڑکیوں سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہنگامہ ہونے پر وہ لازمی معبد کے اندر جانے کی کوشش کرتیں اور اندر والوں کو۔ خبردار کرتیں۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ایک بار معرکہ شروع ہوتا تو اندر والوں کو خود ہی پتا چل جاتا۔ کرنل کو بات کیے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ مجھے اوپر سرخ روشنیاں سی محسوس ہوئیں۔ یہ جل بجھ رہی تھیں جیسا کہ طیاروں میں وارننگ لائٹس ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد دو یا تین تھی۔ یہ وقفے وقفے سے جل بجھ رہی تھیں اس لیے درست تعداد کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ روشنیاں واضح ہو رہی تھیں اور پھر اچانک ہی طیاروں کی تیز سرچ لائٹس آن ہو گئیں اور وادی کی فضا میں روشنی کی تین لکیریں چکرانے لگی تھیں۔ میرے لیے یہ نئی چیز نہیں تھی لیکن میرے ساتھیوں کے لیے ضرور تھی۔ وہ دم بخود تھے اور ایرٹ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس نے پوچھا۔ "یہی طیارے ہیں؟"

"ہاں یہی طیارے ہیں۔"

"یہ تو جادو ہے۔"

"جادو نہیں یہ اڑنے والی مشینیں ہیں۔"

طیارے نیم دائرے میں چکر لگاتے ہوئے نیچے آرہے تھے۔ اپنی سرچ لائٹوں کی مدد سے وہ وادی کی دیواروں اور ایک دوسرے سے ہوشیار تھے۔ چند منٹ میں وہ اتنا نیچے آچکے تھے کہ جب ایک طیارے پر دوسرے کی سرچ لائٹ پڑتی تو اس کی ساخت واضح ہو جاتی تھی۔ یہ دو انجن والے چھوٹے طیارے تھے جن میں سات آٹھ آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ابھی ان کی آواز نمایاں نہیں تھیں مگر مکھی بھنبھنانے جیسی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھے یعنی جہاں ہم تھے وہاں سے کوئی تین ہزار فٹ کی اونچائی تھی۔ اسی لمحے نیچے تیز روشنی ہوئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو کرنل نے رن وے لائٹس آن کر دی تھیں۔ طیاروں کے پائلٹ نے بھی یہ لائٹس دیکھ لی تھیں اور وہ اب گھومتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ ہزار فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد وہ رن وے کی سیدھ میں آنے کے لیے سیٹ ہونے لگے۔ اب ان کے انجنوں کی آواز بھی نمایاں ہو گئی تھی۔

میں نے رسی لگانے کے سمت چنی تھی وہ رن وے لائٹس کو مدنظر رکھتے ہوئے چنی تھی۔ کرنل نے لائٹس اس طرح لگائی تھیں کہ وہ اس سمت میں دیوار سے کسی قدر فاصلے پر تھیں اور مخالف سمت میں یہ دیوار کے خاصے پاس تک تھیں۔ گویا طیارے اسی سمت سے اتر سکتے تھے۔ اگرچہ یہاں وادی کی دیوار قریب تھی لیکن پھر بھی یہ ایک میل کے فاصلے پر تھی اور اتنی دوری محفوظ لینڈنگ میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس طرف سے لینڈ اس وجہ سے بھی چنی گئی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ اس طرف پودے اور کچھ چھوٹے درخت تھے جب کہ دوسری طرف دیوار تک ہموار میدان تھا اور وہاں طیاروں کو اترنے میں آسانی ہوتی۔ پھر سائیڈ پر اتنی جگہ تھی کہ ایک طیارہ اتر کر اس طرف گھوم جاتا تو دوسری کے لیے رن وے فوری خالی ہو جاتا۔ میں نے دیکھا کہ پہلا طیارہ جو سب سے نیچے تھا وہ گھوم کر اس سیدھ میں آرہا تھا۔ اس دوران کرنل خاموش کھڑا تھا۔ وہ شاید پہلے ہی پائلٹس کو بتا چکا تھا کہ انہیں کس سمت سے اترنا ہے۔

اب طیاروں کی آواز وادی میں گونج رہی تھی اور میں نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار رہنے کو کہا۔ ہم نے تیر کمان سنبھال لیے تھے۔ مگر فی الحال اسٹیپ کی دیوار کے ساتھ دبکے ہوئے تھے۔ مجھے پہلے خیال نہیں آیا مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر طیاروں کی روشنی میں پائلٹس نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ کرنل کو خبردار کر سکتے تھے۔ ایسا ممکن تھا کیونکہ اس عجوبہ وادی میں آنے کے بعد ان کا واسطہ سب سے پہلے جس عجوبے سے ...... پڑتا وہ بھی اہرام نما معبد تھا۔ اگر وہ اس کی طرف توجہ دیتے تو ہم بھی نظر آسکتے تھے۔ مگر اب خیال آنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں صرف امید کر سکتا تھا کہ پائلٹس کی توجہ لینڈنگ کی طرف ہو گی۔ کم سے کم اس کی جو سب سے نیچے تھا۔ کرنل ساکت کھڑا ہوا لینڈنگ کے لیے آنے والے اولین طیارے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ لینڈنگ زون کی سیدھ میں آگیا تھا۔

باقی دو طیارے عین ہمارے اوپر تھے۔ پھر ان میں سے ایک الگ ہو کر لینڈنگ کی پوزیشن لینے لگا تھا۔ اسی لمحے کرنل کے ساتھ رکھے ریڈیو پر لائٹس تیزی سے آن آف

ہونے لگیں۔ کرنل چونکا اور نیچے جھکا تھا کہ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کسی پائلٹ نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور اب وہ کرنل کو خبردار کر رہا ہے۔ اس وقت تک پہلا طیارہ لینڈنگ زون کے پاس پہنچ گیا تھا۔ کرنل...... ریڈیو پر بات کر رہا تھا اور طیارے کے انجن کے شور میں اسے ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر پھر اس نے سن لیا اور اہرام کے اوپر دیکھا۔ میں نے چلا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ہوشیار وہ ہمارے بارے میں جان گئے ہیں۔''

کرنل کھڑا ہوا اور اس نے رائفل ہاتھ میں لے لی تھی۔ میں نے پھر چلا کر خبردار کیا۔ ''کوئی نمایاں نہ ہو۔''

چلانا یوں پڑ رہا تھا کہ طیارے کے انجن کا شور اب سماعت میں گھس رہا تھا۔ میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ کرنل کے ساتھ زیبی بھی ہوشیار ہو گئی تھی اور اس نے رائفل سنبھال لی تھی۔ میرا دل ایک لمحے کو ڈوبا تھا۔ ہمارے سرپرائز اٹیک کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ کرنل اور زیبی ہماری موجودگی سے واقف ہو گئے تھے۔ مگر دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میری نظر اب طیارے پر مرکوز تھی جو تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں فصیل کراس کی اور اگلے ہی لمحے ہوا میں قلابازی کھائی تھی۔ اس کے اگلے دونوں ٹائر زرسی سے الجھے تھے اور جب وہ زمین سے ٹکرایا تو تقریباً الٹا ہو چکا تھا۔ طیارے کی رفتار کم سے کم بھی سو میل فی گھنٹا تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور طیارہ زمین سے ٹکرا کر اچھلا اور جب دوسری بار گرا تو اس میں آگ لگ چکی تھی۔ تیسری بار اس نے قلابازی کھائی اور اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ٹکڑے رن وے اور احاطے میں جا بجا پھیل رہے تھے۔ ہر ٹکڑے میں آگ لگی ہوئی تھی اور طیارے کی مرکزی باڈی سے شعلے ابل رہے تھے۔ پھر اس کے بھی ٹکڑے ہونے لگے۔ یہ ایک شاندار منظر تھا۔ اب یہاں فوری طور پر دوسرے طیارے کی لینڈنگ کا امکان باقی نہیں رہا تھا جب تک رن وے کو ملبے سے صاف نہ کر دیا جاتا۔ ملبا جل رہا تھا اور اس کے پاس جانے اور اسے رن وے سے ہٹانے کا فوری طور پر کوئی امکان نہیں تھا۔

پھر میں نے طیارے کی تباہی کا سب سے بہترین منظر دیکھا۔ طیارے کا ایک ٹکڑا جلتا اور اڑتا ہوا ان لوگوں کی طرف آیا۔ کرنل رائفل اوپر کیے کسی نشانے کا منتظر تھا اور یہ ٹکڑا آ کر اس کے جسم سے ٹکرایا۔ ایک دھماکے کے ساتھ کرنل گرا تھا۔ مشتعل بردار خادمائیں پہلے ہی طیارے کی تباہی کے ... بھاگ رہی تھیں۔ زیبی نے برقی لائٹیں

بند کر دی تھیں اور اب وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ پھر رن وے لائٹس بھی بند ہو گئیں۔ وہاں صرف طیارے کے جلتے ملبے کی روشنی تھی۔ اس میں موجود کسی فرد کا بچنا محال لگ رہا تھا۔ میں نے ایک بار اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا کہ کوئی نمایاں نہ ہو اگرچہ کرنل مارا گیا تھا یا شدید زخمی تھا لیکن زیبی غائب تھی۔ وہ کہیں چھپ کر وار کر سکتی تھی۔ زیبی کے بعد دوسرا بڑا خطرہ اوپر موجود دو طیارے تھے۔ ان میں مشین گنوں کی موجودگی عین ممکن تھا اور پھر فوراً ہی یہ خطرہ سامنے بھی آ گیا۔ جیسے ہی خادمائیں دوسری طرف گئیں ایک طیارے نے غوطہ لگایا اور ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے چلا کر کہا۔

''ہوشیار کسی جگہ چھپ جاؤ۔ یہ حملہ کرنے آ رہا ہے۔''

''ہم کہاں جائیں؟'' ایرش نے پوچھا۔

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ''اہرام کے کونوں کی طرف جاؤ تاکہ ایک طرف سے حملہ ہو تو تمہارے پاس دوسری آڑ ہونی چاہیے۔ آدھے آدھے دونوں سمتوں میں ہو جائیں۔ سب ایک دوسرے سے دور رہو۔ یہ ایک وقت میں ایک ہی ہدف پر حملہ کر سکتا ہے۔ پاس رہو گے تو خطرہ بڑھ جائے گا۔''

ربیک اوپر آ گیا تھا۔ ''اور آپ؟''

میں نے اہرام کی چوٹی کی طرف دیکھا۔ ''مجھے دوسری طرف جانا ہے۔''

''لیکن......'' ربیک نے کہنا چاہا مگر میں نے غرا کر کہا۔

''جو کہا ہے ویسا ہی کرو۔ یہ زیادہ دیر حملے نہیں کر سکتے ہیں مگر ان کے حملے بہت خوفناک ہوں گے۔ اگر بچنے کے لیے عمارت میں جانا پڑے تو وہاں چلے جانا۔''

یہ کہتے ہی میں بھاگا اور اسی لمحے غوطہ مارنے والے طیارے نے اپنی مشین گن کا دہانہ کھول دیا۔ گولیاں برس رہی تھیں لیکن نشانے سے دور تھیں۔ میرے ساتھی جہاں تھے وہیں دبک گئے۔ صرف میں حرکت میں تھا۔ میں گھوم کر معبد کی عمارت والے پہلو میں آیا۔ یہاں موجود فوجی افسر نیچے اتر رہا تھا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی نیت فرار کی ہے۔ میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر معبد کے سامنے والی سمت جانے لگا۔ اس وقت میرے پیروں کو پر لگے ہوئے تھے۔ دوسرا طیارہ بھی اس حملے میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے میرا رخ کیا تھا جب کہ پہلا طیارہ گولیاں برساتا آگے نکل

گیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کی عافیت کے لیے صرف دعا ہی کر سکتا تھا۔ پہلا گزرا تو دوسرے طیارے نے مشین گن سے گولیاں برسانا شروع کیں۔ پہلے اس کا نشانہ معبد کا نچلا حصہ تھا اور میں نے فرار ہونے والے فوجی افسر کو چھلنی ہو کر گرتے دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر اس آفاقی حقیقت کو جانا کہ موت سے بچ کر آدمی کہیں نہیں جا سکتا ہے۔

اس کے بعد طیارے کا رخ میری طرف ہو گیا تھا۔ سیڑھیوں پر برستی گولیاں بتدریج میرے پاس آتی جا رہی تھیں۔ طیارہ بھی نزدیک آ گیا تھا۔ جب گولیاں مجھ سے چند فیٹ کے فاصلے پر تھیں تو میں نے آگے کی سمت چھلانگ لگائی تھی اور اسی لمحے طیارہ اوپر سے گزر گیا۔ میں پھسلتا ہوا آگے گیا تھا اور اس جست نے مجھے گولیوں سے بچا لیا۔ جب طیارہ گزر گیا تو میں اٹھ کر بھاگا اور معبد کے سامنے آ نکلا تھا۔ اب میں دیوار سے لگ کر اور جھک کر آگے بڑھنے لگا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ مشعل بردار خادمائیں کہیں دبک گئی تھیں اور زرینہ بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اگر وہ میری طرح معبد کی دیوار سے لگ کر چل رہی تھی تو مجھے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ جھک کر ہر ممکن تیزی سے میں معبد کے داخلی دروازے کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ اس وقت تک مجھ پر حملہ کرنے والا طیارہ دوبارہ پلٹ آیا تھا اور معبد کے عقبی حصے سے بھی فائرنگ کا شور جاری تھا۔ وہاں میرے ساتھیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ایک طیارے کی تباہی نے انہیں دیوانہ بنا دیا تھا۔

میں نے نیچے دیکھا اور کود کر اسٹیپس سے نیچے اترنے لگا۔ میں آرام سے اترنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ طیارہ آرگون کی طرف سے پلٹ کر آ رہا تھا۔ اوس کی وجہ سے اسٹیپ پھسلواں ہو رہے تھے اور کودنے کے دوران اپنے توازن کا خیال بھی رکھنا تھا ورنہ لڑھک جاتا تو پھر نیچے پہنچ کر ہی مجھے بریک لگتے۔ اسی وجہ سے میری رفتار ذرا سست ہوئی تھی۔ طیارے نے کوئی چھ سو فٹ کی بلندی سے مجھ پر گولیاں برسانا شروع کیں اور رفتہ رفتہ گولیوں کی لائن نزدیک آنے لگی۔ یہ بھاری مشین گن تھی جس کی تین انچ لمبی گولی ایک فٹ موٹے ٹھوس کنکریٹ سے گزرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس وقت میں.... معبد کے داخلی دروازے کے اوپری شیڈ سے کچھ ہی نیچے تھا۔ مجھے لگا کہ میں اس رفتار سے شیڈ تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ اس لیے آخری دو اسٹیپ میں نے چھلانگیں لگاتے ہوئے طے کیے اور شیڈ کے اوپر گرا۔ پیروں کے بل گرتے ہوئے میں نے

دونوں ہاتھ ٹیکے اور قلابازی کھاتے ہوئے شیڈ کی کسی قدر اٹھی چھت پر گرا تھا۔

آخری گولیاں معبد کے سامنے روش پر لگیں اور اس کے بعد طیارہ اوپر اٹھا تو مشین گن کا رخ بھی بدل گیا اور پائلٹ نے گولیاں برسانا بھی بند کر دی تھیں۔ ایک بار پھر میں عین آخری موقع پر بچا تھا۔ میں چھت پر نصب خودکار گن کے بالکل سامنے گرا تھا جو ٹرائی پوڈ پر اپنے تمام لوازمات کے ساتھ سیٹ تھی۔ فی الحال یہ آف تھی ورنہ میں بالکل سامنے تھا اور مجھے شوٹ کرنا ایک سیکنڈ کی بات تھی۔ ظاہر ہے معبد سے باہر آنے سے پہلے اسے آف کر دیا گیا تھا۔ میں اٹھ رہا تھا کہ گن کے اوپر لگی ہوئی ایک ایل ای ڈی روشن ہوئی اور میں نے جیسے خودکار انداز میں قلابازی لگائی اور اس کے پیچھے گرا تھا۔ ہونے والا فائر نہ جانے کہاں گیا تھا۔ فائر بے آواز تھا صرف ہلکی سی ٹھس کی آواز آئی تھی۔ گن میری طرف گھوم رہی تھی لیکن یہ ایک حد تک ہی پیچھے گھوم سکتی تھی۔ پیچھے میں محفوظ تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے اس کا معائنہ کیا۔ لیکن نزدیک نہیں گیا تھا اور رہی سید ھا کھڑا ہوا تھا۔

ٹرائی پوڈ کے ساتھ اسے کنٹرول کرنے والا باکس لگا ہوا تھا جس میں کیمرے اور سینسرز تھے۔ اس کا بھی امکان تھا کہ دیگر کیمروں کی مدد سے اسے کنٹرول کیا جاتا ہو۔ میں باکس کو ٹٹولنے لگا۔ یہ مکمل طور پر بند تھا اور بہ ظاہر مجھے ایسا کوئی بٹن نہیں ملا جو اسے آف کر دیتا۔ اب میں نے گن چیک کی۔ یہ اس باکس میں نصب تھی۔ لیکن اسے الگ کیا جا سکتا تھا اور میں نے اسے الگ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور نیچے جلنے والی مشعلوں کی روشنی یہاں آ رہی تھی۔ مجھے اپنا بچاؤ بھی کرنا تھا۔ اس لیے میں ایک حد سے زیادہ آگے بھی نہیں آ سکتا تھا۔ طیارے کی آمد سے پہلے مجھے گن کو الگ کر لینا تھا۔ طیارہ گھوم کر پھر حملہ کرنے کے لیے آرگون کی طرف چلا گیا تھا۔ گن کسی لاک کی مدد سے اس بکس میں پھنسی ہوئی تھی اور میں وہ لاک تلاش کر رہا تھا۔ مگر اندھیرے میں وہ لاک نہیں مل رہا تھا۔

اچانک ہی گن سے فائر ہوا اور میں اچھل پڑا تھا۔ یقیناً ڈیوڈ شانے محسوس کر لیا تھا کہ گن کے ساتھ چھیڑ ہو رہی تھی۔ یہ سنگل فائر تھا اور گولی کہیں سامنے گئی تھی۔ بکس میں لگی مشین گن خاصی بھاری تھی اور اس کی مار اچھی خاصی تھی۔ پھر فائر ہوا تو میں نے اپنی کوشش تیز کر دی۔ میرا ہاتھ گن کے ساتھ ایک ابھار پر گیا۔ پہلے میں اسے بکس کا فکس حصہ سمجھا تھا لیکن جب دوبارہ ہاتھ اس پر آیا تو میں نے اسے

دبایا اور زور سے دبانے پر یہ اندر گیا اس کے ساتھ ہی گن بکس سے الگ ہوگئی۔ صرف گن نہیں بلکہ اس کے نیچے کوئی آٹھ انچ لمبا، چار انچ چوڑا اور تین انچ موٹا ایمونیشن بکس بھی الگ ہوگیا۔ اس سمیت گن کا وزن کوئی دس کلوگرام ہوگا اور اسے اٹھانا ہی خاصا مشقت آمیز کام تھا۔ میں نے چیک کیا تو گن بکس کے کھانچے میں اس طرح پھنسی تھی کہ اس کا ٹریگر اندر ایک لیور کی گرفت میں آجاتا تھا اور وہ لیور حرکت کرتا تھا تو فائر ہوتا۔

دوسرا لیور گن کے سائیڈ پر لگے مینول کو تبدیل کرکے اسے خودکار اور سنگل شاٹ پر کرتا تھا۔ یہ تمام تفصیلات میں ابھی بتا رہا ہوں ورنہ اس وقت مجھے گن چیک کرنے کا ہوش نہیں تھا۔ ٹرائی پوڈ بکس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اگر یہ گن کے ساتھ ہوتا تو مجھے اضافی وزن اٹھانا پڑتا۔ اب میں زیادہ آسانی سے گن استعمال کرسکتا تھا۔ طیارہ پلٹ کر آرہا تھا اور اس نے حملے والی پوزیشن لے لی تھی۔ کوئی چھ سوگز کی دوری سے اس کی مشین گن گولیاں اگلنے لگیں میں اس کے نزدیک آنے کا انتظار کررہا تھا۔ گولیاں مجھ سے بہت دور باغ کو ادھیڑ رہی تھیں۔ مگر ان کا رخ میری طرف ہی تھا۔ جب طیارہ چار سوگز دور رہ گیا تو میں نے اس کے ایک انجن کا نشانہ لے کر گولیاں چلانا شروع کیں۔ گن کا دھکا خاصا زیادہ تھا اور ہر فائر پر میں ہل جاتا تھا۔ اگر میں نے پشت دیوار سے نہ لگائی ہوتی تو میں پیچھے جاگرتا۔ اگر نہ بھی گرتا تو نشانہ غلط ہوجاتا۔ مگر دیوار نے مجھے سپورٹ کیا تھا۔

طیارہ نزدیک آرہا تھا اور اس سے برستی گولیاں بھی نزدیک آرہی تھیں۔ جب وہ دو سوگز دور رہ گیا تو میں نے گن کو خودکار موڈ پر کیا اور اس بار کسی تکلف کے بغیر گولیوں کی جوابی بارش شروع کردی۔ طیارے کے پائلٹ کو شاید اس کی توقع نہیں تھی کہ اسے زمین سے برابر کا جواب ملے گا۔ یہ گن اس کے طیارے میں لگی مشین گن سے کسی طرح کم خطرناک نہیں تھی۔ اس کی مار بھی خاصی تھی۔ توقع نہ ہونے کی وجہ سے پائلٹ بے فکری سے بہت کم بلندی پر چلا آرہا تھا۔ طیارہ سو گز دور تھا اور گولیاں شیڈ تک آکر اسے ادھیڑ رہی تھیں کہ اچانک طیارے کے دائیں انجن میں دھماکا ہوا۔ شعلے نکلے اور پھر انجن دھماکے سے پھٹ گیا۔ طیارہ ایک طرف جھکا اور اس کے ساتھ ہی اس کی مشین گن سے گولیاں نکلنا بند ہوگئیں۔ ظاہر ہے اب پائلٹ کو اپنی بقا کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔

کیونکہ طیارے کا صرف بایاں انجن کام کررہا تھا اس لیے وہ میرے دائیں طرف گیا تھا۔ پائلٹ نے اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ نہ صرف دایاں انجن بلکہ پر کا بڑا حصہ بھی ٹوٹ گیا تھا اور طیارے کی ایروڈائنامک بگڑ چکی تھی۔ عام طور سے دو انجنوں والے طیارے ایک انجن بند ہونے پر دوسرے انجن کی مدد سے بھی پرواز جاری رکھ سکتے ہیں لیکن ایک بار ایروڈائنامک بگڑ جائے تو طیارہ درست انجنوں کے ساتھ بھی پرواز نہیں کرسکتا ہے۔ طیارہ معبد کے مغربی کنارے سے ٹکرایا۔ تصادم کے دھماکے کے ساتھ ہی اس کے ٹکڑے ہوا میں بلند ہوئے تھے۔ یہ ہر طرف برس رہے تھے اور یہ سب مشکل سے پانچ سیکنڈ میں ہوگیا۔

ان ٹکڑوں سے بچنے کے لیے میں دیوار کی جڑ میں گھس گیا اور گول مول ہوکر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے جو چند ایک ٹکڑے اس طرف آئے دیوار نے ان سے محفوظ رکھا تھا۔ جب ٹکڑوں کی بارش ختم ہوگئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا، تصادم نے اہرام کا ایک حصہ تباہ کردیا تھا اور طیارے کا جلتا ہوا ملبا اس کی سیڑھیوں سے ہوتا ہوا نیچے تک پہنچا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور رب کا شکریہ ادا کیا جس نے ایک بار پھر اپنے بندے کو یقینی نظر آنے والی موت سے بچایا تھا۔ تیسرے طیارے کی آواز آئی تو میں چونکا۔ وہ معبد کے اوپر سے ہوتا ہوا آرگون کی طرف جارہا تھا۔ دوسرے طیارے کے حشر نے آخری طیارے کے پائلٹ کا حوصلہ پست کردیا اور اس نے پسپا ہونے میں عافیت سمجھی تھی۔ پتا نہیں وہ آرگون کی طرف گیا تھا یا وادی سے واپس جارہا تھا۔ کیونکہ اس کی سرچ لائٹ بند ہوگئی تھی اس لیے وہ کچھ ہی دیر بعد نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اسے پسپا ہوتے دیکھ کر مجھے اب اپنے ساتھیوں کی فکر ہونی چاہیے تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں سے کتنے طیارے کی مشین گن کا شکار ہوئے تھے۔ اگر ان میں سے کچھ بچے تھے تو وہ یقیناً اپنے زخمی ہونے والے ساتھیوں کی دیکھ بھال کررہے ہوں اور جو مرچکے ہوں گے وہ ہر چیز سے بے نیاز ہوگئے ہوں۔ اس لیے ان کی مدد کے لیے جانے سے زیادہ ضروری ڈیوڈ شا کی طرف جانا تھا۔ اس لیے اپنے ساتھیوں کی زندگی و موت اوپر والے پر چھوڑ کر میں نے وہ کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں گن سمیت مزید دو اسٹیپ نیچے کودا۔ بھاگ دوڑ اور گرنے پڑنے سے جسم پر خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر یہ چوٹیں ایسی نہیں تھیں جو مجھے حرکت کرنے سے روک سکتیں۔ آخری اسٹیپ سے روش پر کودتے

ہی میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ عین ممکن تھا کہ زینی اور وہ بچ جانے کی صورت میں کرنل بھی اسی طرف موجود ہوتے۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

کچھ دیر پہلے تک ماحول طیاروں کے انجنوں اور مشین گن کی گھن گرج سے گونج رہا تھا۔ مگر اب وہاں خاموشی تھی۔ میں سرکتا ہوا داخلی دروازے کے سلوپ تک آیا۔ ایک لمحے کو سر نکال کر دیکھا اور فوراً ہی سر واپس کر لیا۔ ایک لمحے کی جھلک میں اندر مشعلوں کی روشنی دکھائی دی اور اس روشنی میں نہ تو کوئی انسان نظر آیا اور نہ ہی کوئی ہتھیار جیسی چیز جیسے کہ یہ خودکار گن تھی۔ ورنہ خطرہ تھا کہ اندر بھی اس قسم کا کوئی ہتھیار نہ ہو۔ اللہ کا نام لے کر میں گھوما اور سلوپ پر آگیا۔ لیکن سیدھا جانے کے بجائے میں نے ترچھا ہو کر دیوار سے لگتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی۔ میری تمام حسیات بہت چوکنا تھیں۔ خاص طور سے میں سماعت پر زور دے رہا تھا کیونکہ آنکھ صرف رکاوٹ تک دکھاتی ہے۔ جب کہ کان رکاوٹ کے پیچھے کی آہٹ بھی سناتا ہے۔ گن کو میں نے دوبارہ سنگل موڈ پر کر لیا تھا۔ میں ایک لمحے کے دسویں حصے میں گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔

سلوپ کے اوپری حصے میں دائیں بائیں دو عدد مشعلیں روشن تھیں اور ان کی تیز روشنی میں سب واضح نظر آ رہا تھا۔ اندر آنے سے پہلے میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ تیسرا طیارہ اب یہاں واپس نہیں آئے گا۔ آرگون کی طرف جانے کے بعد وہ پلٹا نہیں تھا اور اب اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس طرف طیارے کے اترنے کی۔ بہت سی جگہیں تھیں۔ آرگون کے اندر اور باہر ہموار میدان تھے۔ مگر کسی بھی جگہ اسے خوش آمدید نہیں کہا جاتا۔ آرگون میں ایزارٹ اور اس کے ساتھی مزاحمت کرتے اور اس سے باہر ریناٹ کی فوج مزاحمت کرتی۔ لیکن دونوں ہی طرف آتے والے مسلح افراد کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ طیارے میں اگر آٹھ افراد تھے اور وہ اسلحہ بھی لائے تھے تو وہ ہزاروں کی فوج پر بھاری تھے جو تیر کمان اور نیزوں سے مسلح تھی۔

اصولاً دو طیاروں کی تباہی کے بعد اس تیسرے طیارے کو واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ مگر اس کی واپسی میں واحد رکاوٹ ڈیوڈ شا ہو سکتا تھا۔ اس کا اگر طیارے سے رابطہ تھا تو وہ پوری کوشش کرتا کہ وہ کہیں لینڈ کرے اور پھر اس کی مدد کے لیے آئے۔ کرنل زندہ تھا یا نہیں لیکن ابھی اس کے ساتھ زینی اور سب سے بڑھ کر یاسو تھے۔ ایک طیارے کے آٹھ افراد بھی اسے مل جاتے تو اس کی طاقت میں

کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ وہ طیاروں اور پندرہ سولہ افراد کی ہلاکت اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے موقع مل جاتا تو وہ پھر باہر سے اس سے زیادہ کمک منگوا سکتا تھا۔ میں اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے معبد میں گھسنے کا خطرہ مول لیا تھا۔ سلوپ کے سب سے اوپری حصے میں آتے ہی مجھے سامنے دو عدد نوجوان پجاری دکھائی دیے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوفزدہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ان میں سے ایک نے گڑگڑا کر کہا۔

"ہمیں مت مارنا ہم ان کے ساتھ نہیں ہیں۔"

میں ان کی زبان سمجھ رہا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتے۔ بہرحال اشاروں کی زبان سے بھی کام چلایا جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے آگے آنے کا اشارہ کیا اور انہوں نے بلا چوں چرا حکم کی تعمیل کی تھی۔ وہ میرے ہاتھ میں گن جیسے ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں نے سوچا اور اشارے سے پوچھا کہ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھ کہاں ہیں۔ کئی بار کی ایکسرسائز کے بعد میں انہیں سمجھانے میں کامیاب ہوا تو ان میں سے ایک نے اندر اشارہ کیا۔ غالباً وہ سمجھ رہا تھا جیسے میں ان کی زبان بول نہیں پا رہا ہوں اسی طرح سمجھوں گا بھی نہیں۔ میں نے منہ سے بولنے کو کہا تو اس نے کہا۔ "وہ اندر خاص حصے میں ہیں جہاں سینتور کا معبد ہے۔"

سینتوران کا خدا تھا۔ اس کے معبد سے مراد یہی ہو سکتی تھی کہ وہاں اس کا مجسمہ یا ایسی کوئی چیز تھی جسے یہ سینتور سے منسوب کر سکتے تھے۔ میں نے اشارہ کیا کہ وہ بولتا رہے۔ اس نے کہا۔ "یہ راہداری اوپر جاتی ہے۔ تیسری منزل کے بعد صرف خاص پجاری ہی آگے جا سکتے ہیں۔"

یقیناً یہاں ایسا نظام تھا جس میں اونچ نیچ اور تفریق تھی۔ تیسرے فلور سے آگے جاتے ہوئے عام پجاریوں کے پر جلتے ہوں گے۔ کیونکہ میری دلچسپی کے لوگ وہاں تھے اس لیے میں نے اسی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ان دونوں کو سمجھایا کہ وہ میرے آگے چلیں اور فرار ہونے کی کوشش انہیں فوری موت سے ہمکنار کر دے گی۔ ہاں میرا کہنا مانتے رہے تو ان کی زندگی کا امکان ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے اس لیے شرافت سے میرے آگے چلنے لگے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے انہیں رکنے کو کہا اور پھر ان سے اشاروں میں روبیر کا پوچھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا اس لیے میں نے آسان کام کیا اور خاداؤں کا پوچھا۔ بولنے والے پجاری نے کہا۔ "خادمائیں دوسری

منزل پر رہتی ہیں۔"

اہرام نما عمارتوں میں وزن سہارنے کے لیے اندر بھی زیادہ تر ٹھوس حصہ ہوتا ہے اور خلا جہاں راستے اور کمرے ہوتے ہیں وہ کم ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔طویل راہداریاں تھیں اور پھر چھوٹے ہال یا کمرے آتے تھے۔راہداریوں سے چھوٹی گلیاں نکل رہی تھیں اور ان کے دونوں طرف کمرے یا حجرے تھے۔حجرے میں نے سائز کے لحاظ سے کہا ہے۔ورنہ یہ بھی ٹھوس اور بہت صفائی سے ہموار کیے ہوئے پتھروں سے بنے تھے۔یہاں فرش سفید ٹائل نما پتھر سے بنا ہوا تھا اور اسے بھی پالش کیا گیا تھا۔اوپر جانے والی راہداری مسلسل سلوپ کی صورت میں تھی۔یہ گھوم بھی رہی تھی اور کہیں کہیں ہموار بھی ہو جاتی تھی۔سلوپ اتنا تھا کہ چڑھنے اور اترنے والے کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ہم دوسرے فلور پر آئے تو یہاں مجھے خادمائیں دکھائی دیں۔یہاں ہال نسبتاً بڑے تھے۔وہاں فرنیچر اور دوسرے لوازمات بھی دکھائی دے رہے تھے۔عورتیں مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئیں اور جب میں نے اشارے سے ایک کو بلایا تو وہ رونے لگی تھی مگر گھسٹتی ہوئی مجھ تک آگئی۔میں نے اس سے پوچھا۔

"روبیر؟"

"بڑی پیاری سی لڑکی تھی اس کی عمر بیس سے زیادہ نہیں تھی۔لیکن عملی طور پر وہ عورت تھی۔یہاں کسی کنواری لڑکی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔وہ منہ اٹھا کر مجھے دیکھتی رہی۔روبیر کا نام اس کے سر پر سے گزر گیا تھا۔مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کیونکہ روبیر تو مفرور تھی۔اس کا نام صرف زونیرا جانتی تھی اور وہ اب ہمارے پاس تھی۔یہ عورتیں روبیر کے نام سے بھی ناواقف تھیں۔پجاری پہلے ہی روبیر کی موجودگی سے انکار کر چکے تھے۔میں عورتوں میں دیکھ رہا تھا۔وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔میں نے محسوس کیا کہ یہاں ساری خادمائیں نہیں ہیں۔ان کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔میں نے اشارے سے پوچھا کہ باقی عورتیں کہاں ہیں؟ ایک عورت نے سمجھ کر کہا۔"وہ اوپر ہیں سنتور والے حصے میں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔اگر روبیر پکڑی گئی تھی تو اسے بھی دوسری خادماؤں کے ساتھ پجاریوں کے خاص حصے میں رکھا گیا تھا اور ظاہر ہے آرام سے نہیں رکھا گیا اس پر سختی کی جا رہی ہوگی۔وہاں شاہین تھا جو اسے پہچانتا تھا۔میں نے ساتھ آنے والے پجاریوں سے شاہین کے بارے میں پوچھا تو اس کے بارے میں بھی یہی اطلاع ملی کہ وہ اوپر خاص حصے میں ہے۔میں نے پجاریوں کی مدد سے خادماؤں سے کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائیں اور اپنی جان بچانے کے لیے کہیں چھپ جائیں لیکن معبد سے نکل جائیں۔پجاریوں نے کہا تو یہ پندرہ سولہ عورتیں افراتفری میں بھاگ گئیں۔اب ہمیں دوسرے فلور پر جانا تھا۔یہاں سے آگے جاتے ہوئے بھی میں نے پجاریوں کو سامنے رکھا تھا۔دوسرا فلور تقریباً خالی تھا وہاں ہمیں نصف درجن چھوٹے درجے کے پجاری ملے اور میں نے انہیں بھی یہاں سے جانے کا مشورہ دیا۔میرے مشوروں نے میرے ساتھ موجود پجاریوں کو فکر مند کر دیا تھا۔بولنے والے نے کہا۔

"یہاں کچھ ہونے والا ہے تو ہمیں بھی جانے دو۔"

میں نے انکار کیا اور گن سے انہیں آگے چلنے کا اشارہ کیا۔با دل ناخواستہ انہوں نے قدم آگے بڑھائے تھے۔اب میں زیادہ محتاط تھا کیونکہ دو فلورز پر مجھے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی بے فکر ہو کر بیٹھے ہوں گے۔یقیناً کچھ نہ کچھ مزاحمت تیسرے فلور پر ہو سکتی تھی۔شاید ڈیوڈ شا نے یہاں باسو کو لگایا ہو۔حیرت انگیز طور پر اس قدر خراب حالات کے باوجود اس نے باسو کو باہر نہیں نکالا تھا ورنہ وہ پہلے طیارے کی تباہی کے ساتھ ہی اسے باہر آ سکتا تھا اور اگر وہ آ جاتا تو ہمارے لیے اوپر منڈلاتے طیاروں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔مگر ڈیوڈ شا نے شاید اسے اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھنا مناسب سمجھا تھا۔یہ خود غرضی کی انتہا تھی کہ اسے اپنی بیٹی کی فکر بھی نہیں تھی جو باہر تھی اور اب نہ جانے کہاں تھی؟

تیسرے فلور پر راہداری ایک مستطیل نما ہال میں کھل رہی تھی۔مخالف میں ایسی ہی راہداری اوپر جا رہی تھی اور دائیں بائیں ہال کے سروں پر چھوٹی گلیاں نکل رہی تھیں۔یہاں سیڑھیاں بنائی جا سکتی تھیں لیکن شاید اس لیے سلوپ بنایا گیا کہ بھاری سامان بھی ٹرالیوں پر با آسانی معبد کے اوپری حصے تک پہنچایا جا سکے۔اس ہال میں مجھے لکڑی کی بنی ہوئی ٹرالیاں دکھائی دی تھیں۔میں کھٹکا تھا کہ یہ جگہ ایسی نہیں تھی جہاں سامان ڈھونے والے ہاتھ گاڑیاں رکھی جاتیں۔جلد میرا کھٹکا درست ثابت ہوا۔جیسے ہی دونوں پجاری ہال کے دروازے تک پہنچے۔کہیں سے دو عدد تیر آ کر اس کے جسموں میں پیوست ہوئے۔ایک گر گیا اور

دوسرا پلٹ کر میری طرف آیا تھا۔ تیر نے اس کا دل چھید دیا تھا اور میں نے اسے سنبھالا تو اس کا چہرہ میری طرف مڑ گیا اور مجھے مرنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ تیروں کی دوسری بوچھاڑ آئی اور اس کے مردہ جسم میں اتر گئی۔ اس دوران میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تیر انداز ہاتھ گاڑیوں کے عقب میں تھے۔ میں نے مرنے والے پجاری کو یوں سینے سے لگا لیا کہ دونوں اس کی بغل سے ہاتھ نکالے اور ان سے گن پکڑ کر ہاتھ گاڑی پر فائر کیا۔ پہلی بار مجھے اس گن کی تباہ کاری دیکھنے کا موقع ملا۔

اگرچہ طیارے کی تباہی نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ کس قدر موثر اور خطرناک ہتھیار ہے۔ مگر وہ منظر ایک لمحے کا تھا اور دوسرے لمحے طیارہ معبد سے آٹکرایا تھا۔ یہاں سب میری نظروں کے سامنے تھا۔ گولی نے ہاتھ گاڑی کا ایک حصہ تباہ کر دیا اور اس کے ٹکڑے فضا میں اڑ رہے تھے۔ دوسری گولی نے ایک تیر انداز کو مار گرایا اور اس کے ساتھ موجود فرد اٹھ کر بھاگا تھا۔ میں نے عقب سے اس پر گولی چلائی اور وہ گر گیا۔ وہ سلوپ پر ذرا اوپر چلا گیا تھا پھر اپنے ہی خون پر پھسلتا ہوا واپس آ گیا۔ مجھے کسی کی پشت میں گولی اتارنا پسند نہیں تھا۔ لیکن وہ میری آمد کا الارم بجا دیتا۔ گن بے آواز تھی اس لیے اندر والوں کو پتا نہیں چلتا۔ مگر بھاگنے والا ضرور میرا راز فاش کر دیتا۔ مارے جانے والے دونوں افراد نے معبد کے سپاہیوں والی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ دو مارے گئے تھے لیکن وہاں مزید سپاہیوں کی موجودگی ممکن تھی۔ میں نے ڈھال بنے پجاری کو چھوڑا نہیں اسے اسی طرح پکڑے ہوئے ہال میں داخل ہوا اور اس کا جائزہ لیا۔

جہاں تک نظر جا رہی تھی مجھے وہاں کوئی اور فرد نظر نہیں آیا۔ یہ جگہ خالی لگ رہی تھی لیکن اوپر جانے سے پہلے میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پجاری کی لاش چھوڑ دی اور دل ہی دل میں اس سے معذرت کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں ایسی جگہوں پر دیکھ رہا تھا جہاں کسی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔ لیکن جلد واضح ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ چھوٹی گلیوں میں جانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا میرا جلد از جلد ڈیوڈ شا تک پہنچ جانا ضروری تھا۔ اس کے بعد وہ ہوتا جو ہماری تقدیر میں اوپر والے نے لکھ دیا تھا۔ اگر ڈیوڈ شا کا انجام میرے ہاتھ سے تھا تو میں اسے عجلت میں انجام دینا چاہتا تھا۔ مگر یہ عجلت وقت کے ضیاع کی حد تک تھی ورنہ میں آگے بڑھنے میں پوری طرح محتاط تھا اور اگر شبہ ہو جاتا تو

☆ دنیا میں 80 فیصد میٹھا پانی زیرِ زمین اور برف کی صورت میں موجود ہے جب کہ 20 فیصد دریاؤں اور جھیلوں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی جھیلوں میں موجود 80 فیصد پانی (تقریباً ایک لاکھ 25 ہزار مربع کلومیٹر) 40 بڑی جھیلوں میں پایا جاتا ہے۔

☆ دنیا میں رقبے کے لحاظ سے نمکین پانی کی سب سے بڑی جھیل کو ہم Caspian sea کے طور پر جانتے ہیں اس ایشیائی جھیل کا رقبہ ایک لاکھ 50 ہزار مربع میل پر مشتمل ہے جب کہ اس کی لمبائی 750 میل اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 3 ہزار ایک سو فٹ ہے۔

....☆....☆....

☆ دنیا میں رقبہ کے حوالے سے میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل Superior lake ہے جس کا رقبہ 95 ہزار مربع میل ہے۔ یہ امریکا اور کینیڈا کے درمیان بحری راستے کا بھی کام دیتی ہے۔ Superior Lake میں پانی کا اندازہ 3 کوارڈ ویلین کیلن ہے (3,000,000,000,000,000) یہ دنیا میں سطح زمین پر دستیاب میٹھے پانی کا 10 فیصد ہے اور یہ اتنا پانی ہے جو شمالی اور جنوبی امریکا کو ایک فٹ پانی میں ڈبو سکتا ہے۔

☆ دنیا میں رقبے کے حوالے سے بڑی پانچ جھیلوں میں اندازاً 22 ہزار 9 سو مربع کلومیٹر پانی ہے۔

☆ ایشیاء کی جھیل Baikal میٹھے پانی کے حوالے سے دنیا کی سب سے بڑی جھیل ہے جو کہ رقبے کے حوالے سے بڑی پانچ جھیلوں کے برابر پانی کی حامل ہے اور یہ دنیا میں دستیاب میٹھے پانی کے 20 فیصد کی حامل ہے۔ (ماسوائے زیرِ زمین اور برف) یہ میٹھے پانی کی سب سے گہری جھیل ہے جس کی گہرائی کا اندازہ ایک میل سے زائد ہے۔

مرسلہ: راحت علی کراچی

اسے رفع کیے بغیر آگے نہیں جاتا تھا۔

ہال کا معائنہ کر کے مجھے اطمینان ہوا تو میں نے راہداری کے اگلے سرے کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی دس فٹ تک سیدھی گئی تھی اور پھر ایل کی صورت میں دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں زمین سے کوئی دو ڈھائی سو فٹ اوپر آ گیا تھا گویا سینتور کا معبد یہاں آخر میں تھا۔ اس کے بعد اہرام کی چوٹی اتنی بڑی نہ رہ جاتی کہ اس میں مزید کوئی خلا رکھا جاتا۔ یا اگر خلا تھا تو بھی اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گویا اب دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گئے تھے۔ دیکھا جائے تو میں اکیلا تھا۔ لیکن میں اس سے خوش تھا۔ اگر میرے ساتھی ساتھ ہوتے تو وہ اس صورتِ حال میں میری خاص مدد نہیں کر سکتے تھے اور میں انہیں خطرے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب مجھے جو کرنا تھا وہ اپنی ذات پر رسک لے کر کرنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آگے بڑھوں کہ اچانک ہی اوپر سے ایک گول سیاہ چیز لڑھکتی ہوئی نمودار ہوئی اور تیزی سے نیچے آنے لگی۔ میں سیکنڈ کے دسویں حصے میں حرکت میں آیا میں نے چھلانگ لگائی اور ہاتھ گاڑی کو لیتا ہوا دوسری طرف گرا تھا۔ اس کا نچلا حصہ خلا تھا جو گرنیڈ سے مجھے تحفظ نہیں دے سکتا تھا مگر اس کا تختہ جس پر سامان رکھا جاتا تھا وہ موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اب میں اس کی آڑ میں تھا۔

خوش قسمتی سے گرنیڈ راہداری سے باہر آنے سے پہلے پھٹ گیا تھا۔ میں نے گرتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے۔ اس کے باوجود دھماکا سماعت شکن تھا۔ مجھے لگا جیسے اس محدود سے ہال میں طوفان آ گیا ہے۔ وہاں چیزیں اڑ رہی تھیں اور درجہ حرارت یک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ میں سجدے والی پوزیشن میں پڑا ہوا تھا۔ دھماکے کی بازگشت ختم جانے کے بعد میں اندازہ لگا رہا تھا کہ مجھے کتنا نقصان ہوا ہے اور جسم کے کون سے حصے مجروح ہیں کیونکہ گرنیڈ مجھ سے مشکل سے چھ فٹ کے فاصلے پر پھٹا تھا۔ جب مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا تو میں گن اٹھاتا ہوا اٹھا۔ ہاتھ گاڑی کا پچھلا حصہ دھماکے سے اڑ گیا تھا۔ دھماکے نے راہداری کے آغاز کی دیوار کا بھی نقصان کیا تھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ گرنیڈ راہداری میں ہی پھٹ گیا تھا ورنہ یہ ہال تک آ جاتا تو میں اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس صورت میں شاید ہاتھ گاڑی بھی مجھے تحفظ نہیں دے سکتی تھی۔

ہاتھ گاڑی مضبوط لکڑی کی تھی مگر گرنیڈ نے اس کے ایک حصے کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اگر گرنیڈ اس کے سامنے پھٹتا تو باقی حصوں کا بھی یہی حال متوقع تھا۔ اس کے پیچھے میں کہاں محفوظ رہتا؟ اگر شدید زخموں سے بچ جاتا تب بھی کچھ نہ کچھ زخم تو آتے۔ ہلوپ پر گڑھا پڑا تھا مگر اس کا پتھر اتنا موٹا تھا کہ نیچے کوئی خلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ گرنیڈ نے سات آٹھ انچ تک پتھر ادھیڑ دیا تھا۔ یہی حال دیواروں کا ہوا تھا۔ اس کے باوجود۔ اس طاقتور گرنیڈ نے بھی یہاں کے اسٹرکچر کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ باہر طیارے کے ٹکرانے سے خاصی تباہی ہوئی تھی۔ مگر یہ عمارت اتنی بڑی تھی کہ اس کے ایک حصے پر طیارہ ٹکرانے سے اندر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ شاید اندر معمولی سی دھمک کے سوا اور کوئی آواز بھی نہیں آئی ہو گی۔ میں نے فوری اوپر جانا مناسب نہیں سمجھا اور ذرا پیچھے ہٹ کر ایک ستون کی آڑ میں پوزیشن سنبھال لی۔

یہ پوزیشن خاصی آکورڈ تھی۔ کیونکہ میرے عقب میں بھی ایک گلی تھی اور وہاں سے بھی کسی کی آمد ممکن تھی۔ اس صورت میں میں عقب سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں دونوں طرف نظر رکھے ہوئے تھا اور یہی مشکل تھی۔ مجھے سامنے سے کسی کے آنے کا اتنا خطرہ نہیں تھا اصل خطرہ عقب سے تھا۔ بہرحال جس نے گرنیڈ پھینکا تھا وہ دوبارہ یہی کام کرتا ورنہ پہلے گرنیڈ کا نتیجہ دیکھنے آتا۔ میں نے گن کا رخ راہداری کی طرف کیے رکھا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا نہ تو مزید گرنیڈ پھینکا گیا اور نہ ہی کسی نے آ کر جھانکنے کی زحمت کی کہ جس کے لیے یہ زحمت کی تھی وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ چند منٹ بعد میں نے ہی حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس بار میں نے راہداری کی طرف جانے کے بجائے عقب میں موجود گلی کا رخ کیا۔

اگرچہ یہ تو واضح تھا کہ اوپر جانے کا راستہ راہداری سے ہی ہو کر جاتا ہے لیکن اگر میں دیکھ لیتا تو کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ یہاں تاریکی تھی میں نے ہال میں لگی ایک مشعل اتار لی۔ گلی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ کچھ آگے جا کر اس میں دائیں بائیں دروازے نمایاں تھے۔ میں نے ایک دروازے میں جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ مگر تیسرے کمرے تک جانے سے پہلے مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں ٹھٹک گیا آواز اگلے دروازے سے آئی تھی۔ یہاں کمروں کے دروازے نہیں تھے صرف چوکھٹ تھیں اور ان پر پردے تھے۔ میں نے گن کی نال سے پردہ ہٹایا اور مشعل آگے کی تو مجھے ایک نسوانی وجود اس حال میں نظر آیا کہ وہ دیوار سے یوں جڑا ہوا تھا جیسے اس کا ایک جز بن جانا چاہتا ہوں۔ اس کے سرخی مائل

براؤن بال دیکھ کر میں نے بے ساختہ کہا۔ ''روبیر۔''

وہ میری آواز سن کر تڑپ کر اٹھی اور آندھی طوفان کی طرح میری طرف آئی۔ اسے مشتعل کی آگ سے بچانے کے لیے مجھے خاصی کوشش کرنا پڑی تھی۔ وہ کسی دہشت پا کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ ''شہباز...... شہباز...... مجھے معلوم تھا...... آپ آئیں گے...... میں آپ کا...... انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے پھولی سانسوں کے دوران کہا۔ اس کا نازک بدن اب پہلے سے زیادہ شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس نے وہی حرکت کرنا چاہی جو معبد کی طرف جانے سے پہلے باغ میں کی تھی مگر میں نے ہاتھ درمیان میں لا کر اسے روک دیا۔ وہ خفیف ہو کر رک گئی تھی۔ میں نے گن نیچے رکھی اور مشتعل دیوار کے کھانچے میں لگا دی۔ پھر اسے خود سے جدا کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں کامیابی سے اندر آ گئی تھی اور پھر عورتوں میں چھپی رہی۔ کسی نے مجھ پر شک نہیں کیا۔ رات ہوتے ہی مجھے اور چند دوسری خادماؤں کو اوپر بلایا گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شامین نے مجھے پہچان لیا۔ وہاں سے بھاگ نکلی۔ تب سے مجھے تلاش کیا جا رہا ہے اور میں چھپتی پھر رہی ہوں۔ ایک بار تو پکڑی جاتی لیکن یہاں کی ایک لڑکی نے میری مدد کی۔''

''اس پاداش میں اسے تشدد کر کے زخمی کر دیا گیا تھا اور پھر اسماروں کے سامنے پھینکنے کا حکم دیا لیکن ہم نے اسے بچا لیا ہے۔''

''سچ۔'' روبیر خوش ہو گئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے شاید وہ بہت دیر سے پیاسی تھی۔ میں نے پانی کی چھاگل اسے دی تو اس نے بے تابی سے پانی پیا تھا۔ پھر میں نے اسے ڈرائی فروٹ دیے۔ اس نے کھاتے ہوئے گن کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''وہی ہتھیار جس نے عمارت سے بھاگنے والی عورت کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس سے معبد کے دو سپاہیوں کو مارا ہے۔ یہاں کل کتنے لوگ ہیں۔''

روبیر نے سر ہلایا۔ ''یہاں شامین کے ساتھ چار سپاہی ہیں۔ دس پجاری ہیں جن میں چار چھوٹے درجے کے پجاری اور باقی اوپری درجے کے پجاری ہیں۔''

میں حساب لگا رہا تھا۔ تین چھوٹے درجے کے پجاری اور دو سپاہی مارے گئے تھے۔ شامین اور اس کے بچ جانے والے دو سپاہی، سات پجاری، اتنی ہی خادمائیں اور ڈیوڈ شاد باسو۔ یہ کل انیس افراد ہوئے اور زینی بھی واپس آ گئی تھی تو بیس بنتے تھے۔ اگر پجاریوں دخادماؤں کو نکال دیا جاتا تب بھی مجھے پانچ سے چھ افراد سے نمٹنا تھا اور یہ سب ہی خطرناک لوگ تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ سب اوپر ہیں؟''

روبیر نے سر ہلایا۔ ''سینتور کے معبد میں۔ وہاں بڑے پجاریوں کے لیے خاص کمرے ہیں۔''

''باہر ابھی بہت ہنگامہ اور دھماکے ہوئے ہیں کیا تم نے اندر کچھ سنا؟''

''نہیں۔'' روبیر نے ذرا تعجب سے کہا۔ ''بس ایک بار دھمک سے ہوئی تھی جیسے معبد کی عمارت لرزی ہو۔ باہر کیا ہوا ہے؟''

میں نے اسے مختصراً باہر کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ خوش ہوئی کہ ہم نے ڈیوڈ شا کا منصوبہ تقریباً ناکام بنا دیا تھا اور نہ صرف دو طیارے تباہ کر دیے تھے بلکہ ان میں موجود ڈیوڈ شا کے آدمی اور اسلحہ بھی تباہ ہو گیا۔ ایک طیارہ واپس یا آرگون کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ڈیوڈ شا کا اس سے رابطہ ہے تو وہ اسے جانے نہیں دے گا اور اگر وہ کہیں اتر گیا تو یہاں کے لوگوں پر بہت زیادہ تباہی نازل کر سکتا ہے۔ ایز ارٹ اور اس کی ساری فوج مل کر بھی ان لوگوں کو نہیں روک سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں آ ئیں ہمیں ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دینا ہے۔''

روبیر فکر مند ہو گئی۔ ''آپ اکیلے ہیں۔''

''میں کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔'' میں نے دوسرے معنوں میں کہا۔ مگر وہ خوش ہو گئی۔

''میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''یہ بتاؤ کہ اوپری چیمبر تک جانے کا کوئی اور راستہ ہے؟''

روبیر سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''راستہ ہے لیکن مجھے اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔''

''تب تمہیں اس کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''میں ایک جگہ چھپی ہوئی تھی تو مجھے تلاش کرنے والے دو پجاری وہاں آ گئے اور وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ کہیں میں خفیہ راستے سے تو فرار نہیں ہو گئی۔ دوسرے نے اس کی تردید کی اس نے کہا۔ یہ خفیہ راستہ سینتور کے معبد میں نکلتا ہے اور میں تو فرار

ہو کر نیچے آئی تھی اس راستے سے باہر جانے کے لیے ضروری تھا کہ میں سینتور کے حصے میں رہتی۔"

روبیر کی بات نے مجھے چونکایا تھا۔ اس نے ایک معمولی سی نظرانداز کی جانے والی بات کو خاص بنا دیا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔"

وہ بلا تامل تیار ہوگئی اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں اسے کہاں لے جا رہا تھا اور وہاں کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ میں نے مشعل چھوڑ دی تھی اور ہم گلی سے مستطیل ہال میں آئے۔ یہاں چند لمحے سن گن لینے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں روبیر کو لے کر تیزی سے راہداری میں آیا اور ہم معبد سے باہر جانے لگے۔ راستہ کلیئر ہی تھا اس کے باوجود میں دیکھ بھال کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ جب تک میں روبیر کے ساتھ تھا یہاں کوئی ٹریپ یا آدمی لگا دیے گئے ہوں۔ میں بے خبری میں شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ روبیر کو میں نے پیچھے کی نگرانی پر لگایا تھا کہ کوئی عقب سے آ کر ہم پر وار نہ کر سکے۔ وہ مڑ کر پیچھے بھی دیکھ رہی تھی۔ معبد کی بیرونی راستے پر آ کر میں نے اسے پیچھے روکا اور خود آگے بڑھا۔ پہلے میں نے دائیں بائیں اور کسی قدر اوپر دیکھ کر اطمینان کیا کہ باہر کوئی نہیں تھا۔ پھر روبیر اور ایک مشعل لے کر باہر آیا۔

پہلے میں نے روبیر کو سہارا دے کر معبد کی دیوار کے اوپر چڑھایا۔ یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا کیونکہ اس کا ریشمی لبادہ بہت پھسلواں تھا۔ اسے اوپر چڑھا کر میں نے گن اور مشعل تھمائی اور خود بھی چڑھ گیا۔ جب روبیر کو مزید چڑھنے کو کہا تو اس نے اپنے لبادے کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اس کی وجہ سے بہت مشکل ہو رہی ہے۔"

"مجبوری ہے یہاں کوئی اور لباس بھی نہیں ہے۔"

"میں اس کا علاج کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور گھٹنوں سے ذرا اوپر لبادے کو ذرا سا چیرا اور پھر اسے گولائی میں پھاڑتی چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں یہ لبادے کے بجائے فراک رہ گیا تھا۔ اس نے اتاری پٹی کو کئی بل دے کر اپنی کمر پر باندھ لیا اور یوں لباس بالکل چست ہو گیا۔

اگرچہ میں نے عام سے انداز میں کہا تھا مگر وہ کھل اٹھی۔ "میں آپ کو اچھی لگ رہی ہوں۔"

"اب اوپر چلو۔" میں نے اسے کمر سے پکڑ کر اوپر کیا اور پھر اس کے پیروں کو سہارا دے کر اسے اگلے اسٹیپ تک پہنچا دیا۔

ایک ایک اسٹیپ کر کے ہم اوپر جاتے رہے۔ اس دوران میں، میں آس پاس بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ معبد کی مغربی سمت طیارے کا ملبا بکھرا ہوا تھا اور اس میں ابھی تک آگ جل رہی تھی۔ ہم کوئی سو فٹ کی بلندی پر آئے ہوں گے کہ اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس وقت میں اسٹیپ پر چڑھ رہا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ "نیچے ہو جاؤ۔"

"نہیں آپ اوپر آئیں۔" اس نے پریشان ہو کر کہا اور میرا ہاتھ کھینچنے لگی۔ اوپر آ کر میں نے اسے دیوار کی جڑ کی طرف دھکیلا اور خود اس کے ساتھ دیوار سے لگ کر جھک گیا۔ فائرنگ چند لمحے جاری رہی اور پھر رک گئی۔ بلاشبہ گولیاں چلی تھیں لیکن یہ کسی ہتھیار سے نہیں چلی تھیں بلکہ طیارے میں تباہ ہونے والے ایمونیشن کو حرارت پہنچی تو اس میں موجود گولیاں چلی تھیں اور ان کی آواز پٹاخوں جیسی تھی بہرحال یہ بھی خطرناک ہوتی ہیں اس لیے میں نے احتیاط مناسب سمجھی۔ روبیر کو علم نہیں تھا اور میرے پاس سمجھانے کا وقت نہیں تھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔ اس لیے جیسے ہی فائرنگ رکی۔ میں نے اوپر کی طرف سفر شروع کر دیا۔ معبد کے سامنے باغ اور عمارت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی نقل و حرکت میری نظر میں نہیں آئی تھی۔ اب مجھے ریک اور دوسرے ساتھیوں کا خیال آ رہا تھا مگر میں خاص طور سے انہیں چیک نہیں کر سکتا تھا۔ دو سو فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد میں اور روبیر معبد کے پچھلے حصے میں پہنچے وہاں رن وے پر پڑا ہوا طیارے کا ملبا جل رہا تھا۔

میں نے سیڑھیوں کا جائزہ لیا مگر مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا نہ زندہ، نہ مردہ اور نہ زخمی حالت میں۔ مجھے ذرا سکون ملا کہ میرے ساتھی بچ نکلنے میں کامیاب رہے تھے۔ میں نے انہیں جان بچا کر عمارت کی طرف جانے کو کہا تھا۔ وہ شاید وہیں تھے۔ یہاں سے اگلے اسٹیپ آسان تھے اور مجھے صرف روبیر کو سہارا دینا پڑ رہا تھا۔ اس نے مشعل سنبھال لی تھی اور میرے پاس گن تھی۔ اس کا ایمونیشن بکس پیک تھا اس لیے میں اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ اس میں کتنی گولیاں ہیں۔ اسے الگ کر کے دیکھا تو خاصا وزنی پایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس میں ابھی اچھی خاصی گولیاں موجود تھیں۔ مجھے نیچے میدان میں پڑے ہتھیاروں کا خیال آیا۔ شاید اس میں کچھ قابل استعمال ہوں۔ اسی طرح اگر کرنل مارا گیا تھا یا شدید زخمی تھا تو اس کے بھی ہتھیار وہاں موجود ہونے چاہیے تھے۔ مسئلہ وہی تھا کہ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں جلد از جلد ڈیوڈ شا تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ روبیر اس

کو وہ پیائی سے تھک گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''اگر ہم نے نیچے آنا تھا تو اتنا اوپر چڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت ہے اور ہمیں ابھی مزید اوپر جانا ہے۔'' میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ میں ٹھیک اس جگہ چڑھنا چاہ رہا تھا جہاں پہلے سے چڑھا تھا۔ جب میں نے مزید اوپر جانے کو کہا تو روبیر چونکی۔ وہ سمجھ گئی تھی اس نے کہا۔

''آپ اس خفیہ راستے تک پہنچنا چاہتے ہیں جو سینٹور کے معبد تک جاتا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے اگلا اسٹیپ چڑھ کر کہا۔

''مگر باہر سے آپ کیسے تلاش کریں گے؟''

''یہ میں ابھی بتاتا ہوں۔'' میں نے اسے اوپر کھینچا۔

''باقی سب کہاں ہیں؟'' روبیر نے یہ سوال خاصی دیر سے کیا۔

''وہ نیچے تھے جب طیاروں نے حملہ کیا میں نے انہیں بچ کر عمارت میں جانے کو کہا تھا۔ وہ وہیں ہو سکتے ہیں۔''

اب ہم کوئی تین سو فٹ کی بلندی پر تھے مجھے یاد تھا کہ ہلنے والا پتھر مجھے چار سو فٹ کے بعد ملا تھا۔ اسٹیپ چھوٹے ہوئے اور بلندی پر آنے کے بعد روبیر ڈر رہی تھی۔ میں نے اس کا ڈر محسوس کرتے ہوئے اسے یہیں رکنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ ''میں آپ کے ساتھ رہوں گی چاہے مجھے کتنا ہی ڈر کیوں نہ لگے۔''

''تب بھی تم یہیں رکو جب میں راستہ تلاش کر لوں گا تو تمہیں اوپر بلا لوں گا۔'' میں نے اس سے مشعل لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نیچے اور آس پاس نظر رکھو کوئی خطرہ محسوس ہو تو مجھے خبردار کرنا۔''

روبیر مان گئی مگر خبردار کرنے والے انداز میں بولی۔ ''اگر آپ نے راستہ تلاش کر لیا اور مجھے لیے بغیر گئے تو میں معبد کے سامنے والے راستے سے اندر آ جاؤں گی۔''

سچی بات ہے کہ میرا یہی ارادہ تھا کہ میں اسے لیے بغیر ہی اندر چلا جاؤں گا۔ مگر اس کی دھمکی اور اس سے زیادہ پختہ لہجے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں اسے معبد سے نکال لایا تھا کیونکہ وہاں اس کے لیے خطرہ تھا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں اسے عمارت تک پہنچاتا اس لیے ساتھ رکھا تھا۔ یہاں وہ محفوظ تھی اور جب تک کوئی اوپر نہ آتا اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر اب وہ بیر تسمہ پا ہو گئی تھی اور بہر صورت میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''نہیں جاؤں گا تمہیں لیے بغیر، مگر اب تم یہاں چھپ جاؤ تمہارا سفید لباس نمایاں ہو رہا ہے۔''

وہ سیڑھی کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ''ایسے ٹھیک ہے؟''

اگرچہ وہ پوری طرح نہیں چھپ رہی تھی کیونکہ سیڑھی چھوٹی تھی مگر کھڑے ہونے کے مقابلے میں بیٹھ جانا بہتر تھا۔ ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

میں اوپر کی طرف بڑھا۔ جب معبد کی چوٹی سو فٹ دور رہ گئی تو میں نے اس پتھر کو تلاش کرنا شروع کر دیا جو ہل رہا تھا۔ میں دائیں سے بائیں پتھروں کو ٹٹولتا ہوا گیا۔ جب اس اسٹیپ پر پتھر نہیں ملا تو میں اوپر والے اسٹیپ پر گیا۔ یہاں بھی تمام پتھروں کو چیک کیا اور وہ ان میں بھی نہیں تھا۔ تیسرے اسٹیپ کے بعد سیڑھیوں کا سائز مختصر ہو گیا تھا اور مجھے یاد تھا کہ وہ پتھر خاصا بڑا تھا۔ میں نے تیسرا پتھر ہلایا تو وہ ہل گیا۔ میں نے جلدی سے مشعل پاس رکھی اور پتھر کو ہلایا۔ یہ آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا۔ میں نے ایک اسٹیپ نیچے ہو کر اس کے اوپری حصے پر دونوں ہاتھ جمائے اور اسے آگے کی طرف کھینچنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کی حرکت بتا رہی تھی کہ وہ آس پاس کے پتھروں سے آزاد ہے۔ میں نے دوسرے زاویے سے کوشش کی اور اب کی بار اسے پیچھے دھکیلا اور منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔

پتھر یوں آسانی سے اندر چلا گیا جیسے کئی سو کلوگرام کے بجائے اس کا وزن صرف چند کلوگرام ہو۔ یہ دو فٹ لمبا، چوڑا اور اونچا پتھر تھا۔ اس کا وزن کم سے کم بھی دو سو کلوگرام ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس کے وزن کے حساب سے زور لگایا تھا۔ پتھر جتنی آسانی سے اندر گیا تھا اتنا ہی بے آواز بھی تھا۔ اس کے سرکنے سے بہت معمولی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ پتھر سرکتا ہوا اوپر والے اسٹیپ کے نیچے بالکل ہی غائب ہو گیا تھا اور جس جگہ سے سرکا تھا۔ وہاں دو ضرب دو فٹ کا خلا نمودار ہوا تھا۔ میں نے مشعل اٹھا کر اندر روشنی ڈالی۔ چار فٹ کی گہرائی تھی اور اس کے آگے تین فٹ کا دو فٹ چوڑا خلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ متوازی تھا یعنی اس میں انسان گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چل سکتا تھا۔ مجھے شاید اکڑوں بیٹھنا پڑتا۔ میں نے پلٹ کر روبیر کو دیکھا اور اسے بالکل اپنے پاس پا کر مجھے غصہ آیا تھا۔ وہ خاموشی سے اوپر چلی آئی تھی۔ شاید اس نے میرا غصہ بھانپ لیا تھا۔ جلدی سے بولی۔ ''میں نے آپ کو پتھر سرکاتے دیکھ لیا تھا اس لیے اوپر

آئی ہوں۔"

"میں اندر جارہا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے مشعل اسے پکڑائی۔ "جب میں مانگوں تو مجھے دینا۔ مگر اب آواز مت نکالنا۔"

اس نے مشعل پکڑی تو مجھے اس کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملاتے نظر آئے۔ یہ آنسو تھے جو میرے لہجے پر آئے تھے۔ یہ اشک شوئی کا وقت نہیں تھا۔ میں خلا میں اترا اور گھٹنے موڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر میں نے ہاتھ اوپر کر کے مشعل لی اور خلا میں دیکھا۔ سامنے چند فٹ تک تین فٹ اونچا خلا تھا اس کے بعد یہ بڑا ہو گیا تھا۔ میں آگے آیا اور بڑے خلا میں جھانکا۔ یہ دو فٹ چوڑا اور کوئی پانچ فٹ اونچا تھا۔ پورا سر اٹھانا تو ممکن نہیں تھا لیکن آدمی کھڑا ہو کر رکوع کی حالت میں چل سکتا تھا۔ میں نے واپس ہو کر روبیر سے گن لی اور پھر اسے بھی اندر آنے کو کہا۔ ساتھ ہی ایک بار پھر ہدایت کی کہ کوئی آواز نہ نکالے اور اگر بولنا ہو تو سرگوشی میں میرے کان میں بولے۔ اس نے سر ہلایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پتھر کس طرح بند ہوتا تھا اور میں اسے بند کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ ممکن ہے پھر کھلے ہی نہیں اور ہم چھ سے وہاں میں پھنس کر رہ جائیں۔ میں نے مشعل سامنے کی اور بڑھنے لگا۔ گن میں نے دوسرے ہاتھ سے سنبھال رکھی تھی اور یہ خاصا مشکل کام تھا کیونکہ جھک کر اٹھائی تھی۔ مگر یہ مشکل کام کرنا ہی تھا۔

سرنگ کچھ دیر سیدھی چلتی رہی کوئی دس گز کے بعد یہ دائیں طرف گھومی اور کسی قدر سلوپ کے انداز میں نیچے جانے لگی۔ یہاں سے یہ پھر دائیں طرف گھومی اور سلوپ برقرار رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم کوئی بیس فٹ نیچے آچکے تھے۔ یہاں گھٹن نہیں تھی۔ شاید خفیہ راستہ کھل جانے سے تازہ ہوا اندر آرہی تھی۔ سرنگ ایک بار پھر دائیں طرف گھومی اور اس بار سلوپ کے بجائے سیڑھیوں سے واسطہ پڑا۔ ان کی تعداد بیس تھی اور ہم بیس فٹ کے فاصلے میں بیس ہی فٹ نیچے اتر گئے۔ بیتالیس درجے کی وجہ سے بہت سنبھل کر اترنا پڑا تھا۔ البتہ یہاں چھت اونچی ہو گئی تھی اور ہم سیدھے ہو کر اتر سکتے تھے۔ ورنہ جھکی حالت میں بہت دشواری پیش آتی۔ جہاں سیڑھیوں کا اختتام تھا وہیں سرنگ بھی ختم ہو گئی تھی۔ تین بائی تین مربع فٹ کی ہموار جگہ کے بعد ایک دیوار تھی۔ یقیناً ہم سیتور کے معبد کے پاس تھے اور اس دیوار کے پار کوئی کمرا یا جگہ تھی۔

اصل سوال یہ تھا کہ اسے کھولا کیسے جاتا؟ میں نے گن روبیر کو پکڑائی تو وہ اس کے وزن سے گرتے گرتے بچی پھر سنبھل کر پکڑ لیا۔ میں مشعل کو دیواروں کے پاس کر کے بہ غور معائنہ کر رہا تھا۔ یہاں ایسی کوئی چیز ہونی چاہیے تھی جس سے آگے راستے کھلتا۔ مگر خاصی تلاش کے بعد بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ یہاں سامنے والی دیوار سمیت تینوں دیواریں قطعی ہموار تھیں۔ ان پر معمولی سا ابھار بھی نہیں تھا۔ دیواروں کے بعد میں نے فرش کا معائنہ شروع کیا اور اس بار بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ سب سے آخر میں چھت رہ گئی تھی جو کوئی ساڑھے چار فٹ اونچی تھی۔ یہ بھی ٹھوس پتھر کی اور ہموار ثابت ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سرنگ کے اس طرف سے اسے کھولنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تھک کر میں پہلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ روبیر مجھ سے ایک سیڑھی اوپر تھی اور اس دوران میں قطعی خاموش رہی تھی۔ میں بیٹھا تو اس نے جھک کر سرگوشی میں کہا۔

"راستہ نہیں ملا؟"

"راستہ ہے مگر اسے کھولنے کا طریقہ نہیں مل رہا۔" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"اب موقع ہے۔"

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور اپنے برابر کی طرف اشارہ کیا۔ "روبیر یہاں آؤ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے گن اوپری سیڑھی پر رکھی اور ذرا سرک کر میرے برابر میں آئی تھی کہ اس کا وزن پڑتے ہی سیڑھی ذرا سی اندر دھنسی اور سامنے موجود دیوار اپنی جگہ سے بے آواز سرکنے لگی۔ میں نے بہت تیزی دکھائی اور اٹھا تھا کہ کئی انچ کھل جانے والی دیوار دوبارہ بے آواز اپنی جگہ آگئی۔ روبیر بھی حیران رہ گئی تھی۔ شکر ہے اس نے آواز نہیں نکالی۔ چند انچ کے خلا سے مجھے دوسری طرف ایک روشن کمرا دکھائی دیا تھا۔ فرش پہ عمدہ قسم کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور ایک طرف فرشی میز رکھی تھی۔ تو خفیہ دروازے کو کھولنے کا طریقہ یہ تھا۔ شاید سیڑھی پر سو کلوگرام یا اس سے زیادہ وزن آتا تو دروازہ کھل جاتا تھا اور جیسے ہی یہ وزن کم ہوتا وہ بند ہو جاتا۔ میرا اور روبیر کا مشترکہ وزن اتنا ہو گیا تھا کہ سیڑھی کا یہ اسٹیپ دب کر خفیہ دروازہ کھول دیتا۔ روبیر نے سرگوشی کی۔ "یہ ہے خفیہ راستہ؟"

میں نے سر ہلاتے ہوئے عقب میں موجود گن اٹھالی۔ ممکن ہے دوسری طرف کوئی ہو اور اس نے دروازہ کھلتے اور پھر بند ہوتے دیکھ لیا ہو۔ اس صورت میں دروازہ اب دوسری طرف سے کھلتا۔ میں اس کے لیے تیار تھا اور

روبیر کو اشارے سے پیچھے ہٹنے کا کہا۔ وہ مشعل لے کر سیڑھیوں کے اوپری حصے میں چلی گئی۔ مگر کئی منٹ گزرنے کے بعد بھی کوئی ردعمل نہیں ہوا تو میں بھی پیچھے ہٹ آیا اور سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ روبیر میرے ساتھ آ گئی۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”سنو میں اندر جاؤں گا اور تم یہیں......“

”میں آپ کے ساتھ......“

”میری بات سنو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم رکو گی نہیں بلکہ واپس جاؤ گی۔ عمارت میں جا کر دوسروں کو بھی اسی راستے سے اندر لاؤ گی۔ اگر میں ناکام رہا اور پکڑا گیا تو تم لوگ ہی میری واحد امید ہو گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟“

اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”جی۔“

”تب جیسے ہی میں اندر جاؤں گا تم یہاں سے نکل جاؤ گی اور باقی سب کو لے کر آؤ گی۔“

”آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔“

میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”روبیر تم بہت اچھی لڑکی ہو اور مجھے یقین ہے قدرت نے تمہارے لیے آگے بہت اچھا رکھا ہے۔“

”آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ جب شامین ملے گا تو آپ اسے اپنے ہاتھ سے ماریں گے۔“

”وعدے کی ضرورت نہیں ہے میں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے۔“

اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے کہا۔ ”بس آخری بار۔“

یہاں میں بے بس ہو گیا۔ اس نے اپنے نازک لب میرے ہونٹوں سے لگا دیئے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی چاہی کہ یہ بھی اس کے حکم کی خلاف ورزی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے ہونٹ الگ کیے اور کھڑی ہو گئی۔ میں نے مشعل اسی کے پاس رہنے دی کہ باہر جانے تک اسے اس کی ضرورت تھی۔ ہم دونوں آخری سیڑھی تک آئے۔ میں نے خود کو تیار کیا اور پہلے میں سیڑھی پر آیا پھر روبیر آئی اور دروازہ کھلنے لگا۔ اس کا میکنزم اتنا اعلیٰ درجے کا تھا کہ پتھر کا وزنی دروازہ سرکنے کی آواز معمولی سی تھی۔ جیسے ہی یہ اتنا کھلا کہ میں اندر داخل ہو سکتا میں نے جست لگائی اور کمرے میں پہنچ گیا۔ وزن ہٹتے ہی دروازہ بند ہونے لگا تھا۔ سیکنڈ سے بھی پہلے میں نے کمرے کا معائنہ کر لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور جب تک میں عقب میں دیکھتا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

میرے چھلانگ لگانے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی اور اگر کوئی کمرے کے پاس تھا تو اس تک یہ آواز جا سکتی تھی۔ میں گن لے کر ایک ترچھے ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ مگر جب کوئی ردعمل نہیں ہوا تو میں دبے قدموں کمرے کے دروازے تک آیا۔ یہاں چوکھٹ میں اعلیٰ درجے کی لکڑی سے بنا ہوا دروازہ نصب تھا۔ میں نے پہلے کان لگا کر سن گن لی۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا تو مجھے ایک خاصا بڑا ہال دکھائی دیا۔ جس کے وسط میں ایک دائرے میں سونے کا اہرام بنا ہوا تھا۔ یہ اوپر چوٹی پر لگے اہرام سے خاصا بڑا تھا۔ اس کا سائز دس بائی دس اور اونچائی بھی دس فٹ تھی۔ دائرہ سیاہ پتھر کا تھا اور فرش سے فٹ بھر اونچا تھا اس دائرے میں ارغوانی سیال بھرا ہوا تھا اور بہ ظاہر یہ شراب لگ رہی تھی۔ جہاں تک میری نظر جا رہی تھی وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر فوراً ہی ایک آواز آئی۔

”تم سب معبد کی طرف آؤ۔“

یہ آواز ڈیوڈ شا کی تھی۔ مگر وہ کس سے مخاطب تھا میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا۔ چند لمحے بعد اس کی آواز دوبارہ آئی۔ ”جو راستے میں آئے اسے اڑا دو۔ چاہے جنگل سے آنا پڑے تم لوگ جلد از جلد یہاں پہنچو اوٹ اوآرڈر۔“

آواز سنتے ہی میں نے دروازہ ذرا بند کر دیا تھا۔ ڈیوڈ شا اہرام کے دوسری طرف سے بات کرتا ہوا نمودار ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ریڈیو کا ریسیور اور مائیک تھا۔ ریڈیو ایک پجاری نے اٹھا رکھا تھا اس سے منسلک تار کہیں جا رہی تھی۔ یہ ویسا ہی ریڈیو تھا جیسا کرنل نے باکس میں رکھا ہوا تھا اور اس سے طیاروں سے رابطہ کیا تھا۔ اس کی گفتگو سن کر میرا دل دھڑک اٹھا کہ تیسرا طیارہ شاید آرگون یا اس کے آس پاس کہیں لینڈ کر گیا تھا اور اب اس میں موجود مسلح افراد یہاں آنے کے لیے تیار تھے۔ اگر یہ لینڈنگ شہر کے اندر تھی تو ایزارٹ اور حریت پسند سخت خطرے میں تھے۔ طیارے میں آنے والے سات آٹھ افراد خودکار آتشیں ہتھیاروں سے ان کا قتل عام کر سکتے تھے۔ ڈیوڈ شا نے دائرے کے پاس رکھی تپائی سے طلائی جام اٹھایا اور تالاب سے ارغوانی شراب بھر کر اس کی چسکی لی۔ وہ دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔

میرے لیے یہ اچھا موقع تھا میں نے گن سیدھی کی اور ٹریگر پر دباؤ ڈالا تھا۔ مگر جیسے ہی فائر ہوا کوئی جھری کے

سامنے آیا۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ میں خود کو روک ہی سکا تھا۔ گولی آنے والے کے سینے میں اترتی ہوئی دوسری طرف نکلی اور اس نے ریڈیو بردار پجاری کو بھی نشانہ بنایا۔ وہ کربناک آواز نکالتا ہوا پیچھے گرا اور جھٹکے کی وجہ سے ریسیور کا تار ٹوٹ گیا۔ ڈیوڈ شا کے منہ سے گالی نکلی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے حیرت انگیز پھرتی سے جست لگائی اور اہرام کے دوسری طرف جا گرا تھا۔ میری چلائی دوسری گولی اہرام کو لگی تھی۔ ڈیوڈ شا نے گرتے ہی چلا کر باسو کو آواز دی۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ دشمن اندر گھس آیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر آیا۔ مارا جانے والا ایک سپاہی تھا۔ ایسا ہی ایک سپاہی سامنے سے آرہا تھا اور اس نے نیزہ اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس کے پاؤں کا نشانہ لیا اور گولی نے گھٹنے سے اس کا پاؤں الگ کر دیا تھا۔

مضروب سپاہی نیچے گر کر دھاڑیں مارنے لگا۔ باسو ایک کمرے سے نمودار ہوا اور اس کے ہاتھ میں اس کا بڑے سائز کا ریوالور تھا۔ میں اس کی تباہ کاری سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس لیے گن کا رخ باسو کی طرف کرتے ہوئے فائر کیا اور تیزی سے کمرے میں واپس آگیا۔ باسو کی چلائی گولی چوکھٹ سے لگی تھی۔ اگلی گولی نے دروازے میں سوراخ کر دیا اور میں بال بال بچا تھا۔ میں دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسری سمت سے فائر ہوا تو دروازے میں ایک سوراخ اور ہو گیا۔ گولی باسو سے مخالف سمت سے آئی تھی۔ پھر زینی کی آواز آئی۔ ''پاپا یہ شہباز ہے میں نے آپ سے کہا تھا۔''

''یہ وہی ہے۔'' ڈیوڈ شا کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ ''شہباز کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

میں نے پہلے سوچا کہ اسے جواب نہ دوں مگر پھر میں نے بولنے کا فیصلہ کیا۔ ''ہاں سن رہا ہوں۔''

''مجھے حیرت ہے تم یہاں تک چلے آئے۔''

''تمہیں صرف اسی بات پر حیرت ہے؟'' میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے دو طیارے اور کوئی پندرہ سولہ آدمی مٹی میں مل گئے ہیں کیا تمہیں اس پر تعجب نہیں ہوا۔''

''ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ایک طیارہ اتر گیا ہے اور اس کے آدمی جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے وہ جلد اوپر پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے دروازہ کی چٹخنی چڑھا دی۔ مجھے خطرہ تھا کہ کوئی گرنیڈ اندر ارسال نہ کر دیا جائے۔ اس صورت میں میرے پاس سوائے وفات پانے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ یہاں آڑ کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس بار ڈیوڈ شا کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''شہباز میں نے ہمیشہ تمہیں رعایت دی مگر تم نے اس کا غلط فائدہ اٹھایا۔''

''تم نے رعایت اپنے مطلب کے لیے دی اور میں اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔''

''اب تمہیں کوئی رعایت نہیں ملے گی یہی جگہ تمہارا مدفن بن جائے گی۔''

''دیکھتے ہیں کہ کس کا مدفن کہاں ہوتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کرنل کہاں ہے؟''

''وہ شدید زخمی ہے۔'' زینی نے جواب دیا۔ ''شہباز تمہیں اس کا حساب بھی دینا ہوگا۔''

''دو طیاروں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کل اس سے زیادہ تعداد میں طیارے آجائیں گے۔'' ڈیوڈ شا بولا۔ ''ایک بار میرے آدمیوں کو یہاں آنے دو۔''

ڈیوڈ شا بڑ نہیں ہانک رہا تھا وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مگر میں نے اسے الٹا ہی تاثر دیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے تمہیں کل تک مہلت مل جائے گی۔ یہ مت سمجھنا کہ صرف میں خطرہ میں ہوں۔ جلد یہاں موجود اور بھی لوگ معبد میں آجائیں گے اور تمہارے لیے کہیں جائے پناہ نہیں ہوگی۔''

''مجھے کسی کی فکر نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''شہباز میں اب بھی تمہیں ایک موقع دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہتھیار ڈال دو اور خود کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں، صرف قید رکھوں گا۔ جب میں یہاں کا حکمران بن جاؤں گا تو تمہیں واپس پاکستان بھجوا دوں گا۔''

''تم صرف ریناٹ جیسے لوگوں کو احمق بنا سکتے ہو۔'' میں ہنسا۔ ''کیا ہوا اس کا انجام، اگر میں نے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو مجھے اپنے انجام پر کوئی شبہ نہیں رہے گا۔''

میری بات مکمل ہوتے ہی باہر سے دروازے پر خودکار رائفل سے برسٹ مارا گیا۔ گولیاں سوراخ کرتی پار ہو گئیں اور میں دیوار سے لگے ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا۔ مگر میں نے ایک کربناک چیخ مارنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ یہ فائرنگ زینی نے کی تھی کیونکہ اسی کے پاس خودکار رائفل تھی۔ ڈیوڈ شا سے مجھے اس جرأت کی امید نہیں تھی۔ میں بے آواز لیکن تیزی سے دروازے کے دوسری طرف آیا۔ باہر اس برسٹ اور میری چیخ کے بعد خاموشی تھی۔ میں نے کوشش کی تھی کہ تاثر اصل رہے۔ ڈیوڈ شا جیسا عیار جانتا تھا

کہ میں گولی لگنے پر بھی ایک حد سے زیادہ واویلا نہیں کرسکتا ہوں۔ میں خفیہ راستے کے پاس آیا اور اب مجھے اس کو کھولنے والے طریقے کی تلاش تھی۔ یہ کمرا میرے لیے چوہے دان بن گیا تھا اس سے باہر بیک وقت کئی ہتھیار منتظر تھے کہ میری جھلک نظر آئے اور وہ موت کا دہانہ کھول دیں۔ میرے لیے دوسری راہ لازی تھی۔ یہاں دیوار سپاٹ تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ باہر سے زیبی کی آواز آئی۔ "وہ مارا گیا ہے؟"

ڈیوڈ شا نے کچھ کہا مگر اس کی آواز مدھم تھی میں سن نہیں سکا تھا۔ مگر اس نے یہی کہا ہوگا کہ جب تک وہ میری لاش آنکھوں سے نہ دیکھ لے وہ اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔ مجھے اس طرف سے بھی خفیہ راستے کا کوئی بٹن نہیں ملا۔ بنانے والوں نے یقیناً ایسا بنایا تھا جس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ باہر اب خاموشی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کے لیے اندر آنا ضروری نہیں تھا وہ باہر رہتے ہوئے بھی میرا خاتمہ کر سکتے تھے یا مجھے قابو کر سکتے تھے۔ قابو کرنے والی بات پر میں نے سوچا ہی تھا کہ باہر سے باسو نے فائر کیا اور دروازہ جو پہلے ہی خاصا سوراخ دار ہو گیا تھا اس میں ایک بڑا سوراخ نمودار ہوا اور فوراً ایک چھوٹا گیس بم اندر آ کر گرا۔ اس سے پہلے ہی گیس خارج ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے چند گہرے سانس لیے اور سانس روک لی۔ دس سیکنڈ سے بھی پہلے پورا کمرا گیس سے بھر گیا تھا۔

اچانک میرا سر چکرایا اور کمرے میں جلنے والی مشعل کا شعلہ جیسے بھڑکنے لگا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میں نے تو سانس نہیں لی پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں دروازے کی طرف بڑھا تو مجھے اپنے قدم من من بھر کے محسوس ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح میں دروازے تک پہنچا اور اسے کھولا۔ اب میں دروازے پر کھڑا جھول رہا تھا۔ گن پہلے ہی مجھ سے گر گئی تھی۔ زیبی ایک طرف کھڑی تھی اس نے مجھے دیکھ کر رائفل سیدھی کی تھی کہ ڈیوڈ شا نے اسے منع کیا۔ زیبی نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔ "پاپا یہ اس وقت قابو میں ہے۔ اگر اسے موقع مل گیا تو یہ بچ جائے گا۔ اس نے چالاکی سے کام لیا تھا اگر ہم اس کے دھوکے میں آجاتے تو؟"

"میں جانتا ہوں لیکن شہباز جیسے لوگ ایسی موت کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔ باسو اسے آگے لاؤ۔"

باسو آگے آیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور کسی بچے

کی طرح کھینچ کر آگے لے آیا۔ اس کے بعد اس نے ایک نیلے رنگ کے سیال سے بھری شیشی نکال کر اس کمرے کی طرف اچھالنا چاہی جہاں سے میں آیا مگر ڈیوڈ شا نے اسے روک دیا۔ ''رہنے دو یہ اسی طرف سے آیا ممکن ہے اس کا کوئی اور ساتھی بھی ہو۔ اس گیس کے ہوتے ہوئے کوئی اس طرف سے نہیں آسکتا ہے۔''

شاید نیلا سیال اس گیس کا توڑ تھا۔ زیبی نے کہا۔ ''گیس باہر آسکتی ہے؟''

''نہیں پندرہ فٹ کے بعد یہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کمرے سے باہر یہ اثر نہیں کرے گی۔''

میں اہرام کے دائرے کے پاس زمین پر پڑا ہوا تھا اور رفتہ رفتہ میرے ذہن پر تاریکی چھا رہی تھی۔

ڈیوڈ شا میرے پاس بیٹھا اور اس نے ایک چھوٹا سا اسپرے نکال کر میری ناک پر اسپرے کیا۔ جیسے ہی یہ سانس کے راستے میرے جسم میں داخل ہوا۔ میرے ذہن پر چھائی تاریکی چھٹنے لگی تھی۔ چند لمحے میں ذہن صاف ہو گیا مگر جسم پر چھائی سستی برقرار تھی۔ ڈیوڈ شا نے کھڑے ہوتے ہوئے اشارہ کیا تو باسو نے ایک کرسی لا کر رکھ دی اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ زیبی نزدیک کھڑی تھی اور کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو مجھے فوراً شوٹ کر دیتی۔ مگر اپنے باپ کے حکم سے مجبور تھی۔ باسو حسب معمول سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔ ڈیوڈ شا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

میں کوشش کر کے دائرے کی منڈیر سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''بہتر ہوں لیکن جسم قابو میں نہیں ہے۔''

''تم حرکت کر رہے ہو یہ بھی بڑی بات ہے ورنہ اس گیس کا شکار ہونے والے مفلوج ہو جاتے ہیں اور کئی گھنٹے بعد ہی حرکت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔''

میں کوشش کر کے مسکرایا۔ ''تم جانتے ہو میں کتنا ڈھیٹ ہوں۔''

ڈیوڈ شا سوچ رہا تھا۔ ''تم نے مجھے بہت تنگ کیا۔ اس وقت وادی پر میرا قبضہ مکمل ہو چکا ہوتا مگر تم نے میرے پروگرام میں رکاوٹ ڈال دی۔''

''افسوس کہ میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔''

''تم ہو بھی نہیں سکتے۔'' ڈیوڈ شا نے باسو کی طرف دیکھا اور اشارے سے شراب طلب کی۔ اس نے ایک سونے کا جام اٹھایا اور تالاب سے بھر کر اسے شراب دی۔

''ڈیوڈ شا بہت سی باتوں کا فیصلہ آنے والا وقت کرتا ہے ہم پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''میں کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے پرتکبر لہجے میں کہا۔ ''میرا علم کہتا ہے کہ میں اسی وادی میں رہوں گا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ تالاب سے کراہت آمیز بو اٹھ رہی تھی مگر میں اس کی منڈیر سے دور ہٹ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا اور اگر مجھے ٹیک نہ ملتی تو شاید میں گر جاتا۔ ڈیوڈ شا جیسے دشمن کے سامنے مجھے زمین پر پڑے رہنا گوارہ نہیں تھا۔ اس لیے کراہت کے باوجود تالاب کی منڈیر سے ٹکا رہا۔ ''اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟''

''میں تم کو دکھاؤں گا کہ میں جلد اس وادی کا حکمران بن جاؤں گا اور جب میں حکمران بن جاؤں گا تو پہلا حکم تمہاری سزا کا جاری کروں گا۔ تمہیں آرگون کے شاہی کمپلیکس کے سامنے میدان میں وادی کے تمام لوگوں کو جمع کر کے پھانسی دی جائے گی۔'' اس نے اطمینان سے اپنا ارادہ بتایا جیسے معمول کی کوئی بات کر رہا ہو اور میں نے بھی یوں سنا جیسے یہ میری موت کی نہیں کسی تقریب کی بات کی جا رہی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔

''تمہارا ارادہ تو سمجھ میں آرہا ہے لیکن یہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہو جائے گا۔''

''تم فکر مت کرو سب کچھ تمہاری توقع سے بھی پہلے نمٹ جائے گا۔ ایک بار مطلوبہ تعداد میں میرے آدمی یہاں آجائیں تو اس کے بعد مشکل سے چوبیس گھنٹے میں صرف وہی لوگ زندہ ہوں گے جو میرے قدموں میں جھک کر زندہ رہنا چاہتے ہوں۔''

میں ایک ٹک ڈیوڈ شا کو دیکھ رہا تھا۔ ''اس وقت مجھے تمہارے آباؤ اجداد جنہوں نے ایک دنیا کو اپنی کالونی بنا لیا تھا۔ بہت رحم دل اور انسانیت پر یقین رکھنے والے لوگ لگ رہے ہیں۔''

ڈیوڈ شا ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔ ''ایسا نہیں ہے، اقتدار کے لیے انسان ہمیشہ سے انسانوں کا خون بہاتا رہا ہے۔ یہاں بھی سات آٹھ ہزار لوگ مارے جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔''

''بہت فرق پڑے گا۔ وادی میں بسنے والوں کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور تم جنہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی بات کر رہے ہو وہی یہاں کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ عورتیں، بچے اور بوڑھے بچیں گے۔''

ڈیوڈ شا نے جام خالی کر کے باسو کو تھمایا کہ وہ دوبارہ

ابھرے اور بولا۔ ”دوسری جنگ عظیم میں، جرمنی، جاپان اور روس کا نوجوان طبقہ موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور پھر بچ جانے والوں نے اپنے ملک کو سنبھالا تھا۔ جرمنی میں میں نے ستر اسّی سال کے بوڑھے مردوں اور عورتوں کو سخت مشقت والے کام کرتے دیکھا۔ تم دیکھو گے وادی میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ ایک بار صفائی کے بعد میں یہاں جدید ٹیکنالوجی لاؤں گا اور چند سال بعد یہ دنیا کا ایک جدید ترین ملک ہوگا اور یہاں کا حکمران میں ہوں گا۔“

”تم بھول رہے ہو یہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کسی ملک کا دعویٰ نہ ہو۔“

”اس جگہ نہیں ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اگر تمہارا اشارہ چین کی طرف ہے تو جب تک اسے پتا چلے گا یہاں مغربی طاقتوں کا مشترکہ قبضہ ہو چکا ہوگا۔ یہاں کے باشندے اس قبضے کی توثیق کریں گے اور میں یہاں کا حکمران قرار پاؤں گا۔“

میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا۔ میں رفتہ رفتہ ڈیوڈ شا کے مقاصد کے بارے میں جانتا جا رہا تھا اور جب مجھے لگتا کہ میں سب جان گیا ہوں تو اچانک ہی کوئی نئی چیز سامنے آجاتی تھی۔ اس بار بھی نیا سامنے آیا تھا۔ اب تک میں اسے ڈیوڈ شا کا اپنا منصوبہ سمجھ رہا تھا مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اصل میں جدید استعمار کے ہی ایک منصوبے پر عمل درآمد کر رہا ہے اور اس کا بنیادی مقصد چین کے ابھرتے خطرے کا مقابلہ کرنا تھا۔ مغرب عرصے سے چین کی سرحدوں کے آس پاس اڈے حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جاپان، کوریا اور تائیوان میں اس کے اڈے موجود ہیں۔ یہی ممالک چین کے خلاف مغربی حصار کا اہم ترین حصہ ہیں۔ مگر چین کی مغربی، جنوبی اور شمالی سرحدوں پر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ وسطی ایشیائی ممالک جن پر ایک عرصے سے نظر تھی اب کے چین اور روس دونوں سے تعلقات بہت اچھے ہیں۔

ایک زمانے میں کشمیر اور لداخ پر بھی نظر تھی مگر وہاں جاری آزادی کی تحریک نے انڈیا اور مغرب دونوں کے لیے مشکل کر دیا ہے کہ وہاں چین کے خلاف کوئی فوجی اڈہ بنا سکیں۔ انڈیا اگرچہ مغرب سے بھرپور فائدے اٹھا رہا ہے لیکن وہ چین کے خلاف حقیقی آلہ کار بننے پر راضی نہیں ہے۔ پاکستان چین کا سب سے نزدیکی اتحادی اور با اعتماد دوست ہے۔ دونوں ملک ایک دوسرے پر اپنی مرضی مسلط کیے بغیر ایک دوسرے کے بے لوث کام آتے ہیں۔ مغرب تمام تر کوشش کے باوجود پاکستان کو چین سے دور کرنے میں ناکام رہا۔ آنے والے وقتوں میں یہ دوستی اور اتحاد مزید مضبوط ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس وقت اقتصادی راہداری کا کوئی ذکر نہیں تھا مگر جلد یہ حقیقت بننے جا رہی ہے۔ ایسے میں مغرب چین کے اطراف میں زیادہ سے زیادہ اڈے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وادی پر تسلط کی کوشش ایک مثال ہے۔ مشرق میں فلپائن، سنگاپور اور کسی وقت میں ہانگ کانگ بھی مغرب کے اڈے تھے۔ لیکن اب چین کی ترقی کا مرکز اس کے مغربی صوبے ہیں۔ جو مغرب کی پہنچ سے دور ہیں اور وہ یہاں تک پہنچنے کے لیے بے چین ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ ڈیوڈ شا نے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے دماغ صرف مغرب والوں کے پاس ہے اور وہی سوچ سکتے ہیں؟“ میں نے کسی قدر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”اگر تم لوگ سازشوں میں دماغ لڑا سکتے ہو تو کیا ہم ان کے توڑ کے لیے نہیں سوچ سکتے؟“

”سوچ ضرور سکتے ہو مگر تم لوگ صرف سوچ سکتے ہو۔ عمل نہیں کر سکتے۔“

”وہ وقت دور نہیں جب عمل بھی ہوگا۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”تم لوگ اپنے عمل سے ہمیں سبق دے رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں آنکھیں کھول کر اپنے آس پاس دیکھنا چاہیے کہ جو آگ تم دوسرے ملکوں میں لگاتے رہے ہو وہ بالآخر تمہارے گھر تک پہنچ گئی ہے۔“

”یہ سب عارضی معاملات ہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”جب ہم گڑبڑ کرنے والے مراکز پر حاوی ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں ہنسا۔ ”آدمی جتنا دور کا سوچتا اور منصوبے بناتا ہے ان میں گڑبڑ کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہوتا ہے لیکن ابھی تک تو سب کچھ ہماری مرضی سے ہو رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں ڈیوڈ شا سے بین الاقوامی سیاست یا مغرب کے عزائم پر بات کرتا۔ میں اس سے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں روبیر اور دوسروں کے بارے میں سوچ رہا تھا اگر وہ اس طرف سے آتے تو وہ بھی گیس کا شکار ہو جاتے اور ضروری نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا انہیں میری طرح زندہ چھوڑ دیتا۔ وادی کے لوگوں کے لیے وہ جیسے عزائم رکھتا تھا۔ اس کا بہت زیادہ امکان تھا

کہ وہ انہیں مروا دے گا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے ایک طویل قامت اور وجیہہ شخص نمودار ہوا جس نے رینالٹ کی خاص سیاہ والی وردی پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر سے کسی نے کہا کہ وہ شاہین ہے۔ وہ آگے آیا اور مؤدبانہ انداز میں ڈیوڈ شا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ شا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”اب میرے پاس صرف ایک آدمی رہ گیا ہے۔“

”فکر مت کرو جس آدمی سے ہمیں خطرہ تھا وہ یہ ہے۔“ ڈیوڈ شا نے میری طرف اشارہ کیا تو اس کے چہرے پر نفرت آ گئی۔

”شہباز، کاش اسے میں اپنے ہاتھ سے مار سکوں۔“

”تم نے اپنی وفاداری سے خود کو انعام کا مستحق ثابت کر دیا ہے۔“ ڈیوڈ شا مسکرانے لگا۔ ”میں نے اس سے وعدہ کیا ہے جب میں یہاں کا حکمران بنوں گا تو پہلا حکم اس کی سزا کا جاری کروں گا۔ تم اسے اپنے ہاتھ سے پھانسی دو گے۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی زبان بول رہا تھا اور ڈیوڈ شا انگریزی میں جواب دے رہا تھا مگر دونوں ایک دوسرے کی بات بہ خوبی سمجھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ شاہین ہے؟“

”ہاں یہ شاہین ہے۔“

”یہ مجھے اپنے ہاتھ سے مارنے کی خواہش کر رہا ہے۔ اتفاق سے اس کے بارے میں ایسا ہی وعدہ میں نے بھی کسی سے کر رکھا ہے۔“

”رو بیر۔“ شاہین حقارت سے بولا۔ ”وہ کیا ہے جو شاہین کی موت چاہتا ہے۔“

”وہ بہت کچھ ہے جلد تم جان جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے انسان کو مار کر کبھی خوشی نہیں ہوتی چاہے وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر میں نے تمہیں مارا تو یقین کرو مجھے بہت خوشی ہو گی۔“

”دیکھتے ہیں کہ کون کسے مار کر خوش ہوتا ہے۔“

”اب تم جاؤ اور نیچے مستعدی سے پہرہ دو۔“ ڈیوڈ شا نے اسے حکم دیا تو وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈیوڈ شا نے کہا۔ ”یہ اس وادی میں میرا نائب ہو گا کیونکہ یہ شیطان جیسا خود غرض اور مفاد پرست ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر یہ اپنے باپ کو بھی قتل کر سکتا ہے۔“

”یقیناً، تمہارے مطلب کا آدمی ہے۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”ویسے یہاں موجود پجاریوں کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”انہیں میں سب سے پہلے قتل کروں گا اور لوگوں کے سامنے ختم کروں گا تا کہ ان کے دلوں سے پجاریوں اور ان کے دیوتا کا سحر نکل جائے۔“

میرا اندازہ درست نکلا تھا ڈیوڈ شا کام نکلتے ہی پجاریوں کا کام بھی تمام کر دیتا۔ دیوتا کے ذکر پر مجھے خیال آیا اور میں نے سونے کے اہرام کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی سینتور کی علامت ہے؟“

ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔ ”بنیادی طور پر یہ قوت یا دولت کے پجاری ہیں۔ اگرچہ یہاں سونا وہ حیثیت نہیں رکھتا جو ہماری دنیا میں ہے مگر اس کے سحر سے یہ لوگ بھی نہیں بچ سکے۔ انہوں نے وادی میں موجود سارا سونا اپنے قبضے میں کر لیا اور سینتور کی علامت یہ اہرام ہے۔“

”یہ تعجب نہیں ہے کہ ایک ہی ساخت کی عمارات ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں۔“

ڈیوڈ شا مسکرایا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو یہ دنیا کا قدیم ترین اور خفیہ ترین مذہب ہے اور اہرام اس کی علامت ہیں۔ اسے صرف قدیم مصر میں سرکاری مذہب کا درجہ حاصل رہا ہے۔ مگر الہامی مذاہب کی آمد کے بعد یہ بظاہر ختم ہو گیا۔“

”لیکن یہ آج بھی موجود ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”میں نے اس بارے میں پڑھا ہے۔“

”پڑھا ہے۔“ وہ کسی قدر حقارت سے بولا۔ ”تم لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ دوبارہ آئے گا اور ساری دنیا پر اس کی حکمرانی ہو گی۔ اسی کے ماننے والے اس وقت دنیا کا نظام چلا رہے ہیں۔“

”اتفاق سے میں نے بھی ایسا ہی کچھ پڑھا ہے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ اگرچہ مجھے ڈیوڈ شا کا اعتراف سن کر تعجب ہوا تھا اس نے کتنی آسانی سے مان لیا تھا کہ یہ اسی خفیہ مذہب اور دنیا پر حکومت کرنے والے نظام کا حصہ ہے۔ مگر میں نے یہ بات ظاہر نہیں کی۔ ”جہاں تک آنے والے وقت کا تعلق ہے تو مجھے اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ اس نظام کو جلد موت آ جائے گی اور یہ سامنے ہی اس لیے آئے گا کہ فنا کے گھاٹ اتر سکے۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“ ڈیوڈ شا نے یقین سے کہا۔

”یقین سے مت کہو۔“ میں نے ہنس کر کہا اور اسی لمحے شاہین دوڑتا ہوا اندر آیا تھا اور اس کی صورت بتا رہی تھی

کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے۔ اس نے آتے ہی چلا کر کہا۔
''باہر سے کچھ لوگ اندر آئے ہیں وہ آپ جیسے ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور انہوں نے میرے واحد آدمی کو بھی مار دیا ہے۔''
ڈیوڈ شا اور زیلی بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ ان کا اضطراب نمایاں تھا۔ صرف باسو سکون سے کھڑا ہوا تھا۔ ڈیوڈ شا نے جیسے خود سے کہا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے کیا وہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''ڈیوڈ شا تمہارا خیال غلط ہے یہ وہ لوگ نہیں ہیں۔''
ڈیوڈ شا تیزی سے میرے پاس آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو تم جانتے ہو کیا؟''
''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آرگون کی طرف سے کوئی اتنی جلدی یہاں نہیں آ سکتا ہے۔''
''جھوٹ مت بولو، تم جانتے ہو کہ یہ کون ہیں؟''
''تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔ بہرحال وہ جو بھی ہیں اس وقت تمہارے دشمن ہیں ممکن ہے مقامی آدمیوں کو کچھ ہتھیار مل گئے ہوں۔''
''وہ مقامی نہیں ہیں۔'' شاہین نے کہا۔ ''وہ آپ کی طرح باہر سے آئے ہوئے لگ رہے ہیں۔''
''باسو اور زیلی تم انہیں دیکھو۔'' ڈیوڈ شا نے انہیں حکم دیا اور خود تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ باسو اور زیلی نے اسلحہ سنبھالتے ہوئے باہر کا رخ کیا تھا۔ اس سفر کے دوران زیلی بہت بھاری گرم کپڑوں میں ملفوف رہی تھی اور اسے اپنی جسمانی نمائش کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وادی میں آنے کے بعد اس نے اب اپنی پسند کا لباس پہن لیا تھا۔ اس وقت وہ بہت ٹائٹ جینز اور اسکن فٹ سلیولیس بنیان میں تھی جس میں اس کے فگرز زیادہ ہی نمایاں تھے۔ شاہین نے اسے للچائی نظروں سے دیکھا تھا اور جب اسے احساس ہوا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں تو وہ کھسیا گیا۔ اب وہاں وہی تھا۔ وہ چلتا ہوا میرے پاس آیا اور اچانک اس نے میرے بائیں پہلو پر ٹھوکر ماری۔ تکلیف تو زیادہ نہیں ہوئی لیکن میں لڑھک گیا تھا۔ میں پھر سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی دوسری ٹھوکر نے پھر مجھے لڑھکا دیا۔ اس نے جھک کر زہریلے لہجے میں کہا۔
''تم کیا سمجھتے ہو خود کو؟''
''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن اس کی وجہ سے میری جسمانی بے حسی بھی کم ہو رہی تھی۔ ''میری نظر میں تمہاری اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔''
''جلد ہو جائے گی۔'' اس نے کہتے ہوئے مجھے لگاتار کئی ٹھوکریں ماریں اور میں بے سدھ ہی رہا لیکن اس کی ایک ٹھوکر جو پسلی پر لگی تھی اس نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ میں کراہا تو اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ ''جس طرح تم میرے سامنے بے بس ہو جلد اسی طرح روبیہ بھی میرے سامنے بے بس ہو گی اور میں اس سے کسی کھلونے کی طرح کھیل کر اسے ایک طرف پھینک دوں گا۔''
''یہ موقع تم کو پہلے بھی ملا ہو گا؟''
''ہاں لیکن اس وقت مجھے ایک شریف محبوب کا کردار ادا کرنا تھا۔ یقین کرو میں نے خود پر بہت مشکل سے قابو پایا۔ تم جانتے ہو کہ وہ کتنی حسین لڑکی ہے۔'' شاہین کا لہجہ کہتے ہوئے شیطانی ہو گیا تھا۔
''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''
شاہین نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''لگتا ہے تم بھی اس کے چکر میں ہو۔''
''ہر ایک کو اپنی طرح مت سمجھا کرو۔'' میں نے اپنی جسمانی حالت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ باہر کہیں فائرنگ ہو رہی تھی تو اس کی آواز یہاں تک نہیں آ رہی تھی۔ شاہین چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر وہ ہال کی طرف آنے والی راہداری میں چلا گیا۔ شاید وہ صورت حال دیکھنے گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کوشش کی تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میرے ہاتھ قابو میں تھے۔ اگرچہ انہیں اٹھانے میں دشواری کا سامنا تھا۔ میں مسلسل انہیں ہلاتا رہا۔ پاؤں سمٹ رہے تھے لیکن ان میں اس سے زیادہ زور نہیں آ رہا تھا۔ شاہین شاید پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کا چہرہ زیادہ متفکر تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ آنے والوں کو روکنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے تمہارا فیصلہ اب مجھے ہی کرنا ہو گا۔''
میں چونکا اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اگرچہ حرکت کر رہا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اس سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ شاہین مسلح تھا اور اس کے پہلو سے دو عدد سنگی چاقو لگے تھے۔ اس نے ایک چاقو نکالا اور میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔''
میں یوں مسکرایا جیسے بے بسی کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کر سکوں گا۔ میرے انداز پر وہ بھیانک انداز میں

مسکرایا۔ اس نے جھک کر میرا بایاں شانہ پکڑا اور چاقو میرے سینے کی طرف لا رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آئے۔ ایک ہاتھ سے میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چکنے میں اڑسا ہوا دوسرا اسٹیل چاقو نکال لیا۔ فطری طور پر اس کی ساری توجہ اور زور اپنے دائیں ہاتھ میں موجود چاقو پر تھا۔ میں اس کا چاقو والا ہاتھ کمزور سے انداز میں تھاما تھا اور اس نے زور لگایا تو وہ خود بھی نیچے آیا تھا۔ جب تک وہ میرے اصل عزائم سے واقف ہوتا۔ میں نے دائیں ہاتھ کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے نیچے سے چاقو اس کے جسم کے نازک ترین مقام یعنی حلق میں اتار دیا۔ میرا ہاتھ کمزور تھا اور میں اپنی پوری قوت استعمال نہیں کر سکتا تھا اس لیے حلق ہی مناسب مقام تھا۔

شاہین کو توقع نہیں تھی کہ میں ایسا کوئی وار کروں گا۔ اسے غالباً چاقو نکالے جانے کا علم بھی نہیں ہوا تھا۔ چاقو کئی انچ تک اس کے گلے میں نرخرے کے مقام پر اندر گھس گیا اور شاہین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس دوران میں اس کا دایاں ہاتھ میرے سینے تک آ گیا تھا اور اس کے چاقو کی نوک میری سینے کی کھال میں اتر گئی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔ اس نے حلق میں گھسا چاقو نکالنے کی کوشش کی اور چاقو کے نکلتے ہی خون کا فوارہ بلند ہوا تھا۔ بیشتر خون مجھ پر گرا اور کچھ خود اسی کے لباس پر آیا۔ وہ لڑکھڑایا، پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر نیچے ڈھیر ہو گیا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا مگر مرتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم نے دیکھ لیا کہ کون کس کے ہاتھ سے مرا۔ میں نے رد بیر سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔"

اسی لمحے ڈیوڈ شا نیچے سے اندر آیا اس کے ساتھ کمزور سا مہا پجاری آئی کون تھا۔ ڈیوڈ شا نے اپنے ہی خون میں غلطاں اور ایڑیاں رگڑ کر دم توڑتے شاہین اور مجھے دیکھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ اس نے چیخ کر باسو کو آواز دی... دوسرے لمحے باسو اور زینی وہاں آئے تھے۔ وہ الٹے قدموں آئے تھے جیسے پیچھا کرنے والوں کا مقابلہ کر رہے ہوں۔ ڈیوڈ شا کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نیچے آنے والے نہ صرف اس کی توقع کے خلاف تھے بلکہ شاید وہ اب اوپر آنے والے تھے۔ ڈیوڈ شا نے میری طرف اشارہ کرتے باسو سے کہا۔ "اسے شوٹ کر کے جلدی سے آؤ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

ڈیوڈ شا کہتے ہی آئی کون اور زینی کے ساتھ ایک کمرے میں گھس گیا۔ ڈیوڈ شا کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ باسو اپنا خوفناک پستول سنبھالتا ہوا میری طرف آیا اور میں سنبھل کر پیچھے ہوا۔ ابھی تک میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوا۔ اگر ہوتا تب بھی باسو کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ سے بھی کافی تھا۔ میری نظر اس کے پستول پر تھی۔ یہ اس کی جسامت کے حساب سے تھا اور اس کی گولی شاٹ گن کے بلٹ سے کم مہلک نہیں ہوتی ہے۔ نزدیک آ کر باسو نے پستول کا رخ میرے سینے کی طرف کیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر آ چکی تھی۔ میں نے زیر لب کلمہ طیبہ پڑھا۔ کیونکہ موت برحق ہے اور ہر ذی روح کو آنی ہے۔ میرا واسطہ اس سے زیادہ ہی پڑتا رہتا تھا اس لیے میں ہر وقت موت کے لیے تیار بھی رہتا تھا۔ باسو مجھ سے مشکل سے چار فٹ کے فاصلے پر تھا اور اتنی دوری سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم مجھے مار دو گے؟"

"ڈیوڈ شا کا حکم ہے۔" اس نے غراتی آواز میں کہا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ حکم سے مجبور ہے ورنہ وہ مجھے مارنا نہیں چاہتا۔ میں نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے تم اپنے آقا کے حکم پر عمل کرو۔"

باسو نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا تو میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ فوری گولی چلا دے گا مگر کئی سیکنڈ گزرنے کے بعد بھی جب گولی نہیں چلی تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ باسو کے پتھر جیسے سپاٹ چہرے پر مجھے پہلی بار تذبذب کے آثار دکھائی دیے۔ اچانک نیچے سے آنے والے سلوپ کی طرف سے آہٹ ہوئی اور باسو نے بھڑک کر پستول کا رخ اس طرف کیا تھا۔ وہاں سے کوئی نمودار ہوا تھا کہ اس نے فائر کیا مگر آنے والا فوری واپس گیا تھا اور پھر اس نے رائفل اندر کر کے برسٹ مارا۔ میں لڑھک کر تالاب کے منڈیر کی آڑ میں ہو گیا۔ باسو نے دوسرا فائر کیا اور اس کمرے کی طرف بھاگا جس میں ڈیوڈ شا، زینی اور آئی کون گئے تھے۔ مگر ابھی وہ درمیان میں تھا کہ رائفل دوبارہ نمودار ہوئی اور میں نے چلا کر کہا تھا۔ "فائر مت کرنا۔"

(جاری ہے)

(نجمی رحمٰن، برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

نورین فاطمہ.........میرپور آزاد کشمیر

متاعِ دردِ محبت جسے عطا ہو جائے
فقیر بھی ہو تو وہ بادشاہ ہوتا ہے

ارشد نیاز.........جھنگ صدر

مایا نگر میں وہ ہی چاند بنے پھرتے ہیں
جن لوگوں کا اُجلا تن ہے میلا من ہے

رابعہ کنول.........اسلام آباد

میرے تیرے ملنے کو معجزہ کہہ رہا تھا لیکن
تیرے بچھڑنے کا سانحہ بھی کمال گزرا

تبسم عطاری.........کراچی

مسجد کی صفوں سے کبھی مقتل کی طرف دیکھ
توحید تجھے شبیرؑ کے سجدے سے ملے گی

(معراج محبوب عباسی ہری پوری ہزارہ کا جواب)

ناصر عباس.........کوٹری

ناصر مجھے چھیڑیں گے بہت چاندنی و پھول
آیا نہ میرا دوست اب کے برس بھی

فیضان اختر.........فیصل آباد

نئے برس میں اک پل بھی نہ آئے جدائی
نئے برس میں شاد تو دل کا گلشن رکھنا

(حیا اکرام ملتان کا جواب)

سید مسرت حسین رضوی.........کراچی

یادِ ماضی بھی اک عذاب سہی
دل کی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں

حبیب حسین.........جھنگ

یہ ورق ورق تیری داستاں یہ سبق سبق تیرے تذکرے
میں کروں تو کیسے کروں الگ تجھے زندگی کی کتاب سے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان ہارون آباد کا جواب)

نسیم زہرہ.........حیدر آباد

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

انور حسن شاہ.........فیصل آباد

بتانِ شوخ جب تازہ ستم ایجاد کرتے ہیں
خدا کا شکر ہے پہلے ہمیں کو یاد کرتے ہیں

(عمران جونانی کراچی کا جواب)

آفاق صدیقی.........کراچی

ازل سے ہجر زدہ شوقِ دید سے بیکل
تمہاری راہ میں نظریں بچھا کے بیٹھ گئے

عبدالحکیم شمر.........اورنگی کراچی

آتے ہیں عجب انداز سے وہ ڈالے ہوئے رخ پہ بالوں کو
زلفیں جو اٹھیں ایک شور ہوا سورج نے گہن کو چھوڑ دیا

انجم توقیر.........اٹک

اسے کہنا کہ لوٹ آئے سلگتی شام سے پہلے
کسی کی خشک آنکھوں میں صدائیں رقص کرتی ہیں

(ناہید ادریس ٹورنٹو کینیڈا کا جواب)

عائشہ اعوان.........رحیم یار خان

آتے ہوئے خوش آمدید جاتے ہوئے خدا حافظ
یہ دو لفظ ہی کافی ہیں اگر کوئی پیار سے کہہ دے

مظفر گڑھ.........تبریز عارف

اس شہر میں رہیں گی یوں ہی کیا عداوتیں
کیا گلستاں میں خار کا منظر رہیں گے ہم

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

شریف الحسن.........چنیوٹ

ہم جو لاکھوں ستم اٹھا آئے
پیار پر تو کبھی نہ پچھتائے

عباس علی پیاسا.........بہاولپور

ہمیشہ اک ہی تصویر رہ جاتی ہے آنکھوں میں
یہ پہلا ہجر ہے اور ایسا منظر کب بدلتا ہے

(مرزا حمزہ بیگ حیدر آباد کا جواب)

فلک شیر ملک.........رحیم یار خان

تو نے دیکھا ہے کبھی اک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد

(عبدالحکیم شر کراچی کا جواب)

ابوطالب غزالی.........خان پور

اس کے ہر خط سے ٹپکتا تھا محبت کا چلن
کتنے ناشائستہ جملے میری تحریروں میں تھے

(اے نیاء فہیم کا جواب)

ایم عمران جونانی.........کراچی

تمام عمر مرا دم اسی دھواں میں گھٹا
وہ چراغ تھا میں نے اسے بجھایا ہے

(مرزا ہادی بیگ لطیف آباد)

شہباز اکرم.........لاہور

میری نگاہ شوق کی افتادگی نہ پوچھ
تو دیکھ تیرے چہرے میں کیا رنگ بھر گئی

سلطان احمد.........جہلم

مقید کردیا یہ کہہ کر سانپوں کو سپیروں نے
یہ انسانوں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے

(فلک شیر رحیم یار خان کا جواب)

عنایت علی.........مظفر گڑھ

یہ دل کا فسانہ عجب ہے طفیل
زبانِ نظر سے کہا جائے ہے

(عشرت صدیقی کا جواب)

عجمی رحمٰن.........(نواب شاہ)

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

(نازش احمد کا جواب)

شاہد ریاض چن.........مونڈ کا مظفر گڑھ

میری محبت کی حقیقت تم کیا جانو
سر جھکایا تو تجھے مانگا ہاتھ اٹھایا تو تجھے پایا

ہیتہ عطاری.........میر پور خاص

میں تیری سرد مہری سے ذرا بدل گئی ہوں
مرے دشمن ترا یہ وار بھی کاری نہیں ہے

(عنبرین رضوی کا جواب)

عبدالجبار روی انصاری.........لاہور

یادوں کے بھنور سے اب تو نکل آؤ
بہت زخم سہہ لیے ہیں اب خود کو نہ تڑپاؤ

وارث شاہ.........راولپنڈی

یہ حدیں نہ توڑ دینا میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا میرے حافظے میں رہنا

(عبدالجبار روی انصاری لاہور کا جواب)

نصیرالدین.........کراچی

نہ منزلوں کا نشاں ہے نہ رہبروں کا پتا
غبار راہ پریشاں ہے کارواں کے لیے

(نجمہ الیاس اسلام آباد کا جواب)

زوبیہ الماس.........کراچی

اب کے سال بھی لکھا میں نے اس کے نام کا دیباچہ
میرے ذکر سے خالی رکھے جس نے اپنے باب تمام

الماس طیبہ.........دادو

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

عقیل احمد.........لاڑکانہ

امید کی کشتی کو ڈبویا نہیں کرتے
ساحل ہو اگر دور تو رویا نہیں کرتے

(نصرت علی جہلم کا جواب)

فلک شیر ملک.........شاہ کوٹ

اور پھر کرنا پڑا گوشت سے ناخن کو جدا
یہ ضروری تھا کسی زخم کو بھرنے کے لیے

انعم اسماعیل.........رحیم یار خان

جنبی شخص نے چپکے سے جو کھولیں آنکھیں
میں نے دیکھا کہ در و بام پہ بولیں آنکھیں

(محمد فیضان بخاری کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری.........سرگودھا

اک شام وہ آئے تھے اک رات فروزاں تھی
وہ شام نہیں لوٹی وہ رات نہیں آئی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہورہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

علمی آزمائش 123
30 مارچ 2016ء

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2016ء تک علمی آزمائش 123 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 123

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 27 مارچ 2016 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

والی لوہارو کے ہاں پیدا ہوئے۔ دہلی اور کراچی میں تعلیم مکمل کی۔ 1948ء میں وزارت تجارت میں شمولیت اختیار کی اور 1965ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ کالم نگاری کی۔ شاعری میں مقام بنایا۔ سینٹ کے رکن بھی رہے۔ گزشتہ دنوں کراچی میں انتقال ہوا۔

علمی آزمائش 121 کا جواب

شاہد احمد دہلوی 22 مئی 1906ء میں پیدا ہوئے۔ والد اردو ادب میں بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ خود بھی نثر نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد دہلی سے پاکستان ہجرت کی۔ ایک بڑے ادبی رسالے کے مدیر رہے۔ جوش ملیح آبادی سے قلمی جنگ چلی تو ایک پورا خاص نمبر جوش کے رد میں نکال دیا۔

انعام یافتگان

1۔ مسز عفت جہاں۔ اسلام آباد 2۔ ناصر علی شہاب۔ فیصل آباد 3۔ امین الدین۔ کراچی

4۔ زریں صاحباں۔ لاہور 5۔ ادریس مسیح۔ کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے زینب رند، رفیق خانزادہ، اشتیاق قمر، بابو دبن، سلطان سومرو، زریاب خان، اصغر حسین، وقار الحسن، نوشین مبارک علی، مرزا امشال حیدر، اطہر علی بخاری، نعمت حسین، فہم عطاری، معراج علی سید، فائق علی سید، احباب حسن خان، کلثوم بھٹو، فیضان باری، عذرا حسنین، شمس الدین شمسی، نواز حسن، عارف علی پنہور، تقی الہادی، فیض مبارک، آغا شیراز، نعیم حیدر ملک، امشال فاطمہ، نصیر الدین فاروقی، سلطان اختر زین العابدین۔ لاہور سے زریاب علی خان، کاشف عباس، علی محمد

شاہ، عدیل اختر، فارغ علوی، محسن علی، ملک شیراز، اختر عباس رضوی، نعمان اشرف، کلثوم ملک، شیخ عنایت علی، علی قلی خان، اشتیاق علی فرحت، فاریہ ملک، فرزانہ رفیق۔ ملتان سے فرحت مرزا، نجمہ عباس، توصیف اختر، شہباز تبریزی، زاہد علی، حسن علی خان۔ اسلام آباد سے عنایت علی عباسی۔ فرقان امجد خان، کلثوم ترمذی، نعیمہ شیراز، توصیف احمد۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، عائشہ نیاز، مجاہد علی، فرقان حسن، فاطمہ حسن، عرفان حسن، وردہ سلیم، نصیر الدین، مہوش نیاز، انعام الحسن، عنایت حسین رزاقی، شجاع عباس، اریبہ بٹ، نصیر الدین اشرفی، فضل خان، کلیم اللہ، کاظم حسن، موسیٰ علی، مظفر شمسی۔ رحیم یار خان سے فلک شیر ملک (شاہ گڑھ)، عائشہ اعوان (ترنڈہ)۔ حیدرآباد سے عاشق حسین انصاری، کاشف حسین، اشفاق میمن، حسین علی، نصر اللہ بھٹو، ناہید حسین بٹ، کائنات مرزا، اشرف علی، وحید احمد، تاثیر علی، فہیم اللہ نیازی، محب اللہ آفریدی، سلطان شاہ، نصیر الدین، منصور حسن خان، جاوید انصاری، صدیق علی خان، عمر حیات پہلوان، بیگم اختیار بیگ، عنایت حسن، فہیم الدین، اسحاق اللہ سموق۔ ڈیرہ غازی خان سے ابرار ظفر، یحییٰ شاہ، ندیم ملک، تبریز خان۔ واہ کینٹ سے نصیر عباس، عمران مصطفیٰ۔ لالہ موسیٰ سے ارشد محمد ولی، ناصر حسن، انوار نواز۔ کھاریاں سے ناصر جمشید۔ بہاول نگر سے شاہ ولی اللہ شاہ۔ کوٹلی آزاد کشمیر سے لیاقت علی۔ خانیوال سے اسماء توحید، سرفراز ملک، امتیاز الدین۔ مظفر گڑھ سے فرحت اسلام خان، عباس حیدر، عرفان علی، عبدالخالق، رفعت الدین، ناصر خان (شہر سلطان)۔ کوٹ ادو سے فہد حسن، عزیز خان، نکہت آرائیں۔ کوئٹہ سے کاظم چنگیزی، نوشین فاطمہ کاظمی، شجاعت خان، امتیاز شاہ، ولی اللہ مستونگ، عنایت اللہ خان۔ ہری پور سے نیابت خان، مجید اللہ، ناصر اشرف (کھلابٹ)۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن۔ صادق آباد سے عرفان علی خان۔ میانوالی سے حیات اللہ۔ سرگودھا سے عباس شاہ، عنایت بخاری۔ سیالکوٹ سے ظہیر اشرف، نجمہ فرید، یاسمین فرید۔ بنوں سے ابرار علی شاہ۔ منڈی بہاؤ الدین سے کشف احمد، یحییٰ مجاہد، لیاقت علی، صفدر ملک، اصغر علی پردیسی۔ ملک وال سے نوازش حسن۔ سکھر سے محمد اسلام بھٹو، عماد حسن، عباس علی، منور سلیم، ناصر وجاہت، شفقت خاقان تالپر، حبیب الرحمن، کریم خان۔ شکار پور ذیشان اکبر، درخشاں اقبال۔ آصفہ ہوتی، شگفتہ تحریم۔ میرپور خاص سے محمد فرقان، ضیا احمد، ناصر حسین، افتخار حسین، نوشین ملک۔ بھکر سے خوش بخت، نیاز ملتانی، فدا محمد، صاحب شاہ، افکار قریشی۔ ڈی آئی خان سے قمر الحسن، نازش سلطان، محمد وحید خان، نوازش علی۔ ڈی جی خان سے عبدالرحمن، اشفاق احمد، آفتاب علی نیازی۔ ملتان سے آصف علی قریشی، انیس امام، تبسم فرقان، اذان قریشی، سندس احمد، عرفانہ امام، ناصر اسلم، نصیر حسن، جمیل خان، انیس اقبال، نظیر حسین گیلانی، سندس احمد، صباحت عابدی، رانا کلیم، نسیم ضیائی، جاوید الحسن، مہتاب مرزا، سبب الملوک، فدا حسین، افضل خان، کاظم علی سید، نعمان بٹ۔ جھنگ سے فرقان شیخ، انیس احمد جاوید، امجد بخاری، عاصم سہیل، شاہ احمد، آس محمد، خالدہ فاروقی، ادریس محمد خان۔ شادی پور سے ہارون، نیاز بٹ، واثق علی، نورین اصغر۔ جلہ کنک سے مرزا کلیم احمد، اختر عباس، صولت حیات، اشرف علی۔ فیصل آباد سے منور سلیم، عباس علی اصفہانی، دلاور حسن۔ بدین سے عباس علی ساند۔ کماتاں سے سلیم کامریڈ۔ چکوال سے فرحین، عارف بٹ۔ بہاولپور سے مہناز اکرم ملک۔ بہاولپور سے کلیم بخاری، علی علی اوسط زیدی، ہارون محمد، توصیف خان، ملک اختر عباس، الیاس حسن، عباس حیدر، نبیل خان، زاہد علی، طٰہٰ حسن، الیاس اختر بٹ، صدیق حسن صدیقی، ظفر احمد ظفر۔ پشاور سے سردار سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، دریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زکی، باقر رضی طوری بنگش، ناہید سلطانہ، انور حسن خان، انجم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، داروغہ خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، محسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام۔ میرپور سے اے کے کاظم علی بھٹو۔ لاہور سے خاقان صدیقی، عباس بٹ عرف چھوٹا پہلوان، ظفر الحسین، فیضان بٹ، اسرار علی خان، انعام افضل، وسیم انصاری، نیاز فیضانی، حق فرید پراچہ، زاہد علی سید، نعمان خان، مغیث الدین، ارباب افضل رسول بخش، احمد پہلوان، رحمت اللہ خان، نوید شہباز، اشرف خان، محمد فیض بخش صدیقی، بتول زیدی۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، احمد شیراز، ظفر خانزادہ، سرفراز بٹ، وسیع الدین ہمدانی، احمد نیاز، عقیب الدین، عابد الدین، گل فراز میمن، ناہید اید، فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالوحید، نوشاد گجر، محمد حسین، سلمان نیازی، مسرت بٹ، نصیر نقوی، نعمان کلیم، عاجز ضیا عابدی، یاسین خان، اشرف اللہ، سبطین ظفر، بدر بگٹی، خاقان اچکزئی، ظہیر باری، عنبرین بلیجو، ضیا بلیجو، آفتاب بٹ، عنایت جعفری سید، مرزا دلدار حسین، کائنات سید، قیام حسین، گل بدین، نذر حسین عابدی، طفیل آفاق، اشرف علی، عثمان عثمانی، بدر علی ادریس، حسین ہارون، باسط علی۔ اسلام آباد سے نیلو شاہین۔

عزیزہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت
اس سے پہلے میں نے کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی. اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کہانی کو ضرور لگائیں تاکہ میرا حوصلہ بڑھے. جس واقعے کو میں نے کہانی کا روپ دیا ہے یہ میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے. اس میں دوسرے لوگوں کے لیے بھی بہت بڑا سبق ہے اس لیے اسے ضرور شامل کریں. یوں بھی یہ ایک انوکھا واقعہ ہے۔

عمران
(کوئٹہ)

میں روانگی کی تیاری پکڑ رہا تھا کہ ندا کا فون آیا اور یہ صبح سے اس کا تیسرا فون تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تک میں بذاتِ خود اس کے سامنے نہیں پہنچ جاؤں گا۔ اس کی کالز مسلسل آتی رہیں گی۔ میں نے اپنی آخری اشیا بیگ میں ڈالتے ہوئے کال ریسیو کی اور موبائل کو کان و کندھے کے درمیان دبالیا۔ ''جی فرمایئے؟''

''آپ نکل آئے؟'' ندا نے سوال کیا۔

''نہیں یار ابھی سامان پیک کیا ہے۔ بس نکلنے والا ہوں۔''

''اف آپ ابھی تک نکلے بھی نہیں ہیں۔'' وہ روہانسی سی ہوگئی۔

''یار تمہیں بتایا تو تھا کہ دس بجے آفس سے مجھے چیک ملے گا اور تب میں نکلوں گا۔ ابھی دس کہاں بجے ہیں۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں دس بجنے میں دس منٹ تھے۔

''تو ہاسٹل سے تو نکلیں نا۔'' اس نے کہا۔

''بس نکل رہا ہوں۔'' میں نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''نومی کیا کر رہا ہے۔''

''اللہ اللہ کرکے ابھی سویا ہے۔ صبح سے تنگ کر رہا تھا۔''

''اب اس کا باپ آکر تنگ کرے گا۔'' میں ہنسا۔

''باپ آئے تو۔'' ندا کی آواز میں شوخی آگئی۔ ''پھر دیکھنا کیسے بتاتی ہوں اسے۔ سب تنگ کرنا بھول جائیں گے۔''

''تو بس پانچ چھ گھنٹے صبر کرو۔ امید ہے میں چار پانچ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کمرے سے باہر آتے ہوئے اسے لاک کیا۔ ہاسٹل کی عمارت مل کے پاس ہی تھی بلکہ مل کی زمین پر تھی۔ یہ بہت بڑی ٹیکسٹائل مل تھی۔ چھ مہینے پہلے مجھے یہاں سپروائزر کی جاب ملی تھی۔ اگرچہ مل میرے آبائی شہر سے خاصے فاصلے پر تھی مگر مجبوری تھی۔ میں نے اسپننگ میں ڈپلومہ کیا تھا اور اس کے بعد یہ تیسری جگہ تھی جہاں میں جاب کر رہا تھا۔ دو جگہوں سے اس لیے جاب چھوٹی کہ وہ ملیں ہی بند ہوگئی تھیں۔ بجلی اور گیس کے بحران نے ٹیکسٹائل ملوں کا بھٹا بٹھایا ہوا ہے اور صرف وہی ملیں چل رہی ہیں جن کے مالکان کے پاس لگانے کے لیے پیسہ اور حوصلہ ہے۔ یہ مل بھی اس لیے چل رہی تھی کہ مقامی مارکیٹ کے لیے لان اور کاٹن کے پرنٹڈ سوٹ تیار کرتی تھی۔ یہاں دھاگہ سازی سے لے کر تھان کی تیاری تک سارا کام ہوتا تھا۔ بہت سے بڑے نام کے ڈیزائنرز جن کے سوٹ ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں وہ اسی مل سے اپنا مال تیار کراتے تھے۔

دو مہینے کی بے روزگاری کے بعد جب مجھے اس فیکٹری میں جاب ملی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ندا کا رو رو کر برا حال ہوگیا تھا۔ میں انٹرویو کے لیے دو دن باہر رہا تھا تو ندا کا چہرہ اتر گیا تھا۔ ہماری شادی کو ابھی ڈیڑھ سال ہوا تھا اور ہمارا چار مہینے کا بیٹا تھا۔ نعمان عرف نومی میں ہماری

جان تھی۔ خود مجھے بھی بیوی بچے کو چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ ایک تو نوکری اچھی تھی اور تنخواہ بھی اچھی تھی۔ دوسرے مل کے ساتھ ہی ہاسٹل تھا جہاں دوسرے شہروں سے آنے والے ورکرز ٹھہر سکتے تھے۔ تینوں وقت میس سے کھانا ملتا تھا۔ کوئی خرچ نہیں تھا اور تنخواہ پوری ہی بچ جاتی پھر اوور ٹائم بھی ملتا۔ ابھی تو خاص خرچ نہیں تھا مگر نومی بڑا ہوتا اور اس کی اسکولنگ ہوتی۔ پھر اللہ مزید اولاد دیتا تو اس کے خرچے الگ ہوتے۔ میں چاہتا تھا اس سے پہلے میں کچھ جمع کرلوں۔ ندا پہلے تو کسی صورت نہیں مان رہی تھی۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے منالیا۔ میں نے سمجھایا کہ ابھی مجھے جانے دو۔ میں وہیں کوئی مکان دیکھوں گا اور سال بعد اسے اور نومی کو وہیں بلالوں گا۔

ندا میری چچا زاد بھی ہے اور ہم ایک ہی قصبے اور گلی میں پل کر جوان ہوئے۔ مگر ہمارے ذہنوں میں کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ہمارا ایک رشتہ اور بھی ہوسکتا ہے۔ ندا مجھ سے تین سال چھوٹی ہے۔ جس سال میں نے ڈپلومہ کیا اسی سال اس نے میٹرک کیا تھا۔ چند مہینے بعد جب میری پہلی نوکری لگی تو اماں ابا نے جا کر پھپھو سے ندا کو مانگ لیا۔ پھپھو پہلے ہی اس رشتے پر راضی تھیں اور وہ خوشی سے مان گئیں۔ ان کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑی ردا کی شادی اس کی چچا کے بیٹے سے ہوئی تھی جو آرمی میں تھا۔ ندا کو اماں ابا نے مانگ لیا۔ پھپا اس وقت تک انتقال کر چکے تھے جب ندا چند سال کی تھی اور پھپھو نے بیوگی کا طویل عرصہ بہت ہمت اور حوصلے سے گزارا انہوں نے گھر میں سلائی کرکے اور ٹیوشن پڑھا کر گھر چلایا۔ کسی سے ایک روپے کی مدد نہیں مانگی۔

حالانکہ ابا کھاتے پیتے آدمی تھے اور بہن کے لیے بہت کچھ کرتے تھے مگر پھپھو نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح پھپھو کے سسرال والے بھی پیسے والے لوگ تھے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ ردا کو بچپن سے ہی اس کے چچا نے مانگ لیا تھا۔ کیونکہ وہ یہاں سے دور رہتے تھے اس لیے بچپن میں رشتہ کرنے اور اس کا اعلان کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ البتہ میرے اور ندا کے لیے ابا نے بات صرف پھپھو کے کان میں ڈالی تھی۔ انہیں یہ خیال تھا کہ ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے اور میرا پھپھو کے ہاں دن میں کئی بار آنا جانا ہوتا تھا۔ مجھے پھپھو سے شروع سے پیار تھا اور مجھے فکر لگی رہتی تھی کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہو اس لیے میں دن میں کئی بار جا کر پوچھتا تھا۔ اگر اماں کسی کام سے بازار بھیجتیں تو پھپھو سے بھی پوچھتا جاتا تھا۔ میرا اور ندا کا رشتہ عرصہ بعد مکمل کرلیا گیا تھا اور ظاہر ہے اس کے بعد میں پھپھو کے ہاں نہیں جاسکتا تھا۔ اگر جاتا تو ندا میری آواز سنتے ہی غائب ہوجاتی تھی۔

میرے تین بڑے بھائی ہیں اور جب میری شادی کا وقت آیا تو وہ سب شادی شدہ اور کئی کئی بچوں والے ہوگئے تھے اور اسی وجہ سے ہمارا بڑا سا گھر بھی ناکافی محسوس ہونے لگا تھا۔ بہ مشکل میرے لیے ایک چھوٹا کمرا نکلا تھا جس میں جہیز کا سامان کیا بیڈروم سیٹ بھی مشکل سے آیا تھا اور شادی کے چند مہینے بعد ہی میں پھپھو کے گھر شفٹ ہوگیا۔ یہ فیصلہ متفقہ تھا۔ سب سے پہلے پھپھو نے اماں اور ابا سے بات کی۔ ابا نے مجھ سے پوچھا کیونکہ میں ذرا خوددار قسم کا آدمی ہوں اور کسی بھی معاملے میں اپنے اوپر ہی انحصار کرتا ہوں۔ مگر مجھے پھپھو کا خیال تھا جو اب گھر میں بالکل اکیلی تھیں۔ اگرچہ ایک ہی گلی تھی اور وہ جب چاہتی ہمارے ہاں آجاتیں مگر اپنے گھر کی بات الگ ہوتی ہے۔ اس لیے میں مان گیا اور شادی کے چھ مہینے بعد میں اور ندا پھپھو کے پاس آگئے۔

ان دنوں ہمیں بچے کی خوش خبری ملی تھی۔ پھپھو نے سنا تو وہ بھی خوش ہوگئیں۔ ہمارے آنے سے گھر میں رونق آگئی تھی اور ان کا اکیلا پن دور ہوگیا تھا۔ ندا خوش تھی کہ وہ ماں کے پاس رہ رہی تھی اور سسرال بھی دور نہیں تھا۔ ہمارا تقریباً روز ہی چکر لگتا تھا۔ اماں ابا اور بھائیوں بھابیوں سے گپ شپ ہوتی تھی۔ ان دنوں میری پہلی ملازمت ختم ہوئی تھی۔ میرے بڑے بھائی احسان کی شہر کی مین مارکیٹ میں کپڑے کی شاپ تھی۔ ہم جس علاقے میں رہتے تھے یہ حساس سیکیورٹی علاقے میں آتا تھا۔ لیکن یہ چھوٹا سا شہر خاصا پرانا ہے۔ کسی زمانے میں یہ گاؤں تھا مگر پھر یہاں بجلی اور گیس کی سہولت آگئی۔ سڑکیں بن گئیں اور مکانات پکے اور جدید انداز کے ہوئے تو اب یہ علاقہ شہر لگنے لگا تھا۔ احسان بھائی نے اپنے تعلقات استعمال کیے اور مجھے ایک اسپننگ مل میں ملازمت مل گئی مگر یہ بھی زیادہ عرصے نہیں چلی اور مل ہی بند ہوگئی۔

میں دو مہینے بے روزگار رہا اور یہ خاصا مشکل وقت تھا۔ نومی ہوگیا تھا اور اس کی پیدائش پر خاصے اخراجات آئے تھے میں نے اب تک جو کمایا تھا وہ خرچ ہوگیا اور جب اچانک مل بند ہوئی تو میں خالی ہاتھ تھا۔ پریشانی تھی مگر پھپھو

اور اماں ابا نے مجھے حوصلہ تسلی دی۔ اباجی چپکے سے میرے ہاتھ پر رقم رکھ دیتے۔ اماں ندا اور نومی کے لیے کپڑے اور چیزیں لاتی رہیں۔ پہلے میں گھر میں راشن ڈلواتا تھا اور بل ادا کرتا تھا۔ نوکری نہ رہی تو پھپھو خاموشی سے یہ کام کرنے لگیں۔ بظاہر سب ویسے ہی چلتا رہا۔ کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر مجھے اندر سے بہت محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے میں نے بہت شدومد سے جاب کی تلاش شروع کی۔ بلا مبالغہ سینکڑوں جگہوں پر سی وی بھیجی اور درجنوں انٹرویو دیے۔ بالآخر میرے گھر سے کوئی ڈھائی سو میل کی دوری پر مجھے ایک جگہ سے کال آگئی۔ ندا نے اتنی دوری کا سنتے ہی نفی میں سر ہلانا شروع کر دیا تھا۔

”میں آپ کو اتنی دور نہیں جانے دوں گی۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ وہ رونے لگی تھی اور مجھ سے اس کے آنسو برداشت نہیں ہوتے تھے۔

میں نے پیار سے اس کے آنسو صاف کیے اور سمجھانے لگا۔ شروع میں وہ بالکل نہیں مان رہی تھی لیکن اگر بیوی شوہر سے محبت کرتی ہو تو وہ اس کی بات مان ہی لیتی ہے چاہے دل پر کتنا ہی جبر کرکے کیوں نہ مانے۔ ندا بھی مان گئی، اگرچہ بہت رو دھو کر مانی اور جب میں جا رہا تھا تب بھی اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ نومی کو چھوٹا ہونے کے باوجود احساس ہو گیا تھا کہ اس کا باپ بہت دنوں کے لیے دور جا رہا ہے اور وہ میرے سینے سے لپٹا ہوا تھا مجھے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ بہ مشکل میں نے خود پر جبر کرکے اسے ندا کو دیا۔ جانے سے پہلے میں نے وعدہ کیا تھا کہ مہینے میں ایک چکر ضرور لگاؤں گا بھلے رات بھر کے لیے ہی آؤں۔

مگر جب مل پہنچا تو پتا چلا کہ آنے والے کرما کے سیزن کے لیے تیاری ہو گئی تھی اور اوپر سے آرڈر آیا تھا کہ آنے والے چھ مہینوں میں ورکرز چھٹی کا نام بھی نہ لیں۔ میرے شعبے کے انچارج سمیع الدین نے مجھ سے کہا۔ ”اوپر سے حکم ہے جو چھٹی کی بات کرے اس کی مستقل چھٹی کر دو۔“

اس دھمکی نے سب کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں تو ویسے بھی نیا تھا اور بڑی مشکل سے یہ جاب ملی تھی۔ اس لیے میں چھٹی مانگنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مل میں دو شفٹوں میں کام ہوتا تھا اور اکثر اوقات ہفتے کے ساتوں دن ہوتا تھا۔ اتوار کی چھٹی کا پتا ہفتے کی شام کو دوسری شفٹ کے خاتمے پر چلتا تھا کہ اگلے دن کام ہوگا یا نہیں۔ میں عام طور سے پہلی شفٹ

کمرے میں کپڑے سکھانا مضر ہے

وہ خواتین جو واشنگ مشین میں کپڑے دھونے کے بعد انہیں خشک کرنے کے لیے کسی کھلی جگہ یا دھوپ میں سکھانے کی بجائے کمرے کے اندر ہی الگنی یا ڈوری پر لٹکا دیتی ہیں وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی صحت کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ طبی ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ الگنی یا کپڑے خشک کرنے والے دھاتی فریموں پر گیلے کپڑے لٹکانے سے یا گرم ہوا پھینکنے والے ریڈی ایٹرز کی مدد سے کپڑے سکھانے سے گھر کے اندر ہوا میں نمی کی سطح 30 فیصد تک بڑھ سکتی ہے اور اس سے ایک ایسا ماحول بن جاتا ہے جو تم سطح پر جمنے والی پھپھوند کے لیے بہت سازگار تصور کیا جاتا ہے۔ ماہرین کو خاص طور پر Aspergillos Fumigatus Spores پر تشویش ہے۔ یہ وہ پھپھوند یا فنگس ہے جو پھیپھڑے کو انفیکشن میں مبتلا کر سکتی ہے۔ مانچسٹر کے یونیورسٹی ایسپر گلوسیس سینٹر میں پروفیسر ڈیوڈ ڈیننگ اور ان کی ٹیم نے بڑی تعداد میں ایسے مریضوں کا علاج کیا ہے جو ایسپرگلس نامی پھپھوند کو سانس کے راستے جسم میں داخل کرنے کے بعد بیمار پڑ گئے تھے۔ پروفیسر ڈیننگ کا کہنا ہے کہ واشنگ مشین میں ایک بار دھوئے جانے والے کپڑوں میں تقریباً دو لیٹر پانی موجود ہوتا ہے جو کمرے میں کپڑے پھیلانے کے دوران خارج ہوتا رہتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا جسمانی مدافعتی نظام اس فنگس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو اس مرطوب ماحول میں بہت اچھی طرح پرورش پاتے ہیں۔ اس لیے یہ پھپھوند ان کو بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے لیکن جو لوگ دمہ کے مریض ہوتے ہیں وہ جب اس پھپھوند کو سانس کے ذریعے جسم میں اتارتے ہیں تو انہیں کھانسی کا جسمانی مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے یا اس نظام کو نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے جیسا کہ کیموتھراپی کرانے والے کینسر کے مریضوں اور ایڈز کا شکار ہونے والے افراد میں دیکھا جاتا ہے یا جو لوگ Autoimmune امراض میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں یہ فنگس Pulmonary Aspergillosis کا سبب بنتا ہے۔ یہ وہ طبی صورت حال ہے جس میں پھیپھڑوں اور سائی نس (Sinuses) کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے اور بعض اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: نوشین عارف۔ کراچی

آرام سے پیدل وہاں تک پہنچ گیا۔ یہاں سے بسیں بھی گزرتی تھیں اور ویگنز بھی۔ مجھے جو پہلے مل جاتی میں اسی میں بیٹھ جاتا۔ اتفاق کی بات تھی کہ ایک وین مل گئی اور اس میں جگہ بھی تھی۔ میں نے اپنے بیگ اوپر رکھوایا اور خود اندر آ گیا۔ بیگ کی طرف سے میں بے فکر تھا یہ خاصا مضبوط قسم کا بیگ تھا اور اس پر اچھا والا تالا بھی لگا ہوا تھا۔ کنڈیکٹر نے مجھ سے منزل پوچھ کر کرایہ وصول کیا اور وین آگے روانہ ہو گئی۔ سفر خاصا طویل تھا۔ اس لیے میں وقت گزاری کے لیے موبائل پر ندا سے ٹیکسٹ پر بات کرنے لگا۔ وہ سن کر خوش ہوئی تھی کہ میں مل سے نکل آیا تھا۔ وین والے بسوں کی نسبت تیز چلاتے ہیں اور اگر ان کے مسافر پورے ہوں تو یہ رکتے بھی نہیں ہیں۔ اس لیے مجھے اُمید تھی کہ میں جلد گھر پہنچ جاؤں گا۔

دو گھنٹے بعد میں اس شغل سے تھک گیا تو موبائل رکھ کر اونگھنے لگا۔ جاب کرنے والوں کو دن میں سونے کی عادت نہیں ہوتی ہے اور ان کے لیے وقت گزاری مشکل ہوتی ہے مجھے بھی نیند نہیں آئی اور میں بور ہوتا رہا۔ تین گھنٹے بعد وین والے نے لنچ کے لیے ایک ہوٹل کے سامنے وین روکی۔ یہ عام سا ہوٹل تھا جس میں اچھے کھانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر مسافروں کے لیے تو خاص طور پر واہیات اور بد ذائقہ کھانا بنایا جاتا تھا۔ ان سے قیمت پہلے وصول کر لی جاتی تھی اور ابھی وہ کھانا زہر مار کر رہے ہوتے تھے کہ ڈرائیور روانگی کا ہارن دینا شروع کر دیتا تھا۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو بہترین کھانا فری میں کھلایا جاتا تھا اور ان کے جاتے ہی پیش کر دیا جاتا تھا۔ جب کہ مسافروں کو جان بوجھ کر دیر سے کھانا دیا جاتا تھا۔ ابھی وہ تھوڑا ہی کھاتے تھے کہ وین یا بس روانگی کے لیے تیار ہو جاتی اور مجبوراً مسافر کھانا ادھورا چھوڑ کر آ جاتے اور ان کا بچ جانے والا کھانا دوسرے آنے والے مسافروں کے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ میں یہ بد ذائقہ اور فراڈ والا کھانا نہیں کھانا چاہتا تھا اس لیے وین میں بیٹھا رہا اور بیرے سے لسی منگوائی تھی۔

جب مسافر کھانا کھا رہے تھے تو میں لسی پی رہا تھا اور یہ کسی قدر بہتر تھی۔ گرم موسم کی مناسبت سے اچھی تھی اور اس نے مجھے ٹھنڈا کر دیا۔ حسب توقع ڈرائیور اور کنڈیکٹر پہلے آ گئے اور ڈرائیور نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ بے چارے مسافر کھانا ادھورا چھوڑ کر اسے سناتے ہوئے واپس آئے۔ مسافر پورے ہوتے ہی ڈرائیور نے وین چلا دی تھی۔ وہ مسافروں کی جلی کٹی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لوگ تھک کر چپ ہو گئے۔ تین بج رہے تھے اور ابھی ساٹھ ستر میل کا سفر باقی تھا۔ مجھے اونگھ آ گئی تھی جب اچانک ہی جھٹکا لگا اور وین کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں چونک کر بیدار ہوا۔ مسافر ڈرائیور سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے اور وہ خود بھی جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ انجن سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر آگے سے دھواں سا اٹھا۔

''اوئے بیڑا غرق۔'' ڈرائیور نے پھرتی سے بریک لگائی۔ دھواں دیکھ کر سب گھبرا گئے تھے کہ شاید وین میں آگ لگی ہے مگر یہ دھواں انجن سے اٹھ رہا تھا جو سیز ہو گیا تھا۔ دو منٹ بعد ڈرائیور اور کنڈیکٹر انجن کا بونٹ کھولے اس کا معائنہ کر رہے تھے اور کچھ مسافر بھی ان معائنے میں شامل ہو گئے تھے۔ جلد واضح ہو گیا کہ وین کا انجن سیز ہو گیا ہے اور اب یہ یہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہل سکتی ہے۔ جب کنڈیکٹر نے مسافروں سے کہا کہ وہ اب کوئی دوسری گاڑی پکڑ لیں تو مسافروں نے کرائے کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اس پر ایک مختصر سا جھگڑا ہوا جس میں بیت جمہوری اصول کے تحت اکثریت کی ہوئی اور کنڈیکٹر نے یہاں تک کا کرایہ کاٹ کر مسافروں کی باقی رقم واپس کرنا شروع کی۔ ڈرائیور زیر لب گالیاں دے رہا تھا اور نہ جانے کسے دے رہا تھا۔ جس کو پیسے مل رہے تھے اس نے اپنا سامان اٹھا کر آگے مارچ شروع کر دیا تھا۔

کچھ لوگوں کو نزدیک ہی جانا تھا اور وہ اب پیدل جا رہے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ انہوں نے ہائی وے چھوڑ دی تھی اور اب کچے راستوں پر جا رہے تھے اور جو ہائی وے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے انہیں آگے جانا تھا مگر کسی سواری کے انتظار میں وہ ایک جگہ رکنے کو تیار نہیں تھے اس لیے وہ بھی سامان اٹھا کر آگے جا رہے تھے۔ میں نے ان کی تقلید کی اور اپنا بیگ شانے پر لاد کر آگے چل پڑا۔ باقی لوگ راستے میں رہ جانے اور اب پیدل مارچ کی وجہ سے کوفت میں مبتلا تھے مگر میری کوفت کی وجہ یہ تھی کہ اب میں اور دیر سے اپنی منزل پر پہنچتا جہاں جانے کے لیے میں مہینوں سے بے تاب تھا۔ ندا اور نوی کو میرا مزید انتظار کرنا پڑتا۔ ندا نے مجھے ایس ایم ایس کر کے بتایا تھا کہ نوی اس سے زیادہ بے تاب ہے۔ ساحل نے اسے اب تک دو بار نہلا دھلا کر تیار کیا تھا اور اس نے دونوں بار اپنے کپڑے

گندے کر لیے تھے۔

میں خیالوں میں تھا اور میرے پاس سے دو بار گاڑیاں گزریں اور آگے جانے والے مسافروں نے انہیں روک لیا۔ جب تک میں بھاگتا ہوا ان تک پہنچا تو پتا چلا کہ وہ فل ہو گئی تھیں، اور مجھ سمیت کچھ مایوس مسافر پھر پیدل مارچ پر مجبور ہوئے۔ تیسری بار جب یہ ہوا تو میں واحد ہی پیدل رہ گیا تھا اگرچہ میں نے اس وین والے کی منت کی تھی کہ بھائی مجھے چھت پر ہی جگہ دے دو مگر موٹر وے پولیس کے خوف سے اس نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے پیدل مارچ کرتے ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تھا اور اب تک کوئی خالی بس یا وین نہیں ملی تھی۔ اسی طرح کسی پرائیویٹ گاڑی والے نے بھی لفٹ کے لیے رکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ چل چل کر میری ٹانگیں دکھ گئی تھیں مگر وہاں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے جب ایک گرے درخت کا کچھ بچ جانے والا تنا نظر آیا تو میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔

میری سانس پھول رہی تھی اور جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اب میں وین والے کو کوسنے دے رہا تھا جس کی وجہ سے میں دھکے کھا رہا تھا اگر وین کا انجن سیز نہ ہوتا تو میں اس وقت گھر پر ہوتا یا نزدیک تو ہوتا۔ اچانک موبائل کی بیل بجی تو میں چونکا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس ویرانے میں سگنل نہ ہوں لیکن سگنل تھے تبھی تو کال آئی تھی۔ کال ندا کی تھی اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کہاں ہیں، سوا چار بج رہے ہیں؟“

”جس وین میں آ رہا تھا اس کا انجن سیز ہو گیا اب ایک گھنٹے سے پیدل چل رہا ہوں لیکن کوئی خالی گاڑی نہیں آئی جس میں بیٹھ سکوں۔ تھک کر ایک جگہ بیٹھا ہوں۔“

ندا پریشان ہو گئی۔ ”آپ ویرانے میں اور اکیلے ہیں۔ کچھ دیر میں شام ہو جائے گی۔“

”تم فکر مت کرو۔ مجھے امید ہے کوئی نہ کوئی بس یا وین مل جائے گی۔ یا کوئی لفٹ دے دے گا۔ ورنہ کوئی آبادی مل جائے گی جہاں سے میں ٹیکسی کر سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے آپ روانہ ہو جائیں۔“ اس نے کہا۔ ”اللہ خیر خیریت سے لائے۔“

”دعا کرتی رہنا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ جگہ ویران سی تھی اور یہاں زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ چور ڈاکوؤں سے واسطہ پڑ جاتا تو میرے پاس لٹنے کے لیے خاصا کچھ تھا۔ میں نے بیگ شانے پر ٹانگا تھا کہ سامنے سے ایک سفید وین گزری اس کی سائیڈ والی دیوار پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ پیچھے سے بند کیبن والی وین تھی جو عام طور سے سپلائی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ شاید کسی کمپنی کی تھی جس کا نام اور مونوگرام سائیڈ پر بنا ہوا تھا۔ اتنی تفصیل سے میں نے اس لیے بتایا کہ میری اس سچ بیانی کا اصل قصہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے ذرا دیر ہوئی تھی مگر وین کے گزرتے ہی میں چلایا اور ہاتھ لہرایا تھا۔ پہلے وین اسی رفتار سے چلتی رہی مگر کچھ آگے جا کر اس کی رفتار سست ہوئی اور وہ رک گئی۔ میں جو چل رہا تھا وین کے رکتے ہی اس کی طرف بھاگا۔ وین سے کوئی اترا نہیں اور نہ ہی وہ آگے پیچھے ہوئی۔ وین کی دیوار پر سپر کنفیکشنری لکھا تھا اور اس کے ساتھ کمپنی کا لوگو بنا ہوا تھا۔ نیچے پتا اور فون نمبر لکھے تھے۔ جب میں اس کے برابر پہنچا تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے آدمی نے کہا۔

”لفٹ چاہیے۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”بالکل بھائی اسی لیے تو اشارہ کیا تھا، چل چل کر حشر ہو گیا ہے۔“

”تب آ جاؤ۔“ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور میں نے اندر بیٹھ کر بیگ اپنی گود میں رکھ لیا۔ آگے رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اور پیچھے پتا نہیں کیا تھا۔ اس طرف پلاسٹک کا دھندلا پردہ تھا جس کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری طرف کا دروازہ بند ہوتے ہی اس نے وین آگے بڑھا دی۔ اس نے مجھے سیٹ بیلٹ باندھنے کو کہا خود اس نے بھی سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں عام طور سے ڈرائیور یا گاڑی میں بیٹھنے والے سیٹ بیلٹ نہیں باندھتے ہیں لیکن موٹر وے پر اس معاملے میں سختی کی جاتی ہے اور موقع پر ہی بھاری چالان بھرنا پڑتا ہے اس لیے یہاں ڈرائیور سیٹ بیلٹ کی پابندی کرتے ہیں۔ جب سے موٹر وے پولیس نے وزیروں اور مشیروں کے چالان شروع کیے عام لوگ خود یہاں قانون کی پابندی کرنے لگے ہیں۔ کاش کہ باقی بڑے قانون شکنوں پر اسی طرح ہاتھ ڈالا جائے تو ملک سے جرائم خود بہ خود ختم ہو جائیں گے۔ میں نے بھی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔

روانگی کے بعد میں نے وین کا جائزہ لیا۔ وین تقریباً نئی اور بہترین حالت میں تھی اس کا طاقتور انجن ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔ شام کے ساتھ ہی گرمی کم ہو گئی تھی اور ہوا ٹھنڈی پڑ گئی تھی اس لیے جب وین چلی تو

پسینا تیزی سے خشک ہونے لگا۔ مگر ڈرائیور نے اے سی آن کرتے ہوئے ڈیش بورڈ پر لگا بٹن دبا کر میری طرف کی کھڑکی کا شیشہ بند کر دیا۔ وین فلی آٹو میٹک تھی۔ شیشہ بند ہوتے ہی اندر خنکی بھرنے لگی اس نے کچھ ہی دیر میں میرا سارا پسینا خشک کر دیا۔ پہلی بار میں نے ڈرائیور کی طرف توجہ دی۔ وہ تقریباً تیس برس کا جوان اور گورا چٹا شخص تھا۔ ہلکی سی شیو تھی۔ پینٹ اور ٹی شرٹ میں وہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس نے سوال کیا۔ ''کہاں سے آرہے ہو؟''

میں نے اسے بتایا کہ میں ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا ہوں اور چھٹی پر گھر جارہا ہوں۔ پھر وین کا واقعہ سنایا جس نے مجھے پیدل کر دیا تھا۔ اسے اپنا نام بھی بتایا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور جب میں خاموش ہوا تو اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''کہاں جارہے ہو؟''

میں نے اسے اپنے قصبے کا بتایا تو اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے ہم بھی وہیں جارہے ہیں۔''

میں چونکا۔ ''ہم ...... تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''میرے ساتھی ہیں۔'' اس نے پچھلے حصے کی طرف انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ اب تک عقب میں بالکل خاموشی تھی اور مجھے ذرا بھی آہٹ سنائی نہیں دی تھی لیکن جیسے ہی اس نے بتایا پیچھے سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے عجیب سا لگا اگر پیچھے کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے تو ڈرائیور کے بتانے تک وہ اتنے خاموش کیوں رہے؟ اور جیسے ہی اس نے بتایا انہوں نے بات شروع کر دی۔ اگرچہ وہ دھیمے لہجے میں بول رہے تھے اور الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے اس کے باوجود پتا چل رہا تھا کہ تین چار افراد آپس میں بول رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ حالانکہ بہ ظاہر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ڈرائیور بھی عام سا آدمی لگ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''یہ کسی کنفیکشنری کی سپلائی وین ہے؟''

''پہلے تھی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''اب یہ کلکشن وین ہے۔''

''تم لوگ وصولی کرتے ہو؟''

''ہاں ہم وصولی کرتے ہیں۔ جو شرافت سے دے اس سے شرافت سے اور جو شرافت سے نہ دے۔ اس سے دوسرے طریقے سے کرتے ہیں۔''

ڈرائیور نے یہ بات پوری سنجیدگی سے کہی تھی مگر عقب سے اس کے ساتھی ہنسے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''دوسرا طریقہ کیا ہوتا ہے؟''

ڈرائیور نے اپنی ٹی شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں سیاہ رنگ کا ایک خوفناک سا پستول دبا ہوا تھا۔ سچ کہوں تو پستول دیکھ کر میرا دم خشک ہو گیا تھا۔ جب اس نے مجھے پستول دکھا کر واپس رکھا تو میں زبردستی مسکرایا۔ ''تو یہ دوسرا طریقہ ہے۔''

''آج کل اس کے بغیر کام نہیں بنتا ہے۔'' اس نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ''شادی ہوگئی ہے؟''

نہ جانے کیوں میرے اندر خوف سا آنے لگا تھا۔ ''ہاں، میرا ایک بچہ بھی ہے ابھی دس مہینے کا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اتنے عرصے بیوی بچے سے دور کیسے رہے؟''

میں نے اسے بتایا تھا کہ میں چھ مہینے بعد گھر جارہا ہوں۔ ''روزگار کی مجبوری ہے۔ آج کل ملازمتیں ملتی نہیں ہیں اور یہ اچھی جاب ہے اس لیے گھر سے دوری بھی قبول کر لی۔''

''یہ تو ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''ڈرائیونگ جانتے ہو؟''

''ہاں جانتا ہوں۔''

اس نے اگلا سوال کیا۔ ''تم شروع سے اسی علاقے کے رہنے والے ہو؟''

''ہاں ہم کئی پشتوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے تمہارا آئی ڈی کارڈ بھی اسی علاقے کا ہوگا؟''

''ہاں اسی علاقے کا ہے۔'' میں نے کہا اور میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اس نے یہ سوال بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ میرا خوف بڑھ گیا تھا اور میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''اپنا بیگ پیچھے رکھوا دو۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں نے تمہیں مشورہ نہیں دیا ہے۔'' اس کا لہجہ یک لخت بہت سرد ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں مزاحمت کرتا یا ردعمل دیتا، پلاسٹک کا پردہ ہٹا اور ایک ہاتھ نمودار ہوا اس نے بیگ پکڑ کر کھینچ لیا اور میں بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا

رہا۔اب مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کچھ غلط لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ ڈرائیور کے پاس پستول تھا اور اس کے ساتھی نے جبراً میرا بیگ لے لیا تھا۔ نہ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی میں نے آرام سے رکھا ہوا تھا۔ ویسے بھی جلد منزل آجائے گی۔''

''منزل نہیں علاقہ آجائے گا۔'' ڈرائیور نے گویا میری بات درست کی۔ ''لیکن تمہیں اتنی جلدی جانے کا موقع نہیں ملے گا اور تم ہمارے ساتھ رہو گے۔''

میں نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ ''تمہارے ساتھ رہوں گا مگر کیوں؟''

''فی الحال اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔'' اس نے حسب سابق بے نیازی سے کہا۔ وین تقریباً ساٹھ پینسٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی۔ پونے پانچ بج رہے تھے اور قصبہ ابھی کوئی تیس میل دور تھا ہمیں اس رفتار سے آدھا گھنٹا اور لگتا۔ مگر اب یہ عام سفر نہیں رہا تھا جس میں مجھے صرف وقت اور فاصلے کی فکر ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا احساس بڑھ رہا تھا کہ یہ اچھے لوگ نہیں تھے اور کسی مذموم ارادے سے قصبے میں داخل ہونے جا رہے تھے۔ دہشت گردی کی حالیہ لہر کا سب سے زیادہ نشانہ ہماری سیکورٹی فورسز اور حساس علاقے ہیں۔ میں نے غور سے ڈرائیور کو دیکھا مگر اس میں مجھے دہشت گردوں والی بات نظر نہیں آئی تھی۔ وہ خاصا اپ ٹو ڈیٹ قسم کا نوجوان تھا۔ اس نے گلے میں سونے کی چین پہن رکھی تھی اور ایک کلائی میں بینڈ تھا جس پر آئی لو یو کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ مگر کیا کہا جا سکتا ہے اس قسم کا کام کرنے والے دھوکے بھی دیتے ہیں۔ وہ اپنا حلیہ بھی بدل لیتے ہیں تاکہ آسانی سے اپنے ٹارگٹ تک پہنچ سکیں۔ اس نے میری کیفیت بھانپ لی تھی۔

''فکر مت کرو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''تم مجھے کیوں ساتھ رکھنا چاہتے ہو؟''

''تم دیکھ لو گے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا جب تک تم میرے کہنے پر چلو گے۔''

میں نے پھر پوچھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے جیسے ہم قصبے کے پاس آ رہے تھے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اے سی کی خنکی میں بھی ہلکا سا پسینا آ رہا تھا۔ میرے مقابلے ڈرائیور بالکل پُرسکون اور مطمئن تھا۔ اس کے ساتھی کبھی کبھی بولتے تھے ورنہ وہ اب خاموش ہی تھے۔ میری نظر سڑک کے کنارے آتے سنگ میل کے بورڈز پر تھی اور جب قصبہ پانچ میل دور رہ گیا تو ڈرائیور نے پیچھے کی طرف کر کے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ''دوستو اب ہم صرف چار میل دور ہیں۔''

فوراً ہی عقب سے ہتھیار لوڈ ہونے کی مخصوص آوازیں آئیں اور میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے، تم کیا کرنے جا رہے ہو؟''

''آرام سے بیٹھو اور پُرسکون رہو۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور وین کو سڑک کے کنارے روکنے لگا۔ اسی لمحے میرے موبائل کی بیل بجی اور میں نے موبائل نکالا تھا کہ اس نے میرے ہاتھ سے اچک لیا۔ ندا کی تصویر اور اس کے ساتھ ہی مائی وائف کے الفاظ تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''یہ تمہاری بیوی ہے؟''

''ہاں پلیز مجھے اس سے بات کرنے دو۔''

اس دوران میں اس نے وین روک دی تھی۔ ''ضرور مگر اس خیال سے بات کرنا کہ ابھی تمہیں اپنی بیوی اور بچے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ اسے صرف اتنا بتانا کہ تم گھر کی طرف آ رہے ہو اور تمہیں ایک پرانا دوست مل گیا ہے جس نے تمہیں لفٹ دی ہے تم اس کے گھر کچھ دیر رک کر اپنے گھر آؤ گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''سمجھ رہا ہوں۔''

''تمہاری بیوی نوجوان اور خوب صورت ہے۔ لو بات کرو۔'' اس نے موبائل مجھے تھمایا اور وین سڑک کے کنارے روکتے ہوئے ٹی شرٹ تلے سے پستول نکال لیا۔ میرے پاس اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس دوران میں خاصی بیلز بج چکی تھیں۔ میں نے کال ریسیو کی تو ندا نے تیز لہجے میں کہا۔

''آپ کال کیوں نہیں ریسیو کر رہے تھے؟''

''سوری میں گاڑی کے انجن کے شور میں بہ مشکل سن سکا۔''

ندا نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''آپ کو گاڑی مل گئی؟ کتنی دور ہیں اور کب تک آئیں گے؟''

"اتفاق سے مشہود مل گیا تم جانتی ہو اس کی گاڑی کتنی کھٹارا ہے انجن بہت شور کرتا ہے۔ اس لیے گاڑی رکوا کر تم سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے آنے میں کچھ دیر لگ جائے گی۔"

وہ بے چین ہو گئی۔ "کیوں جب مشہود بھائی کے ساتھ ہیں تو دیر کیوں لگے گی؟"

"مشہود شہر کی طرف سے آرہا تھا۔" میں نے پیچھے رہ جانے والے ایک چھوٹے قصبے کا نام بھی لیا۔ "اسے اپنی شاپ کے لیے کچھ سامان شہر سے لینا ہے تب ہی ہم واپس آئیں گے۔"

"تو آپ اسٹاپ پر اتر جائیں وہاں سے کسی ٹیکسی میں آجائیں۔ مشہود بھائی کے ساتھ جانا ضروری ہے کیا؟"

"مشہود نے مدد کی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اسے منع تو نہیں کر سکتا، تم جانتی ہو، میرے بچپن کا دوست ہے۔"

"اچھا۔" ندا نے مرجھائی آواز میں کہا۔ "کتنی دیر لگے گی؟"

"دو تین گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

ندا نے اچانک کال کاٹ دی اور میں جانتا تھا کہ وہ خفا ہو گئی ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نہ جانے کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟ مشہود میرا بچپن کا دوست تھا۔ اس کا قصبے کی مین مارکیٹ کے قریب ایک جنرل اسٹور تھا اور وہ ہمارے محلے میں ہی رہتا تھا۔ ڈرائیور نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے موبائل لے لیا اور اسے آف کر کے ڈیش بورڈ پر ڈال دیا۔ "تم نے اچھا جواب دیا اپنی بیوی کو۔ نیچے اترو۔" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

جواب میں اس نے اتر کر اور میری طرف کا دروازہ کھول کر مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور غرا کر بولا۔ "یہ آخری بار ہے کہ تم نے کوئی سوال کیا ہے۔ اس کے بعد سوال کیا تو وہ تمہاری زندگی کا آخری سوال ہوگا کیا سمجھے؟"

میں نے بہ مشکل سر ہلایا کیونکہ اس نے پستول کی نال میری پسلی سے لگا دی تھی اور انگلی سختی سے لبلبی پر جمی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ اسے دبا دے گا۔ "سمجھ گیا۔"

"گڈ ڈرائیونگ تم کرو گے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔ تم بتاؤ گے کہ تم قصبے میں رہتے ہو اور اپنے گھر جا رہے ہو۔ یہ گاڑی تمہاری کمپنی کی ہے اور تم سپلائی کرنے جا رہے ہو۔ آئی ڈی کارڈ کہاں ہے تمہارا؟"

"پرس میں؟"

"ڈرائیونگ لائسنس ہے؟"

"نہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں، وہ صرف آئی ڈی کارڈ چیک کرتے ہیں۔"

گویا یہ مجھے آگے رکھ کر قصبے میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ مجبوراً میں ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور وہ فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ اس نے پستول واپس ٹی شرٹ تلے رکھ لیا تھا۔ اس دوران میں پلاسٹک کے پردے کے پیچھے کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں اب یہاں خلا کی جگہ گتے کے ڈبے نظر آرہے تھے اور یہ فرش سے اوپر تک بھرے ہوئے تھے۔ یوں ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وین کا عقبی حصہ پورا سامان سے بھرا ہوا ہے۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ آج کل بہت سختی ہو رہی ہے اگر سیکیورٹی والے پوری وین کی تلاشی لینے پر تل گئے تو ان لوگوں کے ساتھ میں بھی مارا یا پکڑا جاؤں گا۔ میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"اگر انہوں نے وین کی تلاشی لے لی تو؟"

"ایسا نہیں ہوگا۔ ڈرائیو کرو۔" اس نے حکم دیا۔ "یاد رکھنا تمہارے پیچھے ایک گن ہے اگر تم نے غلطی کی تو ایک سیکنڈ میں مر جاؤ گے۔"

"میں کچھ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا اور وین آگے بڑھا دی۔ اس نے مجھے ٹوکا۔

"سیٹ بیلٹ باندھو۔ آگے موڑ ہے پولیس بھی ہو گی۔" اس نے کہتے ہوئے سیٹ بیلٹ باندھ لی اور میں نے بھی باندھ لی۔ میں چھوٹی گاڑیاں چلاتا رہا ہوں لیکن یہ وین بڑی تھی اس لیے مجھے ذرا مشکل ہو رہی تھی۔ دس منٹ بعد ہم قصبے کے گیٹ تک پہنچ گئے تھے۔ اس حساس علاقے میں داخل ہونے کے لیے کئی گیٹ ہیں اور یہ گیٹ نمبر تھری تھا۔ یہاں آنے اور جانے کے لیے کئی لائنیں تھیں جن سے گاڑیوں کو چیکنگ کے بعد ہی آنے اور جانے دیا جاتا تھا۔ میں وین اس طرف لے جانے لگا جہاں لائن میں گاڑیاں کم تھیں۔ مگر ڈرائیور نے مجھے روک کر ایک لائن کی طرف اشارہ کیا جس میں گاڑیاں زیادہ تھیں۔

"اس میں لے چلو۔"

"یہ قطار لمبی ہے۔"

"اس لیے امکان کم ہوگا کہ وہ پوری وین کی تلاشی

لیں۔"

میں نے وین اس قطار میں لگادی جو سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سیکورٹی والے طویل قطار کی پرواہ کیے بغیر مکمل تسلی کے بعد ہی وین کو آگے جانے دے رہے تھے۔ اگر وہ تلاشی لینے پر اتر آتے جیسا کہ لے رہے تھے تو یہ سب پکڑے جاتے یا مقابلہ کرتے۔ اگر زندگی سے نہ جاتا تو جیل تو جانا پڑتا۔ کون مانتا کہ میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔ گویا دونوں صورتوں میں، میں ضرور مارا جاتا۔ قطار سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ شام کا وقت تھا اور چھٹی کرنے والے واپس لوٹ رہے تھے۔ اس لیے یہاں رش زیادہ تھا۔ ہمارا نمبر خاصی دیر بعد آیا مگر اتفاق کی بات ہے جب میں چیک پوائنٹ پر پہنچا تو وہاں چیک کرنے والوں میں میرا ایک واقف کار نذیر علی بھی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ "عمران بھائی آپ...... یہ کام کب سے شروع کر دیا۔"

"بس یار حال ہی میں شروع کیا ہے۔" میں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

"ہاں میں نے تو سنا تھا کہ آپ نے ٹیکسٹائل مل میں ملازمت کرلی ہے۔"

اس دوران میں اس کے ساتھی وین کو آگے پیچھے سے دیکھ رہے تھے اور دھماکا خیز مادے کی تلاش کرنے والے آلے سے چیک کر رہے تھے۔ ایک آیا اور اس نے پہلے میرا اور ڈرائیور کا شناختی کارڈ دیکھا۔ تصویروں سے ہمارے چہروں کا موازنہ کیا۔ ڈرائیور کے شناختی کارڈ پر محمود حسن لکھا ہوا تھا۔ مطمئن ہو کر سیکورٹی گارڈ نے پیچھے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"کنفیکشنری کی سپلائی ہے۔" میرے ساتھ بیٹھے محمود حسن نے کہا۔ پتا نہیں اس کا آئی ڈی کارڈ اصلی بھی تھا یا نہیں۔

"پچھلا خانہ کھولو۔" اس نے حکم دیا تو میں نے بے بسی سے محمود کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر سختی آگئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم نیچے اترتے نذیر علی نے کہا۔

"یار جانے دے میں جانتا ہوں۔ عمران بھائی یہیں رہتے ہیں۔"

یہ سن کر حکم دینے والے نے سر ہلایا اور بیریئر اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے وین آگے بڑھا دی۔ ایک مرحلہ تو بہ خیر وخوبی طے ہو گیا تھا۔ مگر نذیر علی نے مجھے دیکھ اور پہچان لیا تھا۔ قصبے کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اب میں مارا جاؤں گا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے مخصوص کھردرے لہجے میں کہا اور سیٹ بیلٹ اتار دی تھی۔ "قصبے کی مین مارکیٹ کی طرف چلو۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا مگر جب اس نے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"تم نے گولڈ مارکیٹ دیکھی ہے۔"

"ہاں وہ مین مارکیٹ کے اوپری فلور پر ہے۔"

"ہمیں وہاں سے کچھ کام ہے۔"

"وہ یہاں سے خاصی دور ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں تم ڈرائیو کرتے رہو ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ شام کے چھ بجنے والے تھے۔ سورج ڈھل گیا تھا اور کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی۔ گولڈ مارکیٹ کا نام سن کر میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو تھے اور وہاں ڈاکا ڈالنے جا رہے تھے۔ قصبے کی گولڈ مارکیٹ خاصی بڑی تھی۔ نہ صرف اس قصبے کے بلکہ آس پاس کے چھوٹے گاؤں دیہات اور قصبوں سے بھی لوگ زیورات کی خریداری کے لیے یہیں آتے تھے۔ یہاں کم سے کم دو درجن جیولرز شاپ تھیں۔ میں کئی بار وہاں جا چکا تھا کیونکہ یہ اوپری فلور پر تھی اور آمد ورفت کا ایک ہی راستہ تھا اس لیے جیولرز نے الگ الگ سیکورٹی گارڈ رکھنے کی بجائے مشترکہ سیکورٹی رکھ لی تھی۔ یہ ان کے اپنے رکھے گارڈز تھے جو برسوں سے یہاں کام کر رہے تھے اور اگر کوئی ملازمت چھوڑ کر جانا چاہتا تو اسے پہلے لازمی اپنا متبادل اپنی ضمانت پر دینا پڑتا تھا۔ ایک وقت میں داخلی دروازے پر تین گارڈز ہوتے تھے اور دو اندر مارکیٹ میں گھومتے رہتے تھے۔

کیونکہ یہ علاقہ حساس تھا اس وجہ سے لوگ مطمئن رہتے تھے۔ یہ اطمینان بلاوجہ نہیں تھا کیونکہ یہاں برسوں سے ڈکیتی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا ہاں چوریاں ہوتی تھیں مگر گولڈ مارکیٹ اس سے بھی محفوظ تھی۔ وہاں رات کے وقت بھی دو سے تین گارڈز رہتے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی چور وہاں گھسنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ اسی اطمینان کا فائدہ اٹھا کر وہاں ڈاکا مارنے جا رہے تھے۔ اصل مسئلہ قصبے میں داخل ہونے کا تھا تو وہ انہوں نے میری

مدد سے حل کرلیا تھا بلکہ میری مدد بھی کام نہیں آئی تھی وہ تو اتفاق تھا کہ سیکیورٹی میں نذیر علی میرا واقف کار نکل آیا ورنہ وین کی تلاشی لی جاتی اور یہ لوگ گیٹ پر ہی پکڑ لیے جاتے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی قسمت اچھی تھی۔مگر ان کی خوش قسمتی میری بدقسمتی بن گئی تھی۔یہ مجھے ساتھ لے جاکر گولڈ مارکیٹ میں ڈکیتی مارتے اور پھر مجھے ہی یرغمال بنا کر باہر نکل جاتے۔اس کے بعد وہ تو غائب ہوجاتے مگر میں کہاں جاتا.... میں پکڑا جاتا اور ان کے کیے کی سزا بھی مجھے ہی بھگتنا پڑتی۔

لیکن میں مجبور تھا۔اگر محمود کے کسی حکم سے انکار کرتا تو وہ اور اس کے ساتھی پوری طرح مسلح تھے۔وہ مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔بلکہ شاید وہ بعد میں یہی کرتے۔جیسے ہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔وہ ڈاکا مار کر یہاں سے نکل جاتے اور پھر مجھے مار دیتے کیونکہ میں ان کے خلاف عینی گواہ ہوتا۔وہ مجھے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔جیسے جیسے میں اس نکتے پر سوچ رہا تھا میرا خیال پختہ ہوتا جارہا تھا کہ وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔اس پر مجھے ندا اور نوی کا خیال آیا۔میری بیوی بھری جوانی میں بیوہ اور میرا بچہ اپنی پہلی سالگرہ سے پہلے یتیم ہوجاتا۔پھر ان کی دیکھ بھال کون کرتا۔آج کل کا دور ایسا ہے کہ سگے خونی رشتے دار بھی ضرورت پڑنے پر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔کوئی کسی کے لیے تھوڑا بہت کرسکتا ہے۔مگر ندا کو میرے بعد زندگی کی گاڑی خود چلانا پڑتی یا وہ دوسری شادی پر مجبور ہوجاتی اور میرا بیٹا سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر رہ جاتا۔

یہ سوچ کر ہی مجھے جھرجھری سی آگئی تھی۔حساس علاقے کے شروع میں چیک پوسٹ تھی لیکن اندر آنے کے بعد کہیں کوئی نہیں روکتا تھا۔حد یہ کہ یہاں پولیس وغیرہ بھی کم نظر آتی تھی۔عام لوگوں سے اُمید نہیں تھی کہ وہ کسی مشکل صورت حال میں میری مدد کرتے۔اگر مجھے اپنی زندگی بچانا تھی تو اس کے لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔مگر میں کیا کرسکتا تھا۔میں تو بھاگ بھی نہیں سکتا تھا جتنی دیر میں، میں گاڑی روک کر یا اس کا دروازہ کھول کر باہر کودتا اتنی دیر میں محمود مجھے گولی مار چکا ہوتا۔مجھے کوئی ترکیب کرنی تھی کہ مجھے فرار کا موقع مل سکے۔مگر میرے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آرہی تھی۔مجھے وقت چاہیے تھا اور اب مین مارکیٹ زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔محمود کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ یہاں آچکا تھا مگر مجھے اُمید تھی کہ وہ قصبے کے راستوں سے زیادہ واقف نہیں ہوگا۔

ہم قصبے کی مین روڈ سے گزر رہے تھے اور کچھ آگے جاکر وہ سڑک آجاتی جو گھوم کر مین مارکیٹ تک جاتی تھی۔اچانک مجھے خیال آیا کہ میں ایک طرح سے وقت حاصل کرسکتا تھا۔یہ خیال مجھے سڑک کے کنارے لگے ذیلی سڑکوں کے بورڈ دیکھ کر آیا۔ذرا آگے اس سڑک سے پہلے ایک گلی آتی تھی جو بڑے بنگلوز کے درمیان سے گزر رہی تھی۔یہاں پوش افراد اور اعلیٰ افسران کے بنگلے تھے۔پہلے یہ سڑک مرکزی بازار جانے کے لیے شارٹ کٹ تھی۔کیونکہ شارٹ کٹ کی وجہ سے بازار جانے والا ٹریفک بھی یہاں سے گزرنے لگا تھا اور سڑک پرشور اور آلودگی رہنے لگی جو یہاں رہنے والوں کو ناگوار گزرتی تھی۔وہ بڑے لوگ اور افسران تھے اس لیے انہوں نے عام راستے کو بھی بند کروادیا۔اس کے لیے انہوں نے سڑک کے آخر میں فکس بیریئرز لگوا کر اسے بند کروادیا۔

اب اس سڑک پر رہنے والوں کو بھی اگر کینٹ بازار جانا ہوتا تھا تو وہ پورا گھوم کر جاتے تھے۔عام لوگ بھی اب اس گلی سے نہیں گزرتے تھے۔میں اسی علاقے کا رہائشی تھا اس لیے میں یہ بات جانتا تھا مگر یہ لوگ اس سے واقف نہیں تھے۔میں نے وین سڑک سے پہلے اس گلی کی طرف گھما دی۔محمود نے اعتراض کیا تو میں نے اسے وہی شارٹ کٹ والی بات بتائی۔اس نے پھر اعتراض نہیں کیا۔بلکہ وہ خوش تھا کہ وہ جلد منزل پر پہنچ جائیں گے۔سڑک تقریباً ایک کلومیٹر طویل تھی اور اس دوران میں تاریکی چھانے لگی تھی اس لیے اس کے آخر میں لگے بیریئرز اس وقت نظر آتے جب ہم ان کے بالکل پاس پہنچ جاتے۔اس نے پیچھے منہ کرکے اپنے ساتھیوں سے کہا۔"تیار ہوجاؤ بس کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے۔"

گلی چھوٹی تھی اور اس میں جابجا اسپیڈ بریکر بھی تھے اس لیے میں سست ڈرائیو کررہا تھا۔انہیں بھی جلدی نہیں تھی کیونکہ ان کے خیال میں وہ بس پہنچنے ہی والے تھے۔یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ آگے راستہ بند ہے۔اس لیے جب اچانک ہی بیریئرز نظر آئے تو محمود کا منہ بن گیا۔اس نے غرا کر کہا۔"یہ کیا ہے؟"

"یہ پہلے تو یہاں نہیں تھے۔" میں نے خشک ہوتے ہونٹوں کے ساتھ جھوٹ بولا۔"شاید اس چھ مہینے میں لگے

ہیں جب میں یہاں نہیں تھا اس لیے میں بھی ان سے ناواقف ہوں۔ ورنہ پہلے یہیں سے آتا جاتا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو، تم جانتے تھے اور جان بوجھ کر ہمیں یہاں لائے۔" محمود نے کہتے ہوئے پستول نکال لیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "اب ہمیں گھوم کر جانا ہوگا۔ بس چند منٹ کی تاخیر ہوگی۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا اور پھر سفاک لہجے میں بولا۔ "اگر تم کوئی چکر چلا رہے ہو تو یہ تمہاری زندگی کا آخری چکر ہوگا۔ وین واپس موڑ لو اور اب کسی ایسے راستے پر مت مڑنا جو آگے سے بند ہو۔ ورنہ میں اسی جگہ تمہاری لاش پھینک کر واپس آؤں گا۔"

جان بچنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ محمود کے انداز سے لگ رہا تھا کہ میری زندگی کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اس نے کچھ اس موڈ میں پستول نکالا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اگر میں انہیں چکر دینے کی کوشش کروں گا تو وہ میری لاش ہی پھینک کر جائے گا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے وین واپس موڑی اور یہ سڑک کے کنارے کھڑی ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ محمود نے مجھے جھڑکا۔ "دیکھ کر یہاں سارے ہی توپ قسم کے لوگ رہتے ہیں کسی کی گاڑی سے ٹکر ہو جائے تو وہ گلے پڑ جاتا ہے۔"

میں اتنی دیر سے سوچ رہا تھا کہ جان بچانے اور ان لوگوں سے چھڑانے کے لیے کیا کروں مگر کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر جب محمود نے یہ بات کی تو میرے ذہن میں جیسے کھڑکی سی کھل گئی تھی اور میں جیسے جیسے اس کی بات پر غور کرتا گیا مجھے لگا کہ یہ واحد طریقہ ہے جس پر عمل کر کے میں خود کو بچا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر اس میں مجھے بہت حوصلے، ہوشیاری اور درست وقت پر درست فیصلے سے کام لینا تھا تب ہی کام بنتا ورنہ ہو سکتا تھا کہ میرا ہی کام تمام ہو جاتا۔ چند منٹ بعد وین واپس مرکزی شاہراہ پر پہنچ گئی۔ یہ ون وے تھی۔ شروع میں کینٹ کے اندر ٹریفک بہت کم ہوتا تھا میں نے خود بارہا اس سڑک پر کرکٹ کھیلی ہے مگر پچھلے ایک عشرے میں یہاں ٹریفک کا اژدحام ہو گیا ہے۔ یہاں کا ٹریفک بھی بے ہنگم ہے اور خاص طور سے اوپری طبقے کے لوگ تو گاڑی یوں چلاتے ہیں جیسے سڑک بھی ان کی ملکیت ہو۔

شاید یہی وجہ ہے کہ آئے دن یہاں چھوٹے موٹے حادثات ہوتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ان حادثات میں اموات بھی ہو جاتی ہیں۔ کئی حادثے میرے سامنے ہوئے تھے اور کچھ میرے واقف کاروں کے ہوئے تھے۔ کچھ آگے جانے کے بعد مرکزی بازار کی طرف جانے والی سڑک آ گئی اور اس پر خاصا رش تھا۔ پھر یہ سڑک سنگل تھی اس پر دونوں طرف کا ٹریفک آ جا رہا تھا۔ اس سڑک پر آنے کے بعد میں نے وین کی رفتار تیز رکھی تھی اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ مجھے موقع ملے۔ فیصلہ میں نے یہ کیا تھا کہ وین کو کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا دوں گا۔ مگر مخالف سمت سے گاڑیاں میری طرف سے آ رہی تھیں۔ اگر میں کسی سامنے والی گاڑی سے ٹکراتا تو خود ہی نشانہ بنتا۔ مارا جاتا یا شدید زخمی ہوتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ کوئی گاڑی بائیں طرف کی سائیڈ روڈ سے آ رہی ہو۔

اب مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ اگر میں نے کسی دوسری گاڑی سے وین کو ٹکرایا تو اس میں موجود ڈرائیور یا دوسرے افراد بھی زخمی یا مر سکتے ہیں۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے کسی بے گناہ کی جان لینے کا سوچ رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں کانپ اٹھا تھا اور وین کسی دوسری گاڑی سے ٹکرانے کا ارادہ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ دوسری گاڑی اتنی مضبوط ہونا ضروری تھی کہ اسے یا اس کے ڈرائیور کو خاص نقصان نہ ہو لیکن وین کا حشر نشر ہو جائے۔ ایسی گاڑی کوئی لوڈنگ ٹرک ہی ہو سکتا تھا۔ مگر یہاں شاذ ہی کوئی ٹرک یا بڑی گاڑی نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی مجھے کوئی ٹرک یا بڑی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ مرکزی بازار نزدیک آ رہا تھا۔ مجھے اس سے پہلے ہی کچھ کرنا تھا۔ ورنہ اس کے بعد شاید مجھے موقع نہیں ملتا۔ بلکہ مجھے حیرت تھی کہ اندر آنے کے بعد محمود نے مجھ سے ڈرائیونگ کیوں نہیں لی۔ اس نے ایک طرح سے مجھے موقع دیا تھا۔ پتا نہیں اس کی کیا مصلحت تھی؟ شاید وہ خود فری رہنا چاہتا تھا اور ڈرائیونگ دے کر اس نے مجھے پابند بھی کر دیا تھا۔

میری نظر بائیں طرف سے آنے والی گلیوں پر تھی کہ ان سے کوئی بڑی گاڑی نکلے مگر کوئی گاڑی نہیں نکلی اور وین مرکزی بازار کے چوراہے پر پہنچ گئی۔ تیز رفتاری کی وجہ سے وین جلد پہنچ گئی تھی۔ یہاں ٹریفک راؤنڈ اباؤٹ میں گھوم رہا تھا اور بازار دائیں طرف تھا۔ ویسے تو اب چاروں طرف ہی کمرشل ایریا بن گیا تھا مگر خاص بازار کی بڑی سی عمارت دائیں طرف تھی اور گولڈ مارکیٹ اس کے اوپر تھی۔ کسی زمانے میں پوری مارکیٹ بس اسی عمارت میں

تھی۔ پھر جیسے جیسے قصبے کی آبادی بڑھتی گئی اسی مناسبت سے مرکزی مارکیٹ کے آس پاس دکانیں اور شاپنگ سینٹر بنتے چلے گئے اور اب یہ بازار ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ پھیل گیا ہے۔ شروع میں مغرب ہوتے ہی دکانیں بند ہونے لگتی تھیں مگر اب دس گیارہ بجے تک چہل پہل رہتی تھی۔ خاص طور سے کھانے پینے کی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔

اب تک مجھے کوئی ایسی گاڑی نظر نہیں آئی تھی جس سے میں وین ٹکرا سکتا۔ راؤنڈ اباؤٹ میں گھومتے ہوئے ٹریفک میں پھنس کر وین کی رفتار سست ہوگئی تھی اور تب میری نظر مارکیٹ سے پہلے بائیں طرف ایک بڑے کنکریٹ کے ستون پر گئی۔ اس کے اوپر ایڈورٹائزنگ بورڈ لگا ہوا تھا۔ ستون خاصا بڑا اور سڑک کے بالکل کنارے تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ کسی گاڑی کے مقابلے میں یہ ستون کہیں بہتر تھا۔ اس میں صرف وین اور اس میں سوار افراد کا نقصان ہوتا۔ کسی غیر متعلقہ فرد کو گزند نہیں پہنچتی اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اس وقت میں راؤنڈ اباؤٹ کے ٹریفک میں پھنسا ہوا تھا۔ جب کہ ستون سڑک کے کنارے تھا۔ میں نے ٹریفک سے نکلنے کی کوشش کی اور وین بائیں طرف کاٹنے لگا۔ اس کے لیے میں نے رفتار اتنی سست کرلی کہ عقب میں موجود گاڑیاں ہارن دینے لگیں۔ محمود نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ تم کیا کررہے ہو؟''

''کیا کررہا ہوں؟'' میں نے انجان بن کر کہا اور عقب سے آتی ایک بڑی وین کی پروا کیے بغیر اسٹیرنگ بائیں طرف کاٹا اور وین نے زور سے ہارن بجایا تھا۔

''اس طرف کیوں جارہے ہو؟''

''کیونکہ ہمیں اسی طرف جانا ہے۔'' میں نے گولڈ مارکیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ہم ویسے بھی پہنچ جائیں گے۔'' محمود نے کہا۔ ''ابھی سے بائیں طرف ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور رفتار تیز کرو۔''

میں خاصی حد تک سڑک کے کنارے آچکا تھا۔ ایک بائیک والا میرے ساتھ تھا اسے بائی پاس کرنے کے لیے میں نے وین کی رفتار جان بوجھ کر تیز کرلی۔ شام کے وقت یہاں ٹریفک زیادہ ہوجاتا تھا اور اس وقت بھی راؤنڈ اباؤٹ میں خاصی گاڑیاں تھیں۔ اگرچہ محمود نے رفتار بڑھانے کو کہا تھا مگر میں نے جتنی رفتار بڑھائی تھی اس نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کہا۔''... تم رفتار زیادہ کیوں کر رہے۔''

''تم نے ہی تو کہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اچھا ہے یہاں سے جلد نکل جائیں۔ ورنہ ایک بار سست ٹریفک میں پھنس گئے تو نکلنے میں دیر لگے گی۔''

محمود بھی دیکھ رہا تھا کہ راؤنڈ اباؤٹ کے اندر والے حصے میں پھنس جانے والی گاڑیاں سست ہوگئی تھیں اور انہیں یہاں سے نکلنے میں یقیناً خاصی دیر لگتی۔ اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا لیکن جب وین گھوم کر دائیں طرف واقع مرکزی بازار کی عمارت کے نزدیک آنے لگی۔ ستون کے پاس آکر میں نے رفتار میں مزید اضافہ کیا تو وہ چونکا تھا۔ اس بار اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''اے رفتار کم کرو۔''

''بس یہاں سے نکل جاؤں۔'' میں نے ایکسی لیٹر کو اور دباتے ہوئے کہا اور اس گھومتی جگہ یک دم ہی وین کی رفتار پچاس میل فی گھنٹے سے اوپر چلی گئی۔ اس رفتار سے میں اسے موڑتا تو یہ الٹ بھی سکتی تھی مگر مجھے موڑنا نہیں تھا۔ وین کا رخ ستون کی طرف تھا اور وہ صرف دس گز کے فاصلے پر تھا۔ محمود نے اسے نزدیک آتے دیکھا تو پستول نکال کر چلایا۔ ''رفتار کم کرو۔''

اس نے کہتے ہوئے پستول کا رخ میری طرف کیا تھا میں بے ساختہ دروازے کی طرف جھکا۔ ایک دھماکا ہوا جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ گولی چلنے کا تھا یا وین اور ستون کی ٹکر کا تھا۔ آخری لمحے میں میں نے ایکسی لیٹر پوری طرح دبا دیا تھا اور وین نے جست بھری تھی۔ تصادم کے ساتھ ہی میں اپنی سیٹ سے اچھلا اور آگے جارہا تھا کہ سیٹ بیلٹ نے مجھے واپس کھینچ لیا۔ قصبے میں داخل ہونے کے بعد بھی میں نے سیٹ بیلٹ نہیں اتاری تھی۔ وین کی ونڈ شیلڈ دھماکے کے ساتھ ہی کرچی کرچی ہوگئی تھی اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کرلیے تھے۔ مگر محمود نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی۔ وہ اچھلا اور ٹوٹ جانے والے ونڈ شیلڈ سے گزرتا ہوا سامنے ستون سے جا ٹکرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی چیز پیچھے سے آکر ڈیش بورڈ سے ٹکرائی۔

سیٹ بیلٹ نے مجھے بچالیا تھا اس کے باوجود تصادم اتنا شدید تھا کہ چند لمحے کے لیے میرے حواس گم ہوگئے تھے۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو چاروں طرف سے

لوگوں کا شور اور گاڑیوں کے ہارن سنائی دے رہے تھے۔ میں نے ٹٹول کر دروازے کا ہینڈل تلاش کیا اور اسے ان لاک کر کے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے نیچے اترا اور اپنا جسم ٹٹولنے لگا۔ تصادم سے میں بچ گیا تھا مگر مجھے گولی کا خطرہ تھا۔ چند ایک جگہوں پر معمولی خراشیں اور خون لگا تھا مگر کوئی ایسا زخم نہیں تھا جسے میں گولی کا قرار دے سکتا۔ پھر میری نظر ڈیش بورڈ سے ٹکرانے والی چیز پر گئی۔ یہ میرا بیگ تھا۔ میں نے اسے باہر کھینچا اور ڈیش بورڈ پر اپنا موبائل تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ اوپر نہیں تھا۔ یہاں راؤنڈ اباؤٹ ہونے کی وجہ سے روشنی خاصی تیز تھی اور ڈرائیونگ کیبن اندر تک صاف نظر آ رہا تھا۔

میرا موبائل اندر بھی نہیں تھا۔ شاید وہ دھچکے سے باہر جا گرا تھا۔ مگر اندر بھی ہو سکتا تھا کیونکہ کیبن میں کچرا اور بکھر جانے والا شیشہ پڑا تھا۔ حادثے کے بعد لوگ چاروں طرف سے دوڑے آ رہے تھے۔ ان کی تو مجھے پروا نہیں تھی۔ مگر وین کے عقبی حصے میں موجود محمود کے ساتھی اب اپنے حواسوں میں آ رہے تھے اور یہ بات ان کی گالیوں سے عبارت گفتگو سے واضح تھی۔ حادثے نے سب الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس میں پیچھے موجود لوگ اور سامان بھی شامل تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ جو چیز پیچھے سے باہر آئی وہ میرا بیگ تھا۔ اب وہ سامان ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے اور کسی لمحے بھی باہر آ کر مجھے گولی مار سکتے تھے اور میرا اس سے پہلے یہاں سے نکل جانا لازمی تھا۔ میں موبائل کے لیے ہاتھ مار رہا تھا مگر یہاں شیشوں کے ٹکڑے اور دوسری چیزیں یوں بکھری ہوئی تھیں کہ ان کے نیچے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

آوازوں سے لگ رہا تھا کہ وہ باہر آنے والے ہی تھے۔ میں نے موبائل کا خیال دل سے نکالا اور بیگ اٹھا کر راؤنڈ اباؤٹ کے تقریباً رک جانے والے ٹریفک میں گھس گیا۔ اگرچہ ٹریفک رک گیا تھا اس کے باوجود ڈرائیوروں نے میرے ٹریفک کے گھسنے کا برا منایا تھا اور ہارنوں کے شور سے راؤنڈ اباؤٹ گونج اٹھا تھا۔ سڑک کراس کر کے میں دوسری طرف فٹ پاتھ پر آیا۔ اس دوران میں لوگ وین کے آس پاس جمع ہونے لگے تھے اور ان میں سے کچھ وین کے اندر بھی جھانک رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے جاتے دیکھا تھا اور آوازیں بھی دیں مگر میں نے سنی ان سنی کر دی۔ مجبوراً پکارنے والے بھی خاموش ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ انہیں سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی تھی کہ میں حادثے کا شکار ہونے والی وین سے نکلا ہوں۔

میں نے فٹ پاتھ پر پہنچ کر پیچھے دیکھا تو محمود مجھے ستون کے پاس سڑک پر ساکت پڑا نظر آیا۔ وہ خاصی قوت سے جا کر ستون سے ٹکرایا تھا۔ اگر وہ زندہ بھی بچ نکلا تھا تو شدید زخمی تو تھا ہی۔ البتہ اس کے ساتھی اتنے زخمی نہیں ہوئے تھے کیونکہ عقب میں گتے کے ڈبے بھی تھے جنہوں نے تصادم کے دوران انہیں وین کی دیواروں سے ٹکرانے سے بچایا ہوگا۔ اچانک وین کے دروازے سے کوئی نکلا اور اسے دیکھتے ہی میں تیزی سے راؤنڈ اباؤٹ کے فٹ پاتھ پر دوڑتا ہوا مخالف سمت پہنچا تھا کہ عقب سے دو فائروں کی آواز آئی اور وین کے پاس جمع ہونے والی پبلک چیختی چلاتی وہاں سے بھاگنے لگی۔ فائرز کی آواز نے وہاں موجود ڈرائیوروں کو بھی متوحش کر دیا تھا اور وہ دیوانہ وار وہاں سے اپنی گاڑیاں نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں بہ مشکل ان جنونی ڈرائیوروں سے بچتا ہوا راؤنڈ اباؤٹ سے باہر نکلا۔ دو بار گاڑیوں نے مجھے مارا بھی مگر ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اس لیے معمولی سی چوٹیں آئیں۔

ہم جس سڑک سے آئے تھے اس پر ٹیکسیاں کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور بھی اچک اچک کر راؤنڈ اباؤٹ کے دوسری طرف ہونے والا تماشا دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے خود کو صاف کرنا ضروری تھا۔ اس لیے ایک نسبتاً تاریک گوشے میں آیا اور جیب سے رومال نکال کر پہلے اپنا چہرہ اور جسم صاف کیا۔ زخم معمولی تھے اس لیے زیادہ خون نہیں نکلا تھا۔ البتہ میرا لباس باریک شیشوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو صاف کر کے میں اس قابل ہوا کہ کسی ٹیکسی والے سے بات کر سکوں۔ میں سب سے آخر میں کھڑی ایک ٹیکسی تک آیا۔ یہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ اس کے ڈرائیور سے اپنی کالونی تک چلنے کی بات کی۔ اس نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ”یہاں کیا ہوا ہے دو فائر بھی ہوئے ہیں؟“

”پتا نہیں کیا ہوا ہے۔“ میں نے انجان بن کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہاں شاپنگ کے لیے آیا تھا۔“

ٹیکسی وہاں سے نکلی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ پولیس وہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی۔ اب مجھے اپنے موبائل کی فکر تھی وہ وین کے آس پاس سے ملتا تو پولیس سیدھی میرے گھر آتی۔ اس کی سم تو میرے نام پر تھی ہی ساتھ ہی اس میں تمام کونٹیکٹس نمبر بھی تھے۔ میں دل ہی

دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ کسی موقع پرست کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے لے کر خاموشی سے کھسک جائے۔ یہی ایک صورت تھی میری بچت کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس میرے گھر تک آئی تو میں اپنی صفائی میں کیا پیش کر سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ معاملہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ابا اور بھائیوں کے علم میں لانا لازمی تھا۔ میں ٹیکسی میں سیدھا گھر پہنچا ورنہ پہلے میرا ارادہ اماں اور ابا سے ملنے کا تھا۔ کال بیل کے جواب میں ندا نے دروازہ کھولا اور ایک نظر میں تاڑ گئی کہ میں کسی مشکل سے گزر کر آرہا ہوں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''کیا ہوا خیریت تو ہے نا؟''

میں اندر گھسا ٹیکسی والے کو میں راستے میں ہی کرایہ دے چکا تھا اس لیے وہ مجھے اتارتے ہی چلا گیا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں اندر آیا اور سب سے پہلے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا معائنہ کیا۔ ندا میرے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ اسے اپنا ایک صاف ستھرا جوڑا نکالنے کا کہہ کر میں واش روم میں گھس گیا۔ خود کو اچھی طرح صاف ستھرا کر کے میں باہر آیا تو ندا ایک شلوار سوٹ لے آئی تھی۔ اس نے پہلے میرے زخموں پر سنی پلاس لگایا پھر میں نے کپڑے پہنتے ہوئے اسے مختصراً خود پر گزرنے والی سنائی۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گئی تھی کہ میں ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور ان سے جان چھڑانے کے لیے میں نے ان کی وین کو بل بورڈ کے ستون سے ٹکرا دیا تھا۔ اس نے درمیان میں سوالات کرنا چاہے مگر میں نے اسے روک دیا۔ ''ابھی میں ابا کے پاس جا رہا ہوں وہاں سے آکر تفصیل سے بتاؤں گا۔''

ٹونی سو رہا تھا اور پھپو عشاء کے بعد اپنے وظیفے پڑھ رہی تھیں۔ میں اماں ابا کے گھر آیا۔ سب سے سلام دعا کے بعد ابا اور گھر میں موجود ریحان اور عرفان بھائی کو لے کر الگ کمرے میں آیا اور کمرا اندر سے بند کر کے میں نے دھیمی آواز میں انہیں ساری روداد سنائی۔ وہ پریشان تو ہوئے تھے مگر انہوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ اس معاملے کو دیکھ لیں گے۔ ابا نے اسی وقت میرے فرسٹ کزن سے بات کی جو پولیس میں ڈی ایس پی تھے۔ انہیں ساری بات بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر پولیس آئے تو میرے بارے میں یہی بتایا جائے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ میں کسی صورت پولیس کے سامنے نہ آؤں ورنہ میں لمبے چکر میں پھنس سکتا تھا۔ ابا نے اسی وقت مجھے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا جو گھر میں اکیلے ہوتے تھے۔ بیوی مر گئی تھی اور بچے دوسرے شہروں میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں آکر میں نے ان کے گھر کے فون سے ندا کو کال کر کے تسلی دی اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔

''عمران یہ کیا ہے۔ اتنے عرصے صبر سے آپ کا انتظار کیا۔ کتنی شدت سے آپ کے آنے کی منتظر تھی اور.....''

''ندا میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں لیکن تم خود سوچو کہ اللہ نے کتنی بڑی آفت سے بچایا ہے۔ اگر میں یوں حوصلہ نہ کرتا اور وین کو ستون سے نہ ٹکراتا تو وہ اپنا کام نکلوانے کے بعد مجھے کہاں چھوڑتے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے دہل کر کہا۔ ''میں ناشکری کر رہی ہوں۔''

اگلے دن ڈی ایس پی کزن نے بتایا کہ موقع سے میرا موبائل نہیں ملا اور نہ ہی وہاں سے کوئی بندہ گرفتار ہوا ہے۔ جب تک پولیس آئی۔ وین میں موجود افراد وہاں سے پیدل ہی فرار ہو گئے تھے اور پولیس کسی کو تلاش نہیں کر سکی۔ وین چوری کی تھی اور اس میں صرف گھاس پھونس سے بھرے گتے کے ڈبے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ محمود کے ساتھی اسے لے کر بھاگ گئے تھے ورنہ وہ تو خود جانے کے قابل کہاں تھا۔ میرا موبائل کوئی اٹھا کر لے گیا تھا اور میں اس کا شکر گزار ہوا۔ معاملہ صاف ہونے کے بعد بھی ابا نے احتیاطاً مجھے دو دن گھر نہیں آنے دیا۔ بہ مشکل تیسرے دن گھر آنے کی اجازت ملی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنی سم بند کروائی اور دوسری سم لی۔ صرف جان نہیں بچی تھی بلکہ سوائے موبائل کے تمام ہی چیزیں بچ گئی تھیں۔ موبائل اچھا تھا مگر میں نے دوسرا زیادہ اچھا لے لیا۔

ندا اور ٹونی مجھے ایسے چمٹے کہ گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ملتی تھی۔ میں خود بھی ان سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اب میرے پاس تین دن تھے کیونکہ اتوار کے دن میری واپسی تھی اور پیر کی صبح سے مجھے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ یہ تین دن یوں گزرے کہ لگا تین منٹ گزرے ہیں اور جانے کا وقت آگیا تھا۔ میں دل مسوس کر کے روانہ ہوا تھا۔ مگر ساتھ ہی خدا کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے اتنے خوفناک لوگوں سے مجھے بچا لیا اور حادثے میں بھی محفوظ رکھا۔ اگر میں نے حوصلے سے کام لیا تھا تو یہ حوصلہ بھی اسی کی دین تھا۔

مکرمی مدیر
السلام علیکم
میں سرگزشت کی قاری ہوں لیکن آج تک خط نہیں لکھا۔ صرف پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر خیال آیا کہ اپنی زندگی کے واقعات کو بھی کہانی کی شکل میں لکھوں' پتا نہیں پڑھنے والوں کو پسند آئے گی بھی یا نہیں۔ لیکن اس امید پر کہانی بھیج رہی ہوں کہ لوگ سبق حاصل کریں۔ خصوصاً کم عمر لڑکیاں۔

مریم مراد
(جھنگ)

بعض اوقات انسان کی ایک چھوٹی سی غلطی اس کے لیے زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ میں بھی آج تک اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں اور چپ چاپ زندہ ہوں، اس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

میرا تعلق ایک خوش حال اور کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ پاکستان ہجرت کرکے آنے کے بعد دادا ابو نے چھوٹی سی ایک ہوزری مل لگائی تھی جسے ابو نے مزید ترقی دی تھی۔ ہم ان دنوں کراچی کے ایک صاف ستھرے علاقے پی

ای سی ایچ سوسائٹی میں رہتے تھے۔
میری منگنی میری پیدائش کے وقت ہی ماموں زاد شعیب سے ہوگئی تھی۔ یہ اب سے تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت بیشتر گھرانوں میں ایسا ہوتا تھا۔ ابو بڑے بزنس مین ہی نہیں تھے بلکہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ انہوں نے ماموں جان نے کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ بچپن کی منگنی اور ٹھیکرے کی مانگ وغیرہ پرانے زمانے کی فرسودہ باتیں ہیں۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ ہاں اگر وقت آنے پر شعیب بیٹا میرے اور میری بیٹی کے معیار پر پورا اترا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس رشتے پر پہلا حق آپ ہی کا ہوگا۔''
ماموں جان مایوس ہو گئے۔ وہ یوں بھی ابو سے مرعوب تھے کہ کسی بھی طور ابو کے ہم پلہ نہیں تھے۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے اور جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ ان کے برعکس ہمارے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی اور اس دور میں جب کسی کے پاس موٹر سائیکل ہونا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں دو دو گاڑیاں تھیں، ایک گاڑی ابو اور دادا ابو کے لیے اور دوسری امی کے لیے۔
امی بھی پڑھی لکھی تھیں۔ اس دور میں عورتیں بہت کم ڈرائیونگ کرتی تھیں ورنہ مجھے یقین ہے کہ امی بھی اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کرتیں۔ ابو نے ان کے لیے ایک ڈرائیور رکھ دیا تھا، امی بھی کبھار ہی کہیں جاتی تھیں۔ یوں وہ ڈرائیور بیٹھے بیٹھے کھاتا تھا یا بہت ہوا تو گاڑیاں دھو کر چمکا دیں اور ان پر پالش کر دی۔
بات ہو رہی تھی میرے رشتے کی۔ ماموں جان کو اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ ابو نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ بھی ایک طرح سے انکار ہی تو تھا۔ وہ بے چارے بہت دل گرفتہ ہو گئے تھے اور ہمارے گھر آنا جانا بھی بہت کم کر دیا تھا۔
ان ہی دنوں میری پہلی سالگرہ آگئی۔ میں ابو کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ میری سالگرہ بھی انہوں نے بہت دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہفتے پہلے سے وہ مہمانوں کی لسٹ بنانے لگے۔ ان کا اپنا حلقہ بہت بڑا تھا۔ ان کے دوستوں میں زیادہ تر بزنس مین اور صنعت کار شامل تھے۔ ان کے علاوہ ہمارے رشتے دار بھی تھے۔ ابو نے دور و نزدیک کے تمام رشتے داروں کو اس تقریب میں مدعو کر لیا۔
ماموں جان نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر آنے سے معذرت کر لی۔
''منظور کو ایسی کیا مصروفیت ہے؟'' دادا ابو نے ابو سے پوچھا۔
''ابو، یہ بات تو آپ کو منظور بھائی ہی بتا سکیں گے۔'' ابو نے کہا۔
''اس کے گھر میں ٹیلی فون بھی نہیں ہے۔ تم ایسا کرو ڈرائیور کو بھیج کر اسے یہیں بلوالو۔'' دادا ابو نے کہا۔
ایک گھنٹے بعد ماموں جان دادا ابو کے پاس پہنچ گئے۔
''جی ابو۔'' انہوں نے پوچھا۔ ''آپ نے مجھے بلوایا ہے، کوئی خاص بات ہے؟''
''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ایسی کیا مصروفیت آپڑی ہے کہ تم نے مریم کی سالگرہ میں آنے سے انکار کر دیا؟'' دادا ابو نے پوچھا۔
''ابو، دراصل آج کل دفتر میں کام بہت ہے۔ بہت سا کام التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے رات کے بارہ بارہ بجے تک دفتر میں کام کرنا پڑتا ہے۔'' ماموں جان نے نظریں جھکا کر کہا۔
''تمہیں وہاں سے ایک دن کی چھٹی نہیں مل سکتی؟'' دادا ابو نے پوچھا۔
''چھٹی مل سکتی تو میں ضرور شرکت کرتا۔'' ماموں جان نے کہا۔
''تمہارا ڈائریکٹر کون ہے؟'' دادا ابو نے اچانک پوچھا۔
''وہ انڈر سیکریٹری ہیں صمد خان صاحب۔'' ماموں جان نے کہا۔
''صمد کو فون ملاؤ۔'' دادا ابو نے ٹیلی فون ان کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سے بات کرتا ہوں۔''
ماموں جان گھبرا گئے اور جلدی سے بولے۔ ''ابو! میں خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔ اتنے سے کام کے لیے آپ انہیں کیوں زحمت دے رہے ہیں؟''
ماموں جان خاصے خود دار اور با اصول شخص تھے۔ ابو انہیں پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ ماموں جان کیوں روٹھے ہوئے ہیں۔
خیر، وہ بہ حالت مجبوری میری سالگرہ میں شریک ہو گئے۔

کیک کٹنے کے فوراً بعد ابو نے اعلان کیا۔ ''میں منظور کی خواہش پر اپنی بیٹی مریم کا رشتہ ان کے بیٹے شعیب سے طے کرتا ہوں۔''

ابو کی بات سن کر ماموں جان کا چہرہ کھل اٹھا۔

''لیکن......لیکن!'' ابو نے کہا۔ ''میں رجعت پسند اور فرسودہ خیالات کا قائل نہیں ہوں اور بچوں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا بھی مجھے بالکل شوق نہیں ہے۔ اس رشتے کے سلسلے میں میری ایک شرط ہے۔''

ماموں جان نے تشویش سے ابو کی طرف دیکھا۔ تمام مہمان بھی پُرتجسس انداز میں ابو کو دیکھ رہے تھے۔

''کیسی شرط؟'' ماموں جان نے پوچھا۔

''میٹرک کے بعد مریم کی رائے معلوم کی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک لڑکیاں خاصی سمجھدار ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر سکیں۔ شعیب تو اس وقت مزید سمجھدار ہو چکا ہوگا۔ اگر ان دونوں ہی نے ایک دوسرے کو پسند کیا تو میری طرف سے یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت سے پکا سمجھیں۔''

''یعنی دونوں بچوں کی رضا مندی ضروری ہے؟'' میری بڑی پھپھو نے کہا۔

''ظاہر ہے پسندیدگی بھی دو طرفہ ہوتی ہے۔'' ابو مسکرائے۔ ''اگر ہمارے بچوں نے باشعور ہو کر ایک دوسرے کو پسند کر لیا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

یہ سب باتیں مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئیں۔ ساتویں کلاس تک مجھے علم نہیں تھا کہ میرے رشتے کے سلسلے میں ایسی کوئی بات ہوئی ہے۔

میری ماموں زاد ثمینہ یعنی شعیب کی بہن میری ہم عمر تھی۔ اس سے میری دوستی بھی خوب تھی۔ وہ اکثر چھٹیوں میں ہمارے گھر آ کر رہتی تھی۔ مجھ سے چھوٹا انور تھا، وہ بھی ثمینہ کو بہت پسند کرتا تھا کیوں کہ وہ انور کے لیے کبھی چاکلیٹ، کبھی کہانیوں کی کتابیں وغیرہ لے کر آتی تھی۔

ماموں جان نے برسوں پہلے سرکاری ملازمت چھوڑ کر کسی ملٹی نیشنل فرم میں ملازمت کر لی تھی۔ ان کی تنخواہ وہاں خاصی معقول تھی۔ اب ان لوگوں کا معیارِ زندگی بھی کافی بلند ہو گیا تھا۔ انہوں نے چار پانچ سال میں پرانی ایک گاڑی بھی خرید لی تھی۔

اس دوران میں دادا ابو کا انتقال ہو چکا تھا۔

میں کراچی کے ایک بہترین اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ ماموں جان نے شعیب کو شہر کے ایک بہت اچھے اسکول میں ایڈمیشن دلوا دیا تھا۔ وہ خاصا ذہین تھا اور ہر کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔ میں بھی اس سے پیچھے نہیں تھی۔

اس مرتبہ گرمی کی چھٹیوں میں ثمینہ ہمارے گھر رہنے آئی تو ہم نے خوب سیر سپاٹے کا پروگرام بنایا۔ کبھی ہل پارک، کبھی کلری جھیل، کبھی ساحل سمندر پر۔

ہم سمندر کی لہروں سے کھیل رہے تھے۔ میرے دونوں بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر ریت کے گھروندے بنا رہے تھے اور ہمارا ڈرائیور دور بیٹھا ہماری نگرانی کر رہا تھا۔

اچانک ثمینہ نے پوچھا۔ ''مریم! تجھے شعیب بھائی کیسے لگتے ہیں؟''

''وہاٹ ڈو یو مین بھائی کیسے لگتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہے؟'' ثمینہ ہنس کر بولی۔ ''میں نے یہی تو پوچھا ہے کہ تمہیں شعیب بھائی کیسے لگتے ہیں؟''

''اچھے ہیں، ذہین ہیں، اسمارٹ ہیں اور......'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مزید جو خوبیاں ہیں وہ تم میری طرف سے شامل کر لو۔''

''اس کا مطلب ہے کہ شعیب بھائی تمہیں اچھے لگتے ہیں؟''

''آف کورس۔ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں کیا تجھے اچھے نہیں لگتے؟''

''مجھے اچھے کیوں نہیں لگیں گے؟'' ثمینہ مسکرائی۔ ''میرے تو وہ بھائی ہیں۔''

''میرے بھی بھائی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بدھوان کے ساتھ تیری منگنی ہو چکی ہے۔'' ثمینہ نے کہا۔

''کیا بکواس ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ بکواس نہیں ہے مریم!'' ثمینہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''مجھے بھی یہ بات کچھ دن پہلے ہی معلوم ہوئی ہے۔''

''دیکھو ثمینہ! بہت مذاق ہو گیا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''میں نے خود سنا ہے امی اور ابو سے۔''

''ان لوگوں نے تجھے بتایا ہے......''

''ان لوگوں نے مجھے نہیں بتایا۔'' ثمینہ نے میری

بات کاٹ دی۔ ''وہ تو آپس میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے تو بس اتفاق سے ان کی باتیں سن لیں۔'' ثمینہ واقعی مجھے سنجیدہ لگ رہی تھی۔

''اچھا، تو نے کیا سنا؟'' میرا تجسس بھی بڑھتا جارہا تھا۔

''ابو امی سے کچھ کہہ رہے تھے کہ اب ہمیں صفدر بھائی سے بات کرنا چاہیے۔ مریم بھی سمجھ دار ہوچکی ہے اور شعیب بھی۔ ان کی یہ ہی تو شرط تھی۔''

''یہ برسوں پرانی بات ہے۔'' امی نے کہا۔ ''اب تو ابو بھی زندہ نہیں ہیں۔ صفدر بھائی اور ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ......''

''تم کیسی باتیں کررہی ہو؟'' ابو نے کہا۔ ''صفدر بھائی نے بھری محفل میں اس منگنی کا اعلان کیا تھا۔ ابو زندہ نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ خاندان کا ہر آدمی اس منگنی کا گواہ ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں مناسب موقع دیکھ کر بھائی صاحب سے بات کروں گی۔''

''اور ابو کی شرط کیا تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا مجھے علم نہیں۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''لیکن یہ بات تو طے ہے کہ تیری منگنی شعیب بھائی سے ہوچکی ہے۔''

اس دن ثمینہ نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا۔ میری منگنی اگر شعیب سے ہوچکی ہے تو امی نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ ابو کی شرط کیا تھی؟

شعیب مجھے بھی اچھا لگتا تھا لیکن میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ خوب رو تھا، ذہین تھا، جامہ زیب تھا اور کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہوسکتا تھا۔ میں نے اس پہلو سے غور کیا تو شعیب مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا۔

وہ بہت سوبر لڑکا تھا، عام لڑکوں کی طرح چھچھورا نہیں تھا۔ مجھے اس کی یہ ہی بات پسند تھی۔

ان دنوں میرے میٹرک کے امتحان ہورہے تھے۔ میں سب کچھ بھول کر پڑھائی میں لگ گئی۔

میٹرک کے امتحانات کے بعد مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کچھ دن ماموں جان کے گھر رہ آؤں۔ کہ اسی دن ماموں جان اور ممانی جان آگئے۔ ان کے ساتھ ثمینہ بھی تھی۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے ابو بھی گھر پر ہی تھے۔

تھوڑی دیر بعد ثمینہ ہنستی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور بولی۔ ''آج امی اور ابو تیرے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے ابھی ابھی ان لوگوں سے تفصیل معلوم ہوئی ہے۔ تیری منگنی تو تیری پہلی سالگرہ ہی کو ہوگئی تھی لیکن پھوپا جان کی شرط تھی کہ اگر جوان ہونے پر بچوں نے بھی ایک دوسرے کو پسند کیا تو میری طرف سے یہ رشتہ پکا سمجھو۔'' وہ مسکرا کر میرے نزدیک آبیٹھی اور بولی۔ ''اب آپ بتائیں آپ اس رشتے پر راضی ہیں بھابی؟''

اس کے بھابی کہنے سے میں بری طرح شرما گئی اور بولی۔ ''میری مرضی کو چھوڑو پہلے تو شعیب...... بھا......!'' میں بھائی کہتے کہتے رک گئی۔ ''شعیب سے تو بات کرلے۔''

''تم ہاں کروگی تو میں ان سے بات کروں گی ناں؟'' ثمینہ نے کہا۔

''نہیں پہلے تو شعیب سے بات کر۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں رضا مندی کا اظہار کردوں اور شعیب انکار کردے۔ مجھے اپنی توہین کسی بھی قیمت پر گوارہ نہیں تھی۔

''تم بھی بالکل ہی پیدل ہو عقل سے۔'' ثمینہ منہ بنا کر بولی۔ ''امی شعیب بھائی سے بات کرنے کے بعد ہی یہاں آئی ہیں۔ شعیب بھائی تو اس رشتے پر رضامند ہیں۔ کوئی بدذوق ہی ہوگا جو تجھ جیسی خوب صورت لڑکی کے رشتے کو ٹھکرائے گا؟''

''اگر شعیب...... رضامند...... ہو تو...... میری طرف سے...... بھی...... ہاں سمجھو۔'' میں نے سر جھکا کر اٹکتے ہوئے کہا۔

''میں پھوپا جان اور پھپھو کو یہ خوش خبری سنا دوں۔'' ثمینہ یہ کہہ کر ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد امی نے مجھے بلایا اور پوچھا۔ ''مریم! ہم تمہاری شادی شعیب سے کرنا چاہ رہے ہیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''امی...... آپ لوگ...... میرے لیے...... جو فیصلہ بھی کریں گے وہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔''

دوسرے ہفتے شعیب سے میری بات پکی ہوگئی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ پر پابندی بھی لگ گئی کہ اب تم شعیب کے سامنے نہیں آؤ گی۔

اب سے تیس سال پہلے ایسا ہی ہوتا تھا، اب تو منگنی ہوتے ہی لڑکیاں اپنے منگیتروں کے ساتھ بلا روک ٹوک

گھومتی پھرتی ہیں اوران پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔
ان دنوں سیل فون بھی نہیں تھے لے دے کر ایک لینڈ لائن فون تھا۔ وہ بھی لاؤنج میں رہتا تھا۔
جب سے شعیب کے ساتھ میرا رشتہ طے ہوا تھا وہ مجھے کچھ زیادہ ہی اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ کبھی ہمارے گھر آتا بھی تھا تو غیروں کی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا تھا۔ اب میں چاہتی تھی کہ جلد از جلد شادی ہو جائے تا کہ شعیب کا خوب رو سراپا ہمیشہ میرے سامنے رہے۔ میں اس کی میٹھی میٹھی سرگوشیاں سنتی رہوں۔
شعیب ان دنوں ایم بی اے کر رہا تھا۔ ان دنوں ایم بی اے کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ بہ قول شعیب کے اس میں پاس ہونے کے لیے کم سے کم بارہ چودہ گھنٹے تو مسلسل پڑھنا پڑتا ہے۔
ان دنوں ایم بی اے صرف کراچی یونیورسٹی ہی سے ہوتا تھا اوران کی شرائط بہت کڑی تھیں۔ آج کل تو ایم بی اے اور ایم بی بی ایس کی ڈگریاں ریوڑیوں کی طرح بٹتی ہیں۔
یہ سمجھ لیں کہ شعیب نے ابھی ایم بی اے میں داخلہ ہی لیا تھا اور ابھی ہمیں کئی سال انتظار کرنا تھا۔
میٹرک کا رزلٹ آچکا تھا۔ میں نے بھی کالج میں داخلہ لے لیا۔
شعیب نے ٹیلی فون پر بات کرنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ پہلے ثمینہ ٹیلی فون کرتی تھی۔ پھر وہ امی سے بات کر کے مجھے بلاتی تھی اور ریسیور شعیب کے ہاتھوں میں پکڑا دیتی تھی۔ پہلے پہل تو میں بالکل گنگ ہو کر رہ گئی۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ میں شعیب سے کیا بات کروں۔ بس شعیب ہی بولتا رہتا تھا اور میں سنتی رہتی تھی۔
پھر آہستہ آہستہ میری جھجک بھی ختم ہو گئی اور میں بھی شعیب سے باتیں کرنے لگی۔ اب تو مجھے ثمینہ کے ٹیلی فون کا انتظار رہتا تھا۔ وہ اگر کبھی اپنے طور پر بھی امی کو کال کرتی تھی تو میں جھپٹ کر امی سے ریسیور لے لیا کرتی تھی۔
میری آواز سن کر وہ کہتی۔ ”اٹینشن پلیز! اس وقت آپ کی بات اپنے ”ان“ سے نہیں ہو سکتی۔ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ میں نے تو پھپو کو ٹیلی فون کیا تھا۔“
میں مایوس ہو کر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیتی۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ میرا عشق بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مجھے کبھی کبھی ابو پر بھی غصہ آتا تھا کہ کیسی دقیانوسی خیالات کے مالک ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں لیکن ابھی تک صدیوں پرانی اس رسم سے چمٹے ہوئے ہیں کہ لڑکی اور لڑکا شادی سے پہلے ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔
میری کئی دوستوں کی منگنیاں ہو چکی تھیں۔ وہ سب ہی اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اکثر اپنی منگیتروں کا احوال سناتی تھیں کہ لاسٹ ویک اینڈ پر تو ہم نے خوب انجوائے کیا۔ میں اپنے منگیتر کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر گئی تھی اس نے مجھے ڈھیر ساری شاپنگ کرائی۔ ہم نے باہر ڈنر بھی کیا اور رات کو گیارہ بجے اس نے مجھے گھر ڈراپ کر دیا۔
میری ایک دوست رینا تو اپنے منگیتر کے ساتھ سنگاپور کا چکر بھی لگا چکی تھی۔ ان لوگوں نے وہاں پورے ایک ہفتے قیام کیا تھا۔
ایک میں تھی کہ اپنے منگیتر سے بات کرنے کو بھی ترستی تھی۔ اس مشکل کا حل بھی مجھے شعیب نے بتایا۔ ثمینہ ایک دن ایک ٹیلی فون سیٹ لے آئی اور بولی۔ ”مریم! تم یہ سیٹ اپنے بیڈ روم میں لگا لو۔ یہاں ٹیلی فون پوائنٹ تو موجود ہے۔“
”اچھا!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس سے کیا ہوگا؟“
”اس سے ہوگا یہ کہ تم رات کو جی بھر کے شعیب بھائی سے باتیں کر سکو گی۔“
”کیوں، انہوں نے مجھے کوئی دوسرا ٹیلی فون لگوا دیا ہے کیا؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔
”پہلے میری پوری بات تو سن لو۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”رات کو گیارہ بجے کے بعد تم باہر والے ٹیلی فون کا پلگ نکال دینا اور اپنے سیٹ کا پلگ لگا لینا۔ پھر جو بھی کال آئے گی وہ ڈائریکٹ تمہارے ٹیلی فون پر آئے گی۔ باہر گھنٹی بجے گی ہی نہیں۔ تم ہمارے نمبر پر خود بھی کال کر سکتی ہو۔“
ثمینہ نے مجھے بات کرنے کی راہ سجھائی۔
میں نے اس رات گیارہ بجے کے بعد موقع دیکھ کر لاؤنج والے ٹیلی فون سیٹ کا پلگ نکال دیا اور دوسرا سیٹ اپنے بیڈروم میں لگا لیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو اس میں کالنگ ٹون کی مخصوص آواز آ رہی تھی۔
اس رات میں نے جی بھر کے شعیب سے باتیں کیں۔ پھر تو یہ ہمارا روز کا معمول ہو گیا۔ رات کو گیارہ بجے کے بعد میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتی اور صبح کے تین بجے تک شعیب سے باتیں کرنے لگی۔ اب میں اس سے بہت

بے تکلف ہوگئی تھی اور اس سے ہر موضوع پر بات کرتی تھی۔ ہمارا بنیادی موضوع تو شادی تھا۔ وہ اکثر ایسی بات بھی کر جاتا تھا جس سے میں شرما کر اسے ٹوک دیتی تھی۔

ایک دن ثمینہ ہمارے گھر آئی اور امی سے بولی۔ ''پھپھو آج میری ایک دوست زرین کی سالگرہ ہے۔ اس نے مریم کو بھی بلایا ہے۔ کیا میں مریم کو لے جاؤں؟''

''زرین تمہاری سہیلی ہے بیٹا اس نے مریم کو کیوں بلایا ہے؟'' امی نے کہا۔

''وہ مریم کی بھی دوست ہے پھپھو! مریم تو سالگرہ میں جانا چاہتی ہے لیکن آپ سے اجازت لینے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔''

امی رات کی تقریبات میں مجھے تنہا کبھی بھی جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ میں زرین کو جانتی تھی کہ وہ ثمینہ کی دوست ہے لیکن اس سالگرہ میں مجھے نہیں بلایا تھا۔ ثمینہ شاید مجھے بھی ساتھ لے جانے کے لیے امی سے جھوٹ بول رہی تھی۔

''زرین کا گھر کہاں ہے بیٹی؟'' امی نے پوچھا۔

''وہ ڈیفنس میں رہتی ہے۔'' ثمینہ جلدی سے بولی۔

''ٹھیک ہے لے جاؤ مریم کو لیکن جلدی لوٹنے کی کوشش کرنا۔ تمہارے پھوپا جان کو لڑکیوں کا راتوں کو باہر رہنا بالکل پسند نہیں ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولیں۔ ''تم لوگ جاؤ گی کیسے؟ ڈرائیور تو آج چھٹی پر ہے۔''

''مریم خود بھی تو ڈرائیونگ کر لیتی ہے پھپھو۔'' ثمینہ نے جلدی سے کہا۔

''نہیں بیٹا! تمہارے پھوپا کو معلوم ہوگا تو ایک طوفان کھڑا کر دیں گے کہ رات کے وقت دونوں بچیوں کو تنہا بھیج دیا۔ میں شعیب سے کہتی ہوں وہ تم لوگوں کو وہاں چھوڑ آئے گا اور واپس بھی لے آئے گا۔ اب یہ تم لوگوں کی قسمت ہے کہ شعیب اس پر راضی بھی ہوتا ہے یا نہیں۔''

ثمینہ خوش ہوگئی لیکن ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''شعیب بھائی تو کبھی راضی نہیں ہوں گے۔''

''تو بیٹا پھر مجبوری ہے۔'' امی نے صاف صاف کہہ دیا اور ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

امی نے شعیب سے بات کی تو پہلے تو اس نے ٹال مٹول سے کام لیا پھر گویا امی کے کہنے پر مجبوراً راضی ہوگیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنی گاڑی میں ہمارے گھر پہنچ گیا اور ثمینہ سے بولا۔ ''جلدی کرو تم لوگوں کو چھوڑ کر مجھے اپنے ایک دوست کو لینے ایئرپورٹ بھی جانا ہے۔''

ہم جلدی جلدی تیار ہوئے اور شعیب کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ ڈیفنس کے علاقے میں تو آج بھی سناٹا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں تو وہاں ہو کا عالم رہتا تھا۔

شعیب نے جس بنگلے کے سامنے گاڑی روکی اسے دیکھ کر بالکل یہ نہیں لگ رہا تھا کہ یہاں کوئی تقریب ہے۔ بنگلے کا گیٹ بھی شعیب نے خود ہی کھولا اور گاڑی کو پورچ میں لے جانے کے بعد بند کر دیا۔

میں عجیب الجھن میں مبتلا تھی۔ نہ کوئی روشنی، نہ کوئی ہنگامہ، نہ مہمان نہ میزبان، یہ کیسی سالگرہ تھی۔

اس وقت میں بری طرح چونکی جب شعیب نے اپنی جیب سے چابی نکال کر بنگلے کا بیرونی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر اس نے لائٹ جلائی۔

ہم آراستہ ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔ اندر کوئی ذی روح نہیں تھا۔

میں نے جھلا کر ثمینہ سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے ثمینہ؟''

''یہ تو تم شعیب بھائی ہی سے پوچھو۔'' ثمینہ نے کہا۔

''مریم!'' شعیب نے کہا۔ ''ویسے تو ہماری ملاقات ناممکن تھی۔ میں تم سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ میں اس دل کا کیا کروں جو تمہارے نام پر دھڑکتا ہے اور ہر لمحہ تمہیں پانے کی آرزو کرتا ہے۔ مجھے یہی طریقہ سمجھ میں آیا۔''

''ثمینہ!'' میں بپھر کر بولی۔ ''واپس چلو میں اپنے والدین کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ امی نے تم پر اعتماد کر کے ہی مجھے تمہارے ساتھ بھیجا تھا۔''

''مریم!'' ثمینہ نے کہا۔ ''اتنا غصہ مت کرو پلیز۔ اب آ ہی گئی ہو تو کچھ دیر شعیب بھائی سے بات کر لو۔''

''تم چل رہی ہو یا نہیں؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس خوشامدانہ انداز میں میری طرف دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہاں سے خود ہی چلی جاؤں گی۔''

میں جانے کے لیے مڑی تو شعیب نے میرا راستہ روک لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی مقناطیسی کشش محسوس ہوئی۔ میں پگھل کر رہ گئی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''مریم اتنا غصہ مت کرو۔ بس جو کچھ بھی کیا ہے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا ہے۔ تم اگر واپس جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں بلکہ تمہیں گھر تک چھوڑ کر آؤں گا لیکن گھر جا کر پھپھو کو کیا جواب دو گی کہ سالگرہ کی تقریب اتنی جلدی ختم کیسے ہو گئی؟''

''میں کہہ دوں گی کہ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے ہمیں واپس آنا پڑا۔''

شعیب اب تک میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں موم کی طرح پگھل جاؤں گی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''مریم! بس تھوڑی دیر پلیز آئی لو یو۔'' یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''میں دوسرے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔'' ثمینہ نے کہا۔

مجھے شعیب کے والہانہ انداز کی وجہ سے ثمینہ کی موجودگی میں شرمندگی ہو رہی تھی۔ ثمینہ ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی، جاتے جاتے بولی ''بلکہ میں آپ لوگوں کے لیے کافی بنا لیتی ہوں۔ شعیب بھائی کچن کس طرف ہے؟''

''خود ہی ڈھونڈ لو۔'' شعیب نے کہا۔ ''وہاں تمہیں ہر چیز مل جائے گی۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''مریم! یہ بنگلا میرے ایک دوست کا ہے۔ وہ قومی ایئر لائن میں پائلٹ ہے۔ آج کل فلائٹ پر نیویارک گیا ہوا ہے۔ وہ یہاں اکیلا ہی رہتا ہے۔ اس کی فیملی اسلام آباد میں ہے۔''

دیوار پر یونیفارم میں ملبوس خوبرو سے ایک نوجوان کی تصویر لگی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ یہ ہی شعیب کا دوست ہے۔

''دیکھیں شعیب! آج تو میں نے یہ سب برداشت کر لیا لیکن......''

''سوری......سوری......'' شعیب نے اپنے کان پکڑ کر کہا۔ ''آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہو گی چاہے میرا دل کتنا ہی تڑپے، مچلے، میری حرکت قلب بند ہو جائے لیکن......''

میں نے شعیب کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی باتیں مت کریں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کیا آپ ہی کا دل ہے۔ آپ ہی بے چین ہوتے ہیں۔ مجھے بھی آپ سے ملنے کی بات کرنے کی اتنی ہی چاہ ہے لیکن جب امی ابو مجھ پر اور مجھ سے زیادہ آپ پر اعتماد کرتے ہیں تو ہم ان کے اعتماد کو دھوکا

کیوں دیں، کچھ دن صبر نہیں کر سکتے؟''

''صبر ہی تو نہیں ہوتا ڈارلنگ۔'' شعیب نے جذباتی ہو کر کہا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مجھے عجیب سی سنسناہٹ کا احساس ہوا تھا جیسے مجھے ہلکا سا کرنٹ لگا ہو۔

''تم یہ کیا ہر وقت پرانی فلموں کی ہیروئن کی طرح اتنے خوب صورت بال چوٹی میں جکڑے رکھتی ہو۔'' شعیب نے میری گھنی چوٹی سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ''کبھی انہیں کھول کر بکھرا بھی لیا کرو۔''

''لوگ مجھے پاگل سمجھیں گے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن شادی کے بعد یہ سب نہیں چلے گا۔ تمہیں اس طرح رہنا پڑے گا جیسے میں کہوں گا۔'' شعیب نے میرا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

اچانک ثمینہ کے کھنکارنے کی آواز آئی اور وہ شوخ انداز میں بولی۔ ''چائے گرم چائے! انٹرویل ہو چکا ہے۔''

اس کی بات پر ہم دونوں ہنسنے لگے۔

چائے دے کر ثمینہ ایک مرتبہ پھر وہاں سے غائب ہو گئی۔ شعیب نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تم جانتی ہو مریم! میں شروع ہی سے یہ سوچتا تھا کہ کاش یہ خوب صورت لڑکی میری ہو جائے اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ محترمہ میری منگیتر ہیں۔''

''میرے بھی یہ ہی جذبات تھے۔'' میں نے آنکھیں موند کر کہا۔ ''میں بھی یہ ہی چاہتی تھی لیکن اس بات سے بے خبر تھی کہ میں پہلے ہی تمہاری ہو چکی ہوں۔''

''اگر تم انکار کر دیتیں تو شاید میں زندہ نہ رہ پاتا۔'' شعیب نے کہا۔

''سب کہنے کی باتیں ہیں کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' شعیب نے پوچھا۔

''میں نے اپنے چچا زاد کو دیکھا ہے وہ بھی ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ تھا اور ہمیشہ یہ ہی کہتا تھا کہ میں اس کے بغیر مر جاؤں گا۔ اس لڑکی کے گھر والے اس شادی کے مخالف تھے اس لیے شادی نہ ہو سکی۔ میرا چچا زاد کچھ دن تو پریشان اور اداس رہا پھر نارمل ہو گیا اور اس نے بھی شادی کر لی۔ اب شاید وہ اپنی بیوی سے بھی یہی کہتا ہوگا۔''

''تم حامد کی بات کر رہی ہو؟'' شعیب نے پوچھا۔

''میں اسے جانتا ہوں لیکن مریم ڈیئر ہر آدمی حامد نہیں

ہوتا۔"

"میں تو مذاق کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ تو سیریس ہو گئے۔" پھر ہنس کر بولی۔ "میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی تھی۔"

"آئندہ مذاق میں بھی ایسی بات مت کرنا۔ میں...... میں...... تمہارے بغیر مر جاؤں گا مریم۔" شعیب نے بے اختیار میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"میں بھی کب زندہ رہ پاؤں گی۔" میں بھی سیریس ہو گئی۔

اسی وقت دروازے پر دستک دے کر ثمینہ بولی۔

"روم سروس۔"

"کم ان۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ کیا تم تو خالی ہاتھ آ گئی ہو؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے میں یہاں بیٹھ کر آپ لوگوں کے لیے ڈنر تیار کرتی؟" پھر وہ چہک کر بولی۔ "شعیب بھائی ابھی تو ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ اب آ ہی گئے ہیں تو ہمیں کسی اچھی جگہ پر ڈنر بھی کرا دیں۔"

"ہاں، بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "یوں بھی ہم زرین کی برتھ ڈے پارٹی میں آئے ہیں۔ گھر جا کے کھانا کھاتے ہوئے عجیب سا لگے گا۔"

"او کے!" شعیب ہنس کر بولا۔ "چلو پھر کہیں ڈنر کرتے ہیں۔"

"میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل یا ہائی فائی ریسٹورنٹ میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے کہا۔ "وہاں میری کوئی کلاس فیلو یا ابو کے کوئی دوست بھی مل سکتے ہیں۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں سی فوڈ کھاتے ہیں۔" شعیب نے کہا۔ "مریم تمہیں سی فوڈ پسند ہے نا؟"

"ہاں، فرائیڈ پران اور فش مجھے بہت پسند ہیں۔" میں نے کہا۔

ان دنوں کراچی میں ساحل سمندر پر صرف ایک ہی چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا لیکن وہاں کھانا بہت اچھا ملتا تھا۔

ہم تینوں وہاں پہنچے تو مجھے وہاں کا ماحول بھی اچھا لگا۔ نیم تاریکی میں اور کھلی فضا میں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ وہاں اچھا خاصا رش تھا لیکن ہمیں ایک گوشے میں جگہ مل گئی۔

ہم ڈنر سے فارغ ہوئے تو ثمینہ نے کہا۔ "شعیب بھائی اگر آئس کریم بھی......"

"تو، تم لوگ گاڑی کی طرف چلو میں لے کر آتا ہوں۔" شعیب نے کہا۔

ہماری گاڑی وہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ ہم گاڑی کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اندھیرے میں سے ایک دبلا پتلا نوجوان نکل کر سامنے آ گیا۔

"اے کہاں جا رہی ہو؟" اس نے ہانک لگائی۔ وہ شاید نشے میں تھا۔

اس نے اچانک آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔" میں نے چیخ کر کہا اور اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔

وہ نشے میں بری طرح ڈگمگایا اور پیچھے کی طرف گر گیا۔

اچانک اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ پڑا۔ شعیب آئس کریم لے کر واپس آ گئے تھے۔ وہ تھپڑ شعیب نے اسے مارا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔

شعیب نے آئس کریم کے کپ ایک طرف پھینکے اور اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ "تیری ہمت کیسے ہوئی اس کا ہاتھ پکڑنے کی؟" شعیب نے اس کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا۔

وہ اٹھ کر پیچھے گرا تو میں نے آگے بڑھ کر شعیب کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ "چھوڑیں، وہ نشے میں ہے اسے اچھا خاصا سبق مل چکا ہے۔"

"مجھے چھوڑ دو مریم۔" شعیب نے بپھر کر کہا۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی تمہیں ہاتھ لگائے اور میں اسے چھوڑ دوں؟"

"بھیا پلیز۔" ثمینہ نے کہا۔ "اب غصہ تھوک دیں۔ وہ نشے میں ہے اگر مر گیا تو فضول میں آپ کے سر اس کے قتل کا الزام آ جائے گا۔"

ہم نے بہت مشکل سے شعیب کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

سارے راستے شعیب کا موڈ خراب رہا۔

ہم گھر پہنچے تو میں نے شعیب سے کہا۔ "اب اپنا موڈ درست کریں ورنہ امی سمجھیں گی کہ آپ ہماری وجہ سے غصے میں ہیں۔"

شعیب زبردستی مسکرا کے بولا۔ "میں اس وقت اندر آ کر کیا کروں گا بس اب تم جاؤ۔"

"ارے امی ابھی تک میرے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ آپ اندر تو آ ئیں۔"

شعیب اور ثمینہ امی سے مل کر چلے گئے۔ میں اپنے

کمرے میں آ گئی۔
امی بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئیں اور بولیں۔ ’’مریم بیٹا کیسی رہی پارٹی؟‘‘
’’ٹھیک رہی۔‘‘ میں نے کہا۔
’’تمہارے ابو آ چکے ہیں اور وہ کئی بار تمہیں پوچھ چکے ہیں۔ وہ تو تمہیں ٹیلی فون کرنا چاہ رہے تھے لیکن میرے پاس تو زرین کا نمبر ہی نہیں تھا۔‘‘
’’ابو ابھی تک مجھے بچی سمجھتے ہیں، اب میں بڑی ہو گئی ہوں امی۔ اب وہ میری اتنی فکر کرنا چھوڑ دیں۔‘‘
’’سونے سے پہلے اپنے ابو سے ضرور مل لینا۔‘‘ امی نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔
میں نے سینڈل اتارے تو چونک اٹھی۔ میرے پیروں میں ریت تھی۔ میں نے ایک کاغذ لے کر اس پر اپنے جوتے اچھی طرح جھاڑے پھر میں نے تولیہ لے کر کارپٹ کی بھی صفائی کی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ پھر سونے سے پہلے ابو سے ملنا تو لازمی تھا۔ میں ان سے مل کر اور انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔
ہماری زندگی کا پھر وہی معمول شروع ہو گیا۔ میں اور شعیب رات رات بھر ٹیلی فون پر بات کرتے اور میں صبح کالج میں اونگھتی رہتی۔
اس دن ہم لوگ ڈنر کر رہے تھے کہ ابو نے اچانک پوچھا۔ ’’مریم بیٹا! ٹیلی فون ٹھیک کام کر رہا ہے؟‘‘
’’ٹیلی فون!‘‘ میں بوکھلا گئی۔ میں سمجھی کہ شاید ابو کو میری اور شعیب کی بات چیت کا علم ہو گیا ہے۔
’’جی ابو!‘‘ میں نے کہا۔ ’’ابھی کچھ دیر پہلے میری دوست روبی کی کال آئی تھی لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟‘‘
’’کئی دوستوں نے شکایت کی ہے کہ رات کو ہمارا فون مصروف رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی ٹیلی فون آپریٹر گڑبڑ کر رہا ہے یہ لوگ ہمارے نمبر سے دوسروں کو کالز کراتے ہیں۔ کال بھی مقامی نہیں بلکہ انٹرنیشنل۔‘‘
’’کیا کہہ رہے ہیں آپ؟‘‘ امی نے کہا۔
’’بھئی سیدھی سی بات ہے کوئی بددیانت آپریٹر ہماری ٹیلی فون لائن استعمال کر رہا ہے۔ بہت سے لوگ لاہور، راولپنڈی وغیرہ کالز کرتے ہیں، بہت سے لوگ بیرون ملک بھی کالز کرتے ہیں۔ یہ بددیانت آپریٹر اس کے لیے ہماری لائن استعمال کرتے ہیں۔ وہ کال کرنے والوں سے بھی خوب پیسے بٹورتے ہیں لیکن اس کا بل ہمیں ادا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ رات رات بھر لائن انگیج ہونے کا کیا سوال؟‘‘
’’ٹیلی فون تو اکثر دن میں بھی ڈیڈ ہو جاتا ہے۔‘‘ امی نے کہا۔
’’میں بہرحال اس کی شکایت کروں گا۔‘‘ ابو نے کہا۔
میں نظریں جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔ ٹیلی فون تو میری وجہ سے انگیج ہوتا تھا۔ مجھے یہ پہلے بھی سوچنا چاہیے تھا کہ اس دوران میں ابو کی کوئی ضروری کال بھی آ سکتی ہے، کوئی ایمرجنسی بھی ہو سکتی ہے۔
اس رات میں نے تمام صورتِ حال شعیب کو بتائی اور اس سے کہا۔ ’’اب میں زیادہ دیر تک بات نہیں کر سکوں گی۔‘‘
’’لیکن مریم...... پھر......‘‘ وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔
’’پھر کیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’کوئی دوسرا راستہ ہے آپ کی نظر میں؟‘‘
’’ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ہفتے میں دو تین دن بات کر لیں اور......‘‘
’’نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ ابو ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے شکایت کریں گے پھر بات بڑھ جائے گی۔‘‘
’’کچھ بھی نہیں ہو گا مریم۔‘‘ شعیب نے کہا۔ ’’تم فضول میں خوف زدہ ہو۔ ایسی نہ جانے کتنی شکایتیں وہاں پڑی ہوئی ہیں اور......‘‘
’’یہ آپ کی بھول ہے؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’گزشتہ دنوں ابو کے ایک دوست کے ٹیلی فون کا بل بہت زیادہ آیا تھا۔ انہوں نے ڈپارٹمنٹ کے ایکسین اور دوسرے اعلیٰ افسران سے بات کی تو ان کا ٹیلی فون آبزرویشن پر لگا لیا گیا اور ایک ہی مہینے میں چور پکڑے گئے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہمارا ٹیلی فون بھی آبزرویشن پر لگے اور......‘‘
’’اچھا، ابھی تو موڈ خراب مت کرو، بعد میں اس مسئلے پر بھی غور کریں گے۔‘‘
’’لیکن اس وقت میں زیادہ بات نہیں کر سکتی ہوں خدا حافظ۔‘‘
’’بات تو سنو مریم۔‘‘ شعیب نے کہا۔ ’’میں کل دن میں کسی بھی وقت کال کروں گا۔‘‘

"ہاں، جیسے ہم پہلے بات کیا کرتے تھے۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

شعیب تو اس مسئلے کو سیریس نہیں لے رہا تھا لیکن مجھے تو اندازہ تھا کہ ابو کے کتنے تعلقات ہیں۔

پھر کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ شعیب کی کال آئی نہ ثمینہ کی۔

میں نے شعیب سے زیادہ دیر بات نہ کرنے کا عہد تو کرلیا تھا لیکن اس کی طرف سے تو مکمل خاموشی تھی۔ کئی دفعہ میرے دل میں آئی کہ میں خود کال کروں لیکن ہر مرتبہ میری انا آڑے آگئی۔ مجھے غصہ تو اس بات پر تھا کہ شعیب تو رہا ایک طرف ثمینہ بھی کال نہیں کررہی تھی۔

میں نے سب کچھ بھول کر پڑھائی میں مصروف ہونے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ جب بھی کتاب کھولتی شعیب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ وہ شاید میرے صبر کو آزما رہا تھا۔

ایک دن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ہماری ملازمہ نفیسہ نے ریسیور اٹھایا اور بولی۔ "ہیلو...... کس سے بات کریں گی؟...... آپ کون ہیں بی بی؟...... ثمینہ بی بی السلام علیکم۔"

نفیسہ نے میری طرف دیکھا پھر امی سے بولی۔ "بیگم صاحبہ! ثمینہ بی بی کا ٹیلی فون ہے۔" اس نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر نزدیک رکھ دیا۔

مجھے اچانک شدید غصہ آگیا۔ ثمینہ نے ہفتوں بعد کال بھی کی تو امی سے بات کرنے کے لیے۔ میں غصے میں وہاں سے تلملا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد امی میرے کمرے میں آئیں اور بولیں۔ "مریم! میں بھائی جان کے گھر جارہی ہوں...... تم......"

"ماموں جان کے گھر اس وقت......!" میں نے کہا۔ "رات کے دس بج رہے ہیں امی۔"

"میرا جانا ضروری ہے بیٹا، بھائی جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"کیا ہوا ماموں جان کو؟" میں بھی گھبرا گئی۔

"یہ تو وہاں جاکر معلوم ہوگا۔ ثمینہ نے ابھی بس اتنا بتایا ہے کہ ان کی طبیعت سیریس ہے۔"

"امی، میں بھی چلوں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں بیٹا ابھی تمہارے ابو......"

امی کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس وقت گاڑی کے مخصوص ہارن کے ساتھ ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔

"تمہارے ابو آگئے۔" امی نے کہا۔ "یہ بھی اچھا ہوا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

میں بھی امی کے پیچھے پیچھے لاؤنج میں پہنچی۔ ابو لاؤنج میں داخل ہورہے تھے۔ میں نے ابو کو سلام کیا تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح مجھے دعائیں دیں اور میری پیشانی چومی، پھر اپنا کوٹ اتار کر امی کو دیتے ہوئے کہا۔ "آج تو بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔"

"آپ فریش ہوجائیں میں کھانا لگواتی ہوں۔" امی نے کہا۔

"کھانا تو میں نے کھالیا ہے۔" ابو نے کہا۔ "ایک پارٹی کے ساتھ ڈنر تھا۔ تم ذرا اچھی سی چائے پلوادو۔"

"جی!" امی نے مختصر جواب دیا اور جانے کے لیے مڑیں تو ابو نے پوچھا۔ "سعدیہ! کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگ رہی ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ابھی ثمینہ نے ٹیلی فون کیا تھا۔" امی نے کہا۔ "بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

ابو بوکھلا کر کھڑے ہوگئے۔ "ارے انہیں کیا ہوا؟" پھر وہ امی سے بولے۔ "چائے چھوڑو پہلے بھائی جان کی طرف چلتے ہیں۔"

"ابو! میں بھی چلوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا تم بھی چلو۔" ابو نے کہا اور امی کے ہاتھ سے کوٹ لے کر دوبارہ پہن لیا۔

"ہم ماموں جان کے گھر پہنچے تو ان کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی۔ ان کے سر میں شدید درد تھا اور جسم میں بھی درد تھا۔

ممانی جان نے بتایا کہ ان کی طبیعت تو گزشتہ ایک ہفتے سے خراب ہے لیکن آج تو کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی۔ کئی دن سے بخار تھا۔ یہ اسی حالت میں آفس جاتے رہے حالانکہ میں نے انہیں بہت روکا لیکن نہیں مانے، شعیب ہی انہیں آفس لے کر جاتا تھا وہ دن میں بھی کئی مرتبہ ٹیلی فون کر کے ان کی خیریت معلوم کرتا تھا۔ آج یہ آفس سے آئے تو اچانک چکر کھا کر گر گئے۔ ڈاکٹر کا علاج مستقل چل رہا ہے لیکن اس کی سمجھ میں بیماری نہیں آئی۔ کئی میڈیکل ٹیسٹ بھی ہوچکے ہیں۔"

"شعیب!" ابو نے کہا۔ "انہیں ڈاکٹر ابرار کے پاس

لے چلو۔ وہ بہت قابل اور سینئر ڈاکٹر ہیں۔"
"جی پھوپا جان۔" شعیب نے کہا۔ "میں گاڑی نکالتا ہوں۔"
"بھئی گاڑی کو چھوڑو میری گاڑی موجود ہے۔ میں بھی چل رہا ہوں۔"
"اب میں اتنا بھی بیمار نہیں ہوں۔" ماموں جان نے کہا۔ "بس ذرا کمزوری کی وجہ سے چکر آ گیا تھا۔ شعیب ڈاکٹر سے دوا تو لے آیا ہے۔"
"تم تو خاموش ہی رہو۔" ابو نے کہا۔
پھر وہ لوگ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔
ان کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ ڈاکٹر ابرار نے انھیں کئی لیبارٹری ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے اور یہ بتایا کہ ان کا یرقان بگڑ چکا ہے۔ انھیں مکمل بیڈ ریسٹ کرنا پڑے گا۔ انہوں نے کچھ دوائیں بھی دی ہیں۔
مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ میں شعیب کی طرف سے خواہ مخواہ بدگمان ہو رہی تھی۔ وہ بے چارہ تو ماموں جان کی طبیعت کی وجہ سے پریشان تھا۔
جب تک ماموں جان واپس نہیں آ گئے ثمینہ مجھے یہ ہی بتا رہی تھی کہ شعیب بھائی، ابو کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔
وہاں مجھے شعیب سے چند باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ اس نے کہا کہ ابو کی طبیعت ٹھیک ہو جائے پھر میں تم سے تفصیلی بات کروں گا۔
ماموں جان کی طبیعت ٹھیک ہونے میں ایک مہینا لگ گیا۔ امی اور ابو روز وہاں جاتے تھے۔
ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو ایک رات شعیب کا ٹیلی فون آیا۔ وہ بولا۔ "مریم! اب یہ جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں ابو سے بات کرتا ہوں کہ وہ شادی......"
"آپ پہلے اپنی تعلیم تو مکمل کر لیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لوگ بھی کہیں گے کہ ایسی کیا ایمرجنسی تھی کہ شعیب نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر شادی رچالی۔ پھر اس پر ابو راضی ہوں گے نہ ماموں جان۔"
"پھر میں کیا کروں مریم؟" شعیب جذباتی ہو کر بولا۔
"انتظار اور صبر۔" میں نے کہا۔ "آپ نے سنا نہیں ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"
"پتا نہیں اور کتنی مٹھاس چاہتی ہو تم؟" وہ جھنجلا کر بولا۔
"او ہو، ایک ہی سال کی تو بات ہے۔" میں نے کہا اس وقت تک میں بھی انٹر کرلوں گی۔" پھر میں نے اسے چھیڑنے کو کہا۔ "بس یہ دعا کریں کہ ابو کہیں میری گریجویشن کی شرط نہ لگا دیں۔"
"میں تمہیں لے کر بھاگ جاؤں گا۔" شعیب ہنستا کر بولا۔
"ابو گریجویشن کی شرط تو ضرور لگائیں گے۔" اچانک میرا چھوٹا بھائی انور بولا۔
میں بری طرح چونک اٹھی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔
"آپی! مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے آپ کے کمرے سے باتوں کی آواز سنی تو سمجھا کہ آپ امی سے بات کر رہی ہیں۔ میں اندر آیا تو آپ ٹیلی فون پر باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ شعیب بھائی سے بات کر رہی ہیں نا؟"
"میں کسی سے بھی بات کروں۔" میں جھلا کر بولی۔ "تم جاؤ یہاں سے۔"
"کون ہے مریم؟" دوسری طرف سے شعیب کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔
"انور ہے۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں اب تک کیوں جاگ رہا ہے۔" پھر میں انور سے بولی۔ "میں نے کہا نا یہاں سے جاؤ۔"
"ٹھیک ہے۔ صبح میں امی کو بتاؤں گا کہ آپ رات کے بارہ بجے شعیب بھائی سے بات کر رہی تھیں۔"
"مریم، اس سے میری بات کراؤ۔" شعیب نے کہا۔
"ادھر آؤ۔" میں نے انور سے کہا۔ "شعیب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"
انور نے ریسیور لے لیا اور بولا۔ "جی بھائی جان...... اچھا پکا...... پکا وعدہ...... او کے انجوائے یور سیلف۔" اس نے مسکرا کر کہا اور ریسیور مجھے دے دیا۔
شعیب نے مجھے بتایا کہ میں نے انور سے کرکٹ میچ کے پاس لانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ کرکٹ کا دیوانہ ہے اس لیے وہ اپنا منہ بند رکھے گا۔ ان دنوں انگلینڈ کی ٹیم پاکستان آنے والی تھی۔
پھر کئی ہفتے گزر گئے۔ شعیب سے بس دس بیس منٹ کی بات ہی ہوتی رہی۔

شعیب کا عشق اب جنون کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میرا حال بھی ایسا ہی تھا لیکن میں شعیب کی طرح بے صبری نہیں تھی یا پھر اللہ نے عورت کو صبر کا مادہ کچھ زیادہ ہی عطا کیا ہے۔

ایک رات شعیب کا ٹیلی فون آیا تو وہ بہت پریشان تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا کہنے لگا۔ ''مریم! بس ایک دفعہ مجھ سے مل لو پلیز...... صرف ایک دفعہ ورنہ مجھ سے امتحان کی تیاری نہیں ہو پائے گی اور ہماری منزل مزید دور ہو جائے گی۔''

''لیکن شعیب ایک دفعہ ملنے سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''میرے دل کو سکون ملے گا، مجھے قرار آ جائے گا اور میں اپنی پڑھائی پر توجہ دے سکوں گا...... ورنہ...... فیل ہو جاؤں گا مریم۔''

''لیکن شعیب یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے کیسے مل سکتی ہوں؟ مجھے ڈرائیور کالج چھوڑنے جاتا ہے اور وہی واپس بھی لاتا ہے۔ وہ اتنا اصول پسند ہے کہ اگر میں واپسی پر کچھ شاپنگ بھی کرنا چاہوں تو صاف انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے صاحب کا آرڈر نہیں ہے۔ آپ پہلے گھر چلو پھر بیگم صاحب بولے گی تو ہم تم کو لے جائے گا۔''

''کچھ کرو مریم پلیز کچھ کرو۔ میں تمہیں دیکھنے کو ترس رہا ہوں۔''

''اچھا میں کچھ سوچتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل آپ کو بتاؤں گی۔''

''کل کیوں...... آج کیوں نہیں؟'' شعیب جھنجلایا۔

''مجھے کوئی بہانہ سوچنے کا موقع تو دیں۔'' میں نے کہا۔

پھر مجھے موقع مل ہی گیا۔ ہمارے کالج میں سالانہ فیسٹیول شروع ہونے والا تھا۔ میں اس بہانے دیر تک گھر سے باہر رہ سکتی تھی۔ میں نے شعیب کو بتا دیا کہ آپ صرف دو دن صبر کر لیں۔ کالج میں فیسٹیول شروع ہونے والا ہے میں اس دوران میں آپ سے مل لوں گی۔

جس دن میں نے شعیب سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اس دن میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں اپنے والدین کے اعتماد کا خون کر رہی ہوں لیکن میں نے یہ سوچ کر خود کو بہلا لیا کہ شعیب کوئی غیر تو نہیں، میرا منگیتر ہے۔ اس سے ملنے میں کوئی برائی بھی نہیں ہے، بس مجھے تھوڑا سا جھوٹ ہی تو بولنا تھا۔

میں تیار ہو کر گھر سے نکلنے لگی تو امی سے بولی۔ ''امی! آج مجھے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ کالج میں اینول فیسٹیول ہو رہا ہے۔ میں نے بھی تقریری مقابلے میں حصہ لیا ہے۔''

''کب تک واپسی ہوگی تمہاری؟'' امی نے پوچھا۔

''امی شاید پانچ بج جائیں۔ میں کالج سے آپ کو ٹیلی فون کر دوں گی آپ ڈرائیور کو بھیج دیجیے گا۔''

امی مطمئن ہو گئیں۔ وہ کالج کے سالانہ فیسٹیول کا پمفلٹ دیکھ چکی تھیں۔ انہوں نے ڈرائیور سے بھی یہی کہا کہ مریم کو واپس لانے کے لیے مجھ سے پوچھ لینا۔ آج اسے کچھ دیر ہو جائے گی۔

''ٹھیک ہے بیگم صاب۔'' ڈرائیور نے مؤدب انداز میں کہا۔

وہ مجھے کالج کے گیٹ پر اتارنے کے بعد اس وقت تک واپس نہیں جاتا تھا جب تک میں کالج میں داخل نہ ہو جاتی۔

اسے دکھانے کے لیے میں گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ کالج کے بڑے سے لان میں پنڈال لگا ہوا تھا اور لڑکیاں وہاں مختلف پروگرامز کی تیاری میں مصروف تھیں۔

میں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ ڈرائیور چلا گیا ہوگا کہ میں واپسی کے لیے مڑی۔ اس وقت پیچھے سے مجھے کسی نے آواز دی۔ ''مریم!'' میں چونک کر مڑی۔ وہ روبی تھی۔

وہ تیزی سے میرے نزدیک پہنچی اور بولی۔ ''کہاں جا رہی ہو؟''

''مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

ویسے تو موقع ملتا نہیں ہے۔ آج تو کالج میں پڑھائی بھی نہیں ہوگی۔ میں بس ابھی آئی چٹکی بجا کر کہا۔

''تم جاؤ گی کیسے؟'' روبی نے پوچھا۔

''تم میں بھی اپنے ڈیڈی کی عادتیں آ گئی ہیں۔'' اس کے ڈیڈی پولیس میں ڈی آئی جی تھے۔

''ہاں تو کیا تمہاری عادتیں آئیں گی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''جاؤ مگر جلدی آنا میں اکیلی بور ہو رہی ہوں۔''

میں اس سے جان چھڑا کر باہر نکلی۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ شاپنگ کرنے چل دیتی۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ میں کئی دفعہ اس کے بھی گھر

جا چکی تھی۔ اس کے ڈیڈی ڈی آئی جی اسد کریم بہت رعب دار انسان تھے لیکن میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔

میں کالج کے گیٹ سے باہر نکلی تو مجھے شعیب نظر آیا۔ وہ مجھ سے بولا۔ ''جلدی یہاں سے نکلو۔''

''گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گاڑی تو ابو لے گئے ہیں میں اپنے دوست کی بائیک لایا ہوں۔''

کچھ ہی فاصلے پر ایک ہیوی بائیک کھڑی تھی۔ مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔ شعیب کی بائیک دیکھ کر میں خوش ہوگئی۔

اس نے بائیک اسٹارٹ کی تو میں اچھل کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

میں تو بائیک پر بیٹھ کر اتنی مگن تھی کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شعیب کہاں جا رہا ہے۔

چونکی تو اس وقت جب وہ شیر شاہ سے آگے نکل گیا۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''یار شہر میں تو کہیں سکون سے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہی سائٹ پر چلتے ہیں۔ وہاں رش بھی کم ہوتا ہے۔ آج تو چھٹی کا دن بھی نہیں ہے اس لیے وہاں آنے والے برائے نام ہوں گے۔''

اس زمانے میں صرف گاڑیوں والے ہی ہاکس بے یا سینڈز پٹ وغیرہ جا سکتے تھے اس لیے لوگ عموماً چھٹی والے دن کوئی بڑی بس یا وین کر کے جایا کرتے تھے۔

شعیب وہاں سے سیدھا ہاکس بے پہنچا۔

میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ امی ابو کے بغیر گھر سے اتنی دور آئی تھی۔

شعیب نے ایک ریتیلے راستے پر چل کر بائیک روکی۔ اور بولا۔ ''آؤ۔''

وہ کوئی ہٹ تھا۔ خاصا خوب صورت اور آراستہ تھا۔

''میرے ایک دوست کا ہٹ ہے۔'' شعیب نے بتایا۔ ''ہم یہاں سکون سے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کر سکیں گے۔''

ہوا کے تھپیڑے اور سمندر کا شور۔ مجھے نہ جانے کیوں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے شعیب سے کہا۔ ''اندر جا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے باہر بھی زیادہ لوگ نہیں ہیں ہم بھی کسی گوشے میں بیٹھ جائیں گے۔''

''ہٹ میں بیٹھ کر سمندر کی لہروں کو دیکھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' شعیب نے کہا۔

''میں بھی اکثر ہاکس بے آتی رہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں ابو کا بھی ایک ہٹ ہے۔''

''وہ تو یہاں سے کافی دور ہے۔ اب دیر مت کرو۔'' وہ ہٹ کی طرف بڑھا تو ایک طرف سے ہٹ کا چوکیدار نکل کر سامنے آ گیا۔ شعیب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

چوکیدار نے ہٹ کا دروازہ کھول دیا اور بولا۔ ''صاب زیادہ دیر مت کرنا بس ایک گھنٹا۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔'' شعیب نے کہا۔ ''تم جاؤ اور سنو یہاں پینے کا پانی تو ہے ناں؟''

''ہاں صاب! پانی ہے اور آپ بولے گا تو کچھ کھانے کو بھی لے آئے گا۔''

''ٹھیک ہے ضرورت ہو گی تو منگوا لیں گے۔'' شعیب نے کہا۔

''اتنا شاندار ہٹ آپ کے کس دوست کا ہے شعیب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میرے کسی دوست کا ہٹ نہیں ہے۔'' شعیب نے کہا۔ ''یہاں کے چوکیدار پیسے لے کر لوگوں کو دو چار گھنٹے کے لیے یہ ہٹ دے دیتے ہیں۔ اس سے ان کی اضافی آمدنی ہو جاتی ہے۔''

مجھے شعیب کی بات سن کر عجیب سا لگا۔ میں اتنی بچی بھی نہیں تھی کہ اس کی بات سمجھ نہ پاتی۔ یہاں وہی لوگ آتے ہوں گے جنہیں تنہائی کی ضرورت ہوتی ہو گی۔ چوکیدار ہمیں بھی ویسا ہی سمجھ رہا ہوگا کہ ہم بھی اس مقصد کے لیے ہٹ میں آئے ہیں۔ مجھے شعیب پر شدید غصہ آیا لیکن اب تو آ ہی گئی تھی۔

ہٹ میں ایک بہت شاندار بیڈ روم بھی تھا۔ کسی شوقین مزاج کا ہٹ ہوگا۔ میں نے سوچا۔

شعیب مجھے بیڈ روم میں لے گیا اور بولا۔ ''آرام سے بیٹھو مریم! اب ہمیں یہاں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ اتنے مہینوں کی باتیں ادھار ہیں تم پر۔''

اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ کر اسے چوم لیا۔ میرے

جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن اس نے کہا۔ "اب تو یہ ہاتھ میں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم مجھ سے اتنی دور کیوں بیٹھی ہو مریم؟" شعیب نے کہا اور اٹھ کر میرے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گیا۔

میں اس سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی میں بری طرح اچھل پڑی۔ شعیب بھی کچھ خوف زدہ نظر آرہا تھا پھر بولا۔ "یہ چوکیدار بھی بالکل جاہل ہے اسے دستک دینے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔"

دستک دوبارہ زیادہ زور سے دی گئی۔

شعیب نے دروازہ کھولا تو پولیس کے سپاہیوں کو دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"بھئی بھی شیکے!" ایک سپاہی بولا۔ "اوئے ادھر تو موجاں ہو رہی ہیں۔"

"کک..... کیا مطلب؟" شعیب ہکلایا۔

"اوئے عشق تو کر رہا ہے اور مطلب ہم سے پوچھتا ہے۔" سپاہی نے اکڑ پن سے کہا۔ "کہاں سے لایا ہے لڑکی کو؟"

"تمیز سے بات کرو۔" شعیب نے کہا لیکن اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"تمیز تو تجھے انسپکٹر صاحب سکھائیں گے۔" سپاہی بھونڈی انداز میں ہنسا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ویسے لڑکی ہے بہت خوب صورت۔"

"تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"آرام سے بی بی آرام سے۔" سپاہی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تجھے اتنا ہی خیال تھا... تو یہاں رنگ رلیاں منانے کیوں آئی تھی؟"

"سنو!" شعیب نے آہستہ سے کہا۔ "یہ لڑکی بہت بڑے خاندان کی ہے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور سپاہی کی طرف بڑھائے۔ "یہ رکھ لو۔"

"اوئے رشوت دیتا ہے؟" سپاہی ترش لہجے میں بولا۔ "پولیس کو رشوت دیتا ہے؟"

"اگر کم ہیں تو...... یہ بھی رکھ لو۔" شعیب نے سو سو کے کئی نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ اس دور میں سو روپے کی بہت اہمیت ہوتی تھی۔

سپاہی نے وہ نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے لیکن اسی وقت خرانٹ شکل کا ایک انسپکٹر ہٹ میں داخل ہوا اور بولا۔

"اوئے یہاں تو فلمی سین چل رہا تھا۔"

"سر جی! شریف لوگ ہیں۔" سپاہی نے کہا۔ "انہیں جانے دیں۔"

"اوئے شریف ہیں تو یہاں کیا عبادت کرنے آئے تھے؟" پھر وہ ناگواری سے بولا۔ "اور تو کیا ان کا ماما لگتا ہے تو ان کی سفارش کر رہا ہے؟"

"چلو میرے ساتھ۔" انسپکٹر نے کہا اور شعیب کا کالر پیچھے سے پکڑ لیا۔ "چل باہر نکل۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "تو بھی آجا بی بی۔ تجھے اتنا ہی شوق ہے تو تیرا شوق میں بھی پورا کر دوں گا۔"

وہ ہم دونوں کو باہر لایا اور بولا۔ "ہماری موبائل یہاں سے دور ہے۔ تم لوگوں کو کچھ دور پیدل چلنا پڑے گا۔"

"ایسا کریں آپ میری موٹر سائیکل پر چلیں۔" شعیب نے کہا۔ "تین آدمی بھی بیٹھ سکتے ہیں۔"

پولیس انسپکٹر شاید اس خیال سے راضی ہو گیا کہ اسے میرے ساتھ چپک کر بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شعیب کرنا کیا چاہ رہا ہے؟"

اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور اسے گیئر میں ڈال کر وہاں سے ہوا ہو گیا۔

"اوئے پکڑو اسے۔" انسپکٹر چیخا۔

شعیب اتنی دیر میں سڑک تک پہنچ چکا تھا۔ سپاہی اس کے پیچھے دوڑے لیکن وہ تو بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے شعیب سے یہ امید تو ہرگز نہیں تھی کہ وہ مجھے ان اوباش لوگوں کے حوالے کر کے بھاگ جائے گا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ ممکن ہے شعیب کسی کو ٹیلی فون کرے۔

"چل او ہیروئن۔" انسپکٹر ہنستا کر بولا۔

"اندر چل تیرا یار تو تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔" اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے ہٹ کی طرف کھینچا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" میں نے بپھر کر کہا۔

"اندر چل۔" اس نے پھر مجھے کھینچا اور ہٹ کے اندر لے آیا۔

"سنو۔" میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ "تم جتنے پیسے مانگو گے میں دوں گی۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہاں سے جانے دو۔"

"اچھا۔" اس نے اچھا کھینچ کر کہا۔ "بہت پیسا ہے تیرے پاس؟"

"ہاں، میرے پاس بہت پیسا ہے تم جتنا کہو گے میں دوں گی۔ دس ہزار بیس ہزار تیس ہزار۔"

انسپکٹر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "سن لڑکی۔" وہ بولا۔ "تیرے پاس اتنا پیسا ہے تو یہاں کیا کرنے آئی تھی؟"

"وہ میرا منگیتر تھا۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"اوئے منگیتر تھا تو شادی تک صبر نہیں کر سکتے تھے تم لوگ باہر تمہیں اور کوئی جگہ بھی نہیں ملی اور وہ کیسا منگیتر تھا جو تجھے یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا؟"

"وہ کسی کو بلانے گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"وہ اب ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "ہم بندہ پہچانتے ہیں۔"

"تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے دونوں سپاہیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اوئے تم لوگ باہر جاؤ۔" وہ دونوں باہر چلے گئے۔ "مجھے پچاس ہزار چاہئیں۔" انسپکٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے پیتے ہوئے کہا۔

"میں دوں گی۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہاں سے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں سے میں پچاس ہزار منگوا کر تمہیں دوں گی۔"

"وہ تو دے گی ہی۔" انسپکٹر مکاری سے مسکرایا۔ "لیکن تجھے ایسے کیسے جانے دوں۔ میں بھی آخر انسان ہوں، جذبات رکھتا ہوں اور......" وہ خاموش ہو کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

پھر اچانک اس نے میرا دوپٹا کھینچ کر اتار دیا اور بولا۔ "کپڑے خوب صورت لڑکیوں کے جسم پر اچھے نہیں لگتے۔"

"تم کیسے انسان ہو؟" میں پھر کر بولی۔ "میں تمہاری بیٹی کی عمر کی ہوں، کیا تم......"

"بیٹی کا نام مت لے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بیڈ کی طرف گھسیٹا۔ "وہ تیری طرح جذبات سے بے قابو ہو کر پبلک مقامات پر رنگ رلیاں نہیں مناتی۔" اس نے میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ "پھر تجھ جیسی حسین لڑکی کو تو کوئی پاگل ہی ایسے جانے دے گا۔"

"دیکھو مجھے جانے دو تم نے پچاس ہزار مانگے ہیں، میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ مجھے جانے دو ورنہ میں شور مچاؤں گی۔"

"شور مچائے گی؟" انسپکٹر مکروہ انداز میں مسکرایا۔ "مچا شور...... یہاں کوئی تجھے بچانے نہیں آئے گا۔" اس نے مجھے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔

میں پوری قوت سے چیخی۔ "بچاؤ...... بچاؤ...... ہیلپ...... ہیلپ......"

"اور زور سے چیخ۔" انسپکٹر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

میں پھر چیخی۔ "بچاؤ...... بچاؤ...... کوئی ہے یہاں؟"

انسپکٹر زور زور سے ہنسنے لگا اور میرا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔

اچانک ہٹ کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور پولیس کا ایک نوجوان افسر اندر داخل ہوا۔ وہ شاید سب انسپکٹر تھا یا پھر اسسٹنٹ سب انسپکٹر۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ چیخ کر بولا۔ اس کی آواز بہت رعب دار تھی۔ وہ خود بھی بہت شاندار اور نوجوان تھا۔ دراز قد، کسرتی جسم، سرخ سفید رنگ اور چہرے پر گھنی مونچھیں۔

"اوئے تو ہے کون، باہر جا اس وقت میں مصروف ہوں۔"

"سر اس لڑکی کو چھوڑ دیں۔" مرزا نے کہا۔

"چھوڑ دوں؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چھوڑ دوں، کیوں؟ میں نے اسے ایک نوجوان کے ساتھ غلط حرکتیں کرتے ہوئے پکڑا ہے۔"

"وہ نوجوان کہاں ہے؟" مرزا نے پوچھا۔

"اوئے تو زیادہ بکواس نہ کر، باہر جا۔ بھاگ گیا وہ حرام زادہ۔"

"تو پھر اس لڑکی کو تھانے لے چلیں سر، اسے یہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں، تو باہر جا۔ اپنی وردی کے پھول دیکھ میں بڑا افسر ہوں یا تو بڑا افسر ہے۔ تجھے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور چلا ہے مجھے قانون سکھانے۔"

"میں قانون نہیں سکھا رہا بلکہ آپ کو یاد دلا رہا ہوں۔" مرزا نے کہا۔ "اگر اس لڑکی کا کوئی جرم ہے تو اسے

تھانے لے چلیں۔ آپ تو خود ہی جرم کرنے جارہے ہیں۔"
"اپنی بکواس بند کر اور باہر جا تیری......" اس نے مراد کو انتہائی غلیظ گالی دیتے ہوئے کہا۔
"لڑکی کو چھوڑ دے۔" مراد کا لہجہ بدل گیا۔
"تو ہوش میں تو ہے؟" انسپکٹر گرج کر بولا۔ "میں تجھے معطل کرادوں گا۔"
"تو مجھے کیا سسپنڈ کرائے گا.........." مراد نے کہا۔ "تو نے مجھے ماں کی گالی دی ہے۔ میں ابھی تیری ساری افسری نکالتا ہوں۔"
"باہر نکل تیری......" انسپکٹر نے پھر اسے گالی دی۔
وہ آگے بڑھا اور انسپکٹر کے چہرے پر اتنے زور سے گھونسا مارا کہ وہ چکرا کر بیڈ پر گر گیا۔ اس نے انسپکٹر کو بال پکڑ کر اٹھایا اور دوسرا گھونسا رسید کر دیا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ کئی دانت ٹوٹ گئے اور وہ بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔
"تو نے میری مری ہوئی ماں کو گالی دی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"
"اسے چھوڑ دیں انسپکٹر۔" میں نے کہا۔
دفعتاً مراد جیسے ہوش میں آگیا اور بولا۔ "آؤ بی بی تم میرے ساتھ چلو۔"
انسپکٹر نے کچھ بولنا چاہا مگر اس سے بولا نہ گیا۔ مراد نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا۔ میرا دوپٹا فرش سے اٹھا کر میرے سر پر ڈالا اور بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" وہ مجھے دروازے کی طرف لے چلا۔
وہاں سے کچھ فاصلے پر اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔
اس نے مجھے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور وہاں سے ہوا ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے بولا۔ "میں تمہیں کہاں چھوڑ دوں؟"
"مجھے میرے کالج کے پاس چھوڑ دیں۔"
"ویسے وہ انسپکٹر تو اب آپ کی جان کا دشمن ہو جائے گا۔"
پھر کچھ سوچ کر بولی۔
"تو ہو جائے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں نے پولیس کی ملازمت کو تو اس وقت لات مار دی تھی۔ اس کی اتنی ہمت کہ وہ میری ماں کو گالی دے۔"
"ویسے آپ کس تھانے میں ہیں؟"
"یہ تو میں نے اس..... کو بھی نہیں بتایا ساحل پر تو

اپنے ایک دوست کی تلاش میں آیا تھا کہ تمہاری چیخیں سن کر ادھر آگیا۔"
"آپ تو میرے لیے رحمت کے فرشتے بن کر آئے ہیں۔"
اس وقت تک ہم کالج پہنچ چکے تھے۔
اس وقت تین بجے تھے۔ ابھی بہت وقت تھا۔ میں کالج میں چلی گئی۔
روبی مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکی اور بولی۔ "تو گیا پوری مارکیٹ خرید رہی تھی کہ اتنی دیر لگا دی اور لائی کیا ہے؟"
"روبی میری بات سن۔" میں نے اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرلیا اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔
"او مائی گاڈ!" روبی حیرت سے بولی۔ "تو تو بال بال بچی ہے مریم! وہ انسپکٹر تجھے چھوڑتا نہیں۔ پھر شاید اس کے ماتحت بھی اپنا حصہ مانگتے۔"
"بکواس مت کر۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "وہ بے چارہ اے ایس آئی تو میری وجہ سے مصیبت میں پڑ گیا۔"
"تو نے کیا نام بتایا تھا اس کا؟ ہاں مراد! میں پتا کرتی ہوں کہ کس تھانے میں ہے! تو فکر مت کر میں ڈیڈ سے بات کرتی ہوں۔ تو پہلے تو جا کر اپنا حلیہ درست کر! اپنے پیروں اور کپڑے وغیرہ سے ریت صاف کر۔ منہ دھو پھر گرما گرم چائے پئیں گے اور سموسے کھائیں گے تو شاید کوئی بہتر حل دماغ میں آجائے۔" وہ مجھے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔
میں منہ دھونے باتھ روم میں گئی تو اچانک مجھے شعیب کا رویہ یاد کر کے رونا آگیا۔ وہ بے غیرت مجھے ان لوگوں کے حوالے کر کے خود وہاں سے فرار ہو گیا۔ کیا وہ مراد کی طرح ہمت نہیں دکھا سکتا تھا؟ میں بری طرح رونے لگی۔
رو رو کر جب میرا دل کچھ ہلکا ہوا تو میں نے منہ دھویا، پرس سے کنگھا نکال کر بال ٹھیک کیے۔ اپنے کپڑوں اور پیروں سے ریت تو میں پہلے ہی جھاڑ چکی تھی۔
میں باہر نکلی تو روبی میری منتظر تھی۔ ہم کینٹین میں پہنچے تو میں نے وہاں سے ڈیڈی کو ٹیلی فون کیا کہ ڈرائیور کو بھیج دیں۔
مجھے اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ شعیب نے میرے ارمانوں کا خون کر دیا تھا۔

میں گھر پہنچی تو امی میرا چہرہ دیکھ کر چونک اٹھیں اور بولیں۔ ''مریم! کیا بات ہے تمہارا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟''
میں ان سے لپٹ کر اس بری طرح روئی کہ وہ بھی گھبرا گئیں اور بولیں۔ ''مریم! اللہ کے واسطے رونا بند کرو اور مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''
''امی..... امی اسکول میں میری ایک دوست تھی صفیہ۔'' میں نے کہا اور آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ ''آج اس کا انتقال ہوگیا۔'' یہ کہہ کر میں پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ میں امی کو کیسے بتاتی کہ انتقال تو میرا ہوا تھا۔ اس دن میں مری تھی۔
''صفیہ کے گھر جانا ہے بیٹا؟'' امی نے پوچھا۔
''نہیں امی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تو اسلام آباد میں تھی اس کے ڈیڈی کا ٹرانسفر ہوگیا تھا۔''
''صبر کرو بیٹا۔'' امی نے کہا۔
مجھے اب صبر ہی تو کرنا تھا۔
میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور وہاں جا کر ایک مرتبہ پھر بلک بلک کر رونے لگی۔
روتے روتے میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو مجھے اب لگا جیسے میرا عکس مجھ سے کہہ رہا ہو۔ ''اچھا ہوا مریم! تجھ پر شعیب کی حقیقت وقت سے پہلے ہی کھل گئی۔ کیا تو زندگی بھر ایسے بے غیرت مرد کے ساتھ گزارہ کرسکتی تھی؟''
''لیکن وہ تو کہتا تھا کہ وہ میرے بغیر مر جائے گا۔'' میں نے خود کلامی کی۔
''جھوٹ بولتا تھا وہ۔'' میرا عکس بولا۔
''جب اس دن ایک شرابی نے نشے میں میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا تو شعیب کتنا مشتعل ہوگیا تھا۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ کوئی مجھے ہاتھ بھی لگائے تو میں اس کا خون کردوں گا۔''
''بزدل آدمی وہ شرابی نشے میں چُور تھا شعیب جانتا تھا کہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی جگہ اگر کوئی سچ مچ کا مرد ہوتا، ہوش و حواس میں ہوتا تو شعیب اسے چھڑانے کی بھی ہمت نہ کرتا۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ وہ پولیس والوں سے بچ کر فرار ہوگیا؟''
''ہاں وہ بے غیرت ہے۔'' میں نے بے اختیار کہا۔
''تو پھر تو ماتم کیوں کررہی ہے۔ تجھے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے تجھے شعیب سے بچا لیا اور ان درندوں سے بھی۔''
''ہاں، مجھے افسوس نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا اور اپنے آنسو پونچھ لیے۔

میرا دل جیسے ایک دم ہلکا ہوگیا۔ میں دیر تک نیم گرم پانی سے نہاتی رہی۔ جب نہا کر باہر نکلی تو شدید بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے نسیمہ سے کھانا لگانے کو کہا اور پوچھا۔
''امی کہاں ہیں؟''
''وہ تو اپنے بھائی کے گھر گئی ہیں۔'' نسیمہ نے کہا۔
''امی ماموں جان کے گھر گئی ہیں؟ مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ شاید..... شعیب صاحب کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ انہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئی ہیں لیکن ایک ہاتھ میں فریکچر ہوگیا ہے۔''
وہ مر کیوں نہیں گیا، میں نے سوچا۔ میں نے اس مریم کو ختم کردیا تھا جو شعیب کو چاہتی تھی اس کی پوجا کرتی تھی۔
''امی دو گھنٹے بعد واپس آئیں تو بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شعیب کی بائیک کسی گاڑی سے ٹکرا گئی ہے۔ اس کا بازو فریکچر ہوگیا ہے۔ ویسے تو اسے اتنی شدید چوٹ نہیں لگی ہے۔ تم اسپتال چلی جانا تمہیں ثمینہ نے بلایا ہے۔ اس وقت وہی شعیب کے پاس ہے۔''
میں اسپتال پہنچی تو ثمینہ روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''شعیب کا کیا حال ہے؟''
''ان کے ہاتھ میں فریکچر ہوا ہے۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''اگر خدانخواستہ وہ گاڑی ان پر چڑھ جاتی تو.....''
''تو کیا ہوتا۔'' میں نے دل میں کہا۔ ''وہ مر جاتا۔''
''شعیب بھائی تمہیں بلا رہے تھے۔'' ثمینہ نے کہا۔
میں شعیب کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز تھا اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔
وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''سوری ڈارلنگ! میں اپنے ایک دوست کے پاس جارہا تھا کہ میرا ایکسی ڈنٹ ہوگیا۔''
''مجھے ان اوباش پولیس والوں کے چنگل میں چھوڑ کر؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم وہاں سے بھاگے کیوں؟''
''وہ ہمیں تھانے لے جاتے، پھر وہ پھوپا جان اور ابو کو بلاتے اور.....''
میں نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کردیا۔ ''بے غیرت، ذلیل، کمینے، بزدل آدمی تو مجھے وہاں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ تو خود کو مرد کہتا ہے ہیجڑے۔''
''تمہیں کیا ہوگیا ہے مریم؟'' شعیب نے کہا۔
''چونکہ تمہیں اپنی جان سے بڑھ کر.....''
میں نے اس کے چہرے پر دوسرا تھپڑ پہلے سے زیادہ

طاقت سے مارا اور بولی۔ ''بکواس بند کر بے غیرت۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور باہر نکل آئی۔ پھر میں ثمینہ سے بولی۔ ''ثمینہ! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے میں گھر جا رہی ہوں۔''

''ہاں تم گھر جا کر آرام کرو۔'' ثمینہ نے کہا۔ وہ بھی شاید شعیب کو زخمی دیکھ کر میری ایسی حالت ہوئی ہے۔

☆......☆

''تم کیا بکواس کر رہی ہو مریم؟'' امی نے کہا۔ میں اس وقت ان کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ''تم ہوش میں تو ہو؟''

''میں ہوش میں ہوں امی۔'' میں نے کہا۔ ''بس میں شعیب سے شادی نہیں کروں گی۔''

''تم جانتی ہو کہ تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے بھائی جان نے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ انہوں نے اپنا تن پیٹ کاٹ کر شعیب کو اچھے اسکولوں میں پڑھایا، اسے بہترین تعلیم دلائی تاکہ وہ ہمارے معیار پر پورا اتر سکے۔''

''لیکن ایسا نہیں ہوا امی۔ وہ تو انتہائی گھٹیا اور ذلیل آدمی نکلا۔''

''مریم......'' امی چیخ کر بولیں۔ ''شاید تو اس وقت پاگل ہو گئی ہے؟''

امی کی آواز سن کر ابو بھی وہاں آ گئے۔

''کیوں چیخ رہی ہو؟'' ابو نے پوچھا۔

''آپ کی لاڈلی فرما رہی ہیں کہ وہ شعیب سے شادی نہیں کریں گی۔''

''کیا؟'' ابو نے حیرت سے کہا۔ ''اب یہ ممکن نہیں ہے بیٹا۔'' ابو نے کہا۔ ''میں نے خاندان بھر کے لوگوں کے سامنے تیرے ماموں کو زبان دی ہے۔''

''لیکن ابو میں......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' پھر وہ امی سے بولے۔ ''مسعدیہ! تم اس سے پوچھو کہ اس کے دماغ میں یہ خناس کیوں سمایا ہے اس نے میرا غصہ کبھی دیکھا نہیں ہے لیکن تم نے تو دیکھا ہے، اس سے تم ہی پوچھو۔'' یہ کہہ کر ابو کمرے سے باہر نکل گئے۔

اچانک میں نے امی کو سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

میری بات سن کر امی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''شعیب تمہیں وہاں چھوڑ کر بھاگ گیا؟'' امی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں امی۔'' میں نے کہا۔ ''کاش وہ وہیں رہتا کاش ہم دونوں مر جاتے لیکن...... لیکن مجھے اتنی اذیت تو نہ ہوتی جتنی اس کے فرار سے ہوئی۔''

''ایسے بے غیرت آدمی کو میں اپنا داماد کیسے بنا سکتی ہوں؟'' امی نے کہا۔ ''چاہے وہ میرے سگے بھائی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، تم فکر مت کرو مریم! اب میں سب سے نمٹ لوں گی۔ وہ انسپکٹر بھی ابھی موجود ہو گا جس نے تم لوگوں کو پکڑا تھا اور وہ آفیسر بھی موجود ہے جس نے تمہیں اس انسپکٹر کے چنگل سے چھڑایا۔''

اسی وقت روبی آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے ڈیڈی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ انہوں نے اس انسپکٹر کو سسپنڈ کر دیا ہے اور اس اے ایس آئی کو ترقی دے کر سب انسپکٹر بنا دیا۔

''وہ ابھی تک اسی تھانے میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اب اس کا ٹرانسفر دوسرے تھانے میں ہو گیا ہے۔''

روبی کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

☆......☆

امی نے میرا کام آسان کر دیا۔ انہوں نے سب سے کہہ دیا کہ آج کے بعد میں شعیب کا نام بھی لینا پسند نہیں کروں گی۔'' میں نے اس رشتے کو ختم کر دیا۔ اس رشتے کے لیے بھائی جان نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ وہ کب چاہتے تھے کہ مریم ان کی بہو بنے لیکن ان بے چارے کو بھی کب علم تھا کہ شعیب، مریم کے قابل ہی تھا ہی نہیں۔''

شعیب ہمارے گھر آ کر رویا، گڑگڑایا لیکن امی کو رحم نہ آیا۔ ابو بھی گویا پتھر کا بت بن گئے تھے۔ میں نے تو اس سے ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ وہ روتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔''

☆......☆

اس واقعے کو لگ بھگ پینتیس برس گزر چکے ہیں۔ اب میں ایک جوان بیٹے اور دو جوان بیٹیوں کی ماں ہوں۔ میرے بیٹے نے اس سال سی ایس ایس کر کے پولیس ڈپارٹمنٹ میں جاب کر لی ہے۔ وہ اے ایس پی ہے۔ وہ انشاء اللہ بہت ترقی کرے گا۔ وہ ایک ذہین، محنتی، فرض شناس، بہادر اور غیرت مند ایس ایس پی کا بیٹا ہے۔ جی ہاں اس کا باپ مراد ہے، وہی مراد جو مجھے ان درندوں کے چنگل سے چھڑا کر لایا تھا۔

نیکی

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

یہ میری نیکیوں کا صلہ ہی تو ہے کہ میری بکھری ہوئی زندگی سنور گئی۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہ چاہا۔اسی لیے میری ڈوبی ہوئی کشتی دوبارہ ساحل سے آلگی ہے۔ میری روداد لوگوں کے لیے سبق ہے۔

شائستہ شاہد
(کراچی)

اُس روز اچانک ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میں لائبریری میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اچانک ہی گھڑی پر نظر گئی تو دیکھا چار بج رہے تھے اور لائبریری تقریباً خالی ہوچکی تھی۔ میں بھی ہڑبڑا کر اٹھی اور کتابیں سمیٹ کر لائبریری سے باہر آگئی۔ وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا جیسے مینہ برس رہا تھا اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تیز بارش میں سلور جوبلی گیٹ تک کیسے جاؤں۔ مشکل

سروس بھی بند ہوچکی تھی اور دور دور تک کوئی متنفس نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یونیورسٹی کی بجائے کسی ویران جنگل میں تنہا کھڑی ہوں۔ بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور اس کی شدت سے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ کافی دیر تک ہوتی رہے گی۔ اس زمانے میں موبائل فون بھی عام نہیں ہوا تھا کہ گھر پر اطلاع کردیتی۔ مجھے دو طرح کی پریشانی لاحق ہورہی تھی۔ ایک یہ کہ گھر کیسے پہنچوں اور دوسرے یہ کہ زیادہ دیر ہوگئی تو امی پریشان ہوجائیں گی۔

ابھی اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھی کہ ایک کار میرے بالکل سامنے آکر رکی اور اس میں سے ایک لڑکے نے پسنجر سائیڈ والا شیشہ اتار کر مجھے بلانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میرا کلاس فیلو شاہد تھا۔ گو کہ میری اس سے بات چیت ہائے ہیلو تک محدود تھی لیکن میں اسے جانتی تھی۔ اس وقت مجھے اس کا دم غنیمت محسوس ہوا اور میں وقت ضائع کیے بغیر اس کی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی لیکن کوریڈور سے کار تک پہنچتے پہنچتے ہی اچھی خاصی بھیگ گئی تھی۔ میں نے اپنے سر اور جسم کے گرد اچھی طرح دوپٹا لپیٹا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سارے اسٹوڈنٹس جاچکے ہیں۔ آپ اب تک لائبریری میں کیا کررہی تھیں؟“

جی چاہا کہ یہی سوال اس سے پوچھوں کہ تم یہاں کیا کررہے ہو لیکن میری اس سے زیادہ بے تکلفی نہیں تھی۔ اس لیے آہستہ سے بولی۔ ”دراصل نوٹس بنانے میں وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ باہر بارش ہورہی ہے تو میں بھی گھر جاچکی ہوتی۔“

”چلیں ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اس بہانے آپ سے ملاقات ہوگئی۔“

مجھے چاہیے تھا کہ کوئی سخت جواب دے کر اس کی پیش قدمی روک دیتی لیکن میں احسان فراموش نہیں تھی۔ اس نے مشکل وقت میں میری مدد کی۔ اس لیے میں نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی البتہ نیپا چورنگی پر پہنچ کر اس نے کہا۔ ”آپ اپنا پتا بتادیں۔ میں وہیں اتار دوں گا۔“

میں جانتی تھی کہ وہ ڈیفنس میں رہتا ہے جب کہ میری رہائش گلبرگ میں تھی اگر وہ مجھے چھوڑنے وہاں تک جاتا تو پھر اسے ڈیفنس جانے کے لیے بہت طویل راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ بارش اب بھی ہورہی تھی البتہ اس کی شدت کم ہوگئی تھی۔ سڑک پر دور دور تک کوئی سواری بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ وہ میری پریشانی بھانپ گیا اور کہنے لگا۔

”میری فکر نہ کریں۔ آپ کو چھوڑنے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن اگر آپ راستے میں اتر گئیں تو گھر پہنچنا مشکل ہوجائے گا۔ اس لیے میں آپ کو گھر پر ہی ڈراپ کروں گا۔“

میں نے اسے گھر کا پتا سمجھادیا۔ سڑکوں پر پانی جمع ہوگیا تھا اور مسلسل پانی برسنے سے سامنے کا منظر دھندلا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے گاڑی چلانے میں دشواری ہورہی تھی تاہم وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کرتا ہوا مجھے منزلِ مقصود تک لے آیا۔ میرا گھر بس اسٹاپ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بارش بھی تھم چکی تھی لیکن سڑک بالکل خالی تھی اور دور دور تک کسی فرد کا نام ونشان نہ تھا۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ورنہ محلے کا کوئی آدمی مجھے اس کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیتا تو لوگوں کو باتیں بنانے کے لیے ایک موضوع مل سکتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

میری توقع کے عین مطابق گھر کے سبھی افراد پریشانی میں مبتلا تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ابو تو ویسے ہی دل کے مریض تھے۔ ذرا سی بات پر ان کا بلڈ پریشر ہائی ہوجاتا تھا۔ اس لیے سب گھر والوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ انہیں ہر طرح کی پریشانی سے دور رکھا جائے۔ اس وقت بھی وہ برآمدے میں کرسی ڈالے گیٹ پر نظریں جمائے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے سوال جواب کریں گے کیونکہ یہ ان کی عادت تھی لیکن خلافِ توقع انہوں نے کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ البتہ امی خاصی برہم ہورہی تھیں۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں کتنی مشکل سے گھر پہنچی ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی شروع ہوگئیں۔

”کیا ضرورت تھی۔ اتنی دیر تک یونیورسٹی میں رکنے کی۔ بارش شروع ہوتے ہی گھر آنا چاہیے تھا لیکن تمہیں ہماری پریشانی کا بالکل بھی احساس نہیں۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”لائبریری میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ مجھے بارش شروع ہونے کا پتا ہی نہ چلا۔“

وہ اسکول ٹیچر تھیں۔ اس لیے ان کے مزاج میں سختی زیادہ تھی۔ ابو کی بیماری نے انہیں اور بھی چڑچڑا بنادیا تھا۔

کیونکہ گھر چلانے کی ساری ذمے داری انہی پر آ گئی تھی۔ بیماری کی وجہ سے ابو کی ملازمت ختم ہو گئی تھی اور انہوں نے ایک دوست کی شراکت سے پراپرٹی کا کام شروع کیا ہوا تھا اور یہ ہوائی روزی تھی۔ کبھی کوئی کام بن جاتا تو چار پیسے آ جاتے ورنہ بعض اوقات پورے مہینے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ اوپر کا مکان کرایہ پر دیا ہوا تھا۔ امی کی تنخواہ اور مکان کے کرائے سے ہی ہماری گزر بسر ہو رہی تھی۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن فرزانہ اور بھائی فراز تھا۔ دونوں ابھی پڑھ رہے تھے۔ گھر کے حالات دیکھ کر میں دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ میری یہی کوشش تھی کہ جلد از جلد تعلیم مکمل کر کے کوئی ملازمت کر لوں تاکہ گھر کے حالات بہتر ہو سکیں۔

دوسرے دن یونیورسٹی میں شاہد سے آمنا سامنا ہوا تو اس نے رسماً ہائے ہیلو کیا اور آگے بڑھ گیا ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ گزشتہ روز اس نے جو احسان کیا تھا اس کے بدلے وہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے گا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح لاتعلق بنا رہا جیسے کہ مجھے جانتا ہی نہ ہو۔ اس کا یہ رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسے نظر انداز کرنا کسی بھی لڑکی کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ بے حد اسمارٹ، ذہین اور خوش لباس اسٹوڈنٹ تھا اور اپنی انہی خوبیوں کی بدولت ڈیپارٹمنٹ میں خاصا مقبول تھا۔ پڑھائی کے علاوہ دوسری سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا جس کی وجہ سے اس کا حلقۂ احباب بھی وسیع تھا جس میں تقریباً سبھی لڑکے تھے۔ صنف نازک سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی جس سے اس کے کردار کی مضبوطی کا پتا چلتا تھا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ اس سے سر راہ ہائے ہیلو ہو جاتی۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کبھی کوئی بات نہیں ہوتی۔ امتحان سر پر تھے۔ اس لیے میں بھی سب کچھ بھول کر پڑھائی میں لگ گئی۔ میرا بیشتر وقت لائبریری میں گزرتا۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا اور گرمی نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ بعض اوقات اتنی تیز دھوپ ہوتی کہ سلور جوبلی گیٹ تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ وہ مئی کی ایک گرم دوپہر تھی۔ میں حسب معمول لائبریری سے نکلی تو کچھ زیادہ ہی سناٹا محسوس ہوا۔ باہر بہت کم چہل پہل تھی اور اکا دکا طالب علم ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ شٹل کا وقت نکل چکا تھا۔ میں پیدل ہی سلور جوبلی گیٹ کی طرف چل دی۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی میں پسینے میں شرابور ہو گئی۔ پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ میرے لیے قدم بڑھانا دشوار ہو گیا۔ اس لیے ستانے کے لیے ایک درخت کے سائے تلے کھڑی ہو گئی۔ وہاں کوئی اسٹال یا کیبن بھی نہیں تھا جہاں سے کولڈ ڈرنک سے اپنی پیاس بجھا سکتی۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ شاہد کی گاڑی میرے پاس آ کر رکی۔ اس بار اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلانے لگا۔ میرے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر تھوڑی دیر اور کھڑی رہتی تو شاید نڈھال ہو کر گر جاتی لہٰذا جلدی سے لپک کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اے سی چل رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس نے شیشہ کیوں نہیں گرایا تھا۔ میرے اوسان بحال ہوئے تو بولی۔ ”بس مجھے سلور جوبلی گیٹ پر اتار دیں۔ وہاں سے بس میں چلی جاؤں گی۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ سب بسیں بند ہو گئی ہیں۔“

”ہائے اللہ، اب کیا ہو گا۔“ میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”ہونا کیا ہے۔ آپ کو بٹھایا ہے تو گھر تک بھی چھوڑوں گا۔“

اس وقت وہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ اس لیے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نیپا کے پاس اس نے ایک اسٹال پر گاڑی روکی اور بولا۔ ”کولڈ ڈرنک پیو گی؟“

وہ ایک دم آپ سے تم پر آ گیا۔ مجھے اس کی یہ بے تکلفی اچھی لگی۔ ویسے بھی بہت زور کی پیاس لگ رہی تھی۔ اس لیے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ گاڑی سے اتر گیا اور کولڈ ڈرنک کے دو ٹن لے کر آ گیا۔ اس نے ایک ٹن مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں جلدی نہیں ہے تو میں یہ کولڈ ڈرنک ختم کر لوں۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے نہیں پی سکوں گا۔“

”نو پرابلم۔ تم کولڈ ڈرنک ختم کر لو۔ پھر گاڑی چلانا۔“

سارے راستے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے اسٹاپ سے ذرا پہلے گاڑی رکوائی اور اس کا شکریہ ادا کر کے اترنے لگی تو وہ بولا۔ ”کیا میں یہ

سمجھوں کہ آج سے ہم دوست بن گئے ہیں۔''
میں ہنستے ہوئے بولی۔ ''اس سے پہلے کیا ہم دشمن تھے؟''
''دشمن تو نہیں البتہ اجنبی ضرور تھے۔''
''سوچ لو، دوست بنانا آسان ہے لیکن دوستی نبھانا بہت مشکل ہے۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔
''آزما کر تو دیکھو۔ ہر امتحان میں پورا اتروں گا۔''
''چلو، تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔'' میں نے کہا اور تیزی سے دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔
میری ذرا سی ڈھیل نے اسے بے باک بنا دیا۔ اب وہ موقع بے موقع مجھ سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگا تھا۔ میں ہمیشہ سے ہی لڑکوں سے تعلق رکھنے کے معاملے میں محتاط تھی۔ خاندان میں کزنز وغیرہ سے زیادہ بے تکلف نہیں تھی اور یونیورسٹی میں بھی مخلوط تعلیم ہونے کے باوجود کسی لڑکے سے میل جول نہیں بڑھایا تھا۔ اس لیے شاہد سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اپنے ساتھ کینٹین چلنے کے لیے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں اپنا تماشا بنوانا نہیں چاہتی تھی۔
ہماری دوستی آہستہ آہستہ پروان چڑھتی گئی۔ یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیوں کا آپس میں بات کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے میں بھی خالی پیریڈ میں اس سے باتیں کر لیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ان کا گھرانا کل چار افراد پر مشتمل تھا۔ ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن نرگس والد کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی اور وہ چاہتے تھے کہ شاہد یونیورسٹی سے فارغ ہو کر فیکٹری کا کام سنبھال لے لیکن وہ مزید تعلیم کے لیے باہر جانا چاہ رہا تھا۔
فائنل امتحان قریب آ رہے تھے۔ اس کے بعد میرا یونیورسٹی جانا بند ہو جاتا۔ میں پوری تندہی سے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ شاہد سے بھی بہت کم بات ہوتی تھی۔ آخری پرچہ دے کر باہر نکلی تو وہ میرے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ قریب آ کر بولا۔ ''آج میرے ساتھ چلو۔ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔''
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا بات کرے گا اور اسے سننے کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ لہٰذا اسے ٹالنے کے لیے بولی۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ جو بات کرنی ہے یہیں کر لو۔''

وہ بولا۔ ''آج ہمارا یونیورسٹی میں آخری دن ہے۔ اس کے بعد نہ جانے کب ملاقات ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ کہیں بیٹھ کر مستقبل کا لائحہ عمل طے کر لیا جائے۔''
میں نے زیادہ بحث نہیں کی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں۔''
''پوچھو، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گی۔''
''تمہاری کہیں منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی؟''
''نہیں اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔''
''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔
''میں تمہیں اپنے حالات بتا چکی ہوں۔ ابو بیمار ہیں امی ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ بہت مشکل سے گزارہ ہو رہا ہے۔ میں کوئی جاب کر کے ان کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔ جب تک میرے بہن بھائی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ میں شادی نہیں کر سکتی۔''
اس نے گاڑی ایک ریسٹوران کے سامنے روکی اور بولا۔ ''آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''
یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کے ساتھ کسی ریسٹوران میں گئی۔ وہ بھی اس لیے کہ میں اسے آخری ملاقات سمجھ رہی تھی۔ اس لیے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے کھانے کا آرڈر دیا اور بولا۔
''مجھے تمہاری ذمے داریوں کا احساس ہے لیکن تمہیں اپنے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔''
''جب وقت آئے گا تو اپنے بارے میں بھی سوچ لوں گی۔''
''تب تک بہت دیر ہو جائے گی۔''
''کوئی بات نہیں لیکن میں خود غرض بن کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں کا سہارا بننا ہے۔''
''تم شادی کے بعد بھی انہیں سپورٹ کر سکتی ہو۔''
''یہ عملاً ممکن نہیں۔ ویسے بائی دی وے تمہیں میری شادی سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی۔''
''اس لیے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بلا جھجک دل کی بات کہہ دی۔
''یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ بہن کی شادی اور بھائی کے برسر روزگار ہونے تک میں اپنے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''
وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں

تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میں بھی تم سے ہی شادی کروں گا۔ چاہے مجھے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی اور بولی۔ ''تم جیسے سمجھ دار آدمی کے منہ سے جذباتی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تمہیں ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے پھر میرے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بہر حال یہ کارڈ رکھ لو۔ اگر کبھی مجھ سے بات کرنا چاہو تو اس نمبر پر فون کر لینا۔''

میں نے کچھ کہے بغیر وہ کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا اور بولی۔ ''جلدی سے کھانا ختم کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

رات کو بستر پر لیٹ کر میں کافی دیر تک شاہد کے بارے میں سوچتی رہی۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاہد کے پروپوزل پر خوشی سے جھوم اٹھتی۔ اس میں ایک نہیں بے شمار خوبیاں تھیں اور کوئی بھی لڑکی اسے بڑی خوشی سے اپنا ہم سفر بنا سکتی تھی لیکن میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی میں شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے بھی یہی جواب دیتی۔ اب میری پہلی ترجیح ملازمت تھی لہٰذا میں نے اس کی تلاش پر توجہ مرکوز کر دی۔

رزلٹ آگیا تھا۔ میں اور شاہد دونوں ہی اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے تھے۔ رزلٹ آنے کے بعد میں نے پوری تندہی سے ملازمت کی تلاش شروع کر دی کیونکہ گھر کے حالات تیزی سے بگڑتے جا رہے تھے۔ ابو کی بیماری بہت بڑھ گئی تھی اور ان کے علاج پر کافی پیسے خرچ ہو رہے تھے۔ دو تین ماہ کی تلاش کے بعد میری ہمت جواب دینے لگی تو میں نے شاہد کو فون کیا اور کہا کہ وہ میری جاب کے لیے کوشش کرے۔ اس کے ڈیڈی کے کافی تعلقات تھے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں ان سے بات کرے گا۔

شاہد کی کوشش بار آور ثابت ہوئی اور اس کے توسط سے مجھے ایک بینک میں جاب مل گئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تو وہ بولا۔ ''خالی شکریہ ادا کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ تم اسی ریستوران میں آجاؤ جہاں میں تمہیں پہلی بار لے کر گیا تھا۔ ہم مل کر تمہاری کامیابی کا جشن منائیں گے۔''

میں انکار نہ کر سکی اور مقررہ وقت پر اس سے ملنے پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے نہیں بلکہ اسے جاب ملی ہے۔ وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا۔ ''آج کی دعوت میری طرف سے ہے۔ جب تمہیں پہلی تنخواہ ملے گی تو تم سے دعوت لوں گا۔''

''کیوں نہیں، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں تو خود تمہیں ٹریٹ دینے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''ایک بات اور۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جب میں نے ڈیڈی سے تمہاری جاب کے لیے بات کی تو امی کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ اب انہیں اور نرگس کو تمہارے بارے میں کرید لگ گئی ہے اور وہ تم سے ملنا چاہ رہی ہیں۔''

''انہیں مایوسی ہوگی۔'' میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''مجھ میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے وہ متاثر ہو سکیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ یہ بتاؤ ان سے ملنے کب چل رہی ہو؟''

''کسی چھٹی والے دن پروگرام بناؤں گی۔ ظاہر ہے کہ مجھے گھر میں بھی بتانا ہوگا۔''

☆☆☆

شاہد کی امی اور بہن بڑے تپاک سے ملیں، وہ بڑے سادہ اور پرخلوص لوگ تھے اور دولت مند ہونے کے باوجود ان میں ذرا سا بھی غرور نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے اصرار کر کے کھانے پر روک لیا۔ ویسے بھی میں امی کو بتا کر گئی تھی۔ میں نے انہیں شاہد کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں میرا کلاس فیلو تھا اور اسی کے توسط سے مجھے یہ ملازمت ملی ہے۔ امی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید وہ بھی ہر ماں کی طرح میرے مستقبل کے بارے میں خواب دیکھ رہی تھیں۔

گھر کے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے معقول تنخواہ مل رہی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر سہولتیں بھی تھیں لیکن یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ مجھے ملازمت کیے ہوئے چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ ایک رات ابو کو دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ابو کے انتقال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کا دم کتنا غنیمت تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہم بالکل بے سہارا ہو گئے۔ میرے اوپر ایک ساتھ کئی ذمے داریاں آگئیں۔ صبح سے شام تک بینک میں سر کھپاتی۔ گھر آ کر امی کو سنبھالتی اور بہن بھائی کا خیال رکھتی۔ اس وقت فرزانہ انٹر اور فراز میٹرک میں تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان کی تعلیم میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس لیے رات کو انہیں بھی لے

کر بیٹھتی۔ چند ہی روز میں اندازہ ہو گیا کہ ان دونوں کو کوچنگ کی ضرورت ہے چنانچہ انہیں قریبی کوچنگ سینٹر میں بھیجنا شروع کر دیا۔

اس موقع پر شاہد نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اب وہ باقاعدگی سے ہمارے گھر آنے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت ڈھارس تھی۔ اسے دیکھ کر امی کی آنکھوں میں بھی اطمینان اتر آتا۔ شاید وہ بھی میرے اور شاہد کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگی تھیں پھر ایک دن ان کے دل کی بات زبان پر آگئی اور انہوں نے مجھ سے شاہد کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ سن کر حیران رہ گئیں اور بولیں۔

''بے وقوف ہو تم، اتنا اچھا لڑکا تم سے شادی کرنا چاہ رہا ہے اور تم اسے انکار کر رہی ہو۔ ایسے لڑکے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔''

''مانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا انسان ہے لیکن میں فی الحال شادی نہیں کر سکتی۔''

''اگر تمہیں اپنی بہن اور بھائی کی فکر ہے تو شادی کے بعد بھی ان کی مدد کر سکتی ہو۔''

''یہی بات شاہد نے بھی کہی تھی لیکن آدمی کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ کیا پتا شادی کے بعد اس کا رویہ کیسا ہو۔ میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔''

''تم جانتی ہو فراز ابھی میٹرک میں ہے۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے میں چھ سات سال لگ جائیں گے۔ تب تک تو تمہاری عمر نکل جائے گی۔ میری مانو تو ہاں کہہ دو۔ اللہ مالک ہے۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔''

''نہیں امی، وہی ہوگا جو میں نے کہہ دیا۔ میں آپ لوگوں کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

ادھر شاہد کے گھر میں ایک کشمکش چل رہی تھی۔ اس کے ڈیڈی چاہتے تھے کہ وہ فیکٹری کا کام سنبھال لے لیکن وہ مزید تعلیم کے لیے باہر جانا چاہ رہا تھا۔ بالآخر اس کی ضد کے آگے ڈیڈی کو ہار ماننا پڑی اور اس نے انگلینڈ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کا مانچسٹر کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملا تو اس نے ایک بار پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ میری منگنی ہو جائے تاکہ وہ سکون سے اپنی پڑھائی پر توجہ دے سکے۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس رشتے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، یہ سن کر وہ جذباتی ہو گیا اور بولا۔ ''میں اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ شادی کے بعد تمہاری آمدنی سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہوگا اور اگر تم چاہو تو پوری تنخواہ اپنے گھر والوں کو دے سکتی ہو۔''

''انہیں مالی مدد ہی کی نہیں بلکہ میری سرپرستی اور رہنمائی کی بھی ضرورت ہے۔ امی کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔''

''اچھا تو پھر ایک وعدہ کرو۔ تم میری واپسی تک انتظار کرو گی۔''

''تم میرا خیال دل سے نکال دو۔ ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے گھر والے مجھے کبھی قبول نہیں کریں گے۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ میرا انتظار کر سکتی ہو یا نہیں۔''

''میں بتا چکی ہوں کہ فی الحال میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور تم بھی میرے انتظار میں وقت ضائع نہ کرو۔''

''تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب میری بات بھی سن لو۔ شادی کروں گا تو تم سے ورنہ ساری عمر کنوارہ بیٹھا رہوں گا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بس دل میں ... مسکرا دی۔ اس وقت میں یہی سمجھ رہی تھی کہ خوامخواہ جذباتی ہو رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ عرصہ میرا انتظار نہیں کر سکے گا اور اسے اپنے گھر والوں کی مرضی اور پسند کے مطابق شادی پر مجبور ہونا پڑ جائے گا۔ اس نے جاتے وقت وعدہ کیا کہ وہ مجھے باقاعدگی سے فون کرتا رہے گا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ میں اسے اپنے حالات سے باخبر رکھوں گی۔

وہ چلا گیا لیکن مجھے اس کی کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے ہمیشہ ایک دوست ہی سمجھا اور اس سے زیادہ میری زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بے شک وہ مجھ سے شادی کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں اپنی ذمے داریاں پوری ہونے سے پہلے شادی کے لیے تیار نہیں تھی اور دوسرے یہ کہ اس کی اور میری سماجی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ وہ اگر ضد کر کے اپنے گھر والوں کو وقتی طور پر اس رشتے کے لیے تیار کر بھی لیتا تو آگے چل کر

میرے لیے بہت سی الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے اس سے دوری اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ وہ خود ہی مایوس ہو کر میرے راستے سے ہٹ جائے۔

امی بہت بیمار رہنے لگی تھیں۔ ابو کے انتقال کے بعد سے ہی ان کی صحت گرتی جارہی تھی۔ اس لیے میں نے ان کی ملازمت ختم کروادی۔ اب ان کی تیمارداری بھی میرے فرائض میں شامل ہوگئی تھی۔ میں گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔ صبح سے لے کر رات گئے تک مصروف رہتی۔ اپنی طرف دھیان دینے کا تو وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ البتہ فرزانہ اور فراز کے بارے میں ہر وقت سوچتی رہتی تھی۔ فرزانہ بھی اب جوانی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ چار سال بعد اس کی تعلیم ختم ہو جاتی تو شادی کے بارے میں سوچنا پڑتا۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔ اس زمانے میں شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں۔ لاکھوں خرچ ہو جاتے ہیں اور یہاں یہ عالم تھا کہ مہینے کے اخراجات بھی بمشکل پورے ہوتے تھے۔ کچھ جمع کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ گھر کے اخراجات میں کمی کر کے ہر مہینے کچھ پیسے بچانے چاہئیں تاکہ فرزانہ کی شادی کے وقت کام آسکیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک فرم میں پارٹ ٹائم جاب کرلی۔ بینک سے فارغ ہو کر سیدھی وہاں چلی جاتی اور آٹھ بجے تک اپنا کام نمٹا کر گھر واپس آجاتی۔ امی کو جب اس ملازمت کا علم ہوا تو انہوں نے بہت شور مچایا کہ میں نے یہ کیا روگ پال لیا ہے۔ میں نے انہیں بہت مشکل سے سمجھایا کہ مستقبل میں بڑے اخراجات آنے والے ہیں جس کے لیے ہمیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کے باوجود ان کا یہی اصرار تھا کہ میں پارٹ ٹائم جاب نہ کروں لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔

تین مہینے بعد شاہد کا پہلا فون آیا۔ وہ جاتے ہی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اس لیے فون کرنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ اس نے بمشکل دو تین منٹ بات کی۔ اس کے لہجے میں پہلے جیسی بے تابی اور بے قراری نہیں تھی لیکن میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہو۔ اس کے بدلنے یا نہ بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ میری زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرا مشن کچھ اور تھا اور میں اسی کی تکمیل کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔

ایک دن اس کی بہن نرگس مجھ سے ملنے آئی۔ وہ خاصی پریشان لگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ڈیڈی بیمار رہنے لگے ہیں اور ان کی بیماری کی وجہ سے فیکٹری کا کام بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاہد بھائی واپس آکر فیکٹری سنبھال لیں اور وہ اپنی زندگی ہی میں ان کی شادی کردیں۔ امی نے تو ان کے لیے لڑکی بھی پسند کرلی ہے لیکن شاہد بھائی نہیں مان رہے۔ وہ واپس آنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی شادی کے لیے رضامند ہو رہے ہیں۔ امی نے خاص طور پر مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کی ان سے بڑی اچھی دوستی ہے۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی بات مان جائیں۔“

میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ اب شاہد کا فون آیا تو اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ اس نے مجھے اس انداز سے دیکھا جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ وہ میرے اور شاہد کے تعلق کے بارے میں جانتی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ شاہد کے انکار کی اصل وجہ میں ہوں۔ چلتے چلتے اس نے ایک ایسی بات کہی جس سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے کہا۔ ”اگر آپ انہیں سمجھانے میں کامیاب ہو گئیں تو یہ ہمارے خاندان پر بہت بڑا احسان ہوگا ورنہ......“

”ورنہ کیا!“ میں نے پوچھا۔

”ورنہ وہی ہوگا جو ممی اور ڈیڈی چاہتے ہیں۔ شاہد بھائی کو ان کی بات ماننا ہوگی۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے جو ہمارے ہم پلہ نہ ہو۔ دوسری صورت میں نقصان شاہد بھائی کا ہی ہوگا۔ ڈیڈی انہیں جائیداد سے عاق بھی کر سکتے ہیں۔“

اس کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ شاہد کو نہیں بلکہ مجھے دھمکیاں دے رہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہی تھی کہ جو خواب تم دیکھ رہی ہو۔ وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ میں نے سرے سے ایسا کوئی خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ جی میں آیا کہ اسے ساری حقیقت بتادوں لیکن اس وجہ سے خاموش رہی کہ شاید ایسا نہ ہو جو میں سوچ رہی ہوں اور نرگس مجھے دھمکانے نہیں بلکہ شاہد کے معاملے میں میری مدد لینے آئی تھی۔

میں نے شاہد کے فون کا انتظار بھی نہیں کیا میرے پاس اس کا نمبر تھا۔ اس لیے خود ہی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تاکہ اس قصے کو فوری طور پر ختم کرسکوں۔ آج اس کی بہن آئی تھی۔ کل ماں بھی آسکتی ہے۔ اگر شاہد واپس نہیں آرہا یا شادی پر تیار نہیں تو یہ لوگ مجھے کیوں بیچ میں گھسیٹ

رہے ہیں۔ اتفاق سے اس روز شاہد سے میرا رابطہ نہ ہوسکا۔ وہ کسی دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ میں نے آنسرنگ مشین پر پیغام چھوڑ دیا تاکہ وہ واپس آکر مجھے فون کرسکے۔

اس نے پندرہ دن بعد مجھے فون کیا اور جب میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں کی بات مان لے تو وہ بھڑک اٹھا اور بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ نرگس تمہارے پاس آئی تھی اور اسی نے تمہیں یہ پٹی پڑھائی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اس معاملے میں مت بولو۔ یہ میرا مسئلہ ہے اسے میں خود ہی حل کروں گا۔"

"لیکن شاہد اس طرح میری پوزیشن خراب ہورہی ہے۔ وہ لوگ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ فساد کی اصل جڑ میں ہوں اور میری وجہ سے تم انکار کررہے ہو۔"

"اگر وہ ایسا سمجھ رہے ہیں تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ تم شادی کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں خود ہی انہیں تمہارے بارے میں بتادوں۔"

"فی الحال یہ ممکن نہیں۔ میں اپنی مجبوری بتا چکی ہوں اور یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہارے خاندان کا شیرازہ بکھر جائے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اپنے والدین کی بات مان لو۔"

"تمہارے مشورے کا شکریہ۔ آئندہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا۔ اپنے برے بھلے کا میں خود ذمے دار ہوں۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔

مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ واقعی اس سے آئندہ اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ یہ اس کا مسئلہ ہے وہ جانے اور اس کے گھر والے۔ مجھے بیچ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب اگر اس کی بہن آئی تو اس سے بھی صاف صاف کہہ دوں گی کہ شاہد نے میری بات سننے سے انکار کردیا ہے۔ اب تم خود ہی اس معاملے سے نمٹو۔

☆......☆

آئندہ دو تین ماہ بڑی مصروفیت میں گزرے۔ امی کی بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ گوکہ باقاعدگی سے علاج ہورہا تھا۔ میں مہینے میں ایک بار ان کا چیک اپ ضرور کرواتی تھی۔ ڈاکٹر جو بھی ٹیسٹ تجویز کرتا وہ فوراً کروائے جاتے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہورہا تھا۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھیں اور انہیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی۔ یہ میرے لیے بہت سخت وقت تھا۔ مجھے بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف امی کی تیمارداری تو دوسری جانب بہن بھائی کی دیکھ بھال۔ اس پر دوجگہ ملازمت، چھٹی کا دن بھی گھر کے کاموں کی نذر ہو جاتا۔ حالانکہ فرزانہ اور فراز بڑے ہو گئے تھے لیکن ان میں ذرا سا بھی احساسِ ذمے داری نہیں تھا سب کچھ مجھے ہی دیکھنا پڑ رہا تھا۔ میں خود بھی ان دونوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھیں۔

فرزانہ پڑھائی میں کچھ تیز نہ تھی۔ اس لیے کوشش کے باوجود اس کے انٹر سائنس میں اتنے نمبر نہیں آسکے کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا۔ لہٰذا اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ سچ پوچھیں تو میں یونیورسٹی کی پڑھائی کو وقت گزاری کا ذریعہ سمجھتی تھی کیونکہ اب پروفیشنل ڈگری کی مانگ بڑھ گئی تھی اور ماسٹرز کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اس لیے میں نے بھی سوچ لیا کہ اگر اس دوران کوئی مناسب رشتہ آگیا تو اس کی شادی کردوں گی اور یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہونے کا انتظار نہیں کروں گی۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں عورت چاہے جتنی بھی پڑھ لکھ لے اسے شادی کے بعد گھر کی ذمے داری سنبھالنا ہوتی ہے۔

اس دن کے بعد شاہد سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کے فون آنا بند ہوگئے تھے۔ شاید وہ بہت زیادہ معروف ہوگیا تھا یا پھر میری بے رخی نے اسے مایوس کردیا ہوگا۔ میں تو دل سے یہی چاہتی تھی کہ وہ مجھے بھول جائے اور اپنے گھر والوں کی مرضی سے شادی کرلے۔ اس لیے مجھے اس کے فون نہ آنے پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ البتہ دل میں کبھی کبھی ایک کسک سی ضرور ہوتی تھی اور مجھے کسی کمی کا احساس ہونے لگتا۔ شاید یہ میری تنہائی تھی جس کی وجہ سے وہ مجھے یاد آنے لگتا۔

جی ہاں امی کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا ہوگئی تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتی اور رات کو ساڑھے آٹھ بجے گھر واپس آتی۔ صرف رات کے کھانے پر فرزانہ اور فراز میرے ساتھ ہوتے تو دو چار رسمی باتیں ہو جاتیں ان کی اپنی دنیا تھی اور وہ اس میں مگن تھے۔ یونیورسٹی میں جانے کے بعد فرزانہ کی دوستیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور وہ ہر وقت ٹیلی فون سے کان لگائے بیٹھی رہتی۔ فراز بی بی اے کی تیاری کررہا تھا۔ اسے پڑھنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ اپنا کیریئر بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میرا کوئی دوست تھا اور نہ امی کے انتقال کے بعد کسی رشتے دار نے ہمیں پوچھا۔ ددھیال

والوں نے تو کبھی ابو کی زندگی میں ہی کوئی تعلق نہیں رکھا
ننھیال میں ایک ماموں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ کبھی کبھی
آجاتے تھے اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہیں تھا جس سے میں
اپنا دکھ درد بیان کر سکتی۔

ایک روز میں شاپنگ کے لیے مال گئی تو میری نظر
فرزانہ پر گئی جو ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ ریستوران سے
نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور
میں اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی
کہ وہ یوں بے حجابانہ غیر لڑکے کے ساتھ گھوم سکتی ہے۔
گھڑی پر نظر ڈالی تو تین بج رہے تھے۔ اس وقت تک تو وہ
گھر واپس آجاتی تھی، کم از کم اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ
اس کی کلاس دو بجے ختم ہو جاتی ہے اور وہ ڈھائی تین بجے
تک گھر پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت میں گھر پر نہیں ہوتی تھی۔
اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ اس کے آنے کا کیا معمول تھا۔
میں نے سر جھٹک کر دوبارہ اس جانب دیکھا لیکن وہ دونوں
نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

میں نے شاپنگ کا ارادہ ملتوی کیا اور بوجھل قدموں
سے گھر آگئی۔ حالانکہ مجھے واپس بینک جانا تھا لیکن اب میرا
کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس وقت میرے دماغ پر وہ
لڑکا اور فرزانہ بری طرح سوار ہو گئے تھے۔ وہ جس طرح
ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اس سے مجھے
یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوئی کہ ان کے درمیان ایک
خاص تعلق قائم ہو چکا ہے۔ نہ جانے یہ چکر کب سے چل رہا
تھا۔ مجھے فوری طور پر اس کا کوئی حل تلاش کرنا تھا۔ فرزانہ
سے براہِ راست پوچھنا مناسب نہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ
سے اکھڑ جاتی یا غلط بیانی سے کام لیتی۔ اس لیے میں نے
اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ گھر میں بات کرنے کا موقع
ملنا مشکل تھا کیونکہ رات کے کھانے اور صبح ناشتے کی میز پر
فراز بھی موجود ہوتا تھا اور میں اس کے سامنے کوئی بات نہیں
کرنا چاہتی تھی۔

اس روز رات کو کھانے کے بعد میں نے اپنے لیے
چائے بنائی۔ ایک کپ فرزانہ کے لیے بھی تیار کی اور اس
کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ فراز دوسرے کمرے میں پڑھ رہا تھا
اور فرزانہ بھی بستر پر بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ ہم دونوں کا کمرا
ایک ہی تھا میں نے اسے چائے کی پیالی پکڑائی اور بولی۔
"فرزانہ میں تم سے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں امید ہے کہ تم میری
بات غور سے سنو گی۔"

"جی جی کہیں میں سن رہی ہوں۔" اس نے کتاب
بند کی اور میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"میری ایک کولیگ ہیں مسز ارشد۔ وہ اپنے بھائی
کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔ انہوں نے تمہیں بھی دیکھ رکھا
ہے اور وہ اس سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہ رہی ہیں تم کہو تو
انہیں بلا لوں۔"

"آپ کو ابھی سے میری شادی کی فکر کیوں پڑ گئی۔
ابھی تو میری پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی۔" وہ کچھ پریشان
ہوتے ہوئے بولی۔

"دیکھو فرزانہ! اگر تم کوئی پروفیشنل کورس کر رہی
ہوتیں تو میں تمہاری ڈگری لینے تک انتظار کر لیتی لیکن ایم
ایس سی کی خاطر تمہیں گھر نہیں بٹھا سکتی۔ جتنی جلدی تمہارے
فرض سے سبکدوش ہو جاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔"

"آپ انہیں منع کر دیں۔ میں ابھی شادی نہیں کر
سکتی۔" وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"شادی کی یہی عمر ہے اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو
اچھے رشتے آنا بند ہو جائیں گے۔ میں تم پر زبردستی نہیں
کروں گی اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو۔"

وہ میری بات سن کر گڑبڑا گئی اور بولی۔ "یہ آپ کیسی
باتیں کر رہی ہیں؟"

"میں نے کچھ غلط نہیں کہا کسی کو پسند کرنا کوئی جرم
نہیں ہے۔ میں ہر حال میں تمہاری پسند کو ترجیح دوں گی۔"

یہ سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
"وہ میرے ڈیپارٹمنٹ میں ہی ہے لیکن مجھ سے دو سال
سینئر ہے۔"

"تم اسے کب سے جانتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں ملتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے ہیں۔"

فرزانہ نے اس لڑکے ارشد کے بارے میں جو تفصیل
بتائی اس کے مطابق وہ فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ باپ کا
انتقال ہو چکا تھا اور ماں ایک بوتیک چلاتی تھی۔ وہ کل تین
بہن بھائی تھے۔ دو بڑی بہنیں شادی شدہ تھیں اور گھر میں
ارشد ہی اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا گلشن میں ذاتی
مکان تھا جس کا اوپر کا حصہ کرائے پر دیا ہوا تھا۔ اس کے
علاوہ کچھ اور جائیداد بھی تھی جس کے کرائے سے ان کی اچھی
گزر بسر ہو رہی تھی۔ بیٹیوں کی شادی کے بعد اس کی امی
بڑی تنہائی محسوس کر رہی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ ارشد
فائنل امتحان سے فارغ ہوتا تو اس کی شادی کر دی جائے۔

”کیا اس نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟“ میں نے فرزانہ کو کریدا۔

”نہیں ابھی اس نے کھل کر نہیں کہا لیکن اس کے انداز سے یہی لگتا ہے کہ وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔“

”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم کسی دن چائے پر اسے بلالو۔“

وہ دیکھنے میں خاصا معقول تھا۔ بینک میں کام کے دوران میرا واسطہ طرح طرح کے لوگوں سے پڑتا رہتا تھا۔ اس لیے میں پہلی نظر میں ہی آدمی کو پہچان لیتی تھی۔ اسے کپڑے پہننے اور بات چیت کا سلیقہ تھا۔ میں نے اس کی گفتگو سے ہی اندازہ لگالیا کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ فرزانہ سے شادی کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے تو اس نے نئے نویلے دولہا کی طرح سر جھکا دیا۔ مجھے اس کی یہ سعادت مندی بہت اچھی لگی اور میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ کسی دن اپنی امی کو لے کر آئے، باقی باتیں انہی سے ہوں گی۔

ارشد کی امی سے مل کر مجھے مکمل اطمینان ہو گیا۔ وہ بہت قاعدے قرینے کی عورت تھیں۔ میں نے انہیں اپنے حالات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ میرے پاس اس مکان اور بینک کی نوکری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے لمبے چوڑے جہیز کی توقع نہ رکھی جائے۔ البتہ مجھ سے جو کچھ ہو سکا۔ وہ اپنی بہن کو ضرور دوں گی۔

انہوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ پکڑا اور بولیں۔ ”ہمیں صرف لڑکی چاہیے اور کچھ نہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے تمہاری بہن بہت اچھی لگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارشد کی پسند ہے۔ بس تم دن اور تاریخ بتا دو تاکہ اپنی بیٹیوں کو لے کر آؤں اور منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔“

میں نے ابھی تک فراز کو اس رشتے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اب وہ منگنی کے لیے کہہ رہی تھیں تو یہ بات فراز کے علم میں لانا ضروری تھی۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ بھائی سے مشورہ کر کے منگنی کا دن اور تاریخ بتا دوں گی۔

اس روز رات کے کھانے کے بعد جب میں نے فراز کو یہ بات بتائی تو وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو فرزانہ کی شادی کی اتنی جلدی کیا ہے۔ میرے خیال میں تو پہلے آپ کی شادی ہونی چاہیے اس کے بعد فرزانہ کا نمبر آئے گا۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہاری تعلیم مکمل ہونے تک میں شادی نہیں کروں گی۔ اچھا ہے اگر فرزانہ اپنے گھر کی ہو جائے تو میری ایک ذمے داری کم ہو جائے گی۔“

”یعنی آپ اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی ہیں۔ پھر ٹھیک ہے۔ آپ کا جو دل چاہے وہی کریں۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں۔“

میں دل مسوس کر رہ گئی۔ فراز سے مجھے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ضرور کوئی بات کرے گا لیکن وہ تو انتہائی خود غرض انسان نکلا۔ اسے اپنی ذات کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ آئندہ کسی معاملے میں اس سے مشورہ نہیں کروں گی۔

دوسرے روز میں نے ارشد کی امی کو کہلوا بھیجا کہ وہ آنے والے جمعہ کو منگنی کی رسم ادا کرنے آجائیں۔ ہمارے کام مجھے ہی کرنا تھے کیونکہ فراز سے تو کوئی توقع ہی نہیں تھی۔ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد بھی کتابوں میں سر دیے بیٹھا رہتا اور گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے ماموں کے گھر والوں کے سوا کسی کو نہیں بلایا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاہد کی امی اور نرگس کو بلاؤں لیکن شاہد نے مجھ سے جو بے رخی اختیار کر رکھی تھی اور فون تک کرنا بند کر دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے میں نے ان لوگوں کو بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں نے ارشد کی امی سے کہہ دیا تھا کہ شادی ایک سال بعد ہو گی کیونکہ مجھے تیاری کے لیے وقت چاہیے۔ انہوں نے ایک بار پھر روایتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں شربت کے پیالے پر بھی نکاح کر دوں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن میں اپنی بہن کو خالی ہاتھ نہیں رخصت کر سکتی تھی۔ اس لیے اپنی بات پر قائم رہی۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی لیکن شادی کے اخراجات کے لیے مزید پیسوں کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے بینک سے قرض لے لیا اور دو بڑی کمیٹیاں ڈال دیں۔ اس طرح میں فرزانہ کی شادی اچھی طرح کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ارشد کی امی نے منع کر دیا تھا کہ جہیز میں فرنیچر اور الیکٹرونکس کا سامان نہ دیا جائے کیونکہ ان کے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے چنانچہ میں نے صرف ایک بیڈ روم سیٹ کے علاوہ کچھ نہیں دیا البتہ اسے دو لاکھ روپے نقد دے دیے تاکہ وہ گھومنے پھرنے جا سکے۔

فرزانہ کی شادی کے بعد میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا گو کہ میں کافی زیر بار ہو چکی تھی اور مجھے دو سال تک بینک کا لون اور کمیٹی کی قسطیں ادا کرنا تھیں لیکن اس کے باوجود یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ اور ارشد ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ فرزانہ کی ساس ورکنگ وومن تھیں۔ ان کا سارا دن بوتیک میں ہی گزر جاتا۔ ویسے بھی وہ فرزانہ کے کسی معاملے میں نہیں بولتی تھیں۔ اس وجہ سے گھر میں کوئی تناؤ نہیں تھا۔

فرزانہ ہر ویک اینڈ پر مجھ سے ملنے آتی اور اکثر وہ دونوں رات کو رک جاتے۔ ارشد بہت باتونی اور مجلسی شخص تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق آجاتی لیکن بعض اوقات وہ بے تکا بول جاتا تھا جس سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک دن باتوں باتوں میں اس نے ایسا چرکا لگایا کہ میرے دل کے زخم ہرے ہو گئے۔ وہ ہفتہ کا دن تھا اور وہ لوگ رات کو میرے پاس رک گئے تھے۔ کھانے کے بعد ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ٹی وی پر کوئی ڈراما چل رہا تھا جس میں ایک ایسی لڑکی کو دکھایا گیا جو عمر رسیدہ ہونے کے باوجود غیر شادی شدہ تھی اور اس کی وجہ سے فرسٹریشن کا شکار ہو گئی تھی۔ ارشد نے اچانک اسکرین پر سے نظریں ہٹائیں اور بولا۔ ”باجی! آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“

اس بے تکے سوال پر میں حواس باختہ ہو گئی اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ یہ میری پرانی عادت تھی کہ جب غصہ آتا تو میں کھڑکی یا دروازے سے باہر دیکھنے لگتی۔ اس طرح میرا دھیان بٹ جاتا اور تھوڑی دیر میں میرا غصہ اتر جاتا تھا۔ ارشد کی بات سن کر مجھے شاہد یاد آ گیا اور میں سوچنے لگی کہ مجھ سے ایسا کیا قصور سرزد ہوا کہ اس نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اتنی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہوگی۔ تبھی اس نے مجھ سے دوری اختیار کر لی۔ عین ممکن ہے کہ اس نے اپنے والدین کے دباؤ میں آ کر شادی کر لی ہو کیونکہ اگر وہ ان کی بات نہ مانتا تو اسے عاق کر دیتے۔ مجھ سے شادی کر کے شاہد کو کیا ملتا۔ ماں باپ اور بہن سے دائمی جدائی، کروڑوں کی جائداد سے محرومی اور کسی اونچے خاندان سے تعلق نہ جوڑنے کا پچھتاوا۔ وہ مجھ سے شادی کر کے یقیناً نقصان میں رہتا اور آج کل کے دور میں کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ شاہد بھی اسی دنیا کا انسان تھا جب اس نے دو اور دو چار کا حساب کیا ہوگا تو اسے اپنے نفع و نقصان کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

میرے جواب دینے سے پہلے فرزانہ بول پڑی۔
”اگر باجی شادی کر لیتیں تو شاید ہم دونوں بہن بھائیوں کی بقیہ زندگی کسی یتیم خانے میں گزرتی۔ انہوں نے یہ قربانی ہمارے بہتر مستقبل کے لیے دی ہے۔“

”خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔“ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”باجی! آج بھی بہت سی لڑکیوں سے زیادہ پرکشش اور جوان نظر آتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی عمر نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میرا خیال ہے کہ اب انہیں شادی کر لینا چاہیے۔“

”ابھی ایک ذمے داری باقی ہے۔“ میں تنک کر بولی۔ ”جب تک فراز کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”باجی! میں آپ سے عمر میں چھوٹا ہوں۔ اس لیے کسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن ہم دونوں کے درمیان جو رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ اس کی رو سے مجھے اتنا حق ضرور پہنچتا ہے کہ آپ کو صحیح مشورہ دوں۔ آپ فراز کی فکر چھوڑیں۔ اب وہ اس جگہ پہنچ گیا ہے کہ کسی کی مدد کے بغیر اپنا سفر طے کر سکتا ہے پھر ہم لوگ موجود ہیں۔ آپ ہمیں کیوں اپنے آپ سے الگ سمجھتی ہیں۔ ہر عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب آپ کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ اس لیے اپنے بارے میں ضرور سوچیں۔ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاوے آپ کا مقدر بن جائیں گے۔“

اس نے کچھ غلط نہیں کہا۔ امی کے انتقال اور فرزانہ کی شادی کے بعد ہی میں بہت زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتی اور یہ کمی صرف جیون ساتھی ہی پوری کر سکتا تھا۔ اصولاً مجھے ارشد کی بات مان لینا چاہیے تھی لیکن میرے اندر کی ہٹ دھرم اور انا پرست عورت اس پر راضی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے آپ سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کرنا میرے لیے ایک مشن کا درجہ رکھتا تھا اور اس کی تکمیل تک میں کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔

شادی کے ایک سال بعد فرزانہ بچے کی ماں بن گئی۔ مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے اب وہ باقاعدگی سے

میرے پاس نہیں آتی تھی لیکن فون پر میری خیریت معلوم کرتی رہتی تھی۔ میری بھی بینک میں منیجر کے عہدے پر ترقی ہوگئی تھی اور میں نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے گاڑی بھی خریدی تھی جب بینک کا قرض اور کمیٹی کی قسطیں ادا ہوگئیں تو میں نے پارٹ ٹائم جاب چھوڑ دی اور بینک سے سیدھی گھر آنے لگی لیکن شام کو مجھے ہر طرف سناٹے اور تنہائی کا احساس ہوتا۔ فراز کے پاس تو مجھ سے بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ اس کا آخری سیمسٹر چل رہا تھا اور وہ زور و شور سے فائنل امتحان کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

امتحان پاس کرتے ہی اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی تو میں نے شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ میری دس سال کی محنت رنگ لائی۔ فرزانہ اور فراز دونوں ہی اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے لیکن میں خود کہاں کھڑی تھی اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اب میری عمر چھتیس سال ہو چکی تھی اور بظاہر میری شادی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کنوارے لڑکے تو کم عمر لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرے حصے میں کوئی رنڈوا یا طلاق یافتہ ہی آتا۔ واقعی پہلے میرے پاس اپنی شادی کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا اور جب سوچنا شروع کیا تو دور دور تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جسے میں اپنا شریکِ سفر بنا سکتی۔ ہمارا خاندان ویسے ہی بہت مختصر تھا۔ دور پرے کے رشتے داروں سے امی ابو نے کبھی میل جول ہی نہیں رکھا۔ اسی طرح ہمارے ملنے جلنے والے بھی برائے نام تھے۔ بینک میں بھی بس دو چار لوگوں سے ہی بات ہوتی تھی۔ ایسے میں میرے لیے رشتہ کہاں سے آتا۔

جب تنہائی بہت زیادہ ستانے لگی تو میں نے فراز کی شادی کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی دلہن کے آجانے سے مجھے بھی کوئی بات کرنے والا مل جائے گا۔ جب یہی بات میں نے فراز سے کہی تو اس نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ وہ بہتر مستقبل کی خاطر امریکا جانے کی تیاری کررہا ہے اور اس مرحلے پر شادی کرکے وہ اپنے پیروں میں زنجیر نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آگئی۔ جس پودے کو تناور درخت بنانے کے لیے میں نے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ وہ مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر جارہا ہے۔ میری زندگی میں تو ویسے ہی تنہائیوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا اس کے جانے کے بعد تو میرے چاروں طرف ویرانی اور سناٹے کا راج ہوتا۔ میں نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ میرے کہنے سے نہیں بدل سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہنے لگا۔

"باجی! مجھے امریکا جانے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی۔ پہلے دو سال وہاں کسی یونیورسٹی میں پڑھوں گا۔ اس کے بعد ہی مجھے کوئی اچھی ملازمت مل سکے گی۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ہم اس مکان کو بیچ دیتے ہیں۔ میں نے مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے جو پیسے ملیں گے اس میں دو حصے میرے اور ایک ایک حصہ دونوں بہنوں کا ہوگا۔"

مجھے اس سے ایسی خود غرضی کی امید نہیں تھی لیکن وہ تو سارا پروگرام بنا چکا تھا اور اس نے اپنے طور پر مکان کا بٹوارہ بھی کرلیا تھا۔ میں نے غصے میں آکر فرزانہ کو فون کرکے فراز کی تجویز سے آگاہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے اس منصوبے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی لیکن وہ بھی اس کی ہم خیال نکلی اور بولی۔

"اس کا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ یہاں رہ کر کیا کرے گا۔ مکان بک جائے تو اس کے جانے کا بندوبست ہوجائے گا اور ہمارے ہاتھ میں بھی چار پیسے آجائیں گے۔ جس سے ہمارے کئی کام ہوسکتے ہیں۔"

کسی نے یہ نہیں سوچا کہ مکان بک جانے کے بعد میں کہاں جاؤں گی اور کس کے ساتھ رہوں گی۔ حالانکہ میں اس پوزیشن میں تھی کہ کرایہ کا فلیٹ لے کر بھی اس میں رہ لیتی لیکن ماں باپ کی نشانی بیچتے ہوئے میرا دل دکھ رہا تھا دوسری بات یہ کہ میں کرایہ کے مکان میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ میں نے حساب لگایا تو مکان کی فروخت سے اتنے پیسے آجاتے کہ اپنے لیے ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید سکتی تھی لہٰذا میں نے فراز سے کہہ دیا کہ وہ کسی پراپرٹی ایجنٹ سے بات کرکے مکان کو سیل پر لگا دے۔

پھر چھ ماہ اسی تگ و دو میں گزر گئے۔ مکان فروخت ہوگیا۔ میں نے اپنے حصے کے پیسوں سے گلستان جوہر میں تین کمروں کا فلیٹ خرید لیا جو مکمل طور پر میری ملکیت تھا۔ اسے اپنے ذوق کے مطابق سجایا۔ ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی جسے چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بیوہ عورت تھی اور اس کا ایک بھائی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ صرف چھٹی والے دن اس سے ملنے جاتی اور شام کو واپس آجاتی۔ فراز کا بوسٹن

یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تھا۔ جانے سے پہلے شاید اس نے میرا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ بہت جلد مجھے اپنے پاس بلا لے گا۔ اس کی بات سن کر میں مسکرا دی۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

فراز کے جانے کے بعد زندگی اور بھی بے کیف ہو گئی۔ میرے پاس گھر آنے کے بعد کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ ٹی وی دیکھنے بیٹھتی لیکن پندرہ بیس منٹ بعد ہی اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی۔ میں نے ایک بار پھر پارٹ ٹائم جاب کے بارے میں سوچا لیکن بڑی بی (ملازمہ) نے اس کی شدید مخالفت کی اور بولیں کہ اگر تم مصروف رہنا چاہتی ہو تو لوگوں کی خدمت کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں لیکن کچھ ہی دنوں بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔

میرے پڑوس میں ایک متوسط خاندان رہا کرتا تھا۔ میاں کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے اور بظاہر ان کے حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے۔ بیگم کبھی کبھی میرے پاس آ کر اپنا دکھڑا رو لیتی تھیں۔ ایک دن آئیں تو بہت پریشان تھیں۔ پتا چلا کہ ان کا بڑا بیٹا نویں جماعت کے دو پرچوں میں فیل ہو گیا تھا۔ جس پر میاں بہت ناراض ہوئے۔ بیٹے کی بھی پٹائی کی اور بیوی سے کہہ دیا کہ اگر دسویں جماعت میں بھی اس کے ایسے ہی نمبر آئے تو وہ اس کی پڑھائی ختم کروا کر کسی مکینک کی ورکشاپ میں بٹھا دیں گے۔ ان کی اتنی گنجائش نہ تھی کہ بچے کو کسی کوچنگ سینٹر میں بھیج سکتیں۔

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”آپ اسے شام کو بھیج دیا کریں۔ میں پڑھا دوں گی۔“

وہ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے بولیں۔ ”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ بس اتنا ہو جائے کہ اس کا سال ضائع نہ ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ اس کے میٹرک میں بہت اچھے نمبر آئیں گے۔“

وہ دوسرے دن ہی اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ آ گئیں۔ بڑا دسویں اور چھوٹا آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ میں نے دو چار سوال کر کے ہی اندازہ لگا لیا کہ دونوں بچے ذہین تھے بس انہیں مناسب رہنمائی کی ضرورت تھی۔ یوں میں ان دونوں بچوں کو دو گھنٹے روزانہ پڑھانے لگی۔ پہلی تاریخ کو میری پڑوسن ایک لفافہ لے کر آئیں اور میری طرف بڑھاتے

ہمارے یہاں عام دستور ہے کہ اگر کسی کو چھینک آئے تو الحمدللہ کہتے ہیں۔ یعنی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ میڈیکل سائنس نے چھینکوں کی افادیت کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ یہاں ایک بات کا اضافہ کر دوں کہ اگر چھینک کو زبردستی روکنے کی کوشش کی جائے تو اس سے جبڑا بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اندازہ لگائیں کہ چھینک میں کتنی فورس ہوتی ہے۔ اگر بارش ہو رہی ہو یا نہ بھی ہو رہی ہو اور آپ کسی ایسی جگہ ہیں جہاں ناریل کے درخت لگے ہیں تو اس درخت کے نیچے نہ کھڑے ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ درخت سے ٹوٹ کر گرنے والا ناریل گولی سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ آنکھوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جادو بھری آنکھیں، شرابی آنکھیں، چھوٹی آنکھیں، بڑی آنکھیں اور نہ جانے کیا کیا۔ اب آنکھوں کے حوالے سے ایک بات اور سن لیں کہ پیدائش سے موت تک آنکھوں کا سائز ایک ہی رہتا ہے لیکن ناک اور کانوں کا سائز بڑھتا رہتا ہے۔

مرسلہ: عباس علی۔ لاہور

☆☆☆

کوک تو آپ یقیناً پیتے ہوں گے، دورِ حاضر کا مقبول ترین مشروب۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا اصل رنگ کیا ہے۔ اس کا اصل رنگ ہے سبز۔ اگر اس میں دوسرے کیمیکلز اور رنگ استعمال نہ کیے جائیں تو آپ کو سبز کوک پینے کو ملے۔ ایک زمانہ تھا کہ ناپ تول کے لیے سیر، آدھا سیر، پاؤ، چھٹانک وغیرہ استعمال ہوتا تھا۔ پھر ناپ تول کا اعشاری نظام رائج ہوا۔ پھر میٹرک سسٹم آ گیا۔ اور اب پوری دنیا میں یہی میٹرک سسٹم رائج ہے۔ لیکن آج بھی دنیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں یہ سسٹم رائج ہی نہیں ہوا۔ ان میں ایک امریکا بھی ہے۔ امریکا کے علاوہ برما اور لائبیریا وغیرہ میں بھی میٹرک سسٹم رائج نہیں ہے۔

مرسلہ: فہیم الدین۔ سکھر

ہوئے بولیں۔

''ہم تمہاری محنت کا معاوضہ تو نہیں دے سکتے یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو۔''

میں نے یہ لفافہ لینے سے انکار کردیا اور بولی۔ ''میں کوئی پروفیشنل ٹیچر نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے پیسوں کی ضرورت ہے صرف پڑوس کا حق سمجھ کر ان بچوں کو پڑھا رہی ہوں۔''

وہ دعائیں دیتے ہوئے چلی گئیں۔ چند روز بعد دو بچے اور آگئے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور چھ مہینے کے اندر میرے پاس دس بچے آنے لگے۔ ان میں کچھ کے والدین صاحب استطاعت بھی تھے۔ انہوں نے مجھے فیس دینا چاہی لیکن میں نے انکار کردیا اور کہا کہ وہ یہ رقم کسی غریب کو دے دیں۔ اس طرح میں بچوں کو بلا معاوضہ ٹیوشن پڑھانے لگی۔ میں نے روزانہ چار گھنٹے ان کے لیے وقف کردیے تھے۔ رات دس بجے انہیں چھٹی دے کر کھانا کھاتی اور تھوڑی دیر ٹی وی دیکھ کر سونے چلی جاتی۔ اس کام میں مجھے روحانی خوشی مل رہی تھی۔ اب میں تنہا نہیں تھی بلکہ میرے اردگرد معصوم چہرے تھے جن کی روشنی سے میرا گھر منور ہو رہا تھا۔

میری محنت رائیگاں نہیں گئی اور وہ سب بچے سالانہ امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوگئے۔ پڑوسن کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ دن رات مجھے دعائیں دیتیں اور میری ہر خدمت کے لیے تیار رہتیں۔ ان کا بڑا بیٹا اب کالج میں پہنچ گیا تھا لیکن اس نے میرے پاس آنا نہیں چھوڑا۔ پوری بلڈنگ میں میری شہرت ہوگئی تھی کہ بینک آفیسر ہونے کے باوجود بچوں کو بلا معاوضہ ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ سب لوگ میری بہت عزت کرتے تھے۔ اب مجھے پتا چلا کہ نیکی کا صلہ اس دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔

میری ترقی ہوگئی۔ اب میں سینئر وائس پریزیڈنٹ تھی اور میرا ٹرانسفر ہیڈ آفس میں ہوگیا تھا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود زندگی میں خالی پن کا احساس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی شاہد بہت شدت سے یاد آنے لگتا اور میں سوچنے لگتی کہ کاش اس کی بات مان لی ہوتی تو میری زندگی یوں ادھوری نہ ہوتی۔ فراز نے تو پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ شروع شروع میں تو وہ باقاعدگی سے فون کیا کرتا تھا لیکن پھر ان میں وقفہ آنے لگا۔ اب مہینے دو مہینے میں اس سے بات ہوجاتی تھی۔

انہی دنوں مجھے بینک کی طرف سے ایک کورس کے سلسلے میں انگلینڈ جانا پڑ گیا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن نوکری کا معاملہ تھا اس لیے جانا پڑ گیا۔ مجھے وہاں تین مہینے رہنا تھا۔ اس لیے بڑی بی کو اس پوری مدت کی ایڈوانس تنخواہ اور فلیٹ کی چابی دے دی تاکہ وہ ہفتے میں ایک دفعہ آکر صفائی کردیا کریں۔ میرے گھر میں روزمرہ استعمال کی اشیاء کے علاوہ کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں تھی جس کے چوری ہوجانے کا ڈر ہو۔ اس لیے بے فکر ہوکر انگلینڈ چلی گئی۔

تین مہینے پلک جھپکتے گزر گئے۔ کورس ختم ہوا تو میں نے بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپسی کی تیاری شروع کردی۔ روانگی سے ایک روز پہلے میں شاپنگ کے لیے گئی۔ فرزانہ، ارشد اور اس کے بچے کے لیے کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ اس کے علاوہ بڑی بی اور اپنے شاگردوں کے لیے بھی کچھ تحائف لینا چاہ رہی تھی۔ شاپنگ سے فارغ ہوئی تو سستانے کے لیے ایک پارک میں چلی گئی۔ وہاں کافی رونق تھی اور تقریباً ساری بینچیں بھری ہوئی تھیں۔ میں مایوس ہوکر واپس ہونے والی تھی کہ مجھے داخلی دروازے کے بائیں جانب ایک بینچ نظر آئی جس پر صرف ایک آدمی کونے میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر انگریزی میں کہا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے وہ چہرہ شناسا لگا۔ وہ شاہد ہی تھا جسے میں ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی۔ گوکہ وہ کافی بدل گیا تھا اور پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور لگ رہا تھا۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ یہ اس شاہد سے بالکل مختلف تھا جسے میں جانتی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''تم...... تم شاہد ہو نا؟''

''ہاں اور تم شائستہ۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

''یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''ایک کورس کے سلسلے میں آئی تھی۔'' میں اپنا سامان بینچ پر رکھتے ہوئے بولی۔

''اکیلی آئی ہو؟''

''ہاں۔''

''شوہر اور بچے نہیں آئے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"میری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔ بچے کہاں سے ہوتے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "تمہاری بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔ "شادی نہیں ہوئی تم سچ کہہ رہی ہو؟" "مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اور شادی نہ کرنے کی وجہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اوہ میرے خدا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اتنا بڑا جھوٹ اتنا بڑا دھوکا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔"

"کیا ہوگیا جو تم اتنے پریشان نظر آرہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور تمہیں کیسے بتاؤں۔ دراصل یہاں آنے کے چند روز بعد ہی مجھ پر گھر والوں کی طرف سے دباؤ پڑنا شروع ہوگیا کہ میں پاکستان واپس آکر ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرلوں۔ پہلے تو میں ٹال مٹول کرتا رہا لیکن جب ان کا اصرار حد سے بڑھا تو میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس پر ڈیڈی نے مجھے عاق کرنے کی دھمکی دی۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میں اپنی بات پر قائم رہا۔ پھر انہوں نے ایک اور چال چلی۔ نرگس کے ذریعے تمہیں کہلوایا کہ تم مجھے سمجھاؤ۔ جب یہ کوشش بھی ناکام ہوئی تو ایک دن امی نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ تمہارے گھر میرا رشتہ لے کر گئی تھیں لیکن تمہارے گھر والوں نے انکار کردیا اور کہا کہ انہوں نے تمہاری شادی کسی اور جگہ طے کردی ہے۔ یہ سن کر مجھے غصہ آگیا اور میں نے ناراض ہوکر تمہیں فون کرنا چھوڑ دیا۔ میں یہی سمجھا کہ تم نے امیری غریبی کے فرق کو دیکھتے ہوئے انکار کیا ہے کیونکہ تم مجھ سے اس کا اظہار کرچکی تھیں۔ اس کے بعد میں نے گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ پاکستان آؤں گا اور نہ شادی کروں گا۔ میں صرف ڈیڈی کے انتقال پر ایک ہفتے کے لیے پاکستان گیا تھا۔ اس کے بعد سے یہیں مقیم ہوں۔"

"تم نے شادی نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ اگر تم سے شادی نہ ہوئی تو ساری زندگی ایسے ہی گزار دوں گا۔"

"اگر تم مجھ سے تصدیق کرکے پوچھ لیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔"

"ہاں یہ میری غلطی تھی لیکن میں اس قدر غصے میں تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی تھی۔"

"اسی لیے غصہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب تو تمہیں یقین آگیا کہ میری شادی نہیں ہوئی۔"

"ہاں اور اب تمہیں میرا پروپوزل قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہوچکی ہو۔"

"ہاں جن کی خاطر زندگی کی خوشیوں سے منہ موڑا وہ اپنی اپنی منزلوں کی جانب روانہ ہوچکے ہیں۔ اب مجھے شدت سے وقت ضائع ہونے کا احساس ہورہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر تم تیار ہو تو ہم آج ہی نکاح کرلیتے ہیں باقی رسومات پاکستان جاکر ادا کرلیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ اب میں تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسی روز شام کو اسلامک سینٹر جاکر نکاح کرلیا اور دوسرے دن وہ میرے ساتھ ہی پاکستان واپس آگیا۔ میں نے راستے میں ہی اس سے عہد لے لیا تھا کہ وہ پاکستان جاکر اپنی ماں اور بہن سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کرے گا انہوں نے جو کچھ کیا اس کا جواب انہیں روز آخرت دینا ہوگا۔ کراچی پہنچ کر میں ایئرپورٹ سے سیدھی اپنے فلیٹ گئی اور شاہد سے کہا کہ وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر آئے اور مجھے رخصت کرواکر اپنے ساتھ لے جائے۔

آج میں شاہد کے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں۔ اس کے گھر والوں نے مجھے دل سے قبول کرلیا ہے۔ شاہد نے اپنی فیکٹری سنبھال لی ہے اور میں بھی اپنی ملازمت پر جارہی ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر شاہد سے سامنا ہوگا اور مجھے کھوئی ہوئی خوشی واپس مل جائے گی۔ بالکل فلمی انداز میں میری کہانی نے نیا موڑ لیا تھا۔ شاید یہ ان دعاؤں کا نتیجہ ہے جو پڑوسن نے اپنے بچے کی مدد کرنے پر مجھے دی تھیں۔ واقعی نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

اندازِ محبت

محترم مدیراعلی
سلامِ شوق
وجی اور سعدیہ یہ دو کردار میرے لیے اجنبی تھے لیکن میں نے سعدیہ کی زبانی جب اس کی کہانی سنی تو دل نے کہا یہ ایک اچھی کہانی ہے صرف اندازِ بیان کا فصیح ہونا ضروری ہے۔ بس میں نے قلم اٹھایا اپنے اندر کے افسانہ نگار کو بیدار کیا اور قلم رواں ہو گیا۔ افسانوی انداز میں یہ روداد یقیناً قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ناظم بخاری
(لودھراں)

گو میرے لیے وجی کا تعارف کرانا اور اس کی داستان سنانا ذرا مشکل تو ہوگا، مگر مجھے یقین ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ وجی میرا خالہ زاد بھائی ہے اور مجھ سے دو سال بڑا ہے۔ اٹھارہ انیس سالہ وجی، شکل وصورت سے بس ایویں سا ہی ہے۔ رنگت اس کی ذرا سی سانولی ہے اور قد ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتا ہوا ہے۔ گو وہ ماں اور بابا کی آنکھوں کا تارا تھا اور اس میں بظاہر ایسا کوئی عیب نہیں پایا جاتا تھا جس پر تنقید کی جا سکتی۔ مگر اس کے باوجود وہ مجھے

ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور میری اس سے کبھی نہیں بنتی تھی۔ ہم دونوں کا مزاج بالکل مختلف تھا اور سوچیں الگ الگ۔ میں نے ہمیشہ اسے بیوقوف کے لقب سے دل ہی دل میں مخاطب کیا تھا۔ وہ یوں کہ اس کا ہر کام ہی احمقانہ ہوتا تھا۔ اسے کرنے کو کہا کچھ جاتا، کرتا کچھ تھا۔ پتا نہیں وہ سمجھنے کی غلطی کرتا تھا یا پھر......

اکثر اسی کی وجہ سے کئی بنے بنائے کام بگڑتے رہے۔ ایک دن وجی نے گائے کا دودھ نکالنے کے لیے بچھڑا چھوڑا اور پتا نہیں کس سوچ میں غرق ہوا کہ بچھڑا ضرورت سے زیادہ ہی دودھ پینے میں مصروف ہو گیا۔ بابا جو تھوڑی دور ایک بھینس کا دودھ دوہ کر اندر گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے انہوں نے وہیں سے آواز لگائی تھی "ارے بھائی اب اسے باندھ دو، سارا دودھ پلانا ہے کیا؟" اور موصوف نے بابا کی بات پر دھیان دیے بغیر، بچھڑے کو باندھنے کی بجائے اپنے قدم تھوڑا دور ٹوبے پر پانی پیتی ہوئی بھینس کی طرف بڑھا دیے تھے۔ بابا بھی اتنی دیر میں گھر میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وجی بھینس کو باندھ کر واپس لوٹا تو بچھڑا گائے کا سارا دودھ ہضم کر چکا تھا اور خوشی سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا ادھر سے ادھر دوڑ لگاتا پھر رہا تھا۔ ماں اور بابا کو اس کارنامے کی خبر ملی تو انہوں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا اور میں نے جھنجلاتے ہوئے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

وجی، اپنی پیدائش کے چھ ماہ بعد سے ہی ہمارے گھر میں تھا۔ ماں اور بابا، جب شادی کے چھ سال تک بھی اولاد کی نعمت سے محروم رہے تو انہوں نے بڑی خالہ سے جب وجی کی صورت میں ان کے ہاں ساتواں بچہ پیدا ہوا تو اسے مانگ لیا۔ بابا کے دو بھائی اور بھی تھے جو دادا ابو اور دادی ماں کے ساتھ شہر میں رہتے تھے۔ مگر نجانے بابا کی طبیعت کس مزاج کی تھی کہ انہیں شہر میں رہنے کا مزہ نہ آ سکا اور وہ ماں کو لے کر گاؤں، نیم پختہ کمروں میں آگئے اور تب سے اب تک یہیں تھے۔ بقول ان کے وجی کی ان کی زندگی میں آمد بہت مبارک ثابت ہوئی۔ اسی سال کھیتوں کے رقبے سے اتنا سارا اناج اترا کہ اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا اور کپاس کی فصل بھی بہت اچھی ہوئی تھی۔ اسی رقم سے بابا نے گھر کے ٹوٹے پھوٹے حصوں کی مرمت کرائی تھی اور رنگ روغن کیا تھا۔ کہاں تو گھر میں چھ برس تک ایک بھی بچہ پیدا نہ ہوا تھا اور اب وجی کے آنے کے سال ڈیڑھ سال بعد ہی میں ان کی گود میں ... اتر آئی تھی۔ میرے

بعد پھر میرا اور کوئی بھائی یا بہن پیدا نہ ہو سکا۔ میری آمد کی خوش نصیبی کو بھی انہوں نے وجی کے سر تھوپ دیا تھا۔ میری پیدائش پر ماں اور بابا بے حد خوش ہوئے تھے۔ شہر سے دادا ابو سب گھر والوں کے ساتھ آئے۔ خوشیاں اور جشن منائے گئے۔ دیگیں پکائی گئیں اور بہت سا کھانا غریبوں اور فقیروں میں بانٹا گیا۔ میری پیدائش کے بعد خالہ کے اصرار کے باوجود بھی ماں اور بابا نے وجی کو ان کے حوالے نہیں کیا تھا۔ اس دوران وہ ان کی آنکھوں کا تارا اور دل کا قرار بن چکا تھا۔ میری وجی سے نہ بننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماں مجھ سے زیادہ اسے پیار کرتی تھی اور یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ البتہ بابا وجی سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔ اس وقت مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وجی میرا سگا بھائی ہے یا خالہ زاد۔ کچھ بڑا ہوتے ہی میں اور وجی اسکول میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ مجھ سے بڑا تھا، سو میں اس کی ایک کلائی یا ایک ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ چلتی تھی مگر مجبوراً۔ وہی مجھے اونچے نیچے راستوں اور پانی کے کھالوں سے با آسانی گزار کر اسکول لے جاتا تھا۔ میں ان کا ہاتھ تھام کر بھی اس کے ساتھ نہ چلتی، اس کی کبھی مدد نہ لیتی، اگر ماں نے سختی سے مجھے اس بارے میں نہ کہہ رکھا ہوتا۔

وہ یوں کہ شروع میں ایک بار میں ایک نالا پار کرتے ہوئے اس میں گر پڑی تھی جس میں کئی دن کا خراب پانی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں میرا بستہ، ہاتھ پاؤں اور لباس کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے اور ماں نے اس دن سختی سے کہہ دیا تھا کہ میں آج سے جب بھی اسکول جاؤں یا آؤں، ہمیشہ وجی کا ایک ہاتھ تھام کر رکھا کروں اور تب سے میں نے وہ کڑوا گھونٹ بھرنا شروع کیا تھا۔ وجی نے شروع دن سے ہی نہ تو کبھی مجھے ڈانٹا تھا اور نہ ہی کبھی مجھ سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ مگر نجانے کیوں میرا دل پھر بھی اس سے کبھی نہ مل سکا تھا۔ اسکول میں ایک دو کلاسیں ہم نے ایک ساتھ ہی پڑھیں تھیں۔ پھر ہماری کلاسیں علیحدہ علیحدہ ہو گئی تھیں۔ جب تک ہم ساتھ رہے، وہ میری تعلیمی مدد بھی کر دیا کرتا تھا۔ بچپن چھپکے سے لڑکپن میں داخل ہو گیا۔ میں نے پانچ کلاسیں پڑھ کر اسکول چھوڑ دیا۔ اس وقت میری عمر دس برس کے قریب تھی۔ بابا ان دنوں ناشتا کر کے زمینوں کو نکل جاتے اور وجی پڑھنے۔ پیچھے ماں اور میں اکیلی رہ جاتیں۔ ان کے جانے کے بعد ماں گھر کا کام کاج نمٹاتی اور دودھ دینے والے جانوروں کی دیکھ بھال میں لگ جاتی۔ اور میں اپنے ننھے سے وجود اور ہاتھوں

سے ان کی ہر ممکن مدد کرتی۔ اس دوران دوپہر ہو جاتی اور بابا زمینوں سے لوٹ آتے اور مجھے بانہوں میں بھر کر پیار کرنے لگتے۔ وہ اگر مجھ سے پیار کرتے تھے تو میں بھی ان پر جان دیتی تھی۔ ان کے چھوٹے موٹے کئی کام میں خود کرتی۔ کبھی وہ زیادہ تھکے ہوئے ہوتے تو ان کا سر اور بازو دباتی اور کبھی کبھار کھانا انہیں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔

اتنے میں اسکول سے تھکا ہارا وجی بھی لوٹ آتا اور ماں کہتی "ساوی بیٹا، چلو بھائی کو کھانا دو۔ بہت دور سے آیا ہے میرا بچہ۔ بہت بھوک لگی ہوگی۔"

ان کا آرڈر ملتا اور میرا منہ بن جاتا۔ نجانے کیوں اس کا کوئی کام کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وجی کھانا کھانے کے بعد شام تک آرام کرتا اور پھر شام کو میرے ہمراہ جانوروں کے لیے گھاس کاٹنے چلی دیتا۔ وہ درانتی سے گھاس کاٹتا جاتا اور میں جمع کرتی جاتی۔ پھر وہ گھاس، چارا کاٹنے والی مشین کے پاس جا کر رکھتا اور پھر ہم مل کر مشین پر چارا کاٹتے۔ پھر وہ چارا، ہم جانوروں کے آگے ڈالتے۔

اس سے کچھ دیر پہلے ہم تمام جانوروں کو کھول کر ٹوبے سے پانی پلاتے اور کھلی جگہ پر باندھتے۔ اس کے بعد ان کا گوبر اٹھانے کا کام ہوتا۔۔۔ جو اکثر وجی ہی انجام دیتا۔

میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وجی نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور بابا کے ساتھ زمینوں پر ان کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اس دوران اس کی صحت پہلے سے زیادہ اچھی ہوگئی تھی اور بقول ماں اور بابا کے، میں پہلے سے زیادہ 'سوہنی' ہوگئی تھی۔ وجی کے اسکول چھوڑنے سے بس تھوڑی سی تبدیلی آئی اس کے علاوہ ہمارے معمولات میں زیادہ فرق نہیں پڑا۔

پھر ایک دن بابا کو نجانے کیسے ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق چرایا۔ ان دنوں زمینوں پر زیادہ کام نہیں تھا۔ فصل بوئی جا چکی تھی۔ بس ہفتہ پندرہ دنوں بعد پانی دینے کا کام ہوتا تھا۔ گھر کے سارے کام نمٹ جاتے تو ہم سب فارغ ہو جاتے۔ پھر ہمارا زیادہ تر وقت، کیکر کی چھاؤں کے نیچے پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہوئے گزرتا۔ انہی دنوں بابا کا ایک دوست بابا سے ملنے آیا تو اپنے ساتھ اپنا پسندیدہ رسالہ بھی لیتا آیا۔ وہ تو بابا سے مل کر دوسرے دن ہی چلا گیا۔ مگر اپنے ساتھ لایا ہوا رسالہ بھول گیا۔ بابا کے ہاتھ وہ رسالہ لگا، انہوں نے پڑھا اور پھر کیا تھا۔ اگلے دن بابا شہر گئے اور وہاں سے اس جیسے بہت سے رسالے لے آئے اور انہیں پڑھنے میں محو ہوگئے۔ بابا کا وقت پڑھنے میں، ماں کا سلائی کڑھائی کرنے میں اور میرا اور وجی کا بوریت میں گزرنے لگا۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میری وجی سے نہیں بنتی تھی۔ ورنہ میں اس سے گپ شپ یا کھیل کود میں وقت بتا دیتی۔ سو جب میں فارغ ہوتی، ماں سے سلائی کڑھائی کا کام سیکھنے کی کوشش کرنے لگتی اور بے چارہ وجی، جب اسے کوئی مشغلہ نہ ملا تو اس نے بھی بابا کی طرح رسالوں سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ پھر تو گویا رسالوں نے بابا اور وجی پر جادو سا کر دیا۔ ماں اکثر ان کی اس 'پڑھائی' سے تنگ آجاتی۔ اس پڑھائی کے چکر میں اکثر گرم کھانا وجی اور بابا کا انتظار کرتا رہ جاتا۔ کچھ دن تک تو میں انہیں رسالے پڑھتا دیکھتی رہی۔ پھر ایک دن خیال آیا کہ آخر ان میں ایسا کیا بھرا ہے کہ بابا اور وجی اتنی اتنی دیر تک پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ایک دن چپکے سے ایک رسالہ لیا اور ماں کی نظروں سے بچ کر باہر زمینوں پر ایک گھنے درخت کے نیچے آکر پڑھنے لگی۔ میں نے ایک کہانی کا آغاز کیا اور پھر بے اختیار پڑھتی چلی گئی۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ مجھے اردگرد کا بھی ہوش نہ رہا۔ اس دن سے میرا شمار بھی بابا اور وجی کے ساتھ ہونے لگا۔ میں شروع شروع میں ماں اور بابا کی نظروں سے بچ کر رسالے پڑھتی رہی۔ کچھ دن بعد بابا کو اس بات کا پتا چل گیا اور انہوں نے مجھے منع بھی نہیں کیا۔ چند دن اور گزرے تو ماں بھی اس راز سے آگاہ ہوگئی۔ اور تو کچھ نہیں کہا اس نے البتہ اتنا ضرور بولی کہ پہلے گھر میں دو پاگلوں کی کمی تھی جو یہ تیسری بھی پیدا ہوگئی؟

پرانے رسالے سب ختم ہوگئے تو بابا کے سر سے بھی کچھ جنون اترا۔ ان دنوں فصل کی کٹائی کا بھی موقع آگیا اور بابا رسالے بھول بھال کر فصلوں کی کٹائی میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران بابا کا، کچھ ضروری کاموں سے شہر آنا جانا بھی ہوتا رہا۔ مجھے رسالے پڑھنے کا کچھ ایسا چسکا لگا کہ جب ایک رسالہ بھی پڑھنے کو باقی نہ رہا تو میری طبیعت اداس اور بور بور رہنے لگی۔ کئی بار جی میں آیا کہہ دوں کہ وہ مجھے شہر سے کچھ نئے اور پرانے رسالے لا دیں۔ پر نجانے کیوں میں ہر بار سوچ کر ہی رہ گئی۔ ان دنوں وجی پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ اس دن میں اپنے کمرے میں لیٹی کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ وجی چپکے سے کمرے میں داخل ہوا اور مسکین سی آواز میں بولا

"سعدیہ، ایک بات کہوں مانو گی؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے مسکین سے چہرے پر اداسی برس رہی تھی۔ وجی کو اچھی طرح پتا تھا کہ مجھے اس کا مخاطب کرنا اچھا نہیں لگتا، اس لیے اس کی بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے کسی ناگزیر وجہ کے بغیر مخاطب نہ کرے۔ مجھے لگا شاید وہ کوئی اہم بات کرنے والا ہے۔ میں نے لہجے میں بیزاریت سموتے ہوئے کہا ''ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''تم خالو سے کہہ کر شہر سے کچھ پرانے اور نئے رسالے تو منگواؤ۔ گھر میں ایک رسالہ بھی پڑھنے کے لیے نہیں رہا... وہ تمھاری بات نہیں ٹالیں گے۔''

شعور کی عمر میں قدم رکھتے ہی ماں اور بابا نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ ان کی اپنی اولاد نہیں ہے، مگر انہیں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔ وجی کی بات سن کر مجھے اس کی بزدلی پر بہت غصہ آیا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب سے میں بڑی ہوئی ہوں، بابا سے بات کرتے ہوئے جھجکتی ہوں۔ پھر بھی اس نے یہ بات کہہ دی۔

''کیوں، میں تمھاری نوکرانی ہوں جو بابا سے یہ بات کہوں؟ اگر رسالوں کا اتنا ہی شوق ہے تو خود کیوں نہیں کہتے بابا سے؟''

''وہ...... میں...... در اصل......''

''کیا...... وہ، میں، در اصل......؟'' جانے کیوں میرا لہجہ تپنے لگا۔ میرا تپا ہوا لہجہ دیکھ کر اس نے سر جھکایا اور جلدی سے کمرے سے نکل گیا اور میرے دل میں مسرت کی ایک لہر اتر گئی۔ 'بے وقوف' میں نے ایک بار پھر اسے اس خطاب سے نوازا جو میں نے اپنی طرف سے اسے دیا ہوا تھا۔ وجی کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ وجی کی بات کسی حد تک ٹھیک ہے۔ گھر میں ایک بھی رسالہ پڑھنے کو نہیں بچا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ آج ہمت کر کے میں بابا سے رسالے لانے کی بات ضرور کروں گی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں بابا سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتی، بابا اگلے دن شہر سے لوٹے تو اپنے ساتھ خود ہی بہت سے رسالے لیتے آئے۔ رسالے آئے تو وجی بھی خوش ہو گیا۔ وہ سمجھا، میں نے ہی اس کے کہنے پر بابا سے رسالے منگوائے ہیں۔ سو شام کو اس نے میرے کمرے میں آ کر شکریہ ادا کیا تو میں نے خشک لہجے میں کہا کہ میں نے بابا سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ بابا خود ہی رسالے لے آیا ہے اور اسے اتنی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مجھے جو کہے گا میں اس پر عمل کروں گی۔

اس بار بھی اس نے ہمیشہ کی طرح سر جھکایا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا اور میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ مچل گئی۔ نجانے کیوں، وجی سے ہمیشہ اسی طرح پیش آ کر مجھے ایک عجیب سی تسکین کا احساس ہوتا تھا۔ اس بار فصل بڑی اچھی ہوئی تھی۔ ان دنوں ماں اور بابا کو جانے کیا سوجھی کہ انہیں اچانک ہی میری شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کے قریب تھی۔ ماں نے جب رات کو میرے پاس آ کر کہا کہ وہ میرے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی ہیں اور بابا کی بھی یہی خواہش ہے تو میں اچانک شرما کر رہ گئی۔ کسی انجانے، ان دیکھے مرد کا تصور پلکوں پر اتر آیا اور...... مگر جب ماں نے وجی کا نام لیا اور کہا کہ ان کی اور بابا کی خواہش ہے کہ میں اور وہ ایک ہو جائیں تو پلکوں پر ٹھہرا ہوا وہ نرم و نازک اور شگفتہ سا تصور اچانک ہی ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ وجی کا نام سنتے ہی میرے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر دوں۔ انہیں بتا دوں کہ میں...... مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ فطری شرم و حیا نے مجھے جکڑ لیا اور میرا سر، چپ چاپ جھک گیا۔ میرے جھکے ہوئے سر کو میری رضامندی سمجھ کر ماں باہر نکل گئی اور میرے لیے سوچوں کے بہت سے در وا کر گئی۔ مجھے مر جانا تو قبول تھا مگر وجی کے ساتھ شادی کرنا کسی طور قبول نہیں تھا۔ میں نے فوراً ہی سوچ لیا کہ اگر میں نے جلد ہی اس سلسلے میں کچھ نہ کیا تو یہ پہاڑ میرے سر تھوپ دیا جائے گا۔ گو ماں کے سامنے مجھے انکار کی جرأت نہیں ہوئی تھی، مگر بابا...... ان سے بھی یہ کہنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ بچا تھا اور وہ تھا خود وجی سے بات کرنے کا راستہ۔ اس شام وجی کسی کام سے میرے کمرے میں آیا تو بغیر کسی تمہید کے میں فوراً ہی شروع ہو گئی۔ خلاف معمول اس بار میرا لہجہ بے حد نرم تھا۔ ''وجی، ادھر آؤ۔''

میرے لہجے کی نرمی نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ حیرت زدہ سا میرے قریب آ تھا۔

''جانتے ہو گھر میں میرے اور تمہارے رشتے کی بات ہو رہی ہے؟''

''جانتا ہوں۔''

''تمھاری کیا رضا ہے اس بارے میں۔''

''جو خالہ اور خالو کی۔ ان کی رضا میں ہی میری رضا ہے۔''

''مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔''

"کیوں؟"

اب میں اس کے اس کیوں کا کیا جواب دیتی کہ مجھے اس کی اُلو جیسی آنکھیں اور بیوقوفوں جیسی صورت پسند نہیں ہے مگر اس کا دل رکھنے کے خیال سے بس اتنا کہا "تمہارے اس کیوں کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ بس میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔" اور پھر کہا "بس تم ماں اور بابا تک میرا یہ انکار پہنچا دو۔ میں ان کے روبرو نہیں ہونا چاہتی۔"

اس نے سر جھکایا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ نجانے اس نے ماں یا بابا سے اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی یا نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اس سلسلے میں میرے پاس نہیں آیا۔ بلکہ اسی دن سے مجھے یوں لگا جیسے ہماری شادی کی چپکے چپکے تیاریاں شروع ہو گئیں ہوں۔ شادی کی تیاریاں دیکھ کر میرا دل کڑھنے لگا۔ مجھے رہ رہ کر جی پر غصہ آتا کہ اس نے ماں یا بابا تک میرا انکار کیوں نہیں پہنچایا؟ اگر پہنچا دیا ہے تو اس کا ردعمل سامنے کیوں نہیں آیا؟ دو دن مزید گزر گئے۔ تیسرے دن میں کمرے میں اداس بیٹھی تھی کہ وجی آدھمکا۔

میرا دل چاہا کہ اس سے اپنی کہی ہوئی بات کے بارے میں پوچھوں مگر اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی بات پوچھتی، اس نے معمول کے مطابق نظریں جھکائیں اور کہا "سعدیہ، ایک بات پوچھوں بتاؤ گی؟"

نجانے کیوں مجھے لگا وہ کوئی اہم بات پوچھنے والا ہے۔ میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ "ہاں پوچھو۔"

"برا تو مانو گی؟"

"نہیں"

"وعدہ کرو"

جی تو چاہا کہ اس کے یوں وعدہ لینے پر اسے کھری کھری سناؤں مگر میں خود پر قابو پا گئی "کہا تو ہے کہ برا نہیں مانوں گی" میں جھنجلا گئی۔

"جب تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو پھر شادی سے کیوں انکار کر رہی ہو؟" اس نے میرے سر پر جیسے بم پھوڑا اس کی بات سے مجھے زبردست شاک لگا۔ اس دن یہ ثابت ہو گیا کہ اس دنیا میں اس سے بڑا کوئی چغد نہیں ہے۔ "محبت؟" یہ لفظ سرسراتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں محبت" اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر جھکا لیں۔

میں اچانک غصے سے پھٹ پڑی۔ "تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں تمہاری اُلو جیسی شکل سے یا تم سے پیار کرتی

سر جان شور

1751ء۔1834ء

ہندوستان کا گورنر جنرل۔ 1768ء میں ہندوستان آیا۔ 1775ء سے 1780ء تک کلکتے میں ریونیو کونسل اور 1787ء سے 1789ء تک بنگال کی سپریم کونسل کا رکن رہا۔ وارن ہیسٹنگز کے بعد اور لارڈ کارنوالس کے مقرر ہونے سے پہلے تقریباً ڈیڑھ سال عارضی طور پر گورنر جنرل کے فرائض انجام دیتا رہا۔ کارنوالس نے اسے بنگال کے بندوبست دوامی میں اپنا مشیر مقرر کیا۔ کارنوالس کے بعد 1793ء سے 1798ء تک گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہا۔ اس کے عہد میں پیشوا دولت راؤ سندھیا، تکوجی ہولکر اور راجا برار نے مل کر نظام آف دکن کو کردلا (احمد نگر سے 56 میل جنوب مشرق) کے مقام پر شکست دی۔ اگر سر جان شور چاہتا تو فروری 1768ء کے عہد نامے کے تحت نظام کو مدد دے سکتا تھا لیکن اس نے پٹس انڈیا ایکٹ پر عمل کرتے ہوئے مداخلت سے انکار کر دیا۔ اس کی اس پالیسی کی وجہ سے نظام نے انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں سے تعلقات بڑھا لیے۔ ٹیپو سلطان نے اپنی فوجی طاقت مستحکم کی اور مرہٹے زور پکڑ گئے۔ سر جان شور عام طور پر عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کرتا رہا صرف اودھ کے معاملے میں مداخلت کی۔ 1797ء میں آصف الدولہ نواب اودھ کی وفات پر جانشینی کا جھگڑا پیدا ہوا تو سر جان شور نے نواب کے بڑے بھائی سعادت علی کو اس کا جانشین مقرر کیا اور 21 جنوری 1798ء کو اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے نواب نے کمپنی کو ہر سال 76 لاکھ روپے دینا منظور کیا اور الہ آباد کا قلعہ کمپنی کے حوالے کر دیا۔

مرسلہ: فرید فرشوری۔ کراچی

جاں نثار اختر

(1914ء۔1976ء)

اردو شاعر۔ گوالیار میں پیدا ہوئے۔ 1939ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ 1940ء میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ رومانی انقلابی شاعر تھے۔ نظموں کے چھ مجموعے سلاسل، نذر بتاں، خاک دل، سکوت شب، گھر آنگن اور تار گریباں شائع ہو چکے ہیں۔ بمبئی (حالیہ ممبئی) میں وفات پائی۔ بالی ووڈ کے مشہور کہانی نویس اور شاعر جاوید اختر انہی کے فرزند ہیں۔

مرسلہ: ممتاز بٹ۔ شادی پور

ہوں؟ اور تمہیں جرأت بھی کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی؟ تم اپنے آپ کو آخر سمجھتے کیا ہو؟ تم کوئی شہزادہ گلفام ہو کہ جو تمہیں دیکھے گا تم پر مرمٹے گا؟ آئینے میں کبھی اپنی شکل دیکھی ہے۔ بے وقوف انسان! تم تو نفرت کے بھی قابل نہیں ہو اور تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں......"

اس کا وہ بُرا اعتماد انداز، جو اس نے شاید زندگی میں پہلی بار اپنایا تھا، یکلخت ٹوٹ کر بکھر گیا۔ مجھے اس بے وقوف انسان پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔

وہ بیوقوف تھا اور بیوقوفیاں کرتا رہتا تھا، مگر وہ اتنا بڑا بے وقوف ہے اور اتنی بڑی بیوقوفی کر گزرے گا۔ اس کا اندازہ آج مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک سلگ گئی تھی اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس کا...... وہ حال کروں کہ وہ یاد رکھے......وہ میرے پے در پے سوالات سے گھبرا گیا اور ہکلاتے ہوئے کہا "میری بات کا برا مت مانو...... اصل میں، میں نے اس رسالے میں ایک ایسی ہی کہانی پڑھی ہے اور یہ کہانی پڑھ کر تصور کر بیٹھا کہ...... اگر تمہیں میری بات بری لگی ہے تو میں تم سے معذرت کرتا ہوں...... مجھے معاف کر دو...... میں آئندہ ایسی کوئی بات، کبھی بھی زبان پر نہیں لاؤں گا......" یہ کہتے ہوئے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبے رسالے میں ایک کہانی کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سے اس نے رسالے کو آدھا موڑ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ میری نظریں لاشعوری طور پر اس طرف اٹھ گئیں۔ وہاں بڑے بڑے لفظوں میں 'نفرتوں میں محبت' لکھا ہوا تھا جو شاید کہانی کا نام تھا۔ اس کی وضاحت بھی میرے غصے کو کم نہ کر سکی۔ میں نے اسی کھردرے لہجے میں کہا "چلو اب نکل جاؤ کمرے سے۔ اور خبردار، آئندہ کبھی ایسی کوئی بات سوچی یا کہی تو......"

اس نے رسالہ ایک طرف رکھا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا اور میری الجھنوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے شاید باہر جاتے ہی ماں یا بابا تک میرا انکار پہنچا دیا تھا۔ کیونکہ ماں اسی وقت ہی میرے کمرے میں چلی آئی اور آتے ہی وجی کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کرنے لگی اور میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں وجی سے شادی نہیں کر سکتی۔ میری بات سن کر ماں کچھ دیر تو مجھے پیار و محبت سے سمجھاتی رہی۔ مگر میری ضد برقرار رہی تو وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ دو دن گزر گئے۔ ماں کا موڈ مجھ سے آف رہا۔ بابا اس دوران میری شادی کی تیاری کے سلسلے میں دادا ابو کے پاس شہر گئے ہوئے تھے۔ اس دن میں کمرے میں بور بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک میں نے وجی کا لایا ہوا وہی رسالہ اٹھایا اور لاشعوری طور پر 'نفرتوں میں محبت' والی کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ میں جوں جوں کہانی پڑھتی گئی، خود پر سے اختیار کھوتی گئی۔ کہانی پڑھتے ہوئے کتنا وقت بیتا، کب کہانی ختم ہوئی مجھے بالکل پتا نہ چل سکا۔ کہانی تھی ہی اتنی خوبصورت اور دلچسپ یہ کہانی ایک لڑکے اور لڑکی کی تھی۔ یوں تو ہر کہانی ہی ایک لڑکے اور لڑکی کی ہوتی ہے۔ لڑکی بظاہر لڑکے سے نفرت کرتی ہے مگر اندر ہی اندر اسے چاہتی ہے۔ پر لڑکے کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ لڑکی کو اس سے نفرت ہے۔ لڑکی بھی کبھی اس پر اپنی چاہت کا اظہار نہیں کرتی۔ پر جب لڑکے کے نکاح کا وقت قریب آتا ہے تب وہ لڑکی اسے بتاتی ہے کہ وہ اسے چاہتی ہے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے...... کہانی پڑھنے کے بعد مجھے بے ساختہ وجی کا خیال آیا۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے یہ کہانی پڑھ کر اپنی طرف سے سوچ لیا تھا کہ میں بھی شاید اسے چاہتی ہوں...... جونہی مجھے وجی کی کہی ہوئی بات یاد آئی اور ساری حقیقت مجھ پر کھلی، میں ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی...... اور پھر اچانک میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ یہ دھڑکن سب سے الگ تھلگ اور انجانی سی تھی اور یہ دھڑکن وجی سے محبت کی تھی۔ اس دن میرے دل میں پہلی بار وجی کے لیے ایک مختلف جذبہ پیدا ہوا تھا۔ یہ جذبہ وجی کی چاہت اور پسندیدگی کا تھا۔ اس کے اس بھولپن نے، جسے میں نے ہمیشہ بے وقوفی سے تعبیر کیا تھا، میرے دل کو موہ لیا تھا۔ اس دن مجھے پہلی بار وجی پر بے ساختہ پیار آیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسی وقت ہی اس بے وقوف کے پاس جاؤں اور اس کی ناک پکڑ کر، اسے ہلاتے ہوئے کہوں "ہاں لو، اب میں تم سے واقعی......" اچانک میرے تصور میں، وجاہت دلہا بن کر کمرے میں چلا آیا۔ میں نے خود کو دلہن کے روپ میں دیکھا، اس نے گھونگھٹ اٹھایا تو میں شرما کر خود میں سمٹ گئی۔ تصور ٹوٹا تو میں حقیقت کی دنیا میں تھی اور سچ مچ شرما رہی تھی۔ بابا ابھی شہر سے نہیں لوٹے تھے۔ میں باہر نکل کر ماں کے پاس پہنچی ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور ان کے ایک رخسار کو چومتے ہوئے کہہ دیا کہ میں اس شادی پر تیار ہوں۔ ماں نے مجھے حیرت بھری محبت سے دیکھا تھا اور پھر بے اختیار بانہوں میں بھر لیا تھا۔

میں ابھی پڑوس کے گھر سے واپس آئی ہوں۔ ان کے چار بچوں کی تیسری برسی تھی جہاں قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جب تک میں وہاں رہی میں نے بڑی مشکلوں سے اپنے آنسو روک رکھے تھے مگر اب وہ میرے اختیار میں نہیں رہے تھے۔ وہ بے ساختہ بہے جا رہے تھے اور پھر اس کے ساتھ ہی میری دبی دبی سسکیاں بھی ابھرنے لگیں۔

میں ہی نہیں قرآن خوانی میں موجود دیگر خواتین کی

محترمه عذرا رسول

السلام علیکم

یہ روداد میری نہیں میرے پڑوس کی ایک خاتون کی ہے لیکن روداد میں خود میں بھی شامل ہوں اس لیے کہانی کی صداقت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا پھر یہ تمام باتیں اخبارات میں بھی آچکی ہیں۔ اُمید ہے میری کمزور اردو کو درست کر کے سرگزشت کی زینت ضرور بنائیں گے۔

زیتون خان

(پشاور)

اندرونی کیفیت بھی دگرگوں تھی۔ اس ماں کی طرف ہماری نگاہیں اٹھتی تھیں تو ہمیں اپنے آپ کو سنبھالنا دوبھر ہو جاتا تھا جس کے چاروں بچے، اس کی بگیا کے چاروں ہنستے مسکراتے پھول ایک ساتھ اس سے چھین لیے گئے تھے۔ ہم بھی بچوں کی مائیں ہیں اس لیے ان کی محبت اور قدر و قیمت کا ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔ ہمارا کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو ہم کیسے بے چین ہو جاتے ہیں اور یہ عورت جس کے چاروں بچے وقت اور حالات نے بیک وقت اس سے جدا کر دیے، کس قدر بے چین اور بے قرار ہو سکتی ہے۔ اس کا ہمیں پتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی ساری خوشیاں اس کے وجود سے کسی نے نچوڑ لی ہوں۔ اس کا پورا وجود آہ و کراہ بن کر رہ گیا ہو۔

ہمارے علاقے متنی میں کبھی یہ عورت بے حد خوش و خرم زندگی گزارنے والی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا شوہر طارق شاہ اسلام آباد میں ایک وفاقی سرکاری ادارے میں ملازم تھا۔ خاصی معقول تنخواہ تھی۔ گھر میں آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ سب سے بڑھ کر خوشی اس بات کی تھی کہ وہ چار ہنستے مسکراتے، صحت مند اور تندرست بچوں کی ماں تھی۔ تین بیٹیاں حسینہ شاہ، شائلہ شاہ اور عائشہ شاہ اور اکلوتا بیٹا مشال شاہ جسے سب پیار سے کاشی کہہ کر پکارتے تھے۔ عائشہ شاہ سب سے چھوٹی اور حسینہ شاہ سب سے بڑی تھی۔

متنی پشاور کا نواحی علاقہ ہے۔ دیگر نواحی علاقوں کی طرح ہمارے علاقے متنی میں بھی لوگ مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ دیتے ہیں۔ حاجی طارق شاہ ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد میں رہتے تھے مگر بیوی بچوں سے ملنے آتے جاتے رہتے تھے۔ انہیں اس بات کا اطمینان رہتا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے بال بچوں کو اگر کبھی کسی قسم کی ضرورت پڑی تو ان کے عزیز و اقارب اور اڑوس پڑوس ان کے پاس پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

ہم پشاور اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے لوگ حادثات اور سانحات کے اس قدر دکھ سہتے رہتے ہیں کہ جیسے یہ ہماری زندگی کے معمولات کا حصہ ہیں۔ بازاروں میں گلی کوچوں میں، شاہراہوں میں موت کے سوداگر زندگیوں کا سودا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بم دھماکا، کبھی خودکش حملہ اور کبھی ٹارگٹ کلنگ۔ ظاہر ہے اس میں جان کی بازی ہارنے والے ہمارے ہی پیارے اور سنگی ساتھی ہوتے ہیں۔ جنہیں چند روز رو دھو کر ہم صبر کر لیتے ہیں مگر وہ حادثہ جو 21 اگست 2012ء میں پیش آیا وہ عام طور پر رونما ہونے والے حادثوں سے بہت مختلف، بہت جانکاہ اور خون کے آنسو رلانے والا تھا۔ وہ منگل کا دن تھا۔ اس دن متنی کے سب سے زیادہ خوش و خرم شاد و آباد جوڑے کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کو غم اور تنہائی کے صحرا میں دھکیل دیا۔ ایک ایسا دکھ دیا جسے لاکھ بار بھی بھلانے کی کوشش کی جائے پھر بھی بھولنا ممکن نہیں۔ جب چار پھول جیسے خوب صورت اور ہنستے مسکراتے بچوں کی ایک ساتھ جدائی کا ہو تو اس درد کا احساس ایسے ہی والدین کو ہو سکتا ہے جن پر ایسی قیامت گزری ہو۔

حاجی طارق شاہ چھٹیوں میں جب گھر آتے تھے تو ان کے بیوی بچوں کی خوشیوں کا جیسے میلہ لگ جاتا تھا۔ ہلہ گلہ، کھیل تماشے، سیر سپاٹے ہر طرح سے ان کا چاہنے والا باپ ان کی خوشیوں میں اضافہ کرتا۔ اس بار یوم آزادی کی چھٹیوں میں وہ گھر آئے تو پکنک پر جانے کا پروگرام بن گیا۔ بچوں نے جیسے پہلے سے پروگرام بنا رکھا تھا کہ بابا آئیں گے تو ان سے پکنک پر لے جانے کی فرمائش کریں گے اور جب ان کے بابا گھر آئے تو ایسا ہی ہوا۔ ان کی سب سے پیاری بیٹی عائشہ نے اپنی توتلی زبان میں فرمائش داغ دی۔

''بابا جانی! ہمیں پکنک پر جانے کو دل چاہتا ہے۔''

اس کے دوسرے بھائی بہنوں نے بھی پر زور تائید کی۔ ''ہاں بابا جانی! ہمیں بھی پکنک پر جانا ہے۔''

طارق شاہ اپنے بچوں کی کوئی بھی جائز خواہش کبھی مسترد نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ان کی خوشنودی کے لیے فوراً ہاں کر دی۔

''بابا جانی زندہ باد۔'' کاشی نے نعرہ لگایا۔ بہنوں نے اس کی تائید میں نعرہ دہرایا اور تالیاں بجاتے اور اچھلنے کودنے لگیں۔

''تو پھر کب چل رہے ہیں۔ 14 اگست کے دن؟''

''نہیں۔'' شاہ سے پہلے ان کی بیگم فاطمہ بول پڑیں۔ ''اس کے اگلے دن 15 اگست کو۔''

''کیوں 14 اگست کو کیوں نہیں؟'' بڑی بیٹی حسینہ پوچھ بیٹھی۔

''یوم آزادی کی وجہ سے ہر جگہ ہر طرف بہت بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ میلے ٹھیلے کا سماں ہوتا ہے، اس عالم میں

پکنک منانے کا صحیح لطف نہیں آئے گا۔“

بچوں نے سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”تمہاری امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ 14 اگست کو ہم لوگ جہاں بھی جائیں گے لوگوں کا ہجوم ہوگا۔ ایسے میں ہم بھرپور طور پر پکنک کو انجوائے نہیں کر سکیں گے۔“

بچے مطمئن ہو گئے اور 15 اگست کا دن فائنل ہو گیا اور پھر 15 اگست کے دن صبح سویرے ہی طارق شاہ بیوی بچوں کو اپنی کار میں بٹھا کر کنڈ پارک روانہ ہو گئے۔ یہ اٹک کے پاس واقع ہے اور پکنک کے لیے بہت اچھی جگہ ہے۔ یہاں پہنچ کر سب نے بہت انجوائے کیا۔ کھیلے کودے، گھر سے لائے ہوئے پکوان کھائے۔ مزے مزے کی باتیں کیں۔ پارک سے بھی چیزیں خرید کر کھائیں۔ اس طرح کھیلتے کھاتے خوشیاں مناتے دن ڈھل گیا اور شام قریب آنے لگی تو فاطمہ نے کہا۔ ”بس اب واپس چلو۔“

دل تو کسی بچے کا جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر جانا تو بہرحال تھا۔ اس لیے گاڑی میں بیٹھے اور ان کا سفر گھر کی طرف شروع ہو گیا۔ جب یہی سے گاڑی آگے بڑھی تو شمائلہ شاہ نے فرمائش کر دی۔

”بابا جانی! تارو جب کے کباب کھلائیں۔“

ماں نے اسے ڈانٹا۔ ”نہیں، سیدھے گھر چلو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

لیکن تمام بچے بیک زبان بول پڑے۔ ”ہم کباب کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔“

باپ نے بچوں کی ماں کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”دے دو ناں اجازت۔ ذرا دیر ہی کی تو بات ہے۔“

فاطمہ جانتی تھی کہ اجازت نہیں دوں گی تو بچوں سے زیادہ ان کے باپ کو دکھ ہوگا اور اس نے اجازت دے دی اور بچوں کی فرمائش پوری کرنے کے لیے انہیں کباب کھلانے لے گئے۔ ان دونوں کو کیا خبر تھی کہ یہ ان کے بچوں کی آخری خواہش، آخری فرمائش ثابت ہوگی۔

سارے بچوں نے کباب خوب جی بھر کر اور مزے لے لے کر کھائے۔ ماں باپ نے بس ان کا ساتھ دینے کی نیت سے منہ جھوٹا کر لیا۔ کباب کھانے کے بعد یہ قافلہ دوبارہ گھر کی طرف روانہ ہوا کچھ آگے جانے کے بعد طارق شاہ نے ایک پیٹرول پمپ پر پہنچ کر گاڑی روک لی۔

”کیوں! اب آپ یہاں گاڑی کیوں روک رہے ہیں؟“ شمائلہ نے سوال کر دیا۔ ”اب گھر پہنچنے میں دیر نہیں ہوگی؟“

”جس طرح تمہارا جی چلتے چلتے کباب کھانے کو چاہتا ہے۔“ طارق شاہ نے خوشگوار موڈ میں جواب دیا۔ ”اسی طرح گاڑی نے بھی پیٹرول پینے کی فرمائش کر دی۔ کہتی ہے میری پیاس نہیں بجھاؤ گے تو آگے جا کر رک جاؤں گی۔“

شمائلہ کے ساتھ دوسرے بچے بھی ہنس پڑے اس دوران جب گاڑی میں پیٹرول ڈالا جا رہا تھا یہ لوگ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اچانک مشال شاہ بول پڑا۔

”بابا جانی! کہیں ایسا نہ ہو کہ آج ہمارا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور میں مر جاؤں۔“

اس کی ماں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اللہ ہم سب کو اپنی سلامتی اور امان میں رکھے۔“

پتا نہیں کیا بات تھی کہ بچوں نے ماں کی بات پر توجہ دینے کی بجائے کاشی کی بے تکی بات کا زیادہ اثر لیا۔ شمائلہ نے دور افق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”زندگی کا کیا بھروسا۔ پتا نہیں کل کا دن ہم دیکھ سکیں گے بھی یا نہیں۔“

اب کے طارق شاہ نے اسے ڈانٹا۔ ”یہ تم لوگ کیسی باتیں کرنے لگے؟ اچھے بچے ہمیشہ اچھی باتیں سوچتے ہیں۔ اچھی باتیں کرتے ہیں۔“

بچوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہے۔ شاید ان معصوموں نے موت کی آہٹ سن لی تھی۔ اس لیے ان کی زبان سے ایسی مایوس کن باتیں نکل رہی تھیں۔

گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے کے بعد یہ خاندان اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی چلتی رہی۔ ان کی منزلیں طے ہوتی رہیں۔ جب ان کی کار تھانہ چھنی کی حدود میں جی ٹی روڈ پر واقع چٹل پوری پہنچی تو ان کی کار ایک زوردار آواز کے ساتھ سڑک پر کھڑی تعمیراتی کام میں استعمال ہونے والی مکسچر مشین سے جا ٹکرائی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب وہ آج تک نہیں دے سکے۔ ہو سکتا ہے لمحہ دو لمحہ کے لیے طارق شاہ پر نیند کا غلبہ آ گیا ہو۔ ان کی آنکھ جھپک گئی ہو۔ یا کسی وجہ سے ان پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی ہو یا پھر موت کے فرشتے نے ان کی نگاہوں کے سامنے دھند کی چادر تان دی ہو۔ سڑک پر کھڑی ہونے والی مکسچر مشین کوئی چھوٹی اور نظر نہ آنے والی چیز نہیں تھی کہ اس پر کار ڈرائیو کرنے والے کی نگاہ نہ پڑتی اور وہ گاڑی کو اپنے قابو میں نہ کر پاتا۔ بہرحال

ہونے والا حادثہ تھا۔ کسی بھی وجہ سے ہوگیا۔ حادثہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ طارق شاہ اور فاطمہ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی نیم بے ہوشی کی کیفیت میں دونوں میاں بیوی نے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں سے ان کے ذہن میں جمی دھند قدرے چھٹی تو فاطمہ نے دیکھا۔ ایک شخص ان کے قریب آیا اور اس نے طارق شاہ کی جیبیں ٹٹولنا شروع کردیں۔ اس نے اس کا موبائل فون نکال لیا۔ پرس سے نقدی نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لی اور گاڑی کی تلاشی لینا شروع کردی۔ خون میں لت پت بچے چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے، رو رہے تھے۔ فاطمہ اللہ رسول کا واسطہ دے کر مدد کرنے کی دہائی دے رہی تھی مگر اس شقی القلب پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی اور ان کے بچے گاڑی میں کچھ اس طرح پھنس گئے تھے کہ لوگوں کی مدد کے بغیر نہیں نکل سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر ان کے قریب آنے والے لوگ ان کی مدد کی بجائے ان کو لوٹ رہے ہیں۔ اس صدمے سے دونوں پر پھر غشی چھا گئی۔ دونوں پھر بے ہوش ہوگئے۔

یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ یہاں انسانوں کے روپ میں وحشی درندے بستے ہیں، انسانوں کی بستی میں، انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں مگر ان میں انسانیت موجود نہیں ہوتی۔ وہ انسانوں سے محبت نہیں کرتے۔ ان کا دین، دھرم، ایمان، ایقان سب کچھ پیسا ہوتا ہے۔ دولت ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ ذلت، کمینگی اور درندگی کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی درندہ صفت انسان یہ لوگ بھی تھے جنہیں موت و حیات کی کشمکش میں جلا روتے بلبلاتے مدد کے لیے پکارتے بچوں کے حالِ زار پر رحم آیا نہ ان کے ماں باپ کی فریاد اور مدد کی دہائی پر ترس آیا۔ وہ انہیں لوٹ مار کر چلتے بنے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد اس راستے سے گزرنے والوں نے بیچ سڑک پر ایک شکستہ حال گاڑی کو دیکھا تو انہوں نے اپنی گاڑیاں روک دیں اور قریب گئے تو خون میں نہائے بے ہوش متاثرین کو کار سے نکالا اور اپنی گاڑیوں میں ڈال کر لیڈی ریڈنگ اسپتال پشاور پہنچایا۔ ڈاکٹروں نے انہیں بچانے کی بھرپور کوشش کی۔

پشاور کا یہ اسپتال چونکہ ہمیشہ حادثات و واقعات سے متاثرین کے علاج معالجے میں پیش پیش رہتا ہے۔ اس لیے میڈیا کے کارندے اس کے ارد گرد ہی رہتے ہیں یا وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگاتے۔ کار ایکسیڈنٹ کے متاثرین کی خبر بھی انہیں ملی تو بریکنگ نیوز کے طور تمام ٹی وی چینلز پر دکھائی گئی جس کے بعد ان کے عزیز و اقارب اور قریبی محلے دار اسپتال پہنچے۔ ان کے بھرپور علاج کے لیے ڈاکٹروں سے تعاون بھی کرنے لگے اور گھر میں ان کی جلد صحت یابی کے لیے دعائیں بھی کرائی جانے لگیں۔ قرآن خوانی اور آیت کریمہ کا ورد بھی کرایا جانے لگا مگر ڈاکٹرز معصوم جانوں کو نہ بچا سکے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر بروقت وہ اسپتال پہنچ جاتے اور ان کا اس قدر خون ضائع نہ ہوتا تو انہیں بچایا جاسکتا تھا۔ فاطمہ کے ہوش میں آنے میں دیر نہیں لگی تھی مگر حاجی طارق شاہ ایک ہفتہ تک کومے میں رہے۔

وہ وقت بھی ان کے عزیز و اقارب اور ہم محلے والوں کے لیے بڑا جانکاہ تھا جب معصوم اور پھولوں جیسے بچوں کے جنازے ایک ساتھ اٹھے۔ ان کی ماں تو پھر ماں تھی۔ بار بار اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ہم سب بھی غم سے نڈھال تھے۔ پورا علاقہ سوگوار تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ جنازے میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد طارق شاہ ہوش میں آئے تو ان کا پہلا سوال تھا۔ "میرے بچے کس حال میں ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"مجھے ان سے ملاؤ۔"

اب مزید جھوٹ بولنے کی ہمت کسی کو نہیں تھی مگر سچ بتانے کا حوصلہ بھی کسی میں نہیں تھا۔ وہ اپنے بچوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے روتے اور تڑپتے رہے۔ وہ شدید زخمی حالت میں تھے اس لیے انہیں اس سانحے سے آگاہ کرکے کوئی انہیں مزید صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا لیکن انہیں کب تک بے خبر رکھا جاسکتا تھا؟ یہ سوال بڑا گھمبیر تھا۔ آخر چند بزرگ ایک عالم دین کو لے کر اسپتال پہنچے۔ جنہوں نے طارق شاہ کو پہلے تو اللہ رب العزت کی قدرت اور مصلحت کے بارے میں بتایا اور ان سے کہا۔ "اللہ پر بھروسا رکھیے۔ اس کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو نئی زندگی بخشی .... وہ جسے چاہتا ہے اپنے رحم و کرم سے نوازتا ہے۔ جس طرح اس نے آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازا اور جسے چاہتا ہے اس سے نعمتیں چھین لیتا ہے جس طرح اس نے آپ کے بچوں کو اپنے پاس بلالیا۔ صبر اور تحمل سے کام لیجیے۔"

مگر صبر کا کہاں یارا تھا۔ طارق شاہ کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ پھر کومے میں چلے گئے۔ کئی دنوں

کے بعد ان کی بے ہوشی ختم ہوئی مگر ان کے دل و دماغ اس سچ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ دوسری طرف ان کی اہلیہ نے یہ قیامت خیز حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اس لیے وہ آج تک اپنے ہوش وحواس کو قابو میں نہیں رکھ سکی ہے۔ اس سانحے کو تین سال گزر گئے ہیں مگر فاطمہ کے لیے وہ اب بھی پہلے کی طرح تر و تازہ ہے۔ وہ روتی ہے، بین کرتی ہے، جب بھی جس سے بھی ملتی ہے۔ اپنے دکھوں کا پٹارہ کھول لیتی ہے۔ اس کے عزیزوں کے علاوہ ہم محلے کی پڑوسن عورتیں اس کی دلجوئی کے لیے اکثر اس کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اسے اس دکھ کو بھولنے کی باتیں کرتی ہیں۔ اسے اپنی باتوں سے بہلاتی ہیں پھسلاتی ہیں مگر وہ ماں ہے۔ ان بچوں کی ماں جنہیں اس نے جنم دیا تھا اور جنہیں اپنی آنکھوں سے موت کی نیند سوتے ہوئے دیکھا ایک دو نہیں چاروں کو موت نے اس سے چھین کر اس کی گود کو اجاڑ دیا تھا۔ وہ کیسے صبر کا سل اپنے سینے پر رکھ لیتی۔ ہماری باتوں سے اس کا جنون کسی قدر کم ہوتا تو وہ ان کی باتیں کرنے لگتی۔ اس سانحے کا ذکر چھیڑ دیتی۔ باپ کے لاڈ پیار کے بارے میں جتانے لگتی۔

اس سانحے کے بعد طارق شاہ جب مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تو قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر گھر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اب میاں بیوی کو ایک دوسرے کی زیادہ سے زیادہ رفاقت کی ضرورت تھی۔ دونوں صحیح معنوں میں نارمل حالت میں نہیں تھے۔ اس لیے ان کا ایک دوسرے کے قریب رہنا بہت ضروری تھا مگر ہم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس قربت کے باوجود وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے دور دور رہنے لگے تھے۔ طارق گھر سے باہر دوستوں یاروں کے درمیان اپنے دکھوں کا رونا روتے رہتے یا اپنے بچوں کی قبروں پر وقت گزارتے۔ جب ان کے بچے حیات تھے تو وہ ان کے سروں پر شیمپو لگا کر نہلاتے تھے اور اب ان کی قبروں کو شیمپو لگا کر دھوتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کی قبروں کے پاس اپنی قبر کی جگہ بھی مختص کر رکھی ہے اور اپنے رشتے داروں کو یہ وصیت کر رکھی ہے کہ میرے مرنے کے بعد مجھے میرے بچوں کی قبروں کے پاس ہی دفنایا جائے۔

ان کے گھر سے اکثر دونوں میاں بیوی کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ لڑتے جھگڑتے تو وہ پہلے بھی تھے مگر اس وقت ان کی بڑی بیٹی حسینہ شاہ ان کی صلح صفائی کرا دیتی تھی مگر اب ایسا کوئی نہیں تھا جو ان کے درمیان صلح کرواتا۔

ایک دن ان کی لڑائی بڑی شدت اختیار کر گئی تو میں بھاگی بھاگی ان کے گھر پہنچی کہ کہیں دونوں غصے کے عالم میں کوئی نامناسب قدم نہ اٹھالیں۔ میں ان کے گھر گئی تو فاطمہ، طارق شاہ سے کہہ رہی تھی۔ ”میں تم کو معاف نہیں کر سکتی۔ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ کیونکہ تم میرے بچوں کے قاتل ہو۔“

”پاگل عورت! تیری بات پر کون یقین کرے گا؟ میں اپنے بچوں کو کیسے قتل کر سکتا ہوں؟“

میں نے فاطمہ کو بے تکی بات کہنے سے منع کرنے کی کوشش کی تو وہ بولی۔ ”زیتون خان! میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں ثابت کر سکتی ہوں کہ یہ شخص جو آج میرے بچوں کی موت پر ماتم کرتا رہتا ہے۔ یہی میرے بچوں کا اصل قاتل ہے۔“

”زیتون بہن! اسے سمجھاؤ، یہ بچوں کے غم میں دیوانی ہو گئی ہے۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہے۔ میں اپنے بچوں، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کیسے مار سکتا ہوں۔ جن سے میں اس قدر پیار کرتا تھا۔“

”تمہارا یہ حد سے زیادہ پیار ہی ان کے قتل کا سبب بنا۔“

فاطمہ نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”کیا ضرورت تھی انہیں پکنک پر لے جانے کی۔ ان کی ہر خواہش پوری کرنے کی۔ اتنی دور جانے اور اس قدر خرچ کرنے کی؟“

طارق شاہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی کہ فاطمہ نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ ”جو پیسے تم نے اپنے بچوں کی ایک معمولی فرمائش پر خرچ کیے تم ان پیسوں سے کئی گھرانوں کے بھوکے پیاسے بچوں کی بھوک پیاس مٹا سکتے تھے مگر کبھی تمہیں ان بچوں کا خیال نہیں آیا۔ تم اپنی دولت سے صرف اپنی خواہش اپنے بچوں کی معمولی معمولی فرمائش پوری کرنا ضروری سمجھتے تھے اگر تم پکنک پر جانے کی ان کی فرمائش پوری نہیں کرتے، انکار کر دیتے۔ انہیں ڈانٹ دیتے تو آج میرے بچے میرے پاس میرے گھر میں موجود ہوتے۔ اس لیے میں تو ان کا قاتل تم ہی کو ٹھہراؤں گی۔ تم...... اور صرف تم ہی میرے بچوں کے قاتل ہو۔“

نکاح نامہ

مکرمی مدیر

السلام علیکم

ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے جسے اگر بہتر انداز میں پیش کیا جائے تو ایک دلچسپ کہانی بن جائے۔ میرے ساتھ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہوا ہے جسے میں نے بہت ہلکے پھلکے مزا کے انداز میں لکھ دیا ہے۔

انور زیب
(لاہور)

یہ دلچسپ واقعہ کراچی میں پیش آیا۔

ہوسکتا ہے کہ اوروں نے اب کسی اور اینگل میں دیکھا ہو۔ لیکن میرا اینگل ذرا مختلف ہے۔ بہت معذرت کے ساتھ میں اس کہانی کو کچھ اس طرح لکھ رہا ہوں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ جان مصیبت میں پھنس گئی تو اشرف کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کی جان واقعی مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی۔

وہ اپنے والد کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا اور اس کے والد فاخرہ سے اس کی شادی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اشرف خود ایک گورا چٹا خوب صورت سا نوجوان تھا۔ جب کہ فاخرہ ایک سیاہ فام قسم کی بے ڈھنگی لڑکی تھی۔

خیر سیاہ فام ہونا کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ بہت تیز مزاج تھی۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں پر غصہ کرتی تھی تو اس کی کرخت آواز پورے محلے میں سنائی دیتی تھی۔

قصہ یہ تھا کہ اشرف کے والد نے ایک بار کسی برے وقت میں فاخرہ کے باپ سے ایک لاکھ روپے ادھار لیے تھے۔ حالانکہ وہ رقم ایک مہینے میں واپس کردی گئی تھی لیکن فاخرہ کے باپ کا احسان ان کے گلے پڑ گیا تھا۔ اس لیے جب فاخرہ کے باپ نے کہا کہ وہ فاخرہ کی شادی ان کے بیٹے اشرف سے کرنا چاہتا ہے تو اشرف کے والد فوری طور پر انکار نہیں کر سکے۔ انہوں نے اشرف کو منانے کی کوششیں شروع کردیں۔

''دیکھ بیٹا، وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔''

''آپ بہت اچھی کا پیمانہ بتا دیں تو شاید میں بھی مان لوں۔'' اشرف نے کہا۔

''بیٹا ایک بار میں نے اس کے باپ سے ایک لاکھ روپے قرض لیے تھے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''1994ء کی۔''

''تو آپ 1994ء کا احسان 2016ء تک کیوں ساتھ لئے آئے اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے یہ ادھار فاخرہ کے باپ سے لیا تھا فاخرہ سے تو نہیں لیا تھا نا۔''

''ارے بیٹا۔ وہ دونوں باپ بیٹی ایک جان دو قالب ہیں۔'' اشرف کے والد نے کہا۔ ''اور یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کتنی سگھڑ اور خوب صورت لڑکی ہے۔''

''کیا..... کیا سگھڑ اور خوب صورت؟'' اشرف نے حیران ہو کر اپنے والد کو دیکھا۔ ''ابو کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ اسے خوب صورت کہیں گے اس کا رنگ تو دیکھیں۔''

''بیٹا میں تو اس کے اندر کی خوب صورتی کی بات کر رہا ہوں۔''

''اندر کی خوب صورتی سے کیا مراد ہے۔ اس کے جگر، پھیپھڑے، تلی، گردے وغیرہ خوب صورت ہیں۔''

''بے وقوف میں اس کے مزاج کی بات کر رہا ہوں۔''

"اس کا مزاج بھی آپ کے سامنے ہے ابا، وہ جب بولتی ہے تو پورا محلہ اس کی آواز سنتا ہے۔"

"ارے یہ تو اس کی ایسی کوالٹی ہے جو ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کو ملتی ہے۔ دیکھ لینا جب وہ قومی اسمبلی کی اسپیکر بنے گی تو اسے کسی اسپیکر کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"ابا صاف بات یہ ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ ہر حال میں اس کی شادی مجھ سے کریں گے۔"

"بیٹا میں نے بتایا نا کہ 1994ء میں، میں نے اس سے ادھار لیا تھا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری زندگی میں یہ 1994ء آیا کیوں۔ کیا کیلنڈر میں سے یہ سال غائب نہیں ہو سکتا تھا۔"

"اب یہ تو کیلنڈر بنانے والوں سے پوچھو۔ بس اتنا ہے کہ تیری شادی اس سے ہوگی۔"

اس کے بعد کی کہانی اشرف کی زبانی سنیں۔

میں اس وقت خاموش ہو گیا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ ابا پیچھے نہیں ہٹیں گے جب کہ میں نے بھی یہ سوچ لیا تا کہ میں کم از کم اس لڑکی سے تو شادی نہیں کروں گا۔

ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی تھی اور مجھے اس پر عمل کرنا تھا۔ ایک شام میں نے فاخرہ کو محلے میں پکڑ لیا۔ چونکہ محلہ ایک تھا اس لیے آتے جاتے ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

"فاخرہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہائے اللہ نہیں۔" وہ شرما گئی۔ "ہمارے یہاں کا یہ دستور نہیں ہے۔"

"کیسا دستور؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی..... شادی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔"

میں بھنّا کر رہ گیا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

"مجھے سب معلوم ہے۔ میرے گھر میں تو تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔" اس نے بتایا۔

میں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔ "فاخرہ! اسی سلسلے میں تو تم سے بات کرنی ہے۔ تم مجھ سے کہیں ملو۔ یہاں محلے میں تم سے بات نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔"

"کہاں ملوں۔"

"تم شام کو گول مارکیٹ کی طرف آ جاؤ۔ وہاں ایک ہوٹل ہے شالیمار، ہم وہاں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جائیں

گے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یاد رکھو یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔ یہ ہم دونوں کی زندگی کا سوال ہے۔‘‘

’’چلیں ٹھیک ہے۔ میں کل کسی طرح نکل آؤں گی۔‘‘

پوری پلاننگ میرے ذہن میں تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب میں یہ اسے بتاؤں گا تو اس کے ہوش اڑ جائیں گے اور وہ خود ہی شادی سے انکار کردے گی۔

میں نے اسے جس وقت بلایا تھا وہ اس سے آدھ گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ ’’کیا بتاؤں گھر میں گانے وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے بڑی مشکلوں سے بہانہ کرکے نکلی ہوں۔‘‘

’’فاخرہ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔‘‘

’’تو بتاؤ نا، اسی لیے تو میں آئی ہوں۔‘‘

’’فاخرہ! کیا تم یہ پسند کروگی کہ شادی کے کچھ دنوں کے بعد ہی بیوہ ہو جاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیسی بات کر رہے ہیں ایسا کون چاہے گا۔‘‘

’’تو پھر تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونے والا ہے۔‘‘ میں نے اپنی آواز میں دنیا بھر کا دکھ سمیٹ لیا تھا۔ ’’تم شاید تین چار مہینوں ہی میں بیوہ ہو جاؤ گی۔‘‘

’’لیکن کیسے! آپ کو کیا معلوم؟‘‘

’’ڈاکٹروں نے مجھے بتایا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ میری آواز اور بھی بوجھل ہو گئی تھی۔ ’’فاخرہ! میں دل کا مریض ہوں۔ میرے دل کے آٹھ والوز بند ہیں۔‘‘ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ دل کے والو کتنے ہوتے ہیں بس تکا مارا تھا اور سر جھکا لیا تھا۔

’’ہائے اللہ! یہ کیا بتا دیا آپ نے۔‘‘

’’ہاں فاخرہ! میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میرے اور تمہارے ابا پتا نہیں ایسا کیوں کر رہے ہیں۔‘‘

’’کیا میرے ابا کو یہ معلوم ہے۔‘‘

’’نہیں، میرے ابا نے یہ بات چھپائی ہے۔ وہ دھوکا دے رہے ہیں۔ اندھیرے میں رکھ رہے ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے میں نے تو پورے خلوص کے ساتھ اپنی پوزیشن بتا دی ہے۔‘‘

میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس بات کا صدمہ ہوا ہوگا کہ ایک رشتہ اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

’’کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ ڈاکٹروں نے آپ کو جواب دے دیا ہے۔‘‘

’’فاخرہ! تم خود سوچو میں یہ جھوٹ کیسے کہہ سکتا ہوں۔‘‘ ’’یہ تو زندگی اور موت والی بات ہے لیکن پلیز تم سے ایک درخواست ہے۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’جو بھی تمہارا فیصلہ ہو لیکن میرے ابا کو پتا نہیں چلنا چاہیے اور نا ہی تمہارے ابا کو معلوم ہو۔‘‘

’’وہ کیوں؟‘‘

’’میں اپنے ابا کو کسی طرح شرمندہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’بس وہ صرف اتنا ہی جان لیں کہ انکار تمہاری طرف سے ہوا ہے۔ ابا کا دھوکا کسی کو پتا نہیں چلا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔‘‘ وہ دھیرے سے بولی۔

اس کی حالت دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ اسے بھی اپنے باپ سے کوئی بہانہ کرکے اس رشتے سے انکار کرنا تھا۔

میرا خیال تھا کہ بس ایک دو دنوں میں اس رشتے کے ختم ہونے کا اعلان ہو جائے گا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا اس طرف میرے گھر میں بھی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ نہ جانے اس کم بخت کو کیا ہوا تھا گھر جا کر خاموش بیٹھ گئی تھی۔

کئی دنوں کے بعد میں نے اسے فون کیا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی آواز میں نقاہت پیدا کرلی تھی۔ میری آواز سن کر وہ جلدی سے بولی۔ ’’دیکھیں مجھے ابھی تک ابا سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔‘‘

’’اب یہ تمہاری مرضی ہے۔‘‘ میں بہت کمزور آواز میں بولا۔ ’’میں تو صرف تم سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کس چیز کی اجازت؟‘‘

’’فاخرہ! کل رات سے میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ لگتا ہے اسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑے گا۔‘‘

’’تو اس کے لیے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔‘‘

’’یہ تم نہیں سمجھوگی۔ اجازت اس بات کی ہے کہ میں تمہارے ارمانوں اور خوابوں کا قاتل بننے جا رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ اسپتال سے میری واپسی نہ ہو۔ اس لیے اجازت ضروری تھی۔‘‘

’’اوہو...... تو کیا معاملہ اتنا سیریس ہو چکا ہے۔‘‘

’’ہاں فاخرہ، تم میری آواز سے اندازا لگا لو۔‘‘ میں نے اپنی آواز میں اور بھی کمزوری شامل کردی۔ ’’خدا حافظ فاخرہ، خدا حافظ۔‘‘

میں نے موبائل بند کردیا۔ یہ میں نے اس پر ایک زبردست وار کردیا تھا۔ اس کے بعد بھی کوئی لڑکی اگر چپکی رہتی تو اسے پاگل ہی کہا جاسکتا تھا۔

دو دن اور گزر گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید اسے میری بات کا یقین ہی نہ آیا ہو۔ اب یقین دلانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں واقعی اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاؤں۔

میں نے اس رات کھانا کھانے کے دوران ابا سے کہا۔ ''ابا میرے دل میں درد رہنے لگا ہے۔''

''ہاں بیٹا۔'' ابا معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ ''اس عمر میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔''

''ارے نہیں ابا۔ یہ وہ والا درد نہیں ہے۔ یہ باقاعدہ درد جگر والا درد ہے۔''

''ابے جگر میں درد ہو رہا ہے یا دل میں۔''

''آپ تو محاورے بھی نہیں سمجھتے ابا۔ درد جگر تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ یہ درد دل والا درد دل ہے۔''

''بدہضمی ہے۔ دو گولیاں کھالے ٹھیک ہو جائے گا۔''

اب ایسے ابا کو کون سمجھاتا۔ ان کو سمجھانے کا یہی طریقہ تھا کہ میں رات کو چیختا چلانا شروع کردوں۔

میں نے یہی کیا۔ رات بارہ بجے کے قریب میں نے داویلا شروع کردیا۔ ابا دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ ''ابے کیا ہوگیا۔ کیوں شور کررہا ہے۔''

''ابا وہ...... دل میں...... دل میں درد ہو رہا ہے۔''

اب تو ابا کے بھی ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے ایمبولینس سروس کو فون کردیا۔ رات ایک بجے ایمبولینس آئی اور مجھے اس میں لٹا دیا گیا۔

اس وقت بہت سے محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے۔ پورے محلے میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ اشرف کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اسے اسپتال لے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر کے کمرے میں صرف میں تھا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے ابا کو بھی کمرے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

پھر جیسے ہی اس نے میرا معائنہ شروع کیا میں اٹھ بیٹھا۔ ''ڈاکٹر صاحب پلیز میری بات سن لیں۔''

ڈاکٹر حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب میں بیمار نہیں ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر یہ سب کیا ہے۔''

''پلیز ڈاکٹر صاحب، اس وقت آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میری کہانی سن لیں۔'' پھر میں نے جلدی جلدی ڈاکٹر کو ساری سچویشن سے آگاہ کردیا۔

یہ سب سن کر ڈاکٹر ہنسنے لگا تھا۔ ''بہت خوب بہت دلچسپ سچویشن ہے۔ اب کیا چاہتے ہو؟''

''آپ کی مدد۔ آپ کا تعاون۔ تاکہ میری یہ شادی ٹل جائے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مجھے بیمار ظاہر کر کے ایڈمٹ کردیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر مان گیا۔ ''حالانکہ یہ سب ہمارے پیشے کے خلاف ہے لیکن معاملہ چونکہ دلچسپ ہے اس لیے تمہارا ساتھ دے رہا ہوں۔ اب دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔''

میں ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرلی تھیں۔ ڈاکٹر نے ابا کو بلا لیا تھا۔ ''جی ہاں آپ کے بیٹے کو ہلکا سا جھٹکا آیا ہے لیکن گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ ہم اسے داخل کررہے ہیں۔ اس کو آبزرویشن میں رکھا جائے گا۔''

اس کے بعد کیا ہونا تھا۔ ابا نے واویلا مچانا شروع کردیا۔ ایک بار یہی سوچا کہ اٹھ کر ابا سے کہہ دوں ابا کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ لیکن جب تصور میں فاخرہ آگئی تو میں نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔

مجھے ایک وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ چاروں طرف پردے لگا دیے گئے۔ مزید رنگ بھرنے کے لیے گلوکوز کی ڈرپ بھی لگا دی گئی۔

میں وارڈ کے بیڈ پر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ابا کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اس وقت ڈاکٹر سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ مجھے نیند آنے لگی۔

غنودگی کا ایسا حملہ ہوا جیسے کسی نے ذہن کو غبار آلود کردیا ہو۔ اس کے بعد میں گہری نیند میں سو گیا۔ خدا جانے کتنی دیر تک سویا رہا ہوں گا۔

اتنا تو یاد ہے کہ جس وقت میں اسپتال پہنچا تھا اس وقت رات کے دو بج رہے تھے اور اب اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر دیکھا۔ چار بج رہے تھے۔ میرے خدا یا میں مسلسل کئی گھنٹوں تک سویا رہا تھا لیکن کیوں کیا ہوا تھا مجھے۔

میرے بیڈ کے چاروں طرف جو پردے لگے ہوئے تھے کسی نے انہیں ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ نمودار ہو گئے۔ ان میں ایک تو میرے ابا بھی تھے۔ ان کے ساتھ

فاخرہ کا باپ اشرف تھا۔ محلے کے دو چار آدمی تھے۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ یہ سب مجھے دیکھنے آئے ہوں گے لیکن مولوی صاحب کی موجودگی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

مردوں کے پیچھے کچھ خواتین بھی تھیں۔ ان کے درمیان دلہن کے لباس میں بھی کوئی تھا۔ آگے جو مرد حضرات کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں ہار تھے۔ جو انہوں نے میرے گلے میں ڈالنے شروع کر دیے۔

میں نے بوکھلا کر ابا سے پوچھا۔ ''ابا کیا ہے یہ سب؟ کیا ہو رہا ہے۔''

''بیٹا تیرا نکاح ہو رہا ہے۔'' ابا نے بہت اطمینان سے بتایا۔

''ابا میں تو مر رہا ہوں۔ آپ تو خود دیکھ رہے ہیں کہ میں اسپتال کے بیڈ پر ہوں۔ میری زندگی کا کیا بھروسا اور آپ لوگ ایک معصوم لڑکی کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''کیا کروں بیٹا۔ وہ لڑکی خود یہی چاہتی ہے۔ لے تو خود ہی اس سے بات کر لے۔ مولوی صاحب نے اس خاص موقع کے لیے خاص اجازت دی ہے۔''

سارے مرد اور عورتیں باہر نکل گئے۔ میرے بستر کے پاس صرف فاخرہ رہ گئی تھی۔

''فاخرہ! کیا ہے یہ سب؟ تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔ تم تو میری حالت دیکھ ہی رہی ہو۔''

''ہاں دیکھ رہی ہوں۔ اس لیے میں نے ابا پر زور دیا کہ اس سے پہلے کہ آپ کو کچھ ہو جائے۔ آپ دوسری دنیا کی طرف چل دیں آپ سے میرا نکاح کروا دیا جائے۔''

''کیا! تم نے خود ہی یہ بات کی ہے۔''

''ہاں کیونکہ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں اور مشرق کی لڑکی جب کسی کو ایک بار اپنے دل میں بسا لے تو پھر زندگی بھر اس کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔''

''بے وقوف لڑکی۔'' میں جل کر بولا۔ ''تم بیوہ ہو جاؤ گی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوگی کہ میں آپ کی بیوہ ہوں۔ بس اب آپ خاموش ہو جائیں۔ اپنے آپ کو زیادہ ہلکان نہ کریں۔ ویسے ہی اتنے کمزور ہو چکے ہیں۔ دیکھیے گا نکاح ہوتے ہی آپ صحت مند ہونا شروع ہو جائیں گے۔''

میں نے کراہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ابا سر پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ اب پچویشن یہ تھی کہ دوسرے لوگ بھی آ گئے۔

فاخرہ اور دوسری عورتیں بیڈ کے ایک طرف کھڑی تھیں۔ جب کہ مرد حضرات ایک طرف تھے اور اس عالم میں فاخرہ سے میرا نکاح پڑھوا دیا گیا۔

اس وارڈ کے دوسرے مریض بھی وہاں آگئے تھے۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تھیں۔

فاخرہ کے گھر والے اور میرے ابا پوری تیاریوں کے ساتھ آئے تھے۔ فاخرہ کے گھر والے مٹھائیاں لے کر آئے تھے۔ ابا چھواروں کے شاپرز لے کر آئے تھے۔ میرے وارڈ اور دوسرے وارڈز کے مریضوں کو بھی یہ خبر مل گئی تھی کہ وارڈ میں کسی کا نکاح ہو رہا ہے۔

ڈاکٹرز اور نرسیں بھی جمع ہو گئی تھیں۔ ابا اور محلے کے لڑکے بہت مستعدی کے ساتھ مریضوں میں مٹھائیاں اور چھوارے تقسیم کرنے لگے اور میں یہ سوچنے لگا کہ کاش میں واقعی بیمار ہو جاتا۔

اس کے بعد کیا ہونا ہے۔ وہی ہوا جو فاخرہ نے کہا تھا کہ دیکھیے گا نکاح ہوتے ہی آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔ نکاح ہوتے ہی میں بستر سے نیچے اتر آیا۔ لعنت ہو اب ایسے ڈرامے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ مجھے یہ بعد میں پتا چلا کہ میں نے جس ڈاکٹر کو اپنا راز دار بنایا تھا اسی نے ابا کو بتا دیا تھا کہ آپ کا بیٹا نکاح سے بچنے کے لیے ڈراما کر رہا ہے۔ بس ابا نے تاؤ میں آکر اسی وقت نکاح کا فیصلہ کر لیا۔

انہوں نے فاخرہ کے ابا سے بات کی اور دونوں پورا بندوبست کر کے اسپتال پہنچ گئے۔ فاخرہ کو بھی ساتھ میں لے لیا اور اس طرح فاخرہ میری بیوی بن گئی۔

میں تو اس دن اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آگیا تھا۔ فاخرہ کی رخصتی بھی ایک ہفتے کے اندر ہی ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ تو ویسے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

اور اب فاخرہ میری بیوی ہے۔ ہم ابا کے مکان میں ہی رہتے تھے۔ شادی کے بعد فرق یہ ہوا ہے کہ پہلے پورے محلے میں صرف فاخرہ کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی تھی اب ہم دونوں کی سنائی دیتی ہیں۔ اس کہانی کو پڑھنے والے میرے حق میں دعا کریں کہ کاش فاخرہ اپنے شوہر کی عزت کرنا سیکھ جائے۔ ویسے اس میں ایک خوبی ایسی زبردست ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ دھاڑنے میں اس کا جواب نہیں ہے۔ اس کی آواز پورے محلے میں پھیل جاتی ہے۔

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام مسنون

ہمارے ارد گرد بکھرے کردار اپنے اندر کتنی اور کیسی کیسی عجب کہانیاں سمیٹے ہوئے ہیں اس کا اندازہ تو تھا لیکن جب زاہد نے معروف شخصیت شہروز خان کی اصل کمزوری پر روشنی ڈالی تو میں اچنبھے میں آگیا۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ظہیر مرزا

(کراچی)

زینیا سے دوستی ہوتے ہی زاہد کو اپنی زندگی بدلی ہوئی لگنے لگی، جہاں زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کی تگ ودو اور عمر بھر کے رتجگوں کی تھکن نے اس کے چہرے کے خطوط کو بدل دیا تھا وہاں زینیا کے وجود نے اسے وہ بشاشت دی کہ وہ ساری تھکن اترتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ شہروز خان کی کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے اسے محض چند دن ہی ہوئے تھے کہ اس کی ملاقات اس کی پرسنل سیکریٹری زینیا سے ہوگئی تھی لیکن اس وقت اسے اندازہ

نہیں ہوا تھا کہ زینیا اس کی زندگی میں کس قدر اہم ہو جائے گی۔

شہروز خان کی کمپنی میں ملازمت بھی اسے اتفاقاً ہی مل گئی تھی مگر اس اتفاق نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ جگہ جگہ نوکری کی درخواستیں دے دے کر وہ عاجز آچکا تھا اور اس دن بھی وہ ناور کے علاقے میں کسی دفتر سے انٹرویو دے کر باہر آ رہا تھا کہ اس کی ملاقات ایک پرانے دوست احسان سے ہوگئی۔ احسان سیٹھ شہروز خان کی سیون اسٹار نامی کلیئرنگ فارورڈنگ کمپنی میں ملازمت کرتا تھا اور اب ملازمت ترک کر کے ملک سے باہر جا رہا تھا۔ احسان نے اپنی جگہ نوکری کی آفر کی اور زاہد نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر قبول کر لیا۔

اس نوکری کو حاصل کرنے کے لیے زاہد کو کچھ بھی کرنا پڑتا تو وہ ضرور کرتا کیوں کہ ان دنوں زاہد اپنی الجھی زندگی سے پریشان تھا۔ وہ فرسٹ ایئر میں تھا کہ اس کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس کے والد کا انتقال اس وقت ہو چکا تھا جب زاہد صرف آٹھ سال کا تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے زاہد کو بچپن میں تو بھرپور توجہ اور آسائشیں ملیں مگر اس کے لڑکپن اور بے فکری کا زمانہ کارخانوں کی چرخیوں میں چل گیا تھا۔ رات دن وہ اسی فکر میں غرق رہا کرتا تھا کہ کس طرح کوئی اچھی نوکری ملے تو ان بھی نوکریوں اور فکروں سے نجات پا سکے مگر ماں کی آئے دن طبیعت کی خرابی نے اس کی فکروں میں اضافہ کر دیا اسی لیے اسے صرف اکیس سال کی عمر میں ساجدہ سے شادی کرنی پڑی۔

کم آمدنی اور دو بچیوں کی پیدائش کے بعد آئندہ زندگی کے سہانے دنوں کی امید بھی ختم ہوگئی تھی۔

سیٹھ شہروز خان کی کمپنی میں ملازمت مل جانے سے زاہد کی زندگی کی تلخی کچھ کم ہوگئی۔ وہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت اوپر پہنچنے کے خواب بھی دیکھنے لگا اور اس کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ خوب محنت کرنے لگا ایک ایک چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن اسے اس دفتر کی ہر چیز کو سمجھنا آسان لگا سوائے زینیا اور باس کے تعلق کو۔ اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذہن غیر شعوری طور پر اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کھوج میں لگ گیا۔

شروع میں زینیا سے محض رسمی مراسم تھے۔ وہ سیکنڈ ایئر کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی۔ سانولی سی رنگت، دبلی پتلی سی، جس میں بظاہر کوئی بھی خاص بات نہیں تھی پھر بھی اس میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو زاہد کو متاثر کر گئی تھی۔

دفتر کے کاموں میں بھی اس کی شمولیت برائے نام تھی۔ شہروز خان کا جگری دوست اور اس کا بزنس پارٹنر سلطان، بزنس کے سلسلے میں مستقل آنے والے کلائنٹس یا شہروز خان کے دوسرے دوست احباب ہر کسی کو زینیا متاثر کن نہیں لگی تھی مگر کسی کو اس بات سے کوئی سروکار بھی نہیں تھا اس لیے دفتر کے اسٹاف میں اس کے اضافے پر بھی کبھار کسی نے پوچھ تو لیا مگر اعتراض کسی کو نہ ہوا سوائے شہروز خان کی دوست ٹینا کے۔

ٹینا شہروز خان کی زندگی تھی۔ کبھی زمانے میں وہ اسٹیج ڈراموں کی مشہور اداکارہ تھی پھر شادی کے بعد اس نے شوبز کو خیرباد کہہ دیا مگر یہ شادی تھوڑے ہی عرصے چلی اور اب وہ دوبارہ شوبز میں قدم جمانے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ جوانی میں ٹینا ضرور خوبصورت رہی ہوگی مگر اب اس کی عمر اور خدوخال میں کوئی کشش نہ رہی تھی۔ وہ اپنی بے تکلفی اور گھٹیا مذاق کی وجہ سے شہروز خان اور اس کے دوستوں میں جان محفل ہوتی تھی۔ ہر تھوڑے عرصے بعد چند دن کے لیے شہروز خان ٹینا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے کراچی سے باہر چلا جاتا۔ ٹینا کو نہ جانے کیوں زینیا سے حسد ہونے لگی۔

”یہ اس نئی لڑکی کی ضرورت تو نہیں تھی تمہارے آفس میں ...... پہلے بھی تو سب کام یہی اسٹاف کر رہا تھا۔ نہ فیشن ہے نہ گریس ہے اور کس قدر روکھی ہے بات کرنے میں ...... فارغ کیوں نہیں کر دیتے۔“ ٹینا نے جیسے ہی زینیا کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو شہروز خان نے اسے وہیں ٹوک دیا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے ...... کام سیکھ گئی ہے۔ چھوڑو اس بات کو۔“ پھر وہ انٹرکام اٹھا کر زاہد سے بات کرنے لگا۔

”زاہد وہ بلز اور انوائس وغیرہ میرے پاس لے آؤ۔“

☆......☆

”سر! یہ کرنٹ لوڈنگ بل اور ڈیلیوری آرڈرز کی کاپیاں ہیں اور یہ NLC کے ٹرالرز کے نمبرز ہیں شیرازی صاحب کو بتا دیا ہے کہ آج DG کارگو میں بھی مال اتر جائے گا۔“ زاہد نے شہروز خان کی طرف کاغذات بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، جو لوکل انٹریز ہیں انہیں کلیئر کروا لو رحمت اور سرفراز جب Sea port اور Dry port سے آجائیں تو انہیں میرے پاس بھیج دینا اور دوسرے جہاز سے آنے والے سامان کی Indorcement کے بارے میں بھی مجھے بتا دینا۔" شہروز خان نے کہا۔

"جی بالکل آپ فکر نہ کریں میں خود ابھی پورٹ ہی جاؤں گا۔" زاہد کہہ کر چلا گیا۔

ثمینا کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ شہروز خان اس کی موجودگی کو مکمل نظر انداز کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے شہروز خان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میری کسی بات کی تمہیں کوئی پرواہ نہیں اب، جب سے یہ لڑکی یہاں آئی ہے ...... آخر اس سے پہلے بھی جو لڑکیاں تھیں وہ ہر لحاظ سے اس سے زیادہ اچھی تھیں مگر اب ...... اس کے آنے کے بعد سے تم کس قدر بدل سے گئے ہو۔"

شہروز خان نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا اور کوئی بہانہ بنا کر چلا گیا۔ اس کے بعد ثمینا نے بھی زیبا کے لیے براہ راست کوئی بات نہیں کی مگر زیبا سے اس کی رقابت اور بڑھ گئی۔ وہ اسی بات پر مصر تھی کہ کسی نہ کسی بہانے وہ زیبا کو اس آفس سے فارغ کروا دے مگر شہروز خان کی مرضی کے بغیر کوئی کام کروانا اس قدر آسان نہ تھا۔

شہروز خان کی شخصیت تھی بھی بڑی رعب والی۔ اس کا جسم کسرتی تھا۔ وہ مہنگے ترین برانڈڈ کپڑے پہنتا اور بہترین خوشبو میں بسا رہتا۔ ہر شخص اس کے ساتھ آسانی سے کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس کا شاطرانہ ذہن دوسروں کی کمزوریوں سے خوب واقف رہتا تھا اور وہ انہی کمزور پہلوؤں پر چوٹ دے کر اپنی من مانی کروایا کرتا تھا۔

پہلے پہل زاہد کی مصروفیت بہت زیادہ رہی۔ آفس کے سبھی کاموں کو سمجھنے کے لیے اسے آفس میں بہت وقت دینا پڑا۔ کام کے معاملے میں اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ پورٹ کے چکر لگاتا، پارٹیوں سے بات کرتا۔ کس پارٹی کو کہاں توڑنا ہے، جہاں بات نہیں بن سکے وہاں کس طرح کام نکلوانا ہے، دفتر کے اندرونی معاملات دیکھنا، ایل سی بنوانا۔ بینک کے چکر لگا تا وہاں کے معاملات دیکھنا وغیرہ اس نے دفتر کے کم و بیش سارے کاموں کو بخوبی سمجھ لیا اور شہروز خان کو بہت سی فکروں سے آزاد کر دیا مگر جہاں زاہد نے دفتری معاملات پر گہری نگاہ رکھی

ڈونالڈ ڈک کتنا مشہور کارٹون کردار ہے۔ ہے نا، نہ صرف بچوں کا بلکہ بڑوں کا بھی پسندیدہ لیکن فن لینڈ میں اس پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ معلوم ہے کیوں؟ کیوں کہ اس نے پتلون نہیں پہن رکھی تھی۔ اس بے چارے کا یہ قصور تھا۔
مرسلہ: نعمان اشرف۔ کوئٹہ

وہیں اس نے شہروز خان جیسے مشکل آدمی کو بھی اپنی مٹھی میں کر لینے کے گر جان لیے۔ اس نے اپنے گھر شہروز خان کی دعوتیں کیں اور اپنی چرب زبانی سے ثمینا کو بھی متاثر کر لیا۔

زاہد نے تھوڑے ہی عرصہ میں شہروز خان کا اعتماد حاصل کر لیا اور اس کے ہر ہر معاملے میں شامل ہونے لگا حتیٰ کہ دفتر کے بعد بھی اس کا زیادہ تر وقت شہروز خان کے گھر پر گزرتا۔ شہروز خان کی بیوی گلبہار اور پانچ سالہ بیٹا تک ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے زاہد کو بلوا لیا کرتے۔ زاہد نے گلبہار کو ڈرائیونگ سکھائی، اسے ڈرائیونگ لائسنس بنوا کر دیا۔ گلبہار نے پورا گھر رینوویٹ کروایا تو زاہد مزدوروں کے ساتھ لگا رہا اور لان بھی نئے انداز سے ٹھیک کروایا۔ زاہد کو کبھی یہ سب کھلتا نہیں تھا. اس نے اپنے انہی حربوں سے نہ صرف آفس میں بہت کم وقت میں ترقی کروائی بلکہ دفتری معاملات کو دوسروں کے سر پر ڈال کر وہ شہروز خان کے دیگر نجی معاملات کو بھی اپنے ہاتھ میں لینے لگا۔ شہروز خان جب کئی کئی دنوں کے لیے ثمینا کے پاس لاہور گیا ہوا ہوتا تو اس کے گھر اور دفتر دونوں کے معاملات کو نہ صرف زاہد سنبھالتا بلکہ ہر لمحہ کی خبر دے کر اسے مطمئن بھی رکھتا۔ شہروز خان، زاہد کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

جب زیبا سے دوستی کی ابتداء ہوئی تو زیبا کے بھی قریب ہونے لگا اور اس کی زندگی کے بہت سے پہلو اس پر کھلنے لگے لیکن ہر بار اسے یوں لگتا کہ جیسے وہ اسے بالکل بھی نہیں پہچانتا۔ ہر نئی بات اس کے لیے حیران کن ہوتی۔ کئی بار اس نے محسوس کیا کہ زیبا جب مسکراتی ہے تب بھی اس کی آنکھوں میں ایک اداسی سی رہتی ہے۔ ایسی کیا بات ہے جو اسے ہر وقت اداس کیے رکھتی ہے۔ وہ سوچتا مگر کبھی اس سے پوچھ نہ سکا۔ اگر کبھی یونہی سرسری گفتگو میں اس نے کچھ پوچھنا بھی چاہا تو زیبا ہنس کے ٹال دیتی یا پھر

بات بدل دیتی۔

زاہد کو پتا تھا کہ زینیا، شہروز کے آفس میں لگ بھگ سال بھر سے ملازمت کر رہی ہے اور شہروز خان کا رویہ زینیا سے دوسروں کے مقابلے میں کچھ مختلف ہے۔ وہ اس کو اپنی جاگیر کی طرح سمجھتا ہے۔ زاہد اس تمام معاملات میں خود کو مکمل طور پر الگ رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز شہر کے حالات خراب ہو جانے کی بنا پر اسے زینیا کو اس کے گھر چھوڑنے جانا پڑا جہاں زینیا کی ماں حسنہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہیں کئی سال سے کینسر کا مرض لاحق تھا اور زینیا اپنے گھر کی واحد کفیل تھی۔

زینیا سے مراسم کچھ اور بڑھے تو اس پر یہ راز بھی منکشف ہوا کہ اس کا اصل نام زرینہ ہے جو اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کی سج دھج سے کبھی کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ زینیا کرائے کے اس چھوٹے سے مکان میں رہتی ہوگی جہاں درودیوار کی خستہ حالی دور سے نظر آجاتی ہے۔ اس کے مکان میں پڑوس کے دکانداروں کی بے ہودہ مذاق، فلمی گیتوں اور گالیوں کی آوازیں با آسانی سنائی دیتی تھیں۔ مگر زینیا کے پہننے اوڑھنے اور رکھ رکھاؤ سے وہ اندازہ بھی نہ کر سکا تھا کہ زینیا کی زندگی میں کتنے دکھوں کا بسیرا ہے۔

کبھی کبھی شہروز خان کے زینیا پر بے جا اعتراضات اور روک ٹوک دیکھ کر اس کا دل دکھتا تھا۔ کسی سے محبت کرنا تو دور، وہ کسی سے کھلنے ملنے پر بھی اسے پابند رکھتا تھا۔ مگر زینیا کی خاموشی اسے کچھ کہنے سے روک دیتی لیکن رفتہ رفتہ زینیا کی زندگی زاہد پر کھلتی چلی گئی۔ زینیا نے زاہد پر یہ راز افشا کر دیا کہ یہ اس کی کسی آفس میں پہلی نوکری ہے اور نوکری شروع کرنے کے کچھ دن بعد ہی اس کی ماں کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اسے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے ایڈوانس میں تنخواہ کے لیے شہروز خان سے پہلی بار درخواست کی تو شہروز خان نے اس کی ماں کا علاج معالجہ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور کہا کہ اس سے بے فکر ہو جائے آئندہ اس کی تنخواہ سے کچھ رقم کاٹ لی جائے گی۔ اس وقت زینیا کو شہروز خان کسی فرشتے سے کم نہیں معلوم ہوا تھا مگر اس کے چند دن بعد ہی اس کی ماں کی دوبارہ حالت خراب ہو گئی اس نے گھبرا کر شہروز خان کو فون کیا اور مدد مانگی۔ شہروز خان نے اس موقع پر پیسا پانی کی طرح بہایا اور اس کی ماں کو موت کے منہ سے چھڑا لیا لیکن ہاسپٹل کے بل کی رقم سوا دو لاکھ روپے تھی جو شہروز خان نے یک مشت ادا کر دی تھی۔ اب سب کچھ بیچ کر بھی اس کی رقم ادا نہیں کی جا سکتی ہے اور تنخواہ سے تھوڑی تھوڑی رقم کٹوانے کے بعد بھی نہ جانے کتنا عرصہ گزر جائے۔ وہ نہ تو اس نوکری سے خوش ہے نہ اسے چھوڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی کی تمام اُمیدیں ختم ہو چکی ہیں۔

زینیا نے زاہد کو بتایا۔ ”باس کا رویہ باقی سب لوگوں کے مقابلے میں اس کے ساتھ بہت زیادہ اچھا ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ شروع شروع میں تو ان کے اس ”اچھے رویہ“ سے ڈر لگنے لگتا تھا کہ کہیں وہ کوئی جملہ کوئی اشارہ، کوئی بات اس طرح کی نہ کر دیں جسے وہ پورا نہ کر سکے مگر ایسا بالکل بھی نہیں ہوا مگر اس سارے اچھے برتاؤ کے باوجود کبھی کبھی ان کا رویہ بالکل عجیب ہو جاتا ہے کہ لگتا ہے کہ سانس بھی ان کی مرضی سے لینی چاہیے ذرا کوئی مجھ سے بات کر لے تو وہ اس قدر سخت گیر ہو جاتے ہیں۔ ان کی بلاوجہ کی روک ٹوک اور خبر گیری ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔“

ایک روز زاہد، شہروز خان کی بیوی کو ساتھ لیے گاڑی خریدنے گیا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر سے دفتر آیا تو دفتر کے ماحول سے اندازہ ہونے لگا کہ آج کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ آفس کا چپراسی جو سارا سارا وقت کام کرنے کے دین کے احکامات پر بحث کیا کرتا تھا یا پھر اونگتا تھا ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ہے وہ نہایت چاق و چوبند انداز میں کام کر رہا ہے۔ البتہ زینیا طبیعت خراب ہونے کا بتا کر گھر جا چکی تھی۔

اگلے روز اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی زینیا سے اس بارے میں پوچھ ہی لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر بتایا کہ کل باس کے پرانے جاننے والے شہزاد صاحب آفس آئے مگر باس اس وقت آفس میں نہیں تھے۔ انہوں نے انتظار کرنا چاہا۔ باس کا فون نہیں لگ رہا تھا ...... پہلے انہوں نے رسمی سی کچھ باتیں کیں پھر میرے پاس رکھی ہوئی کتاب ”جاناں جاناں“ دیکھ کر شاعری پر بات چیت کرنے لگے۔ اپنے بھی دو ایک اشعار سنانے لگے پھر میری تعریف میں بھی ایک شعر سنایا۔ اسی وقت باس آ گئے اور یہ دیکھ کر باس قدر شدید انداز میں برہم ہوئے کہ بتایا نہیں جا سکتا۔ شہزاد صاحب نے بہت معذرت کی مگر باس نے ایک نہیں سنی اور انہیں آئندہ دفتر

آنے سے منع کر دیا۔ مجھ پر برس پڑے کہ وہ دو کوڑی کا شرابی جواری آدمی ہے۔ انسان اپنا اسٹیٹس کا خود خیال رکھے۔ اس شخص کا دھندا ہی یہ ہے کہ لڑکیوں کو متاثر کر کے انہیں پھانسے دے۔

☆☆☆

زاہد نے صرف زینیا کا دل رکھنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں مگر اس بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں دی البتہ اسے شہروز خان کی کوئی بات غلط بھی نہیں لگی لیکن بات اگر یہیں تک ہوتی تو شاید اس کے لیے اس قدر اہم نہ ہوتی مگر ان واقعات نے اسے چونکا دیا۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ جب اسے یہ علم ہوا کہ باس جن لوگوں سے محتاط رہنے کا حکم دیتے وہ ہر گز ایسے نہیں تھے جیسے باس بتایا کرتے۔ شہزاد صاحب بھی ایک چھوٹے موٹے شاعر تھے فلمی گیت لکھا کرتے تھے اور بہت عرصہ کسی فلمی رسالے میں کام کرتے رہے پھر بیمار ہو گئے تو گھر بیٹھ گئے تھے۔ اس قدر غلط بیانی اور پھر اس کے بعد اتنی زیادہ اجارہ داری، زینیا کو بھی یہ سب جان کر حیرت اور دکھ ہوا وہ سمجھی کہ شاید یہ وجہ ہو کہ وہ باس کے روز و شب کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے اور ان کے ذہن میں یہ خدشہ ہو کہ کوئی اس سے وہ سب معلوم نہ کر لے اس قدر دباؤ، اجارہ داری کتنا تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہے۔

"مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میری زندگی کو بہت محدود کر دیا ہو میری اپنی کوئی زندگی کسی سے تعلق نہیں ہے۔ سوشل سرکل بدل گیا ہے۔ صرف ان لوگوں سے ہی ملنا ہے جن سے باس ملنا چاہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں باس کی کھڑی کردہ دیواروں میں مقید ہوں۔ ہر پل، ہر گھڑی خوف کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے کہ نہ جانے کیا بات ناگوار گزرے۔ نہ کسی سے کھل کر بات کر سکتا نہ ملنا جلنا اگر کوئی اور بھی کرے تو دل ڈرا اور لرزاں رہے۔ یہ ختم نہ ہونے والا کیسا عذاب اس کی زندگی میں در آیا ہے۔ اس کرب اور اذیت نے اس کی زندگی کو کس قدر بے رنگ کر دیا ہے۔ بار بار اسے خودکشی کا خیال آنے لگا مگر ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر اداس ہو جاتی۔ اسے لگتا تھا کہ وقت تو کٹ رہا ہے مگر اس کی زندگی آگے نہیں بڑھ رہی ہے، وہ کہیں پیچھے رہ گئی ہے۔" اس نے ان حالات سے تنگ آ کر زاہد کے سامنے دل کا غبار نکال لیا۔

"دیکھو ...... تم ہمت مت ہارو ...... اپنے حصے کی جنگ لڑنی ہو گی، آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں۔ خوشیاں خود تمہیں ڈھونڈتی ہوئی تمہارے دروازے تک آئیں گی۔" زاہد نے اسے ہمت دلاتے ہوئے کہہ تو دیا مگر ان حالات کو دیکھ کر زاہد کو خود بھی لگتا کہ سب کچھ بدلنا تقریباً ناممکن ہی ہو گا۔

زاہد شہروز خان کی ایسی ضرورت بن گیا تھا جس کے بغیر شہروز خان خود کو ادھورا محسوس کرتا مگر حالات اچانک مشکل سے مشکل ہوتے گئے۔

”دیکھا تم نے ان کمینوں نے کیا کیا ہے ......“ شہروز خان بری طرح چلا رہا تھا ”ان حرام خوروں کو بزنس کے جوڑ توڑ میں نے سکھائے ......سب کچھ سکھایا بتایا...... اور......اس سلطان نے مجھ سے الگ ہو کر اپنا خود اپنا کام شروع کر دیا، میرے کلائنٹس توڑ لیے اور اب یہ لاہور والی پارٹی بھی۔“

”ٹکے کی ہنڈیا گئی کتے کی ذات پہچانی گئی۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اتنا پریشر نہ لیں۔ آپ کی اپنی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں۔“ زاہد نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔

”ایسے آسانی سے نہیں چھوڑوں گا میں بھی سلطان کو، میں اس بدذات کی۔“ شہروز خان دھاڑ رہا تھا کہ ثمینا آ گئی۔

ثمینا بھی بڑی ادا اور بے تکلفی سے آئی تھی مگر شہروز خان نے کوئی توجہ نہ دی۔ ثمینا شوبز میں دوبارہ آنے کے لیے بے چین تھی اور شہروز خان، ثمینا کی ہر پریشانی کو اپنے سر لے لینا چاہتا تھا تاکہ ثمینا خوش رہ سکے۔ اس نے پہلے ہی شہروز خان کو بتایا ہوا تھا کہ اس کا ایک دوست اسے فلم میں بہت اچھا رول دے سکتا ہے اگر شہروز خان اس کے پراڈکشن ہاؤس میں پیسا انویسٹ کر دے اور شہروز خان نے اس پر ہامی بھر لی تھی۔ شہروز خان ایسا کر بھی دیتا مگر اس وقت کاروباری معاملات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ اس کے لیے کوئی بات سوچنا بھی دشوار تھا۔

ثمینا نے جیسے ہی بات شروع کرنا چاہی شہروز خان نے صاف معذرت کر لی۔ ثمینا کے لیے یہ سب کچھ اس کی توقعات کے برعکس تھا اس کے دل میں جو خدشے اس کے نئے دوستوں نے ڈالے تھے اسے سچ محسوس ہونے لگے۔

”ٹھیک کہتے ہیں سب لوگ تمہارے بارے میں ......تم جیسا دھوکے باز انسان کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب تک تم سلطان اور تمہارے دوسرے دوستوں کے لیے میں سامانِ عیش بنی رہی تم میرے رہے اور جہاں میں نے تم سے ذرا اپنے فائدے کی بات کی تو تم نے انکار کر دیا، تم جیسا گھٹیا انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا ...... بہت گھٹیا ......“ ثمینا غم و غصے سے چیخنے لگی۔

”تم جیسی گھٹیا عورت سے یہی توقع رکھنی چاہیے۔ تیری اپنی اوقات ہے کیا ......“ شہروز خان بھی غصے میں لال پیلا ہو گیا۔

”ہاں ...... ہاں میں ایسی ہی ہوں جیسا تم نے کہا ہے ......مگر تم ......تم کیا ہو، یہ اب سب کو پتا چلے گا۔ میری ضرورت تو اس وقت کوئی اور بھی پوری کر دے گا۔ تمہارا اپنا دوست سلطان جو اب تم سے الگ ہو گیا ہے وہ بھی مجھے آفر کر چکا ہے مگر میں کیا کرتی ہوں، تمہیں اب پتا چلے گا جب میں تمہارے سارے کرتوتوں کو سب کے سامنے لاؤں گی۔ اب تم دیکھو۔“ ثمینا نے شدید جذباتی ہو کر شہروز خان کے سامنے سارا زہر اگل دیا۔

شہروز خان پہلے ہی کاروباری پریشانیوں سے تنگ تھا۔ ثمینا کی زندگی سے نکل جانے پر مزید پریشان ہو گیا۔ حالات کچھ زیادہ ہی پُرپیچ ہو گئے۔

دن بدن حالات سنبھلنے کی بجائے الجھتے ہی رہے۔ شہروز خان کی توجہ کاروبار پر برائے نام رہ گئی۔ زاہد کے کندھوں پر سارا بوجھ آ گیا البتہ بڑی پارٹیوں سے ڈیلنگ شہروز خان ہی رکھتا تھا۔

شہروز خان ان مسئلوں سے یک لخت نکلنا چاہتا تھا وہ بہت جلدی میں تھا۔ اسی لیے شہروز خان کے اچانک ملک سے باہر جانے کا سن کر زاہد کو عجیب سا لگا۔ اس کی ہر ہر مصروفیت زاہد سے پوشیدہ نہیں تھی پھر اس کی کچھ پریشان سی صورت نے زاہد پر ظاہر کر دیا کہ معاملہ کیا ہے۔ سیٹھ شہروز خان اپنے ذاتی اور دفتری غلط اور جعلی کاموں میں بری طرح پھنس جانے کی وجہ سے کورٹ اور بدنامی سے بچنے کے لیے پریشان ہے اور اسے اس پریشانی سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

زاہد بھی اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا کہ شہروز خان نے اسے انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا ”میں اب کسی معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا بس ......بس کسی طرح ابھی یہ معاملہ سلجھ جائے تو ......“

”ہوں ......واقعی یہ ہے تو .... بہت پریشانی کی بات مگر اخباروں میں اگر آ گیا تو آئندہ کے لیے ہمارا کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ بدنامی الگ!“ زاہد نے پوری سنجیدگی اور خلوص سے سوچتے ہوئے کہا۔

”مگر ......مگر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ رہی ہے۔ اگر تم اس معاملے میں کچھ مدد کرو تو ......“ شہروز خان نے ذرا رک کر کہا۔

”ہوں ...... کہیے کیسی ترکیب میں تو بالکل ہر طرح سے حاضر ہوں...... کیا کسی سے بات کرنی ہے اس معاملے

میں......'' زاہد نے کہا۔

''وہ......اگر......تم ...... ویسے میں تمہیں نئی گاڑی اور اچھی خاصی رقم بھی دوں گا۔ تم ایسا کرو کہ میں اس سارے معاملے سے نکل جاؤں اور تم اپنے ذمہ لے لو یعنی یہ جو کچھ ہوا وہ میری لاعلمی میں تم نے کیا ہے اور......'' شہروز خان جلدی جلدی کہنے لگا۔

''کیا ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ...... ہرگز نہیں ......'' زاہد بات کاٹتے ہوئے چیخا۔

سیٹھ شہروز خان کو پوری شدت سے انکار نے دھچکا سا دیا۔ وہ اس سے اس طرح کی توقع بھی نہیں کرسکتا تھا۔

''تم ہوش میں ہو......تمہیں معلوم ہے تم کس سے بات کر رہے ہو ...... تم جیسے سڑک چھاپ کو میں نے آسمان پر بٹھا دیا اور تم میرے احسانوں کے بدلے ......'' شہروز خان طیش میں چلایا۔

''کوئی احسان وحسان نہیں کیا ہے آپ نے ...... کچھ نہیں کیا ...... مجھے آپ ...... میں نے یہ سب کچھ اپنی ذہانت اور محنت سے حاصل کیا ہے ...... اور آپ مجھے کیا سڑک چھاپ کہیں گے۔'' زاہد غصے میں چلاتا رہا ''میں نے کتنی غلط حرکتوں کو جانتے بوجھتے سب سے چھپائے رکھا مگر میں اتنا مردہ ضمیر نہیں ہوں کہ آپ کی جگہ جیل چلا جاؤں۔ ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔''

''اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گا۔'' شہروز خان دھاڑنے لگا۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں نوکری پر ...... میں خود ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اب میں خود اپنی کمپنی بناؤں گا۔ ترقی کر کے دکھاؤں گا اور تمہارے سارے کرتوت دنیا کے سامنے خود لے کر آؤں گا۔''

''دیکھتا ہوں میں بھی کس قدر دم ہے تم میں ...... میں تو کسی نہ کسی طرح اس پریشانی سے باہر نکل ہی آؤں گا پھر دیکھتا ہوں کہ کون تمہیں بزنس دیتا ہے۔''

''میں تمہارے ہر کارنامے کو تمہاری بیوی گلبہار کو بتا دوں گا۔'' زاہد نے دھمکایا۔

''ہونہہ......جو چاہے کرلو ...... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے ...... سمجھے ......'' شہروز نے آرام سے کہا۔

''میں تمہاری بیوی کو سب کو بتا دوں گا ...... زینیا کے ساتھ جبری نوکری ...... بھی۔''

اس بار شہروز خان دم بخود رہ گیا۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا یوں لگا اس کے سارے کس بل نکل گئے اس کا رویہ یک لخت بدل سا گیا۔ اس نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی اور زاہد کو ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم......تم آخر یہی چاہتے ہو نا کہ میں تمام معاملے سے تمہیں الگ رکھوں ...... تو ٹھیک ہے۔ میں سب کچھ برداشت کرلوں گا اور تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی مگر ...... تم زینیا کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالو گے۔''

شہروز خان نے پینترا بدلا مگر زاہد وہاں سے کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

زاہد کو توقع بھی نہ تھی کہ اگلے روز ہی شہروز خان کا فون آجائے گا اور اس سے فوری ملنا چاہے گا۔ زاہد بادل ناخواستہ اس کے آفس چلا گیا مگر اس نے اس کے ساتھ کام کرنے سے کلی طور پر انکار کردیا۔ شہروز خان نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر زاہد نے بتادیا وہ آئندہ اس سے کسی طرح کا کوئی تعلق بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ پھر بھی زاہد کے واپس جانے سے پہلے شہروز خان نے اس سے تمام باتوں کی معذرت کی اور گلے شکوے ختم کر دیئے۔

''ٹھیک ہے ...... اب جہاں ہر پرانی بات ختم ہوچکی ہے وہیں میں ایک آخری بات آپ سے ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو زینیا سے محبت ہے ...... اسے اپنی پراپرٹی کیوں سمجھتے ہیں ...... آخر اس کا قصور کیا ہے ...... آزادی سے جینے کا حق کیوں نہیں دیتے ......'' زاہد نے زینیا کی آزادی کے لیے ایک کوشش کرنا چاہی۔

''میں ...... میں زینیا کو چھوڑ نہیں سکتا ...... کبھی نہیں ...... کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔'' شہروز خان نے کمزوری آواز میں کہا۔

زاہد نے بے دلی سے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور جانے کے لیے پلٹا مگر اس کا اگلا ہی جملہ سن کر زاہد پتھر کے بت کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔

''میں سب کچھ کرسکتا ہوں ...... ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں ...... مگر اس بات کو سوائے میرے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا ...... میں اسے کہیں اور جانے نہیں دے سکتا کیونکہ وہ میری ...... گزری زندگی کا صلہ ہے ...... میری اپنی ناجائز بیٹی ہے!''

روپ بہروپ

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
کاشف محمود کی کہانی لکھ تو لی ہے لیکن یہ کہانی اس کی بھی نہیں ہے حقیقتاً یہ کہانی آفاق کی ہے، کیسے یہ آپ کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو گا۔ اللہ کی قدرت دیکھیں کہ وہی آفاق جس نے اپنے چہرے پر تقدس کا ملمع چڑھا رکھا تھا اس کا ایک اہم راز کس طرح دنیا والوں پر عیاں ہو گیا۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

میرا نام کاشف محمود ہے۔ ہم ضلع رحیم یار خان کے ایک مضافاتی علاقے میں رہتے تھے۔ میرے والد پرویز خان چھوٹے سے زمیندار تھے۔ میرا بہن بھائیوں میں چوتھا نمبر ہے۔ مجھ سے تین بہنیں بڑی ہیں۔ صائمہ، عاصمہ اور انیلہ۔ میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔ ابو جان نے میری پرورش کی۔ میں اپنی بہنوں کا اکلوتا اور لاڈلہ بھائی ہوں۔ والد صاحب نے مجھے تعلیم دلوائی۔ اس کے بعد میں نے ملازمت کر لی۔ آج میں ایک کامیاب ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ اس مقام تک مجھے والد صاحب نے پہنچایا ہے۔ ملازمت کے بعد میں نے ابو کے ساتھ مل کر اپنی دو بڑی بہنوں کی شادیاں کیں۔ میری بڑی بہن کی پہلے شادی کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد ابو جان نے میری شادی میرے تایا ابو کی بیٹی رخسانہ سے کر دی۔ میری زندگی بہت پُرسکون گزر رہی ہے۔ رخسانہ ایک مثالی بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے میرا ہمیشہ بہت خیال رکھا اور

اب تک رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بس ایک کمی ہے کہ اللہ نے ہمیں اولاد جیسی نعمت سے نہیں نوازا۔ میرے والد صاحب یہ حسرت دل میں لیے اس جہاں سے چلے گئے۔ مجھے رخسانہ نے کئی بار دوسری شادی کا کہا مگر میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں آج سے سولہ سال پہلے اس فلاحی مرکز وسیلہ سینٹر میں تعینات ہوا تھا۔

بعدازاں میں نے اپنا تبادلہ رحیم یار خان کروا لیا تھا۔ اب قسمت ایک بار پھر ہمیں لیاقت پور لے آئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب ہم پہلی بار یہاں آئے تھے۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ میرے ذہن میں وہ سب یاد ہیں، وہ باتیں ایک ایک کرکے تازہ ہونے لگیں۔ میں آج سے سولہ سال پیچھے چلا گیا۔

☆☆☆

''مسلمانو! عورت کا احترام ہم سب پر فرض ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا تھا۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ مگر جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو عورت کو اس کے اصل حقوق حاصل ہوئے۔''

ہم جب اسپتال میں داخل ہو رہے تھے۔ اسپتال کے سامنے مسجد کے اسپیکر سے نکلتی ہوئی خوبصورت آواز نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

''عورت ماں کے روپ میں خدا کا دوسرا روپ ہے۔ بیٹی کے روپ میں رحمت ہے۔ دنیا میں جتنے نبی، پیغمبر اور ولی اللہ آئے سب نے عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔''

وہ خوش الحانی سے وعظ دے رہے تھے۔ میں دفور، عقیدت سے سن رہا تھا۔ پھر ان کی سحر انگیز آواز گونجی۔

''ہم میں سے جو عورت کے حقوق پورے نہیں کرے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس کو سزا ملے گی۔''

ان کے الفاظ بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ میرے ذہن میں مولوی صاحب کی شخصیت کا ایک خوبصورت خاکہ بن گیا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مولوی صاحب سے ایک ملاقات ضرور کروں گا۔ وہ دن گزر گیا۔ اگلے دن میں نے ڈیوٹی شروع کر دی تھی۔ سارا دن گزر گیا۔ بہت کم مریض آئے تھے۔ نذیر علی بھی ان دنوں یہیں تھا۔

میرے ساتھ اشفاق نامی بندہ بھی ہوا کرتا تھا۔ جو کہ ڈسپنسر تھا۔ ہم سارا دن گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔ اِکا دُکا مریض آتے ان کو ہم نمٹا دیا کرتے تھے۔ نذیر علی احمد پور شرقیہ کا رہائشی تھا۔ وہ اپنی بیوی سعدیہ کے ساتھ اسپتال میں ہی رہتا تھا۔ رخسانہ اور اس کی بیوی بھی جلد گھل مل گئیں۔ وہ سارا دن اکٹھی رہتی تھیں۔ وہ اکثر میری بیوی کے ساتھ گھر کے کام وغیرہ بھی کروا دیتی تھی۔ یہاں کا ماحول ہمیں بے حد اچھا لگا تھا۔

تقریر کرنے والے کے بارے مجھے جو معلومات ملیں۔ ان کے مطابق حال ہی میں ان کی بیوی نے ان سے طلاق لی تھی۔ وہ اکیلے رہتے تھے۔ کسی مدرسے سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ شوقیہ تقریر کر لیا کرتے تھے۔ زندگی گزارنے کے لیے کریانہ کی دکان کھول رکھی تھی۔ نام ان کا آفاق تھا۔

یہاں آنے کے چوتھے دن بعد میں مولانا آفاق سے ملا تھا۔ وہ پینتیس سال کے لگ بھگ باریش شخص تھے۔ سرخ و سفید رخسار، متبسم ہونٹ بلاشبہ وہ وجیہہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ویسے تو میں پانچ وقت نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جاتا تھا۔ مگر اس دن میری ان کے ساتھ تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں جب ان کے پاس سے اٹھا تو ان کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ مجھے وہ بہت اچھے لگے تھے۔ پھر ہماری اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ مجھے ان کے ساتھ باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ دین و قرآن کی باتیں بتاتے تھے۔

☆☆☆

میں بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ ماضی کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آ رہی تھیں۔ اچانک میرے ذہن کی اسکرین پہ ایک چہرہ ابھرا۔ وہ چہرہ شکیلہ کا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ فروری کا ایک روشن دن تھا۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ میں، اشفاق، نذیر علی اور ایک نرس جس کا نام فریدہ تھا پلاٹ میں کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک میری نظر گیٹ کی جانب اٹھی تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''نذیر علی کون ہے یہ لڑکی؟''

''سر یہ شرفو لوہار کی بیٹی ہے، ایب نارمل ہے۔''

میلے کچیلے لباس میں ملبوس وہ لڑکی ہمارے قریب آ گئی تھی۔ میں توصیفی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی تقریباً سولہ برس کی تھی۔ ایک بات جس نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ وہ اس کا حسن تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ درمیانے قد کی تھی۔ اس کا بھرپور اور پُرکشش جسم دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ خوبصورت، بچوں جیسا گول چہرہ، لبوں پہ مسکراہٹ اور شرارتی آنکھیں۔ گھنے سیاہ بال جو کمر تک لہرا رہے تھے۔ میں محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ بے پناہ حسن کی مالک تھی۔ اس کا حسن قدرتی تھا۔

بناوٹ اور تصنع سے ماورا اگر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتی تو شہزادی لگتی۔ وہ بھی میری طرف دلچسپی سے دیکھنے لگی تو میں جھینپ گیا۔

"ادھر آ ؤ۔" ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتے ہوئے اسپتال کے گیٹ میں داخل ہوا اور دور سے ہی چلایا۔ وہ آواز سن کر بدک گئی۔ متوحش نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

"سر یہ شرفو ہے۔" نذیر علی نے سرگوشی کی۔ میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ بوڑھا اب قریب آ گیا تھا۔ لڑکی اس کو قریب آتے دیکھ کر اچانک بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسی پھر دوڑ کر ہماری پشت کی جانب آ گئی۔ وہ بوڑھا ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی لاٹھی سے اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ اس کی جانب بڑھا۔ وہ ہنستی ہوئی چکر کاٹ کر ہمارے سامنے آ گئی۔ بوڑھا بھی اسے پکڑنے کے لیے سامنے آ گیا تو لڑکی پھر پیچھے چلی گئی۔ وہ دونوں ہمارے اردگرد چکر لگانے لگے۔ پانچ سات چکر کاٹنے کے بعد بوڑھا ہانپنے لگا۔ تب وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ بوڑھے نے اس کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر وہ بھی ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑے لاٹھی ٹیکتا ہوا گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ دن رات ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے رہے۔ مجھے لیاقت پور آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ میرے آنے سے مریضوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اسپتال کا عملہ بھی بڑھ گیا تھا کیونکہ میں مریضوں کا اچھی طرح معائنہ کرتا اور ان کے علاج پہ خصوصی توجہ دیتا تھا۔ یوں میں علاقے میں کافی مشہور ہو گیا تھا۔ وہ شکیلہ نامی لڑکی مجھے کئی بار نظر آئی۔ میں اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ میں جب بھی اسے دیکھتا تو میرے دل کی عجب سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی تھی کہ کاش یہ ابنارمل نہ ہوتی۔ مگر خدا کی حکمت کو سمجھنا ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنی مرضی سے انسان کی تخلیق فرماتا ہے۔ اسے جو چاہے بنا دیتا ہے۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ مولانا آفاق صاحب سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ روز گپ شپ ہوتی تھی۔ وہ اکثر میرے پاس آ جاتے تھے۔ میں بھی فارغ اوقات میں گاہے بگاہے ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہ موسم بہار کے آغاز کے دن تھے۔ درختوں اور پودوں نے سبز پیراہن اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں شرفو لوہار کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس کا گھر اسپتال کے ساتھ تھا۔ میں نے اس کی تجہیز و تدفین کا انتظام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس دن شکیلہ کی عجب حالت ہو گئی تھی۔

وہ اچانک روتے روتے ہنسنے لگتی تھی۔ شرفو کی موت کے ساتویں دن مولانا آفاق صاحب اور میں عصر کی نماز کے بعد مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری گفتگو کا محور شکیلہ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب اب شرفو کی بیٹی کا کیا ہوگا؟ جوان لڑکی ہے ماں باپ بھی سر پہ نہیں ہیں۔"

"مولانا صاحب آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ بہرکیف اس کا کوئی نہ کوئی رشتے دار تو ہوگا۔ ان کو چاہیے کہ شکیلہ کی دیکھ بھال کریں۔" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب وہ دس سال کی تھی اس کی ماں فوت ہو گئی تھی۔ شرفو نے ہی اس کی پرورش کی ہے۔ میرے خیال میں کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کرے گا۔"

"چلیں جی اللہ بہتر کرے گا۔ اس کا بھی کچھ سوچتے ہیں۔"

پھر میں ان سے اجازت لے کر اسپتال کی طرف آ گیا۔ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو شکیلہ چھپر کے نیچے بیٹھی نظر آئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس کا باپ بھی بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ وہ میلا سا لباس پہنے گم صم بیٹھی تھی۔ وہ تنکوں کو اکٹھا کرتی پھر ان کو بکھیر دیتی۔ میں تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لی اور اسپتال میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

سورج مغربی افق کی طرف جھک گیا تھا۔ آسمان پہ گھیرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دور تک تاریکی چادر تنی ہوئی تھی۔ شام کی لالی نے بادلوں کو سنہرا کر دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسجد میں داخل ہو گیا۔ مولانا آفاق صاحب مسجد کے صحن میں جائے نماز پہ دو زانو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا رخ مسجد کے دروازے کی جانب تھا۔ ان کے آگے صفوں پہ دو آدمی موجود تھے۔ وہ ان سے گفتگو کر رہے تھے۔ مسجد میں نمازی کافی تعداد میں تھے۔

جماعت کا وقت ہو گیا تھا۔ مولانا صاحب نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم سب نے ان کی امامت میں مغرب کی نماز ادا کی۔ اسی اثنا میں ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ سب نمازی اپنے اپنے گھروں کی جانب جانے لگے۔ میں نے بھی مصافحہ کی غرض سے آفاق صاحب کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"ڈاکٹر احمد آفاق تھوڑی دیر رک جائیں۔ آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے بولے۔

"جو آپ کا حکم مولانا صاحب۔"
بارش تھوڑی تیز ہو گئی تھی۔ دونوں آدمی بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا صاحب نے ان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے مسجد کے اندر آ گئے۔ وہ آدمی بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے مسجد کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم سب مسجد میں بچھی صف پہ بیٹھ گئے۔ باہر بارش زور پکڑ چکی تھی۔

ہم پانچوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔
"ڈاکٹر صاحب یہ جمال اور کمال ہیں۔ دونوں بھائی شاہ پور سے آئے ہیں۔" آفاق نے کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

"جمال اپنی سوتیلی بیٹی کا نکاح کمال کے ساتھ پڑھوانا چاہتا ہے۔"
"اوہ۔"
میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"ہمارے معاشرے میں عورتوں کو جانور کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ جس کھونٹے سے دل چاہے باندھ دو۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔

"آفاق صاحب...... یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ آپ کو دخل نہیں دینا چاہیے۔" جمال نامی بندہ قدرے خفگی سے بولا۔

"کمال بھائی! چلو اب گھر چلتے ہیں۔ کل کسی اور مولوی سے نکاح پڑھوالیں گے۔ دنیا میں مولوی مر نہیں گئے ہیں۔"

وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر چلے گئے۔
بارش رک گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد مولانا آفاق صاحب نے سارا ماجرا مجھے سنایا۔ جمال نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد ایک بیوہ عورت سے حال ہی میں نکاح کیا تھا۔ اس عورت کی پندرہ سال کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جبکہ جمال کا ایک بیٹا پہلی بیوی سے تھا۔ اب جمال اپنے چالیس سالہ "کنوارے" بھائی سے اس کا نکاح پڑھوانا چاہتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! ہمارے معاشرے میں عورت کا بری طرح استحصال ہو رہا ہے۔ جب کہیں عورت کے ساتھ ایسا ہوتا دیکھتا ہوں۔ بہت افسوس ہوتا ہے۔ عورت کے احساسات و جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟" آفاق گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔

میں ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پہ حزن و ملال کی پرچھائیاں صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ گم صم بیٹھے کہیں دور خلا میں دیکھتے رہے۔ مجھے خاموش پا کر وہ کپکپاتے لہجے میں بولے۔ "ڈاکٹر صاحب! میرے سوالوں کے جواب آپ نے نہیں دیئے۔ میں جانتا ہوں ان کا جواب کوئی نہیں دے سکتا مگر معاشرے کے اس تاریک پہلو پہ ہمیں سوچنا ہوگا۔ غور کرنا ہوگا۔ عورت کا حق اسے دینا ہوگا۔ وہ حق جو اس سے چھین لیا گیا۔ اسے لوٹانا ہوگا۔" ان کی بات جونہی ختم ہوئی۔ میں نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر فرطِ عقیدت سے چوم لیا۔
"آفاق صاحب میں آپ سے متفق ہوں۔ آج آپ نے وہ باتیں کی ہیں۔ جنہیں ہم پسِ پشت ڈال چکے ہیں۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ہماری کافی باتیں ہوئیں۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میں اور آفاق صاحب مسجد سے اکٹھے باہر آئے تھے۔ بارش رک چکی تھی۔ تاہم آسمان پہ گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔
مسجد کے دروازے پہ ہم مصافحہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے اچانک بجلی چمکی۔ بادل زور سے گرجے۔ میری نظر اچانک شرفو لوہار کے چھپر کے نیچے بیٹھی شکیلہ پہ پڑی۔
"یہ پاگل ابھی تک یہاں ہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"جب اس کا دل چاہے گا چلی جائے گی۔ اچھا اب ہمیں اپنے اپنے گھر جانا چاہیے۔ بارش کا کچھ پتا نہیں ہے۔" آفاق صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑے جو کہ مسجد کے ساتھ ہی تھا۔ میں اسپتال آ گیا۔ رات کا کھانا تیار تھا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر اپنے اپنے بستر پہ لیٹ گئے۔ رخسانہ اور میری بہنیں باتیں کرتی رہیں۔ میں سو گیا تھا۔

☆☆☆

"کاشف...... کاشف۔" ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ رخسانہ کی آواز سن کر میں جاگ گیا۔ وہ مجھ پہ جھکی آہستہ آہستہ آوازیں دے رہی تھی۔
"کاشف باہر شرفو لوہار کے چھپر کے نیچے اس پاگل لڑکی کے چیخنے کی آوازیں آئی ہیں۔ آپ پتا کریں۔"
"رخسانہ میں نے صبح ڈیوٹی کرنی ہے۔ پلیز مجھے سونے دو۔"
"پلیز کاشف جا کر دیکھ آؤ۔"

باہر بادلوں کے گرجنے اور بارش کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”رخسانہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”کاشف سنو پھر آواز آئی۔“

”تم سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔“ کہہ کر میں نے کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

اگلی صبح حسبِ معمول فجر کی اذان کے وقت میری آنکھ کھلی۔ میں بستر سے اٹھا۔ فریش ہونے کے لیے واش روم چلا گیا۔ میں نے وضو کیا اور مسجد چلا گیا۔ وہاں نماز ادا کی اور واپس آ گیا۔ موسم اب قدرے صاف ہو گیا تھا۔ تاہم آسمان پہ بادلوں کی ٹولیاں ہوا کے دوش پہ اڑتی پھر رہی تھیں۔ گھر آیا تو ناشتا تیار تھا۔ ہم سب نے مل کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد چائے پی اور ڈیوٹی پہ آ گیا۔ مصروفیت میں دن گزر گیا۔ یہ پانچ ماہ بعد کا واقعہ ہے۔

وہ اک خوشگوار سی شام تھی۔ میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد گھر آیا۔ کچن میں رخسانہ اور نذیر علی کی بیوی سعدیہ کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی کچن کی طرف چلا گیا۔

”رخسانہ باجی... شرفو کی پاگل بیٹی کو بچہ ہونے والا ہے۔“ سعدیہ کی آواز سن کر میں ٹھٹک گیا۔

مجھے یہ سن کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ میں کچھ دیر کھڑا ان کی گفتگو سنتا رہا پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اب مجھے رخسانہ کا انتظار تھا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسے شاید میری گھر میں موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سعدیہ کو رخصت کرنے کے بعد سیدھی کمرے میں آ گئی۔

”کاشف آج ایک عجیب بات سنی ہے۔ میں حیران رہ گئی ہوں۔“

وہ میرے کچھ پوچھنے سے قبل ہی بتانے لگی۔

”کون سی بات؟“

”شرفو کی بیٹی حاملہ ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ابھی سعدیہ بتا کر گئی ہے۔ اسے محلے کی اماں بشیراں نے بتایا ہے۔“

”اوہ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”ویسے جس نے ایسا کیا ہے۔ بہت برا کیا ہے۔ اللہ سے ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔“

اس موضوع پہ ہماری کافی دیر بات ہوتی رہی۔ اس کے بعد رخسانہ رات کا کھانا بنانے کچن میں چلی گئی۔ اتنے میں عشاء... کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ میں نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔ نماز کے بعد میں گھر آ گیا۔ کھانے کے دوران بھی ہماری اسی موضوع پہ گفتگو جاری رہی۔

☆☆☆

انسان کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جنھیں بھولنا ناممکن ہوتا ہے۔ لوگوں کی زبان سے جو بات نکلتی ہے۔ وہ کسی حد تک سچی ہی ہوتی ہے۔ شکیلہ کے حاملہ ہونے والی بات اب ہر خاص و عام کی زبان پہ تھی۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ شکیلہ کبھی کبھار ہی اب نظر آتی تھی۔ وہ سردیوں کی یخ بستہ رات تھی۔ ہمارے کوارٹر کے بیرونی دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں بستر سے اٹھا اور دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

”کون ہے؟“

”ڈاکٹر صاحب دروازہ کھولیں۔“ نذیر علی نے گھبرائی آواز میں کہا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

”نذیر علی خیر تو ہے نا؟“

”کاشف صاحب اماں بشیراں شکیلہ کو اسپتال لے آئی ہے۔ وہ تکلیف میں ہے۔ میں آپ کو اور باجی رخسانہ کو لینے آیا ہوں۔“ میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر کمرے میں آ گیا۔ رخسانہ بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے میڈیسن والا بیگ اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر نذیر علی کے ہمراہ اس کے کوارٹر میں آ گیا۔ شکیلہ تکلیف سے چلا رہی تھی۔ میں نے اسے انجکشن لگا دیا اور نذیر علی کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد سعدیہ نے آ کر بتایا کہ شکیلہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔

”سعدیہ آپ جائیں اور اماں بشیراں کو ادھر بھیج دیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ جتنی تیزی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اماں بشیراں کمرے میں داخل ہوئی۔ میں انھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ پینسٹھ سال کے لگ بھگ تھیں۔ مجھے پہلی نظر میں وہ بہت شفیق لگیں۔ ”بیٹھ جائیں ماں جی۔“ میں نے خالی چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ماں جی آج جو کچھ یہاں ہوا۔ آپ نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کرنا۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا بچے کی پیدائش گھر میں ہوئی ہے۔ ہمارا یا اسپتال کا کسی کو نہیں بتانا اور صبح سورج نکلنے سے پہلے شکیلہ کو گھر لے جانا۔“

انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر میں نے انھیں کچھ میڈیسن دیں کہ شکیلہ کو کھلا دیں۔ وہ میڈیسن لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں کچھ دیر وہاں مزید رکا پھر رخسانہ کو ساتھ لے کر اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ میں اپنے بیڈ پہ لیٹا کافی دیر جاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

☆☆☆

بچے کی پیدائش کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد اماں بشیراں کا انتقال ہوا تو ان کے سوم والے دن مولانا آفاق نے محلے کے معتبر لوگوں کو مسجد میں اکٹھا کیا۔ میں بھی گیا تھا۔

مولانا صاحب پہلے تو اس زیادتی کا ارتکاب کرنے والے کو برا بھلا کہتے رہے۔ پھر وہ ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "بھائیو! ہمیں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ ہر وقت توبہ کرنی چاہیے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔ شرفو لوہار کی پاگل بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اب اماں بشیراں کی موت کے بعد بچے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟" وہ ذرا توقف کے بعد بولے۔ "شکیلہ کو اپنی خبر نہیں۔ اللہ ہم سب کے گناہ معاف کرے۔ آج میں نے سوچا ہے بچے کی پرورش میں خود کروں۔ تاکہ جانے انجانے میں بھی مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے تو اس نیکی کے صلے میں وہ بھی معاف ہو جائے گا اگر آپ میں سے کسی کو اعتراض ہو تو بتا دے۔" اپنی بات ختم کر کے وہ ہم سب کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

ان کی بات سن کر سب ان کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"مولانا صاحب آپ کا یہ فیصلہ ہمیں بہت اچھا لگا۔" گوٹھ کے ایک بزرگ نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ مولانا صاحب بچے کی پرورش اپنے ذمے لے لیں۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد میرا تبادلہ رحیم یار خان ہو گیا تھا۔ گو کہ اس واقعے کو سولہ سال گزر گئے تھے...... مگر مجھے اب بھی یاد تھا؟

میں بیڈ پہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو نذیر علی سامنے کھڑا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے گاڑی لینے لیاقت پور جانا تھا۔ اب میں فارغ ہوں۔ ابھی نکل چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نذیر علی! بس دو منٹ رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں کمرے میں آیا۔ اپنا پرس اٹھایا اور باہر آ گیا۔

کچھ دیر بعد ہم نذیر علی کی بائک پہ لیاقت پور پہنچ گئے۔

میں جب سامان رکھنے آیا تھا تو نذیر علی کے ساتھ جا کر ایک شوروم پہ گاڑی کی بات پکی کر لی تھی۔ نذیر علی نے اسی شوروم کے سامنے بائک روکی۔ ہم شوروم کے مالک کے آفس چلے گئے۔ اسے مطلوبہ رقم دی اور مہران کار لے کر شام کو واپس اسپتال آ گئے۔

☆☆☆

ہم رات کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ نذیر علی اور اس کی بیوی بھی آ گئے۔ انھوں نے گاڑی کی مبارکباد دی۔ رخسانہ نے ان کا منہ میٹھا کروایا۔ میں گھر کا سودا سلف اور مٹھائی لیاقت پور سے لیتا آیا تھا۔

اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ باتوں باتوں میں مولانا آفاق، شکیلہ اور اس کے بچے کا ذکر چھڑ گیا۔

"سعدیہ بتاؤ اس بچے کا کیا ہوا؟" رخسانہ نے پوچھا۔

"باجی شرفو کی بیٹی آپ کے جانے کے ایک سال بعد مر گئی تھی۔ جبکہ مولانا صاحب دو سال پہلے فوت ہوئے ہیں۔ ان کو فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا۔ ان کا آخری وقت بہت برا گزرا ہے۔ وہ بچہ اب سترہ سال کا ہونے والا ہے مگر بیس کا لگتا ہے۔ گورا چٹا رنگ ہے اور خوب قد کاٹھ نکالا ہے۔ شکل و شباہت اور عادات و اطوار میں بالکل آفاق جیسا ہے۔ مولانا صاحب نے اس کی ایک باپ بن کر پرورش کی ہے۔ کھلایا پلایا۔ اسے دس جماعتوں تک تعلیم دلوائی۔"

مجھے مولانا صاحب کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے سوچا صبح اس لڑکے سے ملوں گا تو تعزیت کروں گا۔

وہ دونوں کافی دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔ ہم بھی سو گئے۔

صبح جمعہ تھا۔ میں اسپتال سے بارہ بجے چھٹی کر کے کوارٹر آ گیا۔ رخسانہ چھت پہ کپڑے ڈالنے گئی ہوئی تھی۔ میں بھی چھت پہ چلا گیا۔ مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔

میں اور رخسانہ چھت پہ کھڑے تھے۔

"کاشف! وہ دیکھو مجھے لگتا ہے یہی شکیلہ کا بیٹا ہے۔"

میں نے مسجد کی طرف دیکھا۔ صحن میں کھڑے لڑکے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں حیرت در آئی۔ مجھے ایسے لگا آفاق صاحب جوان ہو گئے ہیں۔ بالکل وہ لڑکا ہوبہو آفاق صاحب جیسا تھا۔ کچھ بھی فرق نہیں تھا۔

بددعا

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
ایک پرانا واقعہ لکھ کر بھیج رہی ہوں کہ ہمارے ارد گرد رہنے والے کس طرح اپنے چہروں پر ملمع سجائے ہوئے ہیں۔ کون کیا ہے اس بارے میں لوگ زیادہ فکرمند بھی نہیں ہوتے اس لئے میں نے اس واقعے کو کہانی کی شکل میں لکھا ہے اگر مناسب سمجھیں تو سرگزشت میں جگہ دے دیں۔

شمائلہ احمد
(کراچی)

ہم اس سوسائٹی میں آئے تو بہت کم مکان بنے ہوئے تھے۔ وہ علاقہ ابھی زیر تعمیر تھا ابو نے بہت پہلے اس سوسائٹی میں دو سو چالیس گز کا ایک پلاٹ لے کر ڈال دیا تھا۔ پھر جب وہاں بجلی پانی اور گیس پہنچی تو انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے وہ مکان بنانا شروع کر دیا۔

ہم لوگ کرائے کے گھر میں رہتے تھے اور اچھی بھر رقم کرائے کی مد میں مل جاتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ ابو کی آدھی سے زیادہ تنخواہ اس میں خرچ ہو جاتی تھی۔

امی ابو سمیت ہمارے گھر میں چھ افراد تھے۔ سب سے بڑی میں تھی، مجھ سے چھوٹی نورین، پھر شائستہ اور سب سے چھوٹا انور تھا۔

انور بہت منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے امی اور ابو کا بہت لاڈلا تھا۔ شائستہ ہمیشہ اس بات پر چڑ جاتی تھی کہ امی یہ امتیازی سلوک کیوں کرتی ہیں۔

میں اسے سمجھاتی تھی کہ ایک تو وہ سب سے چھوٹا ہے پھر ہمارا اکلوتا بھائی ہے اس لیے اس کی محبت تو میرے دل میں ہے۔

میں ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھی۔ نورین آٹھویں کلاس میں، شائستہ پانچویں میں تھی اور انور نے ابھی اسکول جانا شروع کیا تھا۔ امی نے ضد کر کے اسے شہر کے ایک بہترین انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ دلایا تھا اس کے داخلے کے لیے ابو کو آفس سے قرض لینا پڑا تھا۔ امی نے اپنا کچھ زیور بیچ دیا تھا۔

کرایہ بچانے کے لیے ہم لوگ ابھی آدھے ادھورے گھر میں ہی شفٹ ہو گئے۔ ابو نے اس کا نقشہ تو بہت بہترین بنوایا تھا لیکن ابھی صرف تین کمرے ہی بنے تھے، دیواروں پر پلاسٹر بھی نہیں تھا اور چھت بھی رکی تھی بس اس میں یہ خوبی تھی کہ اس کا لان بہت بڑا تھا۔ لان کیا، وہ خالی جگہ تھی جو تعمیر ہونے سے رہ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے اسے لان بنا لیا تھا۔

ہماری گلی میں گنتی کے چھ گھر تھے۔ ہمارے گھر کے دائیں بائیں کوئی گھر نہیں تھا۔ صرف کارنر پر ایک گھر تھا جس میں کوئی ٹھیکے دار صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے اس گھر کو بہت بہترین انداز میں تعمیر کرایا تھا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں جو کسی کالج میں پڑھتی تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔

ہمارے گھر کے عین سامنے خالہ امینہ کا گھر تھا۔ وہ بیوہ تھیں اور اپنے بیٹے عرفان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان سے دو پلاٹ چھوڑ کر صمد صاحب رہتے تھے۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازمت کرتے تھے ان کے چھوٹے چھوٹے دو بیٹے تھے جنہیں وہ اپنی بائیک پر بٹھا کر اسکول چھوڑنے جاتے تھے۔ ان کے برابر میں ابرار صاحب رہتے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا بڑا تھا اور کسی اسکول میں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔

ان مکانوں کے پیچھے ایک بڑا میدان تھا پھر وہ خالی پلاٹ تھے جنہیں ابھی تک تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ اس علاقے سے خاصے فاصلے پر ایک دوسری سوسائٹی تھی جو خاصی آباد تھی۔ اس سوسائٹی کے لڑکے میدان میں کرکٹ کھیلتے تھے یا پھر فٹ بال۔ ان لوگوں نے باقاعدہ میدان کی صفائی کر کے اسے کھیلنے کے قابل بنا دیا تھا۔

خالہ رضیہ چونکہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے رہتی تھیں اس لیے امی سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے شوہر کسی پرائیویٹ فرم میں معقول ملازمت کرتے تھے اس لیے انہوں نے وفات سے پہلے مکان بنا لیا تھا۔ بینک میں ان کا کچھ پیسا تھا اور لیاقت آباد کی مارکیٹ میں انہوں نے دو دکانیں بھی خرید لی تھیں جن کا اچھا خاصا کرایہ آ جاتا تھا جس کی وجہ سے خالہ رضیہ کو کوئی معاشی پریشانی نہیں تھی۔ ان کا بیٹا عرفان ان دنوں ایم بی اے کر رہا تھا۔ وہ خاصا سوبر اور لیے دیے رہنے والا نوجوان تھا۔ اس سے اکثر سامنا ہو جاتا تھا۔ وہ بے چارہ نظریں جھکائے نزدیک سے گزر جاتا۔

عرفان خاصا خوب رو اور جامہ زیب نوجوان تھا۔ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ مجھے خالہ رضیہ نے بتایا تھا کہ وہ شہر کے ایک معروف جم میں جا کر ایکسرسائز کرتا تھا۔ پھر وہ مسکرا کر کہتیں۔ ”آج کل کے لڑکوں کے شوق ہی نرالے ہیں۔ سلمان خان کو دیکھ کر باڈی بلڈنگ کی ایک وبا چل نکلی ہے۔ جسے دیکھو وہ ایکسرسائز کرتا نظر آتا ہے۔“

ان کی اس بات سے میں بھی متفق تھی۔ میرے کئی کزن بھی اس ”مرض“ میں مبتلا تھے۔

مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی تو نہیں ہے بلکہ میری کزنز اور جاننے والے بھی کہتے ہیں کہ شائلہ بہت زیادہ خوب صورت اور پرکشش ہے۔ وہ ایسی عمر ہوتی ہے کہ ہر لڑکی کے دل میں چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش بیدار ہو جاتی ہے۔ میں کافی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی خود ہی اپنے حسن کو سراہتی رہتی تھی۔ میرا قد درمیانی لیکن جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ رنگت سرخ و سفید تھی اور بال بھورے تھے۔ ہم سب بہنیں ہی خوب صورت اور پرکشش تھیں۔ اصل میں امی بہت خوب صورت تھیں۔ ان دونوں کی خوب صورتی ہمارے حصے میں آ گئی تھی۔

مجھے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ میں باہر نکلتی تھی تو لڑکوں کی ہوس ناک نگاہیں میرا طواف کرتی رہتی تھیں۔ ایسے میں عرفان کی بے نیازی مجھے بہت کھلتی تھی۔ وہ تو میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تو میرے

ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ میرے نمبر اتنے نہیں تھے کہ مجھے کسی میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا۔ پرائیویٹ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن مل سکتا تھا لیکن وہاں کی فیس اتنی تھی کہ ابو کسی صورت افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم ایم بی بی ایس کو چھوڑو اور بی فارمیسی میں ایڈمیشن لے لو۔ آج کل بی فارمیسی کی بھی بہت اہمیت ہے۔

مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ خاصی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

نورین ان دنوں میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ اس نے بھی خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ اب دیکھنے والے نورین کے حسن کی زیادہ تعریف کرتے تھے۔ وہ میری بہن تھی اصولاً تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے عجیب جلن ہوتی تھی۔

اس دوران میں ہمارا علاقہ بھی خوب آباد ہو گیا تھا۔ ہماری گلی کے تقریباً سبھی مکان بن گئے تھے اور آباد بھی ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ پیچھے والی گلی بھی آباد ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے کارنر والے مکانوں میں دکانیں بھی بنالی تھیں۔ ان میں کریانہ، جنرل اسٹور، دودھ دہی کی دکانیں اور میڈیکل اسٹور شامل تھے۔ ہماری گلی کے دوسرے نکڑ پر جو خاندان آکر آباد ہوا وہ... اچھے لوگ نہیں تھے۔ باپ سبزی منڈی میں شاید پیاز، لہسن کا آڑھتی تھا۔ ان کے گھر میں دو لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ لڑکیوں نے تو میٹرک بھی کر لیا تھا لیکن لڑکے میٹرک بھی نہ کر پائے تھے۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی اس لیے دونوں لڑکے کھلے ہاتھوں خرچ کرتے اور دن بھر یا تو موٹر سائیکلوں پر آوارہ گردی کرتے یا پھر گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر آنے جانے والی لڑکیوں پر آوازیں کستے۔

بڑے بیٹے کا نام تو شاید شاہد یا ماجد تھا لیکن وہ لڈن کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے محلے میں باقاعدہ غنڈہ گردی شروع کر دی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس علاقے کا پُرسکون ماحول خراب ہو گیا تھا۔

میں نے فارمیسی کے ساتھ ساتھ انگلش لینگویج کا کورس بھی شروع کر دیا۔ مجھے اس سلسلے میں کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے امی سے کہا۔ ”امی میں شام کو ٹیوشن پڑھنا چاہتی ہوں۔“

”کیسی ٹیوشن بیٹا۔“ خالہ رضیہ نے پوچھا۔ وہ بھی اس وقت موجود تھیں۔

”خالہ! میں نے انگلش لینگویج میں ایڈمیشن لیا ہے۔ اس لیے مجھے ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ امی نے کہا۔ ”تم بی فارمیسی تو کر رہی ہو نا پھر تمہیں مزید بوجھ لادنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ارے شاہدہ بہن!“ رضیہ خالہ نے کہا۔ ”اس میں پریشانی کیا بات ہے۔ رونی، شائلہ کو پڑھا دے گا۔“ وہ عرفان کو پیار میں رونی کہتی تھیں۔

”اس بے چارے کو اپنی ہی پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی ہے تو وہ......“

”اس کا آخری سمسٹر ہے۔“ خالہ نے کہا۔ ”وہ اگلے مہینے فارغ ہو جائے گا۔“ پھر وہ مجھ سے بولیں۔ ”تم فکر مت کرو بیٹا، میں رونی سے کہہ دوں گی۔“

اس بہانے مجھے خالہ رضیہ کے گھر روزانہ جانے کا بہانہ مل گیا۔ عرفان اتنا کم گو اور بورنگ تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا۔ وہ ہنسی مذاق بھی کرتا تھا اور مجھ سے بے تکلف ہو کر بات بھی کرنے لگا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ گئے۔ اس نے بھی کھل کر تو اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار نہیں کیا لیکن بہت سے معاملات میں زبان سے کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ زبان کی بجائے آنکھیں بولتی ہیں۔ میں اس شرم میں اس سے بات نہیں کر رہی تھی کہ میں لڑکی تھی۔ اظہار تو پہلے اس کو کرنا چاہیے تھا۔ جہاں تک عرفان کا سوال تھا وہ ان معاملات میں بالکل کورا تھا۔

نورین اب فرسٹ ایئر میں آ چکی تھی اور اب تو وہ حسن میں مجھے بھی بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ اسے کسی نے مشورہ دیا تھا کہ تم پری انجینئرنگ کرو۔ آج کل لڑکیوں کے لیے انجینئرنگ کے شعبے میں بہت گنجائش ہے۔ اس نے پری انجینئرنگ میں ایڈمیشن تو لے لیا لیکن وہ شروع ہی سے میتھس میں کمزور تھی۔ عرفان کا میتھمیٹک بھی بہت اچھا تھا۔ یوں وہ بھی عرفان کی شاگرد بن گئی اور روزانہ اس سے میتھس پڑھنے لگی۔

نورین میرے برعکس بہت شوخ و چنچل تھی۔ اس نے چند ہی دنوں میں عرفان کو اپنی باتوں سے متاثر کر لیا۔ میں دیکھتی تھی کہ نورین جب عرفان کے سامنے آتی تھی اس کا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ مجھے بہت ناگوار لگتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ عرفان اسے اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہے۔

ایک دن میں یونیورسٹی سے واپس آرہی تھی تو لڈن اوراس کے بدمعاش ساتھی گلی کے نکڑ پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر لڈن نے اوباش انداز میں سیٹی بجائی اور سگریٹ کا بھرپور کش لیا اور دھواں میری طرف خارج کرتے ہوئے گنگنایا گورے گورے مکھڑے پر کالا کالا چشمہ۔

میں کوئی جواب دیئے بغیر پیر پٹختی ہوئی وہاں سے گھر آگئی۔ گھر آنے کے بعد میرا موڈ کافی دیر تک خراب رہا۔

تھوڑی دیر میں عرفان ایک ڈش میں کھیر لے کر آگیا۔ خالہ رضیہ جب بھی اس قسم کی کوئی چیز بناتی تھیں، ہمارے گھر ضرور بھیجتی تھیں۔

عرفان کو دیکھ کر میرا موڈ بہتر ہوگیا۔ میں نے فوراً چمچہ لے کر کھیر کھالی۔ کھیر تو خالہ رضیہ یوں بھی بہت مزیدار بناتی تھیں اور اکثر بناتی تھیں کہ عرفان کو کھیر بہت پسند تھی۔

میں نے اسے چڑانے کو کہا۔ ”خالہ رضیہ کھیر میں میٹھا ڈالنا بھول گئی ہیں یا......“

”میٹھا کم ہے؟“ عرفان نے حیرت سے کہا۔ ”ایسا کرو تم اپنی انگلی ڈش میں اچھی طرح گھماؤ، کھیر میٹھی ہو جائے گی۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

میں جھینپ کر رہ گئی۔ وہ دوسرے الفاظ میں میرے حسن اور خوب صورتی کی تعریف کر رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ لڈن کی حرکت سے ہونے والی ساری کوفت عرفان کے اس جملے سے ختم ہوگئی۔

اسی وقت نورین گھر میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”نورین کیا بات ہے، سب خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت کیسی باجی! محلے کا سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے وہ کم بخت لڈن راستے میں بیٹھا ہر آنے جانے والی لڑکی کو چھیڑتا ہے، آوازیں کستا ہے۔ اب اس نے یہ حرکت کی تو میں بھی اسے مزہ چکھا دوں گی۔ اپنی چپل اتار کر سرِعام اسے اتنا ماروں گی کہ وہ ساری آوارگی بھول جائے گا۔“

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گی آپی!“ انور نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے نمٹ لوں گا۔“

”تم...... تم اس گینڈے سے نمٹو گے؟“ نورین کو ہنسی آگئی۔

انور اب پانچویں میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ لڈن جیسے کسی بدمعاش سے نمٹ سکتا تھا۔

”میں دیکھتا ہوں کل سے وہ نکڑ پر کیسے بیٹھتا ہے؟“ انور نے غصیلی آواز میں کہا۔

”او پودنے!“ شائستہ نے اسے چڑایا۔ ”محلے کے بڑے بڑے لڑکے اس سے ڈرتے ہیں اور تم......“

”تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔“ انور نے اسے گھورا۔

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“ میں نے کہا۔ انور صرف مجھ سے یا امی سے ڈرتا تھا۔ ہماری کوئی بات رد نہیں کرتا تھا۔

”لیکن باجی......وہ......“

”میں نے کہا نا کہ تم کچھ نہیں کرو گے۔ میری ایک دوست کے بھائی پولیس میں ہیں۔ میں کل اس سے بات کرتی ہوں۔ اس لڈن نے تو ہمارا جینا حرام کردیا ہے۔“

”کل سے میں تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ کر آؤں گا اور واپسی میں تمہیں وہاں سے گھر بھی لاؤں گا۔“ انور نے نورین سے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

”تم میں عقل تو نام کو نہیں ہے۔“ امی نے کہا۔ ”انور کے سامنے یہ بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”امی! مجھے کیا پتا تھا کہ انور اندر کمرے میں ہے ورنہ میں یہ بات ہی نہ کرتی۔ ویسے بھی باجی نے اسے منع کردیا ہے۔ وہ لڈن سے الجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“ نورین نے منہ بنا کر کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

یہ دو دن بعد کی بات ہے۔ میں یونیورسٹی جارہی تھی کہ مجھے نکڑ پر لڈن نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس منحوس کی شکل ہی ایسی تھی۔ شکل تو خیر اللہ تعالیٰ بناتا ہے لیکن حرکتیں تو اس نے اپنی خود بنائی تھیں۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب اگر اس نے کوئی چھیڑ چھاڑ کی تو میں اس کے گھر جا کر اس کی شکایت کروں گی۔ اس پر بھی یہ باز نہ آیا تو اپنی دوست کے پولیس آفیسر بھائی سے شکایت کردوں گی۔ میں معاملے کو بڑھا کر محلے میں تماشا بنانا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے بات کو پولیس تک نہیں پہنچنے دینا چاہتی تھی۔

میں لڈن کے نزدیک سے گزری تو اس نے ہانک لگائی۔ ”چلو چھیاں چھیاں چھیاں، چلو چھیاں......“

میں ایک دم رک گئی اور اس کی طرف گھورتے ہوئے بولی۔ ”آخر تمہارا پرابلم کیا ہے؟“

”وہ یار میرا خوشبو کی طرح......“ وہ اپنی ہی دھن میں مست تھا۔

”شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟“ میں

نے بپھر کر کہا۔
وہ پھر اپنی مکروہ آواز میں گنگنایا۔ ''شرافت چھوڑ دی میں نے۔''
میں نے اس کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
اس کے کسی دوست نے کہا۔ ''یار آج تو بہت غصے میں تھی تیری چھمیاں!''
''وہ غصے میں تو اور بھی ظالم لگتی ہے پیارے۔'' لڈن کی آواز آئی۔
میں یونیورسٹی پہنچی تو میرا موڈ خراب تھا۔ اس دن ناہید بھی نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں بھی دو تین پیریڈ چھوڑ کر گھر واپس آگئی۔ ناہید کے بھائی ارشد پولیس میں ایس ایس پی تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں سیل فون پر ناہید سے بات کروں پھر میں نے خود ہی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں ابھی اس معاملے میں پولیس کو ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے میں لڈن کے آدھی باپ سے بات کرنا چاہتی تھی اگر وہ بھی بیٹے کو لگام ڈالنے میں ناکام رہا تو میں ناہید سے رابطہ کرتی۔
واپسی میں پھر وہی سین تھا، لڈن تھڑے پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کے کش لے کر ہانک لگائی۔ ''او جانے والے۔ رک جا ذرا۔''
میں ایک دم رک گئی اور چیخ کر بولی۔ ''تم آخر چاہتے کیا ہو؟''
''میں تمہیں چاہتا ہوں جان۔'' اس نے اوباش انداز میں اپنی دائیں آنکھ دبا کر کہا۔ ''اگر تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو تو دوسروں کے سامنے میں ایسی باتیں کیوں کروں؟'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ گزشتہ دو ہفتے سے میرا اسیل نمبر مانگ رہا تھا۔
''تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو، تم پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔''
''ایک دفعہ پیار سے سمجھا دو، قسم سے پیدا کرنے والے کی اگر نہ مانوں تو کہنا۔''
''میں کہتی ہوں میرا راستہ چھوڑ۔'' میں نے بپھر کر کہا۔
لڈن نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
میں غصے میں لرزنے لگی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،

جھیل کیسے بنتی ہے

جھیلوں کے لیے عموماً دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک پانی اور دوسری وہ جگہ جہاں وہ اکٹھا ہو یا اسے اکٹھا کیا جائے۔ دنیا میں جھیلیں کسی اور طریقے کی نسبت زیادہ تر گلیشیئرز کے باعث وجود میں آئیں۔ اس طرح کی جھیلوں کو ''Glacial Lakes'' کہتے ہیں۔ اسی طرح اونچے پہاڑوں کی اترائیوں (وادیوں) میں واقع جھیلیں ''Alpine Lakes'' کہلاتی ہیں۔ یورپ میں ایسی جھیلوں کو ''Trans'' کہتے ہیں جب کہ مٹی اور برف کے تودوں کے گرنے کی وجہ سے بننے والی جھیلیں ''Barrier Lakes'' کہلاتی ہیں۔ جھیلیں آہستہ آہستہ بہاؤ کے حامل دریاؤں اور سمندروں کے قریب نچلی سطح کے علاقوں میں بھی عموماً پائی جاتی ہیں۔ ایسی جھیلوں کو ''Oxbows'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرتی طور پر چڑھنے والے بڑے چٹانوں پر مشتمل جھیلیں ''Tectonic Lakes'' کہلاتی ہیں۔ اسی طرح بعض جھیلیں ایسے علاقوں میں بنتی ہیں جہاں چونے کا پتھر گھل کر خلاء اور گڑھا بناتا ہے اس طرح کی جھیلوں کو ''Karast Lakes'' کہتے ہیں۔ زیر زمین پانی بھی چونے کے پتھر کو گلا کر زیر زمین جھیلیں بناتا ہے علاوہ ازیں جھیلیں آتش فشاں کے پھٹنے سے بھی بنتی ہیں اور کئی ایک جھیلیں مصنوعی طور پر بھی بنائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: راحت علی۔ کراچی

اس بک کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔
”تیری یہ ہمت؟“ لڈن چیخ کر بولا۔ ”میں نے تھپڑ مارا تو مر جائے گی۔“
”تو مجھے ہاتھ تو لگا کر دیکھ۔“ میں نے کہا۔ ”پھر دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتی ہوں۔“
”اچھا!“ اس کے لہجے میں تحقیر تھی۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے تھپڑ مارنے کو ہاتھ اٹھا لیا۔
وہ مجھے تھپڑ مارنے ہی والا تھا کہ میری پشت سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
میں.... چونک کر پلٹی تو میرے پیچھے عرفان کھڑا تھا۔
اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم ایک طرف ہو جاؤ شائلہ۔“
اس لمحے اس کے لہجے میں ایسا تحکم تھا کہ میں گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئی۔
لڈن کا ہاتھ ابھی تک عرفان کی گرفت میں تھا۔ عرفان نے اس کے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا کہ لڈن اس سے ٹکرا گیا۔ عرفان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر بال پکڑ لیے اور اس کی پیشانی پر اتنی زور سے گھونسا مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔
”آئندہ اگر تو نے کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں تجھے دیکھنے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ عرفان نے تند لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تم جاؤ شائلہ۔“
میں فوراً وہاں سے کھسک لی۔
میں شام کو گھر کی طرف روانہ ہوئی تو تھڑے پر لڈن موجود نہیں تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ گویا عرفان کے ایک ہی تھپڑ نے اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔
میں گھر پہنچی تو امی کو دیکھ کر چونک اٹھی۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ نورین بھی بہت پریشان تھی۔
”خیریت تو ہے امی؟“ میں نے پوچھا۔
”خیریت نہیں بیٹا!“ امی نے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے لڈن اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ رضیہ باجی کے گھر آیا تھا اس نے عرفان کو انتہائی غلیظ گالیاں دیں اور اسے باہر نکلنے کو کہا۔ رضیہ باجی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بولیں۔ ”دفع ہو جا یہاں سے۔“
”ابے مرد ہے تو باہر آ!“ لڈن نے کہا۔ ”کیا اپنی امی کے پلو میں چھپا بیٹھا ہے۔“
عرفان نے باہر نکلنے کی کوشش کی، رضیہ باجی نے اس کا راستہ روکا تو وہ چھت پر چڑھ کر باہر نکل گیا۔ عرفان کے پاس ہاکی تھی۔ اس نے ہاکی سے لڈن اور اس کے دوستوں پر حملہ کر دیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور عرفان اکیلا تھا۔ وہ بہت بری طرح زخمی ہو گیا ہے بیٹا۔ رضیہ باجی بہت پریشان ہیں۔
”عرفان اس وقت کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ اسپتال میں ہے۔ رضیہ باجی اور تمہارے ابو اس کے پاس ہیں۔ بس دعا کرو کہ اسے کوئی شدید چوٹ نہ آئی ہو۔“
میں نے بیگ سے اپنا سیل فون نکالا اور ابو کا نمبر ملانے لگی لیکن ان کا سیل فون شاید آف تھا یا پھر نیٹ ورک پرابلم کر رہا تھا۔
”ابو کا نمبر تو مل ہی نہیں رہا ہے۔“ میں نے کہا۔
”تمہیں کیا پریشانی ہے؟“ نورین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے تمہیں؟“
”کیا؟“ میں نے حسرت سے اسے دیکھا۔ ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو نورین؟“
”جو کچھ ہوا تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔“ نورین چیخ کر بولی۔
”میری وجہ سے ہوا ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
”ہاں تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ نورین نے کہا۔ ”نہ تم صبح عرفان کو اکساتیں نہ وہ لڈن کے گھر آتے، نہ......“
”تم ہوش میں تو ہو نورین؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”عرفان کو میں نے اکسایا تھا؟“
”ہاں، تم نے اکسایا تھا۔“ نورین نے اسی لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کیا ضرورت تھی اس اوباش لڈن کے منہ لگنے کی؟“
”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں لڈن کے منہ کیوں لگوں گی۔ پھر تمہیں اتنی پریشانی کیوں ہے؟“
”کیا مجھے پریشانی نہیں ہونا چاہیے؟“ نورین نے پوچھا۔
”پریشان تو ہم بھی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پریشان نہیں ہو۔ عرفان اگر میری وجہ سے زخمی ہوا ہے تو مجھے زیادہ پریشان ہونا چاہیے۔“
”شائلہ ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔“ امی نے کہا۔ ”تجھے

کس بات کی پریشانی ہے؟"

نورین کوئی جواب دیے بغیر روتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھی تو انور بولا۔ "باجی آپ ٹھہریں میں دیکھتا کون ہے؟"

انور نے دروازہ کھولا تو لڈن کا آڑھتی باپ دروازے پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک بار پھر غصہ آگیا۔ انور نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ "جی فرمایئے؟"

"مجھے تمہارے ابو سے بات کرنا ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" انور نے تند لہجے میں کہا۔ "وہ اس وقت اسپتال میں ہیں۔"

لڈن کا باپ واپس چلا گیا۔

"امی! ابو کا سیل نمبر تو مل نہیں رہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ میں خود ہی اسپتال چلی جاؤں۔" میں نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔" نورین چمک کر بولی۔

"آخر تمہارا پرابلم کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تم عرفان کی کچھ زیادہ ہی خیر خواہ ہو؟" پھر میں نے انور سے کہا۔ "چلو تم میرے ساتھ اسپتال چلو۔"

انور فوراً تیار ہو گیا۔

ہمارے گھر کے نزدیک عباسی شہید اسپتال تھا۔ عرفان وہیں تھا۔

ابو اسپتال کے کوریڈور میں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر میری طرف آگئے اور بولے۔ "تم یہاں کیوں آگئیں؟"

"ابو آپ کا سیل آف جا رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ......"

"میرے سیل فون کی بیٹری جواب دے گئی ہے۔" ابو نے بتایا۔

"اب عرفان کی طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔"

"عرفان کی کلائی میں فریکچر ہو گیا ہے اور سر پر گہرا زخم ہے۔ اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے لیکن حالت اب خطرے سے باہر ہے۔" پھر وہ تشویش سے بولے۔ "تم لوگوں کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا بس اب گھر جاؤ۔"

"لیکن ابو وہ......"

"میں نے کہا نا کہ اب تم گھر جاؤ۔" انہوں نے جیب سے کچھ روپے نکالے اور انور کو دے کر بولے۔ "فوراً گھر جاؤ، ابھی تھوڑی دیر میں میں بھی آ رہا ہوں۔"

ابو کا لہجہ ایسا تھا کہ مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔

اسپتال سے باہر نکل کر عرفان نے رکشا لیا اور رکشا میں بیٹھ کر مجھ سے بولا۔ "باجی ابو کا رویہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے تو ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

ہم گھر پہنچے تو امی نے پوچھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے عرفان کی؟"

"انہیں زیادہ شدید چوٹ نہیں آئی ہے۔ ان کی حالت اب ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد گھر بھی آجائیں گے۔"

"مگر ان کے پاس کون رہے گا؟" نورین نے کہا۔

"ابو کو یہ تو سوچنا چاہیے کہ عرفان ان ہی کی بیٹی کی وجہ سے اس حال کو پہنچے ہیں۔"

"تمہارے ابو صبح گھر سے نکلے ہیں۔ اب رات کے نو بج رہے ہیں وہ بھوکے پیاسے وہیں بیٹھے رہیں گے؟" امی نے نورین کو گھورتے ہوئے کہا۔ "وہ عرفان کے لیے جو کچھ کرسکتے تھے انہوں نے کر دیا۔"

"واہ امی واہ۔" نورین نے کہا۔ "ایک شخص کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ وہ بھی آپ کی بیٹی کی وجہ سے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ......"

"نورین!" امی نے اسے جھڑکا۔ "تمہیں اتنی فکر کیوں ہے؟"

نورین خاموش ہو گئی۔ اس کے انداز سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے امی کی بات ناگوار گزری ہے۔ میں خود بھی حیران تھی کہ آخر نورین کو ہوا کیا ہے؟ پریشان تو ہم سبھی تھے لیکن وہ تو کچھ زیادہ ہی پریشانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاید وہ زیادہ حساس تھی اور بہت چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بہت زیادہ محسوس کرتی تھی۔ میں نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد ابو آگئے۔ وہ بہت تھکے تھکے اور نڈھال لگ رہے تھے۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر آئے تو امی نے کھانا لگا دیا اس دوران میں ابو نے عرفان کے بارے میں ایک بات بھی نہیں کی۔ ہم میں سے کسی کی ہمت بھی نہیں تھی کہ ابو سے کچھ پوچھ سکتے۔

ابو کو چائے کا کپ دیتے ہوئے امی ہی نے پوچھا۔

"اب کیسا ہے عرفان؟"

"وہ ٹھیک ہے۔" ابو نے جواب دیا۔ "جب ڈاکٹرز کو معلوم ہوا کہ عرفان جھگڑے میں زخمی ہوا ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو پولیس کیس ہے اور انہوں نے پولیس کو بلا لیا۔ میں اس وقت تک اسپتال پہنچ چکا تھا۔ انور نے مجھے آفس میں ٹیلی فون کر دیا تھا۔"

پولیس انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کا زخمی سے کیا رشتہ ہے؟"

"یہ میرے محلے میں رہتا ہے۔ میرے بچوں کی طرح ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اسے کب سے جانتے ہیں؟" انسپکٹر عجیب سے لہجے میں کچھ سوالات کر رہا تھا۔

"میں اسے گزشتہ پانچ سال سے جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کی جیبوں کی تلاشی لو۔" انسپکٹر نے ایک ماتحت سے کہا۔ اس کی جیب سے اس کا پرس اور کچھ کاغذات برآمد ہوئے۔ پولیس نے وہ سب اپنی تحویل میں لے لیے۔ حیرت تو مجھے رضیہ پر تھی۔ اس نے اس بات پر ذرا بھی احتجاج نہیں کیا کہ عرفان کی تلاشی کیوں لے رہے ہو بلکہ اس نے انسپکٹر سے آنکھ بچا کر عرفان کا سیل فون مجھے دے دیا۔ میں نے بلا سوچے سمجھے سیل فون اپنی جیب میں ڈال لیا۔

انسپکٹر نے سپاہی سے کہا۔ "اس کی اچھی طرح تلاشی لو۔ اس کے پاس سیل فون ضرور ہوگا۔"

میں حیرت سے پولیس کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ ایک شخص شدید زخمی ہے اور پولیس اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہی ہے۔

میں نے ناگواری سے کہا۔ "مجھے آپ کے رویے پر افسوس ہے آفیسر۔ عرفان زخمی ہے اور آپ اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہے ہیں، آخر کیوں؟"

"آپ کی اس "کیوں" کا جواب شدید زخمی ہوش میں آنے کے بعد خود دے گا یا پھر آپ اس کی ماں سے پوچھیں۔"

باتیں جاری تھیں کہ دستک ہوئی۔

میں یہ سمجھی کہ لڈن کا باپ پھر آیا ہے لیکن دروازے پر پولیس انسپکٹر تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کے چار کانسٹیبل بھی تھے۔

ابو نے پریشانی سے پوچھا۔ "جی فرمایئے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ عرفان کے گھر کی چابی آپ کے پاس ہوگی؟" انسپکٹر نے کہا۔

"عرفان کے گھر کی چابی؟" ابو نے کہا۔

"جی ہاں میرے پاس چابی ہے۔"

"وہ چابی مجھے دے دیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "ہمیں عرفان کے گھر کی تلاشی لینا ہے۔"

"لیکن انسپکٹر صاحب آپ......"

"کوئی لیکن ویکن نہیں صدیقی صاحب۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میرے پاس سرچ وارنٹ ہیں۔ آپ لوگ مجھے گھر کی چابی نہیں دیں گے تو مجھے مجبوراً دروازہ توڑنا پڑے گا۔ آپ کے لیے پولیس سے تعاون کرنا ہی بہتر ہے۔"

امی نے گھر کی چابیاں اٹھا کر دے دیں۔ چابیاں لے کر انسپکٹر اور اس کے ماتحت گھر میں داخل ہو گئے۔

"یہ...... یہ...... سب کیا ہو رہا ہے ابو؟" نورین نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ تو پولیس والے ہی بتائیں گے۔" ابو نے سرد لہجے میں کہا۔

"پولیس کو لڈن کے باپ نے پیسے کھلا دیے ہوں گے ابو۔" نورین نے کہا۔ "پولیس والے تو پیسے لے کر کسی کو بھی مجرم ثابت کر سکتے ہیں۔"

پولیس والے تقریباً ایک گھنٹے تک عرفان کے گھر کی چھان بین کرتے رہے۔ پھر وہ لوگ پلاسٹک کے شاپر میں کچھ چیزیں لے کر باہر آ گئے۔

انسپکٹر ایک دفعہ پھر ہمارے دروازے پر آیا اور ابو سے بولا۔ "آپ مجھے شریف آدمی لگتے ہیں اس لیے میں اس کیس میں آپ کو انوالو نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے کافی ثبوت اکٹھے کر لیے ہیں بس مجھے عرفان کا سیل فون نہیں مل رہا ہے۔ اس میں اس کے سارے کانٹیکٹ ہوں گے۔ ان کے ذریعے ہم باقی لوگوں کو بھی پکڑ سکیں گے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" ابو نے کہا۔ "کیسے ثبوت کیسے کانٹیکٹ؟"

"اگر آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔"

"آیئے۔" ابو نے کہا اور اندر سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے کو کہا۔

پولیس انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو وہاں سے روانہ کرایا

اور خود ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے چہرے اور بات چیت سے ..... خاصا سلجھا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔

''صدیقی صاحب!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کو اس کیس میں ملوث ہونے سے بچا لوں۔''

''کیسا کیس؟'' ابو نے الجھ کر پوچھا۔ ''جس وقت ان لوگوں کا جھگڑا ہوا ہے۔ میں آفس میں تھا میں بھلا اس میں کیسے ملوث ہو سکتا ہوں۔ اصل ملزم تو لڈن اور اس کے ساتھی ہیں۔ آپ انہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے؟''

''ان تمام لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''وہ تو چھوٹے موٹے اچکے ہیں یا پھر ان پر یہ مار پیٹ کا کیس ہے۔ اصل مجرم تو عرفان ہے۔''

ابو بری طرح چونک اٹھے۔ یہی حالت میری تھی۔ میں اور امی ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس کھڑے انسپکٹر کی باتیں سن رہے تھے۔

''میں کچھ سمجھا نہیں؟'' ابو نے حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''عرفان نے آپ کو بتایا ہوگا کہ وہ کہیں جاب کرتا ہے؟''

''جی ہاں۔'' ابو نے حیرت سے کہا۔ ''جاب تو وہ کرتا ہے اور خاصی معقول جاب ہے لیکن جس وقت وہ یہاں آیا تھا اس وقت ایم بی اے کر رہا تھا۔''

''آپ کی یہ بات درست ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''عرفان نے واقعی ایم بی کیا ہے۔ وہ پڑھنے کا شوقین تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی ہوس بھی تھی۔ دو مرتبہ جیل جا چکا ہے پھر اس کا رابطہ کسی گینگ سے ہو گیا۔ وہ گینگ ہر قسم کے جرائم میں ملوث ہے۔ ان کے گروہ کے مختلف نوجوان شہر کے اعلیٰ اور متوسط طبقے اور پوش علاقوں میں رہتے ہیں۔ وہ علاقے کی خوب صورت لڑکیوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر ان کی شرمناک ویڈیو تیار کر لیتے ہیں۔ پھر یہ ویڈیوز گینگ کا لیڈر ایک ویب سائٹ کو مہنگے داموں فروخت کر دیتا ہے۔ یہ لوگ گزشتہ کئی سال سے اس گھناؤنے کاروبار میں مصروف ہیں اور اب تک نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی شرم ناک ویڈیو بنا کر بیچ چکے ہیں۔''

''لیکن انسپکٹر صاحب......!'' ابو نے کہا۔ ''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کر سکتے ہیں؟''

"گزشتہ سال عرفان نے ایک لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس کی ویڈیو تیار کی تھی۔ یہ لوگ ان لڑکوں اور ان کے والدین کو پہلے بلیک میل کرتے ہیں۔ پھر ان سے اچھی خاصی رقم وصول کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ویڈیو بھی انٹرنیشنل مارکیٹ میں بیچ دی جاتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ دونوں طرف سے پیسا بٹورتے ہیں۔ جس لڑکی کی ویڈیو عرفان نے گزشتہ سال تیار کی تھی اس میں ایک غلطی کر بیٹھا۔ ایک شاٹ میں اس کا چہرہ کیمرے کی زد میں آ گیا۔ لڑکی نے بدنامی کے خوف سے خودکشی کر لی لیکن اس کی ایک دوست نے وہ ویڈیو پولیس کے حوالے کر دی۔ یوں ہم نے عرفان کو پہچانا۔ میں نے اس کی تصویر کے کئی پرنٹ آؤٹ نکلوا کر مختلف تھانوں میں دے دیے تھے۔ اس دوران میں ان کے گروہ کا ایک لڑکا پکڑا گیا۔ ہمیں اس پر شبہ تھا لیکن وہ میرے دو چھتر بھی برداشت نہ کر سکا اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ میں نے اسے عرفان کی تصویر کا پرنٹ آؤٹ دکھایا تو اس نے عرفان کو پہچان لیا اور بولا۔ یہ لڑکا بھی ہمارے گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کا نام ناصر ہے۔ بس اسی روز سے مجھے اس لڑکے کی تلاش تھی۔ آج جب میں نے اسے زخمی حالت میں دیکھا تو فوراً پہچان گیا کہ یہ ناصر ہے۔ آپ اسے عرفان کہہ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے آپ کو اپنا غلط نام بتایا ہوگا۔"

"لیکن انسپکٹر صاحب! اس کی ماں تو بہت نیک اور سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔" ابو نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ وہ نیک نہیں ہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ عرفان یا ناصر کی والدہ نہیں ہے بلکہ اس گینگ کی ایک رکن ہے۔ وہ بھی عرفان یا ناصر کے لیے لڑکیوں کو گھیرتی ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "رات خاصی ہو چکی ہے۔ اب آپ آرام کریں اور زحمت ہو تو کل پولیس اسٹیشن آ جائیں۔ میں آپ کا باضابطہ بیان لوں گا۔"

انسپکٹر ڈرائنگ روم سے نکل کر چلا گیا اور ابو گم صم وہیں بیٹھے رہ گئے۔

اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی جیسے کوئی چیز فرش پر گری ہو۔ فوراً شائستہ گھبرائی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور بولی۔ "امی، آپی گر کر بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

میرے ساتھ ساتھ امی اور ابو بھی دوڑے۔ نورین لاؤنج میں بے ہوش پڑی تھی۔ گرنے سے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔

ابو نے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ میں نے اس کے سر اور چہرے سے خون صاف کیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں نے اس پر ہائیڈروجن آکسائیڈ لگا کر پٹی باندھ دی۔

ہائیڈروجن کی جلن سے نورین ہوش میں آ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ "کیا ہوا نورین؟" میں نے بہت پیار سے پوچھا۔

"باجی! میں برباد ہو گئی۔" نورین نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "عرفان نے تو میری بھی ویڈیو بنائی تھی۔"

میں بری طرح چونک اٹھی۔ "یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پرسوں جب میں رضیہ خالہ کے گھر پڑھنے گئی تھی تو عرفان گھر میں اکیلا تھا۔ وہ مجھے اپنی محبت کے جال میں تو پہلے ہی جکڑ چکا تھا۔ پھر اس نے مجھے شربت بنا کر دیا۔ گرمی بہت تھی۔ شربت پیتے ہی میری عجیب حالت ہو گئی۔ مجھے ہوش تو تھا لیکن اس مشروب میں کوئی نشہ آور چیز شامل تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں لٹ چکی تھی۔ میں بلک بلک کر رونے لگی۔ عرفان نے مجھے تسلی دی کہ میں جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا لیکن تم پریشان مت ہو میں تم سے شادی کر لوں گا۔ میں نے کہا کہ میرے گھر والے نہیں مانیں گے۔ وہ باجی کی شادی سے پہلے میری شادی نہیں کریں گے۔ اس پر اس نے بہت مکاری سے کہا کہ تم کوئی فکر مت کرو۔ میرے پاس ایسی تصویریں ہیں کہ وہ ہر صورت مانیں گے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کیسی تصویریں؟"

عرفان نے ہنس کر کہا۔ "وہ تصویریں صرف تمہارے گھر والوں کو دھمکی دینے کے لیے بنائی ہیں۔ تم مجھے غلط مت سمجھو۔"

یہ کہہ کر وہ پھر بری طرح رونے لگی۔

میں نے بمشکل تمام اسے چپ کرایا اور بولی۔ "اس نے وہ تصویریں کیسے بنائی تھیں؟"

"اس وقت اس کے پاس بہت مہنگا سیل فون تھا اس سے پہلے تو اس نے اپنی اور میری کچھ سیلفی بنائیں پھر مجھ سے بولا۔ یار تم تو اس میں بہت خوب صورت آئی ہو لیکن کیمرے کا اینگل غلط ہو گیا۔ میرا چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وہی سیل فون آخر وقت تک اس کے ہاتھ میں رہا تھا۔"

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پولیس انسپکٹر بھی کسی سیل فون کا تذکرہ کررہا تھا۔

”باجی!“ نورین نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ ویڈیو پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو میں بھی اپنی جان دے دوں گی۔ میں ابو کی بدنامی اور رسوائی برداشت نہیں کرسکتی ہوں۔“

”مجھے سوچنے دو۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سیل فون اگر پولیس کو نہیں ملا تو وہ عرفان ہی کے پاس ہوگا یا خالہ رضیہ کے پاس ہوگا۔ انہوں نے وہ پولیس سے چھپایا ہوگا۔“

”پولیس سے وہ کیسے چھپا سکتے ہیں؟“ نورین پھر رونے لگی۔ ”پولیس نے تو اب تک عرفان کے ساتھ ساتھ خالہ رضیہ کو بھی گرفتار کرلیا ہوگا۔“

”تم فکر مت کرو نورین!“ میں نے کہا۔ ”میں خود پولیس انسپکٹر سے بات کروں گی۔ وہ بھلا آدمی ہے۔ میں اس سے کہوں گی کہ اگر آپ کو عرفان کے سیل فون میں کوئی ویڈیو ملے تو اسے پلیز ضائع کردیں۔ میں صبح ہوتے ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ تم بالکل پریشان مت ہو۔“

اسی وقت انور نے مجھے بتایا کہ ابو آپ کو بلا رہے ہیں۔

میں ابو کے کمرے میں پہنچی تو ان کے ہاتھ میں انتہائی قیمتی سیل فون تھا۔ مجھے اس پر بہت حیرت ہوئی۔ ابو تو سیدھا سادہ سیل فون بھی مشکل سے استعمال کرتے تھے۔ انہیں اب تک اس پر میسج کرنا نہیں آیا تھا۔ پھر انہوں نے اتنا قیمتی سیل فون کیسے خرید لیا۔

”شمائلہ بیٹا! یہ عرفان کا سیل فون ہے۔ اسپتال میں رضیہ نے پولیس کی نظروں سے بچا کر میرے حوالے کردیا تھا۔ انسپکٹر نے کئی مرتبہ اس سیل فون کا تذکرہ کیا لیکن میں ذہنی طور پر اتنا الجھا ہوا تھا کہ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میری پینٹ کی جیب میں عرفان کا سیل فون ہے۔ میں اسے استعمال کرنا تو جانتا نہیں ہوں۔ اس وقت شاید یہ آف ہے تم اسے کھول سکتی ہو؟“

میں نے ابو کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔ اس کا واقعی پاور آف تھا۔ میں نے بٹن دبا کر اسے آن کرلیا لیکن اسے کھولنے کے لیے اسکرین پر ایک مخصوص پیٹرن کا بنانا ضروری تھا۔

میں نے کہا۔ ”ابو! یہ لاک ہے۔ مشکل ہی سے کھلے

جسٹس شیخ ریاض احمد

پاکستان کے چیف جسٹس (یکم فروری 2002ء) یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے قانون کا امتحان پاس کیا۔ 1960ء میں پلیڈر، 1922ء میں ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اور 1968ء میں ایڈووکیٹ سپریم کورٹ کے طور پر انرول ہوئے۔ چودہ سال تک قانون کی مشق کی۔ 1969ء سے 1974ء تک یونیورسٹی لاء کالج میں وزیٹنگ لیکچرر رہے۔ 1974ء میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل اور 1880ء ایڈووکیٹ جنرل پنجاب بنا دیے گئے۔ 1884ء میں انہیں لاہور ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ انہوں نے الیکشن کمیشن کے رکن اور سیکریٹری قانون کے طور پر بھی کام کیا۔ جون 1897ء میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ سنبھالا۔ ستمبر 2002ء تک فیڈرل ریویو بورڈ کے چیئرمین بھی رہے۔ فروری 2002ء میں انہوں نے چیف جسٹس پاکستان ہائی کورٹ کا عہدہ سنبھالا۔

اسلامی مالیاتی خدمات کی مجلس

Islamic Financial Services

(Board 8 اسلامی ممالک کا مالیاتی ادارہ اس کا قیام 2002ء میں کوالالمپور (ملائیشیا) میں عمل میں لایا گیا۔ پاکستان سمیت دنیا کے آٹھ مسلم ممالک میں انڈونیشیا، ایران، بحرین، سعودی عرب، سوڈان، کویت اور ملائیشیا شامل ہیں۔ اس کے قیام کا مقصد اسلامی مالیاتی اداروں کو باضابطہ بنانا ہے۔ یہ ادارہ ایسے مشترکہ معیارات یا مشترکہ معیار وضع کرے گا جو اسلامی عقائد کے مطابق مالیاتی خدمات کو فروغ دینے کے لیے مسلم ممالک میں اختیار کیے جائیں گے۔ یہ اس خدشے کو دور کرنے کے لیے قائم نہیں کیا گیا کہ مسلح گروپوں کو رقوم پہنچانے کے لیے اسلامی بینک استعمال ہوتے رہے ہیں۔ تاہم تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ ادارہ حسابات اور ٹرانسپیرنسی کے ایسے سخت قواعد مرتب کرے گا جن کے نفاذ سے رقوم کی غیر قانونی منتقلی کا عمل مزید مشکل ہوجائے گا۔ اس وقت اسلامی ممالک کی مالیاتی منڈی میں تقریباً 200 ارب ڈالر کا سرمایہ گردش کررہا ہے جس میں سالانہ 15 فیصد اضافہ بھی ہورہا ہے۔ نیا ادارہ اسلامی مرکزی بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کی نگرانی اور انہیں اسلامی اقدار کے تحت کام کرنے کے لیے مفید تجاویز بھی فراہم کرے گا۔

مرسلہ: ناصر حسین سواتی۔ کراچی

گا۔ میں کوشش کرتی ہوں اگر کھل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اسے کل پولیس کے حوالے کردیں گے۔"

بے چارے ابو کو کیا معلوم کہ اس موبائل میں بند ویڈیو سے ان کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔

میں وہ سیل فون لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ نورین میرے ہی کمرے میں سوتی تھی۔ وہ اس وقت تک روتے روتے نڈھال ہو کر سو چکی تھی۔

موبائل کی اسکرین پر کسی خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی اور اس پر نقطے پڑے ہوئے تھے۔ ان نقطوں کو مخصوص انداز میں چھیڑنے سے اسکرین لاک کھل سکتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن یہ عبارت ظاہر ہوتی کہ آپ پچیس دفعہ اسکرین لاک کھولنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ اب تیس سیکنڈ بعد دوبارہ کوشش کریں۔ سیل فون کی اسکرین پر تھوڑی دیر بعد میں نے پانچویں مرتبہ اللہ کا نام لے کر ایک نقطے پر انگلی رکھ کر اسے آخر کے نقطے سے ملایا پھر اسے سیدھا نیچے لے گئی اور دوبارہ اوپر لے آئی۔ کلک کی آواز کے ساتھ اسکرین لاک کھل گیا۔

میں نے سب سے پہلے ویڈیوز والا سیکشن کھولا۔ اس میں نورین سمیت کئی لڑکیوں کی انتہائی شرم ناک ویڈیوز تھیں۔ میں نے باری باری سب کو ڈیلیٹ کر دیا۔ وہ اتنی شرم ناک تھیں کہ میں نورین کو بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ پھر میں نے پکچرز کھولا شاید نورین کی کوئی تصویر بھی ہو اس میں نورین کی تین تصویریں تھیں۔ میں نے وہ بھی ڈیلیٹ کر دیں۔

آڈیو ریکارڈنگ میں کلک کیا کہ ممکن ہو کچھ آڈیو ریکارڈ کیا ہو لیکن اس میں کوئی ریکارڈنگ نہیں تھی۔

سیل فون کی اچھی طرح چھان بین اور چیک کرنے کے بعد میں نے اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھا اور سو گئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو نورین اسی زاویے سے سو رہی تھی۔ جیسے رات سوئی تھی۔

میں نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نورین اٹھ جاؤ تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

نورین ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے اسے ہلایا جلایا لیکن وہ اسی طرح پڑی رہی۔

خدشات سے میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے نورین کی نبض دیکھنے کی کوشش کی لیکن نبض بالکل ساکن تھی۔ پھر مجھے مزید دیکھنے کی ضرورت نہ رہی کیونکہ اس کی ناک اور منہ سے خون کی لکیر نکل کر اس کی ٹھوڑی اور گردن کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے نزدیک بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں پڑی تھیں۔ اس کی مٹھی بند تھی۔ میں نے اس کی بند مٹھی کھولی تو اس میں پرچہ دبا ہوا تھا۔

اس میں لکھا تھا۔ "باجی! مجھے معاف کر دینا۔ رات جب آپ وہ ویڈیوز دیکھ رہی تھیں تو میں نے بھی اپنی ویڈیو دیکھ لی تھی۔ اب یہ ویڈیو پولیس کے ہاتھ لگے گی میری عزت قربان ہو گئی تو میں اس صورت میں کیا کروں گی؟"

فوراً ہی میری چیخیں نکل گئیں۔ میری دل خراش چیخوں کی آواز سن کر امی اور ابو ننگے پیر دوڑتے ہوئے پہنچے۔

نورین نے اپنی چوڑیاں پیس کر کھا لی ہیں، اس کے منہ اور ناک سے اب زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ ابو آگے بڑھے اور نورین کے چہرے کو چادر سے ڈھانک دیا۔

میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اچھا بھلا انسان جرم کے راستے پر آخر کیوں چل نکلتا ہے۔ مجھے عرفان یا ناصر کے خاندانی پس منظر کا تو علم نہیں لیکن نہ جانے کیوں یہ یقین ہے کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بھی تھا اور ذہین بھی۔ پھر اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ دولت کا حصول! کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت مند بننے کا جنون۔ کاش وہ ہمارے محلے میں نہ آیا ہوتا یا پھر ہم ان لوگوں پر اتنا بھروسا نہ کرتے۔ کاش! نہ جانے ہمارے ہنستے بستے گھرانے کو کس کی بددعا لگی یا پھر کسی کی نظر کھا گئی؟